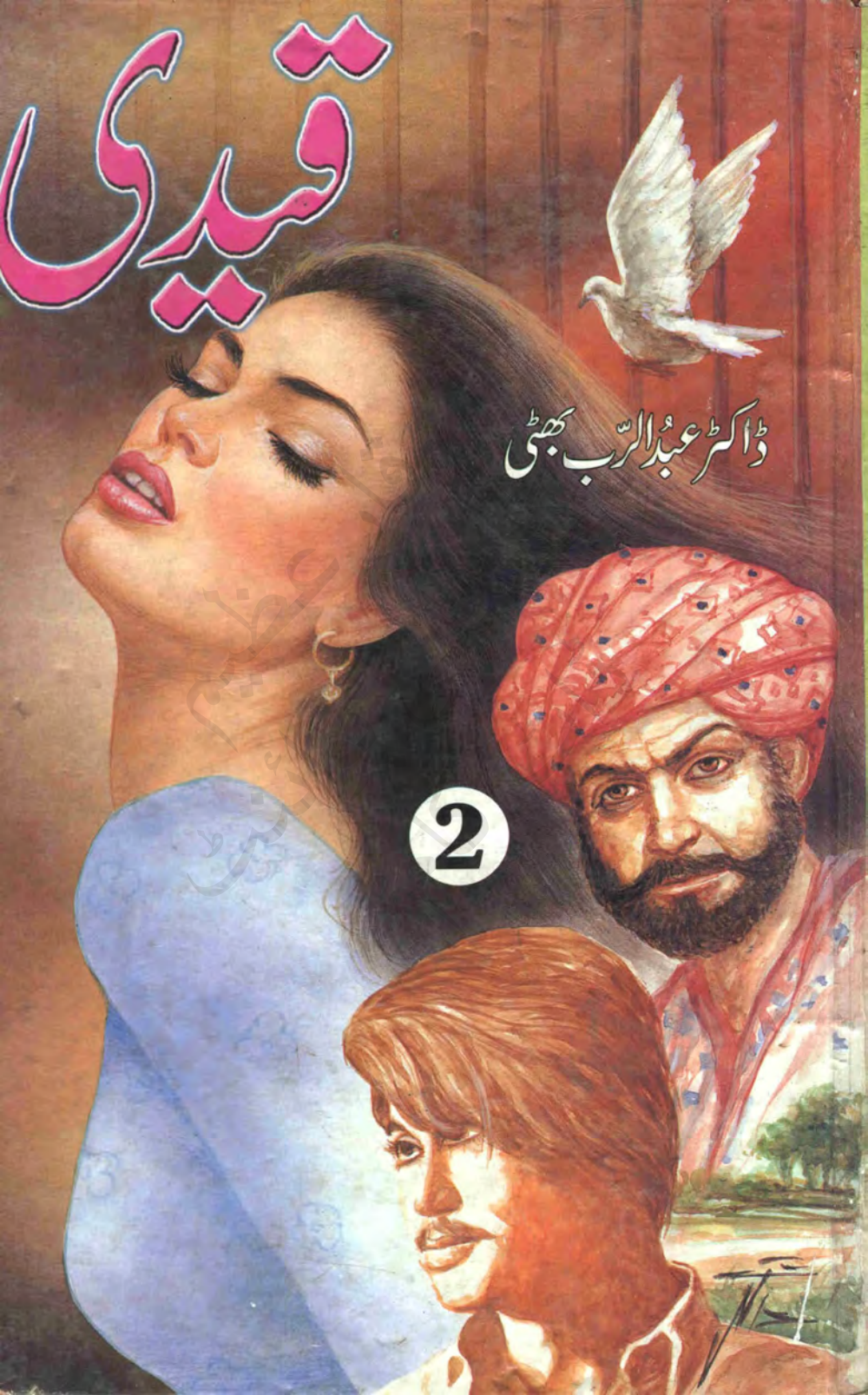


# قیدی

ڈاکٹر عبدالرَب بھٹی

2



نگینہ میری محبت تھی۔ اس کی خاطر میں دنیا کی ہر قوت سے ٹکرا سکتا تھا۔ لیکن اپنی ماں سے ٹکراتا، اس کے ختم سے روگردانی کرنا..... میں خود کو چچی کے دو پانوں کے درمیان پستا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ محبت کا تقاضا مجھے ماں سے بغاوت پر اکسارہا تھا۔ مگر ایسا کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف نگینہ کو چھوڑ دینا، اسے بھول جانا بھی میرے اختیار سے باہر تھا۔

میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور دوسری طرف سے نگینہ اپنی جاں فزا آواز میں ”ہیلو.....“

ہیلو! کر رہی تھی۔ میری خاموشی کا وقفہ طویل ہو رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ اس کے لہجے کی تشویش نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔

”آں..... ہاں۔“ میں نے بے خیالی میں کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”ٹھیک کہاں ہو؟“ اس کے انداز میں شکوہ اترنے لگا تھا۔ ”تم کہاں کھو گئے تھے؟“

”اوہ..... کہیں نہیں۔ بس ذرا اپنے ملازم کو اشارے سے کچھ سمجھا رہا تھا۔“ میں نے اپنی خاموشی کا

بھونڈا جواز پیش کیا۔ ”خیر، تم بتاؤ..... کبیر کا کچھ پتہ چلا؟ وہ کیلاش سے واپس لوٹ آیا ہے یا.....؟“

”وہ ابھی لوٹا تو نہیں ہے۔ تاہم اس کی خیریت کا فون آیا تھا۔“ نگینہ نے بتایا تو میں نے بے چینی

سے پوچھا۔

”کب آیا تھا؟..... اور کس کے پاس آیا تھا؟“

”انگل نظر حیات آئے تھے ہمارے ہاں۔“ وہ بتانے لگی۔ ”انہوں نے ہی پپا کو بتایا تھا کہ کبیر کا

پشاور سے فون آیا تھا اور اس نے اپنی خیر خیریت سے اپنے باپ کو مطلع کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بہت

جلد اور کسی بھی وقت بائی ایئر چنڈی پہنچنے والا ہے۔ اور تادر! مجھے اس کی آمد سے جانے کیوں ایک ڈر سا

لگ رہا ہے۔“ وہ آخر میں شاید فکر مند ہو گئی تھی۔

میں اس کی بات کا اصل مطلب سمجھے بغیر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”نگینہ! تمہیں اس سے ڈرنے

کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”مجھے اپنا کوئی ڈر نہیں ہے۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”ڈر تو مجھے اس بات کا ہے کہ کہیں وہ

بدخلصت شخص تمہارے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ کر ڈالے۔ پہلے ہی پپا، انگل نظر حیات اور انسپکٹر

اگلزخس تم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔“

اس کی بات معقول تھی، جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ وادی

کیلاش کی مہم میں اس مردود عامل عاروب کے ساتھ اعصاب شکن جنگ کے دوران کبیر کا دست راست

کالا ناگ میرے ہاتھوں جہنم داخل ہو گیا تھا جبکہ خود کبیر میری ہی گولی سے زخمی ہوا تھا۔ اب اس کی

واپسی کے بعد عین ممکن تھا کہ دونوں باپ بیٹے (نظر حیات اور کبیر) میرے خلاف کوئی نیا فساد کھڑا کر

”نادر! تم مجھے ایک بات بتاؤ۔“

”ہاں..... پوچھو۔“

”کیا تم میرے پاپا کو معاف کر سکتے ہو؟“

مجھے اس کی بات پر ایک اور جھکا لگا تاہم صاف گوئی سے بولا۔ ”شاید نہیں..... لیکن کیا تم خود بھی یہی چاہتی ہو کہ تمہارے باپ نے میری ماں کے ساتھ جو بھیا تک جرم کیا ہے، اس کی سزا تمہارے باپ کو نہ ملے؟“

چند ثانیے کی اسرار بھری خاموشی کے بعد گنیز نے کہا۔ ”انہیں قانونی سزا ملنی چاہئے۔ لیکن شاید اب اس کا وقت بھی گزر چکا ہے۔“

”ہاں گنیز! مگر یہ تم نے کیا بحث چھیڑ دی ہے؟ یہ بتاؤ، فون کس لئے کیا تھا؟“ میں نے اُسے اس گنیز موضوع سے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔

”میں ماں جی سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے وقت دے دو۔ کیا کل صبح میں آ جاؤں؟“

میں اس کی بات پر یکدم گھبرا کر بولا۔ ”نہیں..... نہیں..... ابھی نہیں آنا۔“

”کیوں بھی، آخر کیا بات ہے؟ بس..... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں اس معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”کون سا معاملہ؟“

”میں کل گرین لاج آ کر ہی بتاؤں گی۔ بائی بائی!“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں اپنے ہاتھ میں ریسیور پکڑے جانے کتنی دیر تک ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس لے کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اگلے دن صبح بیدار ہو کر ماں کی ہدایت کے مطابق میں سیدھا ٹال پہنچا۔

میں صبح نو بجے ٹال پہنچا تھا۔ منجبر مشتاق مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

میری غیر موجودگی میں اس نے ہی یہاں کے کاروباری امور سنبھالے ہوئے تھے۔ ماں بھی وقتاً فوقتاً وہاں آتی رہتی تھیں۔

گیارہ بجے تک میں شدید اضطراب میں مبتلا رہا۔ گنیز نے آج پنڈی سے مری گرین لاج آنا تھا۔ میرے لئے پریشانی کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ نہ جانے ماں گنیز کو دیکھتے ہی اس کے ساتھ کیا سلوک کریں؟ دوم یہ کہ میں گنیز پر ابھی ماں کی اس کے بارے میں غلط فہمی اور ناراضگی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ گرین لاج فون کر کے ذرا پتہ تو کھوں۔ لہذا یہ سوچ کر جیسے ہی میں نے ساگوان کی میز پر دھرے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا، یکدم اس کی تیل گونج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہیلو!“

”ہیلو نادر!..... میں گنیز بول رہی ہوں۔“ دوسری طرف سے اس کی آواز ابھری تو میں یکدم لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

”نہیں..... گنیز!..... تیت..... تم کہاں سے بول رہی ہو؟“

”کیوں؟..... تم پریشان کیوں ہو گئے بھی؟“ وہ بولی۔ ”ویسے میں گرین لاج سے بول رہی ہوں۔“

دیتے جس میں گنیز کا باپ شاہ میر پیش پیش ہوتا۔ جب تک میں اور ماں زندہ تھے، ان تینوں خبیث شیطانوں کی نظروں میں ٹھکتے ہی رہتے۔ کیونکہ وہ میرے اور ماں کے مستحقانہ عزائم سے اچھی طرح واقف تھے۔ میں نے یہ سب سوچا تھا تاہم اس کا اظہار کئے بغیر گنیز کو کھلی دیتے ہوئے بولا۔

”گنیز! تم اس کی فکر مت کرو۔ آنے دو اسے۔ میں یہاں بھی اس سے نمٹ سکتا ہوں۔“

دوسری جانب چند ثانیے خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد گنیز نے کہا۔

”نادر! میرا بہت دل کرتا ہے آئی سے ملنے کو۔ کبھی ملاؤ نا ماں سے۔ سچ نادر! میں تو بچپن میں ہی ان کے پیار سے محروم ہو گئی تھی۔ میں کتنی خوش قسمت ہوں نادر! کہ مجھے تمہاری صورت میں اپنے محبوب کے پیار کے ساتھ ماں کی ٹھنڈی چھاؤں بھی میسر آنے والی ہے۔“ وہ جیسے خواب ناک سے لہجے میں بولے جا رہی تھی۔

میری ماں سے اس کی محبت کا یہ جذبہ یقیناً اس کے اندر متا سے محرومی کے خلا کو پُر کرنے کی دیرینہ خواہش کا ہی باعث تھا۔ مگر میں اسے کیا بتاتا کہ ماں کو اس سے کس قدر نفرت ہے۔ وہ اسے دشمن کی بیٹی سمجھے ہوئے تھیں۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ لیکن یہ سب گنیز کی میری طرف سے ذہنی کایا کھپ کے بعد سے ہوا تھا۔ جس نے ماں کے دل میں اس کی طرف سے غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ گنیز نے اپنے باپ شاہ میر کے کہنے پر ہی مجھ سے منہ موڑا تھا جس کے باعث گنیز نے اپنے باپ کے خلاف عدالت میں جو بیان دیا تھا، وہ واپس لے لیا تھا۔ ماں کو تب سے ہی گنیز سے نفرت ہو گئی اور ساتھ ہی یہ یقین بھی ہو گیا تھا کہ گنیز نے یہ سب اپنے باپ کے ایماء پر اور اسی کے سمجھانے بھانے اور اشاروں پر ہی کیا تھا۔ لیکن اصل حقیقت تو میں ہی جانتا تھا کہ گنیز کے ساتھ کس قسم کی پر اسرار ٹریڈی ہوئی تھی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا نادر! پھر کب ملو رہے ہو ماں سے؟“ میری طول پکڑتی خاموشی پر گنیز نے مجھ سے کہا تو میں اسے ذرا ٹالنے کے انداز میں بولا۔

”ہاں..... ہاں، کیوں نہیں۔ میں تمہیں ضرور ملوؤں گا ماں سے۔ لیکن بس، تمہوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ ذرا حالات کو معمول پر آنے دو۔“ پھر موضوع بدل کر بولا۔ ”اچھا تم بتاؤ، تمہارے پاپا کا تمہارے ساتھ کیا رویہ ہے؟“

”ہوں، ٹھیک ہے، بس کچھ خفا خفا سے رہتے ہیں۔“ وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے گہری متانت سے بولی۔ ”لیکن نادر! انہوں نے تمہاری ماں کے ساتھ انکل نظر حیات سے مل کر جو ظلم کیا تھا، میں انہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ اس لئے تو میں کہتی ہوں کہ مجھے تم ماں سے ایک بار ملو دو۔ میں ان کے قدموں میں گر کر اپنے ڈیڈی کی طرف سے رو رو کر ان سے معافی مانگوں گی۔ مجھے یقین ہے نادر! وہ ہمیں معاف کر دیں گی۔“

گنیز کی اس معافی والی بات پر مجھے ایک جھکا سا لگا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا واقعی ماں گنیز کے باپ کا اتنا بڑا جرم معاف کر دیں گی؟..... پھر یہی سوال میں نے خود سے بھی کیا مگر کوئی جواب ذہن میں نہیں آیا۔

”تم خاموش کیوں ہو نادر؟“ اس نے مجھے خاموش پا کر دوبارہ کہا تو میں نے اسے یہ تیغ حقیقت بتا دینا ہی ضروری سمجھا اور سنجیدگی سے بولا۔

”گنیز! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاپا اور نظر حیات کا جرم اس قدر گھناؤنا اور ناقابلِ ستانی ہے کہ وہ اب معافی ستانی سے کوسوں دور ہو چکا ہے۔ تمہاری یہ کوشش فضول ہی ثابت ہو سکتی ہے۔“

اس کی بات پر میرا دماغ ہلک سے اڑ گیا۔ ”تت..... تم..... کک..... کک..... کب آئیں؟“ ماں کہاں ہیں؟“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔  
 ”میں یہاں آئی تو ماں جی نہیں تھیں۔ سیکنے نے بتایا تھا کہ وہ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں اور تم ٹال پر ہو۔“  
 ”میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ میں نے جلدی سے یہ کہہ کر ریسور رکھ دیا۔ اس کے بعد فیجر مشتاق سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں اپنی نئی جیب میں آبیٹھا اور گرین لاج کی طرف روانہ ہو گیا۔ گرین لاج پہنچا تو ایک ناقابل یقین منظر میرا منتظر تھا۔ نگینہ اکیلے گرین لاج نہیں آئی تھی، اس کے ہمراہ شاہ میر بھی تھی۔ اس کا باپ..... اور میرے باپ کا قاتل شاہ میر۔ اسے اپنے گھر میں دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ کنپٹیاں جیسے بری طرح سلگنے لگیں۔  
 وہ دونوں باپ بیٹی صوفے پر ایک ساتھ براجمان تھے۔ مجھے دیکھتے ہی نگینہ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”آؤ نادر!..... دیکھو میں ساتھ کسے لائی ہوں؟“  
 ”اسے کیوں لائی ہو تم؟“

میں نے سامنے صوفے پر براجمان شاہ میر کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے نگینہ سے کہا تو وہ مجھ سے بولی۔

”نادر! تمہیں ایک زبردست خوشخبری سنانے آئی ہوں۔“  
 جواباً میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اس شخص کی موجودگی میں مجھے کون سی خوشخبری سنا سکتی ہو نگینہ!..... تم نے اسے یہاں لاکر بہت غلطی کی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اس مردود سے کس قدر شدید نفرت ہے۔ اور ماں..... اگر میری ماں نے اسے یہاں اپنی چھت کے نیچے دیکھا تو وہ اسے گولی مارنے سے دریغ نہیں کرے گی۔“

”نادر! پہلے میری بات تو سن لو..... میں.....“ نگینہ نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اس کی بات کاٹ کر اٹل لہجے میں کہا۔

”نگینہ! پلےز، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس شخص کو میری نظروں سے دور لے جاؤ۔“  
 ”نادر! تمہیں میری بات سننا ہوگی۔“ دفعۃً نگینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے نرم اور ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ”نادر! چنانچہ یہاں تم سے اور تمہاری ماں سے اپنے جرم کی معافی مانگتے آئے ہیں۔ وہ اس جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اب تو بتاؤ، ہے نا کتنی بڑی خوشی کی بات۔“  
 نگینہ کا خیال تھا کہ میرے چہرے اور میرے لہجے کی برف پگھل جائے گی۔ مگر وہاں بدستور ایک گلیخیر تھا۔ میں نے کہا۔

”نگینہ! میں نے تم سے کل ہی فون پر کہہ دیا تھا کہ اب یہ معاملہ معافی طلبی سے کسوں دور جا چکا ہے۔ واپسی اور معافی کے تمام در بند ہو چکے ہیں۔“

”ایسا مت کہو نادر!..... کم از کم تم تو ایسا مت کہو۔“ نگینہ یکدم روپاکی ہو گئی۔ ”میں تو..... میں تو تمہیں بہت فراخ دل سمجھتی تھی۔ تم ایک پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے انسان ہو۔ میری خاطر ہی پاپا کو معاف کر دو۔ معاف تو خدا بھی کر دیتا ہے۔“

نگینہ کی بات پر میں اپنے اندر کے ٹھوٹے ہوئے اُبال پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر نگینہ کو دوسرے طریقے سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”نگینہ! بات صرف میرے معاف کرنے کی نہیں ہے۔ اس شخص نے میری ماں کو جو زخم دیا ہے، اس کا ازالہ کرنا ناممکن ہے۔ اور ماں کے لئے اپنے شوہر کے قاتل اور بیوگی کے زخم کے بعد بے گناہ نیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلے جانے کے ذمہ داروں کو معاف کرنا ناممکن ہی ہوگا۔“

اس بار شاہ میر نے مداخلت کی اور وہ صوفے سے اٹھ کر چند قدم چلتا ہوا میری طرف آیا۔ پھر نادم سے لہجے میں مجھ سے بولا۔ ”میں تم سے اتنا کہوں گا نادر! کہ کیا تمہارے بس میں مجھے معاف کرنا نہیں ہے؟“  
 ”ہرگز نہیں.....“ میں نے بلا تردد اور انتہائی سردمہری سے کہا تو وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر دھڑے سے بولا۔

”گئی بیٹا! ہمیں پھر یہاں سے چلنا چاہئے۔ بلاوجہ یہاں بد مزگی نہ ہو جائے۔ تمہیں پہلے نادر علی کو اعتماد میں لے کر قاتل کرنا چاہئے تھا۔ آؤ چلو۔“

مجھے اس کے شاطر لہجے میں مکارانہ طنز کی جھلک صاف محسوس ہوئی۔ نگینہ نے اپنی گھنیری سیاہ پلکوں کی چلن اٹھا کر درد بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اس کے بعد وہ ہولے سے اپنے باپ کو مخاطب کر کے بولی۔

”پاپا! آپ باہر جا کر گاڑی میں بیٹھیں، میں ابھی چند منٹ میں آتی ہوں۔“  
 ”اوکے بیٹا!“ شاہ میر نے ہولے سے کہا اور پھر خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”نادر!..... نادر! ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہمارے اندر کی نادم شخص کو معاف کرنے کا، عفو و درگزر کا جذبہ کیوں نہیں ہوتا؟ اگر کسی کو اپنی غلطی کا اعتراف ہے تو اسے..... اسے آخر کیوں معاف نہیں کیا جاتا؟ کیا..... کیا دشمنی کا جذبہ اسی قدر طاقت ور ہوتا ہے یا ہماری تنگ نظری اور تنگ ذہنیت اسے طاقت ور بناتی ہے؟“

باپ کے باہر جانے کے بعد نگینہ نے آزرہ لہجے میں مجھ سے کہا اور پھر سسکیاں بھرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس وقت چاچا فضل مرحوم کی بیوہ سیکنے بھی وہاں موجود تھی۔ ذرا دیر بعد باہر گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز ابھری۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی اور باہر آ کر اپنی جیب میں آبیٹھا اور دوبارہ ٹال کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹال سے میں دو بجے بعد دوپہر واپس گھر لوٹا تو ماں کو بڑی بے چینی کے عالم میں کمرے کے وسط میں ٹپکتے دیکھا۔ ان کے شاداب چہرے پر غصے اور طیش کی سرخیاں مترشح تھیں۔ جبکہ بڑی بڑی کالی آنکھوں سے نفرت و غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔

انہوں نے سیاہ پھول دار سوٹ کے اوپر لمبا ”سیسٹر“ چڑھا رکھا تھا جو ان کے دراز قد و قامت والی شخصیت کو مزید بڑھتا رہتا تھا۔ پیروں میں لاٹک پڑے تھے اور گھنیرے ہندی رنگ کے ریشمی بال، جن میں چاندی کا اکاؤ کا تار بھی جھلک رہا تھا، شانوں پر ٹکڑے ہوئے تھے۔ وہ ایسے میں ایک بھرپور پہاڑی عورت نظر آرہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رک گئیں اور برساتی ہوئی نگاہوں سے مجھے گھور کر گویا دانت پیستے ہوئے بولیں۔

”نادر! میں جو پوچھوں، مجھے صرف اس کا جواب چاہئے۔“  
 میں خاموشی سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”شاہ میر یہاں آیا تھا؟“  
 ”ہاں ماں!“

”گنیزہ بھی اس کے ساتھ تھی؟“

”ہاں ماں!“

”اور تم نے اپنے باپ کے قاتل کو یہاں سے جانے دیا؟ تم نے اس کے سینے میں گولی کیوں نہ دی؟ محض اس لئے کہ وہ گنیزہ کے ساتھ یہاں آیا تھا؟“

”ماں! یہ بات نہیں ہے۔ وہ یہاں معافی مانگنے آیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”معافی..... یہ کون سا لفظ ہے؟ میں تو اس لفظ سے واقف ہی نہیں ہوں۔ کیا تمہاری لغت دشمن کو معاف کرنے کا لفظ ہے؟ اگر ہے تو مجھے بھی بتا دو۔“

ماں نے جھٹکے دار لہجے میں مجھ سے کہا۔

”ماں! وہ مجھ سے بھی معافی مانگ رہا تھا لیکن مجھ سے وہ مایوس ہو کر یہاں سے گیا ہے۔“

”ہونہہ..... مایوس ہو کر.....“ ماں نے استہزاءیہ لہجے میں کہا۔ پھر ناگن کی طرح پھٹکار بولی۔ ”نادر! اس کی صرف یہاں سے لاش جانی چاہئے تھی اور وہ بھی اس حرافہ گنیزہ کے کاندھوں پر..... سمجھے تم؟“

”ماں! میں نے شاہ میر کو معاف نہیں کیا ہے۔ میں نے کہا نا، وہ یہاں سے بری طرح مایوس ہو کر.....“ میں نے برزور لہجے میں کہا تو ماں اپنے لائے قد پر جھولتے ہوئے براؤن ”سیسر“ کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر چند قدم چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی تھی کہ اس کی پھٹکاری ہوئی، جلتی سکتی سانسوں کی تپش مجھے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ پھر جیسے ایک ایک لفظ چبا کر مجھ سے بولی۔

”نادر! حقیقت یہ ہے کہ تم نے اسے معاف کر دیا ہے۔“

”نہیں ماں! نہیں..... میں نے اسے ہرگز معاف نہیں کیا ہے۔“ میں بھی ماں کے جلتے سگے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا۔

میں نے دیکھا، ماں کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔ جانے کیا ہوا، انہوں نے مجھے فوراً اپنے سینے سے لگا لیا۔ بے اختیار میں نے بھی ماں کو اپنے ساتھ بھینچ کر لپٹا لیا۔ ماں نے میری پیشانی کو چوما اور میں نے اس کے گال کو بوسہ دیا۔

ماں کے متا بھرے وجود کی قربت نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔

وہ مجھ سے الگ ہوئیں اور اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے میرے چہرے کا بڑے والہانہ انداز میں جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹا! تم اپنے بہادر باپ قادر علی خان کا دوسرا روپ ہو۔ وہ مجھ سے ہمیشہ بڑا بولتا تھا۔ مجھے بھی تم پر بھروسہ ہے کہ تم اپنی ماں سے ہرگز جھوٹ نہیں بولو گے۔ بے فکر رہو، مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ تم کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے۔ اور شاہ میر یقیناً تم سے مایوس ہو کر ہی یہاں سے لوٹا ہوگا۔ لیکن میں تمہاری زبان سے اس کے علاوہ ایک اور جملہ بھی سننا چاہتی ہوں۔“

ماں کے اس غیر معمولی رویے میں پیار بھری پلک کو محسوس کرتے ہی میرا پورا وجود مسرت سے سرشار ہو گیا اور میں جوش بھرے یقین کے ساتھ ماں سے بولا۔

”ماں! اپنے سینے پر بھروسہ کرو۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے، آپ کا یہ بیٹا کبھی دشمنوں کو معاف نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی مفاہمت کرے گا۔“

ماں نے مجھے تقاضا آمیز مسکراہٹ سے دیکھا اور اسی لہجے میں بولی۔ ”نادر بیٹے! مجھے تم پر فخر ہے اور

پورا بھروسہ بھی۔ پر تو ایک بات بتا، کیا واقعی تجھے گنیزہ اچھی لگتی ہے؟“

ماں کا اس طرح گنیزہ سے متعلق میرا عندیہ لینا، میرے لئے عجیب بھی تھا اور خوشی کی بات بھی۔ لہذا میں نے بھی ماں سے کچھ نہیں چھپایا اور صاف گوئی سے دل کی گہرائیوں سے بولا۔ ”ہاں ماں! گنیزہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔“

میری بات پر ماں کے چہرے پر چند ٹاپے پڑ سوچ خاموشی کے آثار طاری رہے اس کے بعد وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

”نادر بیٹے! باوجود اس کے کہ وہ ہمارے دشمن کی بیٹی ہے، وہ تم سے نباہ کر لے گی؟“

”ہاں ماں! کیونکہ وہ بھی واقعی اپنے باپ کو ہمارا بھرم سمجھتی ہے۔“

”مگر بیٹا! وہ اپنے باپ کی محبت سے مجبور ہو کر، تمہارا کسی وقت ساتھ تو نہیں چھوڑ دے گی؟“

”نہیں ماں! میں گنیزہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔“

”تب بیٹا! پھر وہ یہ آس لے کر ہمارے پاس کیوں آئی تھی کہ ہم اس کے باپ شاہ میر کو معاف کر دیں گے؟“

”ماں! گنیزہ فطرتاً ایک نرم خو اور صلح جو طبیعت کی لڑکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اگر ہم اس کے باپ کو معاف کر دیں گے تو زیادہ اچھی اور خوشی کی بات ہوگی۔ مگر اب وہ مایوس ہو گئی ہے ہم سے۔“

”میں تم سے یہی پوچھنا چاہتی تھی نادر بیٹے! کہ اب مجھ سے اور بالخصوص تم سے مایوس ہونے کے بعد گنیزہ کیا واقعی تمہارے ساتھ شادی پر آمادہ ہو جائے گی؟“ ماں نے گہرے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ماں! مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس سب کے باوجود مجھ سے منہ نہیں موڑے گی۔“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

”کیا تمہاری اور گنیزہ کی شادی میں اس کے باپ شاہ میر کی مرضی بھی شامل ہوگی؟“

”شاید نہیں۔“ میں نے گونگو سے لہجے میں کہا اور حریف بولا۔ ”لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ گنیزہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور وہ اپنے مجرم باپ کی مرضی کے خلاف میرے ساتھ ضرور شادی پر رضامند ہو جائے گی۔“

”تو ٹھیک ہے پھر۔“ دفعۃً ماں نے گنیزہ لہجے میں انتہائی متانت سے کہا۔ ”تم گنیزہ سے فوراً اس سلسلے میں حتمی بات کر لو۔ تم دونوں کی شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ ماں نے اتنا کہا اور پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں ہکا بکا سا کھڑا رہ گیا۔ ماں کے رویے میں گنیزہ سے متعلق اچانک نرمی جہاں میرے لئے خوشی کی بات تھی تو وہیں مجھے ایک عجیب سی الجھن آمیز حیرت بھی ہو رہی تھی۔

میں اس سارے معاملے پر گہرائی سے سوچنے لگا۔ جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے ماں کچھ اخذ کرنا چاہ رہی ہو، گنیزہ کو آزمانا چاہتی ہو کہ وہ واقعی باپ سے متفرق نہ ہو یا پھر اس کے اشاروں پر ہم ماں بیٹے کو بے وقوف بنارہی تھی۔ یقیناً اب گنیزہ کا میرے ساتھ شادی کے لئے ”ہاں“ یا ”نہ“ کہنا بہت اہم ہو گیا تھا۔

بہر طور کچھ بھی تھا، مجھے پورا یقین تھا کہ گنیزہ کبھی مجھ سے شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ماں نے مجھے ایک موقع دیا تھا۔ وہ یا تو اپنے تئیں گنیزہ کا اصل چہرہ میرے سامنے بے نقاب کرنا چاہتی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ بہر حال کچھ بھی سہی، اگر ماں کے دل میں یہی کرید یا کسی قسم کی

لہجہ میں کہا۔ ”مجھے صرف اپنے سوال کا جواب چاہئے۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟“  
 ”میں تمہاری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا رذیل کتے! دماغ ہو جاؤ میری نظروں سے۔“ میرے اندر  
 کا اُبال عروج پر پہنچ گیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔  
 نظر حیات کا چہرہ احساسِ ذلت اور طیش کے مارے مزید سرخ ہو گیا۔ اس کے ساتھ کھڑے دو  
 کرخت رو آدمیوں کی آنکھوں میں مجھے گھورتے ہوئے عجیب سی چمک ابھری جو یکھٹ معدوم بھی ہو گئی۔  
 اس کے بعد نظر حیات اپنے دانتوں تلے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔  
 ”نادر! ایک بات یاد رکھو۔ اگر میرے بیٹے کا ذرا بھی بال بیکا ہوا یا وہ مجھے اگلے چوبیس گھنٹوں کے  
 اندر اندر نہ ملا تو میں اس کی ذمہ داری تمہارے سر سمجھوں گا۔“ تہدیدِ انداز میں یہ کہہ کر وہ واپسی کے  
 لئے مڑ گیا۔

میں دوبارہ اپنی ریوالونگ چیز پر بیٹھ گیا۔ دونوں گارڈز کو میں نے واپس جانے کا اشارہ کیا البتہ فیجر  
 مشتاق مسکسی صورت بنا کر مجھ سے تفکیر بھرے لہجے میں بولا۔  
 ”سرجی! یہ تو اتنا ہنگامہ کر گیا ہے۔ ہمارے مال کو پھر سرخ سیل نہ لگوا دے، جی کڑا کے۔“  
 ”اب اگر ایسا ہوا تو میں اس کے خلاف اختیارات سے متجاوز ہونے کی حکمت جاتی کارروائی کر  
 ڈالوں گا۔“

”بالکل..... بالکل۔“ وہ اپنا سر دھننے لگا۔

میں نے اسے تسبیہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی ذرا مال کی خرید و فروخت میں احتیاط برتنا، خیال  
 سے۔ کوئی ٹھیکے دار ہمیں چوری کا مال پیلنے کی کوشش نہ کرے۔ بالخصوص نئے ٹھیکیداروں کے سلسلے میں  
 احتیاط کرنا۔“

”ٹھیک ہے سرجی! میں اس بات کا خیال رکھوں گا، جی کڑا کے۔“

”کیا مطلب جی کڑا کے؟..... کیا تمہارا کام کرنا دوبرہ ہو گا؟“ میں نے دانستہ اس کے نئے ٹکیے  
 کلام پر مصنوعی غصے سے گھور کر پوچھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔

”اوئن..... نہیں جی..... سرجی! میرا مطلب تھا کہ میں زیادہ اچھے طریقے سے خیال رکھوں  
 گا۔ جی کڑا کے۔“ وہ اچانک چپ ہو گیا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... تم جاسکتے ہو۔“ میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے  
 اٹھ کر چلا گیا۔ میں ریوالونگ چیز کی پشت گاہ سے سر نکا کر کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔

ہمارے ازلی دشمن شاہ میر اور نظر حیات کو میں جب بھی کسی پریشانی یا مصیبت میں تلملاتا ہوا دیکھتا تھا  
 تو مجھے بڑی ذہنی آسودگی ملتی تھی۔ اس طرح نظر حیات کا اپنے نقش قدم پر چلنے والے بیٹے کی کشدگی پر  
 پریشان اور متفکر ہونا میرے لئے باعثِ مسرت تھا۔

اگرچہ وہ اس کی کشدگی کا الزام میرے سر پر قیوب کر مجھے دھمکی بھی دے کر گیا تھا لیکن مجھے اس کی  
 گیدڑ بھکیوں کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ میں تو فقط کبیر کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا کہ زخمی ہونے کے بعد  
 اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ اور وہ کہاں تھا؟ عین وقت پر جہنمِ واصل کالا ناگ کی ترغیب پر اس نے عامل  
 عاروب کے پیروکاروں کے سامنے مجھ پر بے دریغ گولیاں چلا دی تھیں اس لئے اس کا تو یقین تھا کہ  
 عامل عاروب کے پیروکاروں کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کبیر بہر حال ان کا دشمن نہ تھا۔ تاہم میرے  
 اندازے کے مطابق اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ تو پھر آخر وہ کیا کہاں؟ ایک خیال یہ بھی

تشکیک تھی تو یہی سہی۔ مجھے ماں نے ایک موقع دیا تھا۔ کیا خبر، اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی نے اسے  
 پکھلا دیا ہو۔

بہر طور ماں کا رضامند ہونا میرے لئے کم خوشی کی بات نہ تھی اور میں یہ خوش خبری جلد سے جلد نگینہ  
 بھی سنانا چاہتا تھا۔ گویا اب میں اپنی محبت کو نگینہ کی شادی کی صورت میں پانے کا حتیٰ فیصلہ کر چکا تھا۔  
 میں نگینہ سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا مگر پہلے مجھے اس کے فون کا انتظار تھا۔ اگلے روز میں ٹال  
 پہنچا۔ معمولات کے کام نمٹائے اور بارہ بجے تک قدرے فارغ ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نظر آفس کبیر  
 کے کھٹے والے دروازے سے باہر ٹال کے وسیع و عریض احاطے پر پڑی۔ ایک سیاہ رنگ کی ٹویٹا پراڈ  
 تیزی سے اندر داخل ہوئی اور ایک جھٹکے سے میرے آفس کبیر کے سامنے رک گئی۔

میں قدرے چونک سا گیا۔ پھر جس شخص کو میں نے تیزی کے ساتھ کار سے اترتے دیکھا، وہ نظر  
 حیات تھا۔ اسے دیکھ کر میری کنپئیاں سلگ اٹھیں۔ اس کے ہمراہ دو افراد بھی تھے۔ نظر حیات نے گر۔  
 کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

”یہ مردود یہاں کیا لینے آیا ہے؟“

میں ہولے سے زیر لب بڑبڑایا۔ تاہم سنہیل کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنے دونوں آدمیوں کے ساتھ اندر داخل  
 ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی، غیظ اور تفکرات کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔

”نادر! میرا بیٹا کبیر کہاں ہے؟“ اندر داخل ہوتے ہی مجھے گھورتے ہوئے غیظ آلود لہجے میں بولا۔  
 اس اثناء میں میرے دو سٹگ گارڈز جو باہر چوٹی گیٹ میں متعین تھے، ایک کار کو رکے بغیر تیزی سے اندر  
 داخل ہوتے دیکھ کر فوراً وہاں آن پہنچے تھے اور ساتھ ہی چند مزدور بھی۔ برابر والے کمرے سے فیجر مشتاق  
 بھی دوڑا چلا آیا تھا۔ میں نے اپنے سٹگ گارڈز اور فیجر مشتاق کو تو وہیں کھڑے رہنے دیا البتہ مزدوروں کو  
 واپس جانے کا حکم دیا۔

”تم نے یہاں آنے کی جرأت کس طرح کی ہے نظر حیات!“ اس کے سوال کو سر بہ سر نظر انداز  
 کرتے ہوئے میں نے بھی خونخوار غراہٹ سے مشابہہ آواز میں اس سے کہا۔

”ابھی میں نے اپنی جرأت تمہیں دکھائی کب ہے نادر!“ وہ دانت پیس کر غیظ لہجے میں بولا۔ ار  
 دوران میرے سٹگ گارڈز نے اس کی بدتمیزی اور دراندہ وار اندر داخلے پر نظر حیات سے کچھ جانا چاہا تھا مگر  
 میں نے اشارے سے انہیں خاموش کھڑے رہنے کو کہا۔

”نادر! اگر تمہاری ماں اسی طرح کی بزدلانہ حرکتیں کرے گی تو وہ بھی ایسی ہی حرکت کا نشانہ بن سکتی  
 ہے۔ وہ شاید بھول رہی ہے کہ وہ میری طرح خود بھی ایک جوان اور اکلوتے بیٹے کی ماں ہے۔“

اگرچہ کبیر کے سلسلے میں مجھے تھوڑی بہت اس کی بات کی ہے جتنی تو تھی کہ نہ جانے عامل عاروب کا  
 خانقاہ میں میرے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا تھا؟ تاہم نظر حیات کی اس تہدید پر میرے  
 خون جیسے کنپٹیوں تک اچھال مارنے لگا۔ مگر میں بھی سردست زبانی کلامی ہی اسے دق کرنا چاہتا تھا۔ اس  
 سے گھور کر بولا۔

”نظر حیات! بجرم باپ کی اولاد کے سلسلے میں یہ تو کہا جاسکتا ہے، اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنے  
 والے بیٹے کا بھیا تک انجام اپنے باپ سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ایک مظلوم مگر بہادر ماں کے بیٹے سے  
 ایسی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔“

”کسی خوش فہمی میں مت رہنا تم دونوں ماں بیٹا۔ سمجھے تم۔“ نظر حیات نے غیظ و غضب سے لرز



میرے ذہن میں آتا تھا کہ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ عامل عاروب کے پیروکاروں نے اپنے روحانی پیشوا (عاروب) کی ہلاکت یا زخمی ہونے کے بعد مشتعل ہو کر کبیر کو بھی زندہ نہ چھوڑا ہو۔ کیونکہ بہر حال عین وقت پر کالا ناگ اور کبیر نے ہی بھری خانقاہ میں مجھ پر فائرنگ کی تھی اور اس "ترا بڑی" میں عامل عاروب بھی زخمی یا ہلاک ہو گیا تھا۔

بہر طور وہ دن خیریت سے گزرا۔ مجھے بھوک نہیں تھی اس لئے میں نے کھانا ہی نہیں کھایا تھا اور شام پانچ بجے تک ٹال میں بیٹھا رہا۔ ٹھیک ساڑھے پانچ بجے میں ٹال سے گھر رخصت ہونے کے لئے اٹھا۔ باہر آ کر اپنی جیب میں بیٹھا اور جیسے ہی ٹال کے احاطے والے بڑے سے چونی گیٹ سے باہر نکلا، اچانک ایک انگریز رنگ کی ایف ایکس کار بالکل میری جیب کے سامنے رکی۔ میں نے بھی بڑیک لگا دیئے۔ میں نے کار سوار کو دیکھا جو تنہا تھا بلکہ تھی۔ وہ ایک فیشن طرز عورت تھی۔ میں اسے پہچان کر بری طرح چونکا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مسز جواد تھی جس کے کبھی کبیر کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے مگر بعد میں میری اس سے "ون نوون" ملاقات کے بعد بالکل منقطع ہو گئے تھے۔

وہ مجھے جیب میں سوار دیکھتے ہی فوراً اپنی کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتری اور بڑی بے تابانہ انداز میں جیب کی طرف بڑھی۔ ناچار مجھے بھی نیچے اترنا پڑا۔ مجھے اس کا چہرہ مضطرب سا محسوس ہوا۔ بہر طور وہ میرے قریب آ کر مجھے لہجے میں بول۔

"نادر صاحب! مجھے یقیناً آپ نے پہچان لیا ہو گا؟" میں نے دھیرے سے محض سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا تو وہ مزید بولی۔ "مم..... مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ پلیز! آپ ذرا دیر کے لئے میرے ساتھ چل سکتے ہیں؟" وہ پنڈی میں رہتی تھی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟..... کیا آپ ابھی سیدھا پنڈی سے آرہی ہیں؟"

"ہاں..... میں بہت مشکل میں ہوں نادر صاحب! پلیز میری مدد کریں۔ اس مشکل وقت میں مجھے یقین ہے کہ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔"

"آخر بات کیا ہے محترمہ! کچھ تو بتائیں۔" میں نے بالآخر پوچھا۔

"پلیز، آپ کو میرے ساتھ میرے بنگلے پر چلنا ہو گا۔"

میں پریشان ہو گیا۔ "کیا اس وقت؟"

"ہاں..... اسی وقت۔ اور وہ بات ایسی ہے کہ میں یہاں آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اتنی زیادہ واقفیت تھی۔ وہ بہر حال میرے لئے ایک طرح سے مانوس اجنبی ہی تھی۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے خاتون....."

"میرا نام غزالہ ہے۔" اس نے میری بات کاٹ کر اپنا نام بتایا۔

"ہاں..... لیکن میں آپ کے ساتھ کیسے چل سکتا ہوں؟ اگر آپ کسی پریشانی میں مبتلا ہیں تو آپ کو وہیں، متعلقہ تھانے کی پولیس سے مدد لینی چاہئے تھی۔"

میری مسلسل بے اعتنائی اور بے رخی پر اس کے چہرے پر ایک لمحے کو مایوسی کی رقع ابھری، پھر دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ ایک التجائے لے لی۔

"پلیز!..... پلیز نادر صاحب! میں..... میں آپ کے پاس بڑی امید لے کر آئی ہوں۔"

میری بات پر اس کا چہرہ مزید تاریک ہو گیا۔ پھر وہ بڑی آزرده سی سانس خارج کر کے غم زدہ سی ٹکراہٹ سے بولی۔ "نادر صاحب! اگر ہمیں صبح چلنا ہوتا تو میں اس وقت بھلا آپ کے پاس کیوں آتی؟ رکوئی بات نہیں، میں آپ کی گتھی ہی کیا ہوں؟ بس ایک ملاقات میں آپ نے مجھے متاثر کیا تھا کہ آپ اپنے اندر انسانیت کا درد رکھتے ہیں۔ سو اسی امید کے سہارے چلی آئی تھی۔ آپ کا شکریہ! مجھے آپ سے دلی گدہ نہیں۔"

وہ یہ کہہ کر مایوسانہ انداز میں واپس چلی۔ مجھے بے اختیار اس پر ترس آ گیا۔ وہ جب اپنی کار کا دروازہ کھولنے لگی تو میں نے بے اختیار اسے آواز دی۔

”مٹھریئے ذرا.....“ میری بات سن کر وہ پلٹ کر امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھنے آئے۔ میں نے کہا۔ ”آپ اپنی کار میں بیٹھیں، میں اپنی جیب میں آتا ہوں۔“

میری بات سن کر وہ خوشی سے نہال ہو گئی اور اگلے لمحے ہی وہ اپنی کار میں سوار ہو گئی اور میں نے جیب کی ذرا نیوگ سیٹ سنبھال لی۔

ذرا دیر بعد ہی ہم دونوں پنڈی کی طرف رواں تھے۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پہلے تو پہنچوں، صورت حال کیا ہے؟ اس کے بعد ضرورت پڑی تو ماں کو وہیں سے فون کر کے کوئی نہ کوئی کرنا پڑے گا۔ بلکہ بہانہ کیا، حقیقت ہی بتاتا کہ اس طرح کوئی مصیبت کا مارا دوست ملا تھا اور میں از ہمدردی سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ ہو گیا۔ سوا آٹھ بجے رات ہم پنڈی پہنچے۔

بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہم نے اپنی گاڑیاں روک دیں اور نیچے اتر آئے۔ بنگلے پر ویرانی اور عجیب پراسرار خاموشی کا راج تھا۔ غزالہ نے جلدی سے آہنی گیٹ کا تالا کھولا اور مجھے اندر داخل ہونے کو کہا۔ پھر میرے بعد وہ بھی اندر آ گئی۔

ہم مرکزی دروازے سے اندر کمرے میں پہنچے اور ایک ایسی میری پھٹی جس نے خطرے کا الارم بجا دیا۔ لیکن میں نے کوئی توجہ نہ تھی۔ وجہ یہی تھی کہ میری غزالہ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے مسکرا کر ایک صوبے پر بیٹھنے کا کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ذرا دیر میں آنے کا کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اچانک ایک سرد نال میری گردن سے آن لگی۔

”خبردار! کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ اس خاموش پستول کی گولی گردن سے پار ہو جائے گی۔“

ایک سرسراتی ہوئی یکسر اجنبی، سفاک آواز میری سامعوں سے ٹکرانی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔

دل جیسے یکدم سائیں سائیں کرتی کینٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔

جب اس نے معلوم شخص کو یہ تسلی ہو گئی کہ میں کسی مزاحمت کے موڈ میں نہیں تو اس نے مجھے دوسرا دیا۔ ”اب پیچھے دیکھ بغیر اٹھ کر آگے بڑھو۔“

میں تعمیل حکم میں ہونٹ پیچھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے سامنے والے کمرے کے دروازے طرف بڑھنے کو کہا۔ میں نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ مجھے خطرے کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔ غزالہ عورت نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ مگر کیوں؟..... اس کا جواب سوچنے کا یہ موقع نہ تھا۔ مجھے سردست گلو خلاصی کے بارے میں سوچنا تھا۔ حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے کسی خطرناک جال میں پھنسا

کی کوشش کی جا رہی تھی۔ جبکہ مجھے چھپنے سے پہلے ہی یہ جالی توڑنا تھا۔

مجھے یہ تو بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ مجھے حکم دینے والے شخص کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ وہ وہاں اکیلا لہذا میں مذکورہ کمرے کے بند دروازے تک پہنچ کر دانستہ رکا تو حسب توقع اس نے عقب سے غرا کر

”دروازہ اندر دھکیلو۔“

میں نے فوراً آگے بڑھ کر دروازے کے ”لٹو“ پر ہاتھ رکھا اور اسے گھما کر دانستہ یوں جھک

دروازے کو دھکیلا کہ میری گدی سے پستول کی سرد نال ہٹ گئی۔ گن پوائنٹ سے ”آؤٹ“ ہونے میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھکائی دی۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے غیر ارادی طور پر خاموش، سائلنسر لگے پستول کا ٹرائیگر دبا دیا۔ ”ٹھک“ کی آواز سے گولی چلی لیکن میں جھکائی دے پڑا اور ساتھ ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی کا زوردار وار اس کے پہلو پر کیا۔ ضرب کی شدت نے بے

اچانک خواب گاہ کے دروازے پر غزالہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا وہی پستول دبا ہوا

میں نے دوسرا گھونسا اس کے درباری انداز میں جھکے ہوئے چہرے پر رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے میرا زیادہ پھیلنا پسند نہیں آیا تھا، لہذا اس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اپنے جھکے ہوئے سر سے میرے پستول میں ٹکرا کر اسے روک دیا۔ نتیجتاً پستول ہاتھوں کے طوطے کی طرح اڑ کر اس کے ہاتھ سے ٹکٹا چلا گیا۔ اس نے نقاب چڑھا رکھا تھا۔

میں نے دوسرا گھونسا اس کے درباری انداز میں جھکے ہوئے چہرے پر رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے میرا زیادہ پھیلنا پسند نہیں آیا تھا، لہذا اس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اپنے جھکے ہوئے سر سے میرے پستول میں ٹکرا کر اسے روک دیا۔ نتیجتاً پستول ہاتھوں کے طوطے کی طرح اڑ کر اس کے ہاتھ سے ٹکٹا چلا گیا۔ اس نے نقاب چڑھا رکھا تھا۔

میں نے دوسرا گھونسا اس کے درباری انداز میں جھکے ہوئے چہرے پر رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے میرا زیادہ پھیلنا پسند نہیں آیا تھا، لہذا اس نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے اپنے جھکے ہوئے سر سے میرے پستول میں ٹکرا کر اسے روک دیا۔ نتیجتاً پستول ہاتھوں کے طوطے کی طرح اڑ کر اس کے ہاتھ سے ٹکٹا چلا گیا۔ اس نے نقاب چڑھا رکھا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اپنی دوسری ٹانگ زمین پر ٹکی اس کی اکلوتی ٹانگ پر سوپ کے انداز میں رسید کر دی۔ مگر اس کی پہلی ٹانگ میں نے مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے رکھی۔ نتیجتاً جیسے ہی وہ زمین بوس ہوا، میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ٹانگ مروڑ کر اسے اٹھ کر دیا۔ پھر اس کی دونوں ٹانگوں کو اس کے کولہوں کی طرف فطری انداز میں موڑ کر اس پر اپنے پورے وزن کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اس کے حلق سے نیل کے ذکرانے جیسی آواز خارج ہوئی۔ میں نے زوردار نکا اس کی ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے پر رسید کیا تو وہ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ چکا تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کا نچلا دھڑ بے کار ہو چکا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں کی مدد سے سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے میری نظر غیر ارادی طور پر سامنے بیڈ پر پڑی اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بیڈ پر ایک انسانی وجود پشت کے بل بیٹھا ہوا تھا مگر اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر دستے تک خنجر بیوست تھا۔

بیڈ پر خون پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا جو کافی حد تک اس کے میٹرس میں جذب ہو چکا تھا۔ میں اس شخص کو اچانک چکا تھا جواب یا جانے کب کا مردہ ہو چکا تھا۔ وہ غزالہ کا معذور شوہر جواد احمد تھا جواب لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اچانک خواب گاہ کے دروازے پر غزالہ نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا وہی پستول دبا ہوا



تھا جو نقاب پوش کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ اس نے جو سامنے بیڈ پر اپنے شوہر کی خون آلود لاٹ دیکھی تو ایک زوردار چیخ ماری۔ مجھے اس کی چیخ کا مطلب و مقصد کچھ میں نہ آ سکا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا، وہ زمین بوس پڑے اس نقاب پوش کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے ہڈیائی اند میں چلا کر بولی۔

”ذلیل!..... خونی!..... بت..... تونے..... تونے میرے شوہر کو مار ڈالا۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ میں غزالہ کو روکنے کی کوشش کے بارے میں ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ اس نے تلے اوپر دو تین بار ٹرائیگر دبا کر اسے ہلاک کر ڈالا۔

اس کے بعد پستول ایک جانب پھینک کر وہ بیڈ کی طرف لپکی اور اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ رونے لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا؟

میرے جی میں تو آئی کہ میں اس سارے نہ سمجھ میں آنے والے پراسرار خونی کھیل پر لعنت بھیجا اور جل ٹو جلال ٹو، صاحب کمال ٹو، آئی بلا کو ٹال ٹو کا ورد کرتے ہوئے فوراً یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن میں غزالہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسے مجھ سے کس بات کی دشمنی تھی؟ یا کیا اس نے میرے احسان کا بدلہ چکایا تھا کہ میں نے اسے کبیر جیسے مہینے اور کینہ پرور شخص کے شیطانی چنگل سے بچایا تھا۔ مگر میں خود حیران تھا کہ اگر یہ سارا کیا دھرا سبز جواد کا ہی تھا تو پھر وہ تو پہلے ہی یہاں موجود تھی اس کا اپنے معذور شوہر کی لاش سے لپٹ کر رونے کا کیا مطلب تھا؟

بالآخر میں نے ذرا قریب آ کر اس سے استہزاء نہ لپچے میں پوچھا۔ ”یہ سب کیا ڈرامہ ہے محترمہ! آپ اس خونی ڈرامے میں میرا کردار بھی شامل کرنا چاہتی ہیں؟“

اس نے بین کرنا بند کیا، پھر سیدھی کھڑی ہو کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ چہرہ نہایت آزرده نظر آ رہا تھا مگر مجھے یہ سب مصنوعی لگا تھا۔ اس کے آنسو مگر مجھ کی یاد دلا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی صفائی میں بڑا خوبصورت اور زلا دینے والا جھوٹ بولے گی۔ مگر اس نے چہرے پر ایسے ملتانہ تاثرات نہیں تھے۔

”نادر صاحب!..... آ..... آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ میں اس کے ان اکھنڈ سنجیدہ جملوں پر ششدر رہ گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے گھور کر درشت لہجے میں بولا۔

”نہیں..... تمہیں مجھے بتانا پڑے گا، یہ سب کیا تھا؟ آخر تم میرے ساتھ کون سی دشمنی نکالنا چاہتے ہو؟“

”آپ کا کام ختم ہو گیا۔ آپ جائیں۔ اس میں ہی آپ کی بھلائی ہے۔ ورنہ اس چکر میں آپ گناہ بھجن کر رہ جائیں گے۔“

وہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی۔ آنسو بھی خود بخود اس کے خشک ہونے لگے تھے۔

”کون سا کام لیا ہے تم نے مجھ سے؟“ میں نے اپنی آنکھیں کبیر کر اس سے پوچھا۔

”جو کام میں آپ سے لینا چاہتی تھی، وہ میں نے لے لیا ہے۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

شاید مجھے دیر ہو گئی۔ کاش میں پہلے ہی یہ کام کر دیتی۔

مجھے اس کی عجیب و غریب باتوں پر حیرت ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میں بھی اڑ گیا تھا۔ ”میں ایسے نہ

جاؤں گا۔ پہلے تمہیں مجھے بتانا پڑے گا۔ آخر تم مجھے یہاں خود خد کر کے لائی تھیں اور مزید کہ یہاں

لاٹیں بھی موجود ہیں۔ ایک تمہارے شوہر کی، دوسری اس نقاب پوش کی جسے تم نے ہلاک کر ڈالا ہے

میرے لہجے میں خود بہ خود تندہی اور دشمنی آ گئی تھی۔

”نادر صاحب!..... پلیز، ضد نہ کریں۔ ابھی آپ جائیں۔ بعد میں آپ کو ساری حقیقت بتا دوں گی۔ مجھے ان دونوں لاشوں کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔“

”یہ کوئی مشکل کام نہیں تمہارے لئے۔“ میں نے استہزاء نہ لہجے میں کہا۔ ”تم با آسانی پولیس میں یہ بیان دے دو گی کہ اس شخص نے تمہارے شوہر کو خنجر مار کر قتل کر ڈالا ہے، تم نے اپنے دفاع میں اس کے پستول سے اسے مار ڈالا۔ لیکن میں یہاں پر موجود ہوں، یعنی گواہ کی صورت میں۔ پولیس میرے بیان کو زیادہ اہمیت دے گی۔“ میں نے اسے دوسرے طریقے سے دھکی دی۔ میری توقع کے برخلاف وہ نہر ملی مسکراہٹ سے بولی۔

”پولیس کے سامنے آپ کے نہیں بلکہ میرے بیان کی زیادہ اہمیت ہو گی نادر صاحب! کیونکہ اس وقت آپ میری چھت کے نیچے موجود ہیں۔ آپ اس نقاب پوش کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔“

اسے ڈرانے کی بجائے الٹا میں ڈر گیا۔ کسی نے درست ہی کہا، عورت واقعی چال باز ہوتی ہے۔ اپنے چلتے پر اتر آئے تو اچھے اچھوں کو نکتی کا ناچ نچا دیتی ہے۔ مگر میں بھی اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے والا نہیں تھا۔ میں نے اسے سیدھا کرنے کے لئے ٹیڑھی انگلی سے کام لیا اور جھپٹ کر اس کی نرم و نازک گردن دبوختی، وہ کراہ کے رہ گئی۔

”مجھے سیدھی طرح سے بتاؤ، یہ سب کیا چکر تھا؟..... ورنہ میں تمہارا بھی برا حشر کر کے رکھ دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کی گردن ذرا ڈھیلی چھوڑی تو اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”آپ کو اجازت ہے۔ میرا جو حشر چاہے کریں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“

میں بھنا کر رہ گیا۔ ”لعت ہے تجھ پر۔“ میں نے دانت پیس کر کہا اور ایک جھٹکے سے اس کی گردن چھوڑ دی۔ پھر نقاب پوش کی لاش کی طرف بڑھا۔ جھٹک کر میں نے اس کے چہرے سے نقاب نوج لیا۔ اس کا چہرہ میرے لئے ابھری تھا۔

پھر میں نے ایک عصبی نظر جواد کی بیوہ پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میرے وجود میں جانے کیوں پھریری سی اترنے لگی۔ میں نے پھر واقعی اس سارے پراسرار معاملے پر ایک عدد لعنت بھیجی اور باہر نکل آیا۔ اپنی جیب میں بیٹھا اور واپس ہو لیا۔

رات کے آخری اور دم توڑتے پہر میں، میں ”گرین لاج“ پہنچا۔

مجھے اس بات کی حیرت تھی کہ ابھی تک ماں نے میرے ٹال سے گھر نہ پہنچنے پر مجھ سے موبائل پر رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟ بہر طور میں جیب سے اتر ا اور دروازے کی طرف بڑھا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ میں نے دروازہ تھوڑا کھلا ہوا پایا۔ خطرے کی بو محسوس کرتے ہی میں ادھ کھلے دروازے کو زور سے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا تو مجھے درو دیوار سے چپنے دشتوں بھرے سنائے چیتے محسوس ہوئے۔

”ماں!..... ماں!“ میں پکارتا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئیں۔ پھر میں کینہ کو پکارنے لگا۔ اپنے شوہر (فضل چاچا) کے مرنے کے بعد وہ مستقل یہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھار وہ اپنے عزیزوں سے ملنے نیچے وادی میں چلی جاتی تھی۔ میں باہر آیا اور چوکیدار کو آواز دی مگر وہ بھی موجود نہیں تھا۔ میرا ہاتھ ٹھٹکا اور دل جیسے کنپٹیوں پر بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ میں واپس پلٹا اور اندر آیا تو اچانک ٹیلی فون کی کھنٹی بجی۔

”ہیلو!“ میں نے لپک کر ریسور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی اور کھر کھراتی ہوئی آواز ابھری۔

مجھے اس خبیث اور نطفہ خنزیر کا پتہ بھی تو چلانا تھا، لہذا بولا۔

”غوراً تم کو مل جائے گا۔ مگر میری ماں.....“

”یہ ہوئی ناکام کی بات۔“ دوسری طرف سے تاؤ دلانے والی مسرت سے کہا گیا۔ ”اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے والا معاملہ ہوگا۔“

”کب اور کہاں؟“

”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم اعظم خان سے بات کر لو۔ اور جب میں دوبارہ فون کروں تو غور کے کی آواز سنوں گا۔ اوکے، بائی!“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میرا پورا وجود غصے کی آگ میں بری طرح پھٹنے لگا۔ میں نے اپنی جلتی جلتی کیفیات پر یہ مشکل قابو پایا، کریڈل دبا کر خان صاحب کے نمبر شیخ کرنا ہی چاہتا تھا کہ اجابک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے ریسپور رکھا۔ جیب سے اپنا موبائل نکال لیا۔ اسکرین پر اعظم خان کا نمبر ابھرا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ موبائل کان سے لگا کر کہا۔

”ہیلو انکل!“ میں نے دانستہ اتنا ہی کہا تو دوسری طرف سے ان کی مضطربانہ آواز ابھری۔

”نادر بیٹے! تمہارے پاس..... کسی کا فون آیا تھا؟“

”ہاں..... ابھی تھوڑی دیر پہلے آیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”کون تھا وہ؟..... کیا کہہ رہا تھا؟“

میں نے جواباً انہیں ساری بات بتا دی۔

”تم ابھی گرین لاج میں ہی ہو نا؟“

”جی۔“

”میں آرہا ہوں۔“

”کیا غور کے کو لے کر؟“

”نہیں، میں اکیلا آرہا ہوں۔“

”نہیں انکل! اب غور کے کو ساتھ لانا ہوگا۔ میں نے اسی طریقے سے نشتے کا فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے غضب ناک انداز میں کہا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں آرہا ہوں۔“ انہوں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

نصف گھنٹے بعد وہ میرے سامنے تھے۔

”انکل! اس نے کہا تھا کہ ذرا دیر بعد دوبارہ فون کروں گا اور..... اب میں صرف غور کے کی آواز

سننا چاہتا ہوں۔“ میرے لہجے میں تشویش تھی۔

”آئے دو اس کا فون۔ میں خود بات کروں گا۔“ خان صاحب بولے۔

”انکل! وہ بڑا خبیث آدمی ہے۔ بڑے نازیبا الفاظ استعمال کر رہا تھا ماں کے بارے میں۔“

”ہوں.....“ اعظم خان نے ایک پُر سوچ ہنکارا بھرا بولے کچھ نہیں۔

”انکل! ویسے غوراً زندہ تو ہے نا.....؟“ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے ایک اندیشے کے

تحت پوچھا۔

”بے فکر ہو۔ وہ زندہ ہے۔ دراصل میں اس سے ایک ”کٹ منٹ“ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

وہ پُر سوچ لہجے میں خود کلامی کے انداز میں بولے۔

”مسٹر نادر!“ لہجے میں استفسار تھا۔

”ہاں..... بول رہا ہوں۔ تم کون ہو؟“

”تمہاری ماں کا یار۔“ دوسری طرف سے انتہائی زہریلے لہجے میں کہا گیا اور اس لغو گوئی پر مجھ میرے سارے وجود کا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔

”..... کی اولاد!.....“ ٹو بھول رہا ہے، تیری ماں کا یار تو میں ہوں۔ تو ہے کون کہنے انسانا جو غیظ میں مجھے مجبوراً اس کی سطح تک اترنا پڑا۔

”ہا..... ہا..... میری تو ماں ہی نہیں ہے۔ خیر چھوڑو، تمہاری تو ہے نا۔“ دوسری جانب سے قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اچھا سنو، پولیس کو بالکل خبر نہ ہونے پائے کہ تمہاری خوبصورت اور حسین، پُر شمار مگر کچی عمر کی ماں ہمارے قبضے میں ہے۔ سمجھے۔“

”ذلیل!..... کتے!..... کہنے! مجھے اپنا نام بتا۔ تجھے پولیس نہیں، میں سبق سکھاؤں گا۔“

اس کی بہ دستور لغو بیانی اور گھٹیا گفتگو پر میرے اندر آتش فشاں ابلنے لگا۔

”ہاں، ہاں..... بتاتے ہیں۔ لیکن بس ہمارا ایک چھوٹا سا کام کر دو۔ غور کے کو چھوڑ دو۔“ دوسرے

طرف سے کہا گیا۔

”مجھے نہیں معلوم غوراً کہاں ہے؟“

”اپنی ماں کا تو معلوم ہے نا کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟“ وہ پھر کہنے پن پر اترنے لگا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی نیس پھٹ جائیں گی۔ ہم میں نے اپنی خوں ناک کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”وہ پولیس کی قید سے فرار ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے وہ پولیس کی قید میں ہی تھا۔“

”مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو نادر علی خان!“ دوسری طرف سے اس نے دانت پیس کر غراہ ہوئے کہا۔ ”میں اچھی طرح جانتا ہوں، غور کے کو کس نے اور کیوں پولیس کی حراست سے فرار کر دیا ہے۔ اور یہ حقیقت تم بھی جانتے ہو اور تمہاری ماں بھی، کیا بتاؤں نام؟“ دوسری طرف سے طنزیہ کہا گیا۔

جواباً میں نے دانستہ خاموشی اختیار کی تو وہ دوبارہ بولا۔ ”اعظم خان نام ہے اس شخص کا۔ ویسے میں اسے بھی فون کر کے ہوشیار کر دیا ہے۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“ میں نے کہا۔

”فصل باتوں میں وقت ضائع کر دو گے تو غور کے کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ کیونکہ میں اچھے طرح جانتا ہوں کہ غور کے کی موت تم تینوں کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ اگر غور کے کو کچھ ہو گیا سمجھو، میں تمہاری ماں کا وہ حشر کروں گا کہ اسے خود اپنے خوبصورت سے وجود سے گمن آنے لگے گی۔“

”کتے!..... بکواس بند کر اپنی۔“ ٹو نہیں جانتا کہ ٹو نے کس کی ماں کو اغواء کرنے کی جرات ہے۔ اگر ٹو نے.....“

”بس، بس۔“ گیدڑ جھکیاں دینے سے بہتر ہے کہ کام کی بات کر دیا پھر میں فون بند کر رہا ہوں۔“

”بولو..... کیا چاہتے ہو؟“ بالآخر میں نے دانت کھینچ کر مجبوراً ذرا معقولیت کا مظاہرہ کیا۔

”غور کے کی واپسی۔ زندہ اور صحیح سلامت۔“

میں جانتا تھا کہ اب اس سے جھوٹ بولنا بے کار ہے۔ کیونکہ وہ اپنی معلومات کا رعب مجھ پر ڈال

تھا۔ اس سے بحث کرنے کا مطلب اپنی ماں کو مزید ذہنی کرب میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔ اور

”جیسے تم، تمہارے حوصلے اور بہادری پر پورا یقین ہے۔“ وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”لیکن یہاں رہے کہ تمہاری کوشش یہی ہو کہ غمخوار بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔“

”آپ کو آخر اس کی فکر کیوں کھائے جارہی ہے انکل! جاتا ہے تو جائے جہنم میں۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا؟“

میری بات پر انکل اعظم خان یوں حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی چمکانہ بات کہہ ڈالی ہو۔ ”تم کیا کہہ رہے ہو نادر بیٹے!“ حیرت سے بولے۔ ”تم تو اچھی طرح جانتے ہو، وہ آزاد ہوتے ہی پولیس کی گرفت میں بھی جاسکتا ہے اور اس کا پولیس کی گرفت میں جانے کا مطلب اپنے دیرینہ دشمنوں شاہ میر اور نظر حیات کو اپنے خلاف ہتھیار دینا ہوگا۔ مجھے اپنی فکر تو نہیں لیکن تمہاری ماں شبنم اور تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔“

”انکل! یہ بعد کی باتیں ہیں..... غمخوار اتنا تر نوالہ نہیں ثابت ہو سکتا۔“ میں نے ان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ خود ایک بہت بڑا گینگسٹر ہے۔ پولیس کے ہتھے اتنی آسانی سے نہیں چڑھ سکتا۔“

میری بات پر انکل اعظم نے ایک طویل سانس خارج کی، پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ ”ٹھیک ہے پھر۔ میں کسی طرح غمخور سے کو یہاں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا مگر جواباً خاموش ہی رہا۔ انکل اعظم خان رخصت ہو گئے۔

میرا دل بری طرح بے چین تھا۔ نامساعد حالات کے پھیڑے اس تواتر کے ساتھ مجھے اپنی زد میں لے ہوئے تھے کہ میرا دل و دماغ جھٹک ہو کر رہ گیا تھا۔

کہاں تو میں گنیز کے یہ خوشخبری سننے کے لئے بے چین ہو رہا تھا کہ ماں ہم دونوں کی شادی پر رضامند ہو چکی ہے، ماں کے اندر کی برف کھٹلنے لگی تھی۔ یہ تقدیر کی طرف کاری ہی تھی کہ حالات مجھے ایک جگہ نکلنے نہیں دے رہے تھے۔ میں اس نامعلوم شخص کے فون کا منتظر تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اتنی دیر میں انکل اعظم خان غمخور سے کو یہاں لے آئیں۔

پھر وہ تو نہ آئے البتہ ذرا ہی دیر میں ان کا فون آ گیا۔ ”نادر بیٹے! میرا غمخورے کو لانا مناسب نہیں ہے۔ تم ایسا کرو، اس نامعلوم شخص کا فون آئے تو اسے میرا موبائل نمبر دے دینا۔ میں غمخورے سے اس کی بات کرادوں گا اور معاملہ بھی طے کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ مجھے پولیس کے خبروں کا خدشہ ہے۔“

مجھے ان کی بات مناسب لگی۔ میں فون کا انتظار کرتا رہا لیکن فون نہ آیا۔ میں اوجھٹا ہوا بالآخر دیکھا۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی۔ میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر سو گیا تھا۔ مجھے بعد میں سیکڑے لگا جگایا تھا۔ یہ قول اس کے وہ کل شام اپنے کسی پیارے عزیز کی مزاح پر کر کے نیچے وادی میں گئی تھی بلکہ چونکہ ابابا نے صبح ہی سے چھٹی لے رکھی تھی۔ میں نے انہیں ماں کے انواء کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

میں نے ان سے کسی کے فون وغیرہ کے آنے کا دریافت کیا تھا مگر ان کا جواب نفی میں تھا۔ میں نے ان وغیرہ کیا اور ٹال فون کر کے غیر مشتاق سے بات کی۔

”میں آج ٹال نہیں آسکوں گا۔ تم سنبھال لینا۔“

”آپ بے فکر ہیں۔ میں ہوں نا..... جی کڑا کہے۔“ اس کی مخصوص آواز ابھری۔ اس سے پہلے وہ طویل گفتگو کرے، میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

”ویسے وہ ہے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”اسے میں نے جہاں پر غمخوار بنا کر رکھا ہے، وہ جگہ یہاں سے بہت دور ہے۔“

”انکل! ایک بات بتائیں۔“ میں نے کسی خیال کے تحت ان سے کہا۔

”کہو!“ وہ استفسار طلب لہجے میں بولے۔

”آخر آل غمخور آپ ہی کا آدمی تھا۔ کیا آپ اس کے دوسرے ساتھیوں کو یا اس کے ٹھکانے کو نہیں جانتے؟“ میں نے اپنے تئیں ایک اہم سوال پوچھا۔

وہ جواباً بولے۔ ”نادر بیٹے! غمخور میرا ہی آدمی تھا۔ وہ درحقیقت ایک فلم مافیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے کسی معروف اداکارہ کو بھی قتل کیا تھا مگر اس کے خلاف ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث وہ رہا کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس میں میری کوششوں کا بھی دخل تھا۔ اس اداکارہ کا نام پینا تھا۔ رسی بات اس کے دیگر ساتھیوں اور اس کے ٹھکانے کی تو میں صرف اسے فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کے ساتھ ہی دیکھا کرتا تھا۔ لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ یہ حرکت اس فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کی ہو سکتی ہے۔“

وہ اتنی ہی صراحت کرنے کے بعد خاموش ہوئے تو میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ ”کیا اس فلم پروڈیوسر اشفاق شاہین کا تعلق بھی فلم مافیہ سے ہے؟“

”شاید.....“ وہ بولے۔ مگر پھر جیسے میرے سوال کا مطلب سمجھ کر دوبارہ بولے۔ ”ویسے یہ عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق فلم مافیہ سے بھی ہو۔“

میں جیسے اس جواب کا منتظر تھا، لہذا فوراً ہی بول اٹھا۔ ”انکل! پھر تو مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ یہ حرکت غمخورے کے اس گرو گھنٹال پروڈیوسر اشفاق شاہین کی ہی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اسے ٹریس کر کے ٹریپ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔“

میری تجویز پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لیکن پھر فوراً میں نے خود اپنی ہی تجویز رد کر دی اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ”لیکن نہیں..... اس طرح تو وقت ضائع ہو گا اور یہ بات بھی حتمی نہیں کہ ماں اس کی قید میں ہو سکتی ہے۔ یہ بات انواء کنندگان کو پیش دلانے کے مترادف ہوگی۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنے ذہن میں پہلے پہل اُبھرنے والے منصوبے کے بارے میں غور کیا جس کا ابھی میں نے ان سے ذکر بھی کیا تھا

”انکل! ان نامعلوم انواء کنندگان سے نمٹنے کا ایک یہی طریقہ کار ہو سکتا ہے کہ ہر دست ان کی بات مان لی جائے۔ پہلے غمخورے سے ان کی بات کرا دی جائے، اس کے بعد سیدھے سیدھے ان سے اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے والا سودا کریں۔ اس دوران وہ جو کوئی بھی ہوگا، ہمارے سامنے آجائے گا اور پھر اس پر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش بھی کروں گا۔“

”مگر نادر بیٹے! اس میں خطرہ بہت زیادہ ہوگا۔ تم اس سے نمٹو گے یا اپنی ماں شبنم کو بچاؤ گے؟ اور پھر ہماری ناکامی کی صورت میں غمخور بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر غمخور ہاتھ سے نکل گیا تو.....“

”انکل! مجھے اس وقت اپنی ماں کی جان پیاری ہے اور بس..... میں کسی اگر مگر میں نہیں پڑ سکتا۔“

میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ”ماں جس کیمینے کی قید میں ہے، اس کے خیانت بھرے لہجے اور کیمینگی نے مجھے اندر سے لرزاتا کر رکھ دیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کہ غمخورے کو میرے حوالے کر دیں، میں خود ان لوگوں سے نمٹوں گا۔“

نہیں اٹھاتی تھی۔

”تم نے اب تک انہیں کیا بتایا؟“ جواب دینے کے بجائے التام میں نے اس سے سوال کیا۔

”بہی..... کہ..... میں کچھ نہیں جانتی۔“

”گڈ! تم اس بیان پر قائم رہنا۔“

”لیکن..... نادرا! نظر حیات کو اس بات کا بھی پورا یقین ہے کہ میں کبیر کے متعلق جانتی ہوں کہ

وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔“ وہ بولی۔

اچانک میرے ذہن میں اپنے دونوں مہادشمنوں کو آپس میں لڑانے کا شاطرانہ منصوبہ ابھرا، لہذا

بولی۔ ”تم یہ بتاؤ کہ کیا تم نے اپنے باپ کو اب تک ساری حقیقت بتائی ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر تم ایک کام کرو۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے باپ شاہ میر کو ان کے یار نظر حیات کے بیٹے کے

بارے میں صاف صاف بتا دو کہ اس نے کس طرح کالا ناگ کے ساتھ مل کر تمہارے خلاف سازش کی

تھی، جس میں تمہاری جان کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔“

”نہیں..... ابھی تو میں نے انہیں یہ بات نہیں بتائی۔“ وہ بولی۔

”یہ تمہاری بھیانک غلطی ہے۔ تمہیں اپنے باپ کو کبیر کی تمہارے خلاف سازشوں کے بارے میں

آگاہ کر دینا چاہئے۔“

”لیکن نادرا! یہ بھی تو سوچو، اس طرح کی تلاش والی مہم آشکار ہو جائے گی اور انہیں کبیر کے بارے میں

بھی علم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے؟“

”یہ ساری باتیں تم اپنے باپ کو اعتماد میں لے کر بتا سکتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں نے کہا نا، کہ انہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“ وہ اپنی پہلی بات دہراتے ہوئے بولی۔ ”پاپا

میری بات کا بالکل اعتبار نہیں کریں گے نادرا! میرے ساتھ تمہارے جیسا معاملہ ہے۔ جس طرح خان جی کو

میرے حوالے سے تم پر بعض باتوں کا یقین نہیں آتا، اس طرح میرے پاپا بھی اپنے دوست نظر حیات

کے بیٹے کبیر کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔ تم نہیں جانتے ہو نادرا! کہ پاپا اور نظر حیات کے

درمیان کس قدر گہری اور پرانی دوستی ہے۔ بلکہ پاپا تو اس دوستی کو مزید مضبوط بنانے کے خواب دیکھ رہے

ہیں اور اشاروں کنایوں میں مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ میں کبیر کے ساتھ خوش رہ

سکتی ہوں۔ آگے تم سمجھ جاؤ۔ مگر وہ مجھ پر کسی قسم کا دباؤ ایسا نہیں ڈال سکتا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمہاری

پوزیشن اور ان کے گھناؤنے جرم نے انہیں مجھ سے کافی حد تک خفیہ کر رکھا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش

ہوئی۔ اسی وقت ٹیلی فون کی بیل بجی اٹھی۔ میں چونکا اور گھینے سے لگا۔

”ایک فون آیا ہے، میں تم سے بات کرتا ہوں۔“ ٹھیک ہے۔“

”اوکے، خدا حافظ!“ گھینے لے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے موبائل فون آنف کر کے جلدی سے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ اس اغواء

کنندہ کا فون ہو گا۔ مگر دوسری جانب سے بالکل اعظم خان کی آواز پر میں چونک اٹھا۔

”نادرا بیٹے! اس کا فون تو نہیں آیا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں اگل! میں خود بے چینی سے فون کا منظر ہوں۔“

”مجھے فون کیا تھا اس نے۔“

میں اس وقت ماں کی وجہ سے سخت پریشان ہو رہا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ماں ایک کیسے شخص کا

میں تھی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ یہ گھینے کی کال تھی۔

”ہیلو نادرا! کیسے ہو؟“ اس کی مترنم آواز ابھری۔ میرے دل میں یاس زدہ ہوک اٹھی۔ کاش

اسے خوشخبری سنا سکتا۔ تاہم بولا۔

”خیریت نہیں ہے گھینہ!“

”کیوں؟ کیا ہوا؟..... تم..... ٹھیک..... تو ہوتا؟“ اس کے لہجے میں ایک

پریشانی در آئی۔

”ماں کو چند نامعلوم افراد نے اغواء کر لیا ہے۔“ بالآخر میں نے بتایا۔

”اوہ گاڈ..... کب؟..... کیسے؟“ وہ بری طرح پریشان ہو گئی۔

”یہ ابھی میں نہیں جانتا۔ شاید کوئی اغواء برائے تاوان کا معاملہ ہو گا۔“ میں نے اصل حقیقت چو

بات بتائی تو اس نے پوچھا۔

”کیا انہوں نے اب تک رابطہ نہیں کیا؟“

”کیا تھا۔“

”کیا کہا پھر..... کوئی مطالبہ پیش کیا؟“

”نہیں، ابھی اطلاع دی ہے اور دوسرے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔“

دوسری طرف چند ثانیے پر سوچ خاموشی چھائی رہی، پھر گھینہ کی آواز ابھری۔ ”نادرا! ایک بات کم

برا تو نہیں مناؤ گے؟“

”نہیں..... بھلا میں تمہاری بات کا برا کیسے منا سکتا ہوں؟“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”اگر تم کہو تو میں پاپا سے اس سلسلے میں مدد لوں؟“ اس نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ مجھے واقعی

کی یہ بات انتہائی ناگوار لگ رہی۔ تاہم میں نے ہموار لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں گھینہ! یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں اپنے باپ کے قاتل اور اپنے دیرینہ دشمن سے مدد کی!

مانگوں کا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے معتدل لہجے میں زہر کی کاٹ ابھر آئی تھی۔

”اچھا..... جیسے تمہاری مرضی۔“

”اپنے باپ سے بھول کر بھی اس کا ذکر نہ کرنا۔“ میں نے لمحہ بھر توقف کے بعد اسے تنبیہ کی۔

”اچھا ٹھیک ہے..... مگر کم از کم..... پولیس سے ہی مدد لے لو۔“ وہ بولی۔

”اس سے معاملہ مزید خراب ہو جائے گا اور ماں کی جان کو الگ خطرہ لاحق ہو گا۔“ میں نے

”میں خود اس معاملے سے نمٹوں گا۔“

”اللہ کرے ماں جی خیریت سے ہوں۔“ وہ دعائیہ لہجے میں بولی۔ مجھے اس کا یہ انداز پسند آیا۔

توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ ”تم سے ایک بات کہنا تھی۔ مگر تم خود ہی پریشان ہو۔“

”نہیں..... کہو، کیا بات ہے؟ یہ پریشانی تو اب شاید ہم ماں بیٹے کا مقدر بن چکی ہیں۔“

نے کہا۔

”نادرا! نظر حیات اپنے بیٹے کبیر کے سلسلے میں ہمارے ہاں آتے رہتے ہیں۔ وہ مجھ سے کبیر

بارے میں پوچھتے ہیں۔ میں انہیں کیا جواب دوں؟“

مجھے گھینہ کے یوں مشورہ لینے کا انداز پسند آیا تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ میری مرضی کے خلاف کوئی

میں اس وقت اپنے مسئلے کی طرف الجھا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے زیادہ توجہ نہ دی۔  
شام ہوئی تو میں جیب میں انکل اعظم خان کی طرف روانہ ہو گیا۔ پندرہ منٹ بعد میں ان کے پاس  
تھا۔ انکل خان میرے ہی منتظر تھے۔

انکل خان بھی میرے ساتھ جانا چاہتے تھے مگر میں نے منع کر دیا۔

”انکل! آپ صرف یہاں بیٹھ کر میری کامیابی کے لئے دعا کریں اور وزیر خان کو میرے ساتھ بھیج  
دیں۔ میں وہاں سے غفور کے کو اپنی جیب میں لے کر اغواء کنندگان کے پاس جاؤں گا، تنہا۔ وزیر خان کو  
راتے سے لوٹا دوں گا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہارا اکیلے جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔“ انکل خان بولے۔

”نہیں انکل! آپ کا جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔“ میں نے قطعیت سے کہا۔  
”وزیر خان کو ہی لے جاؤ۔“

”اس کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تنہا یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دوں گا۔ یہ معاملہ نازک ہے، زیادہ  
بھڑ بھڑا مناسب نہ ہوگی۔“

”کیا تم غفور کے کو ان کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟“ انہوں نے بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے  
دئے کہا۔

”یہ حالات پر منحصر ہے۔ ماں کی جان کو خطرہ ہوا تو مجھے غفور کے کو ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔“ میں  
نے گہری متانت سے کہا۔ وہ چند ثانیے کی پُر سوچ خاموشی کے بعد بولے۔ ”ٹھیک ہے..... جیسے تم  
ماسب سمجھو۔ مگر اپنا خیال رکھنا بیٹا! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

اغواء کنندگان نے مجھے آج رات غفور کے کو لے کر لالہ زار سنگم پر ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان  
نے تاکید کی۔

رات ساڑھے بارہ بجے کے قریب میں وزیر خان کے ساتھ جیب میں انکل خان کی رہائش سے نکلا۔  
رے کو یہاں سے دور جس جگہ ریغال بنا کر رکھا تھا، وہ آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وزیر خان کی  
ندہ پر ہم وہاں پہنچے۔

یہ ایک چھوٹا سا خوب صورت کالنج تھا۔ بلکہ اریب قریب میں ایسے کئی کالنج بنے ہوئے تھے، جن کا  
مدیساخوں کو اس پُر فضا مقام پر آرام اور پرسکون رہائش فراہم کرنا تھا۔

میں نے مذکورہ کالنج کے سامنے جیب روک دی۔ جب ہم دونوں نیچے اتر آئے، کالنج میں ملازمنوں  
عقب میں دو عدد مسلح افراد موجود تھے۔

وزیر خان نے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ غالباً انکل خان بھی انہیں میری  
آمد کے مقصد سے آگاہ کر چکے تھے۔ غفور کے کو رن بستہ میرے سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے بہ غور  
میں کیڑ کر غفور کے کا جائزہ لیا۔ وہ دنبے کی طرح پلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر ذرا بھی پریشانی یا  
کا شائبہ تک نہ تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے البتہ دونوں ٹانگیں آزاد تھیں۔ وہ بھی میری طرف  
سے جا رہا تھا۔ میں نے رست واپس پر وقت دیکھا۔

میرے پاس آدھا گھنٹہ باقی بچا تھا۔ میں نے وقت ضائع کئے بغیر غفور کے کو ساتھ لیا اور فرنٹ سیٹ کا  
دھول کر اسے سوار کرایا۔ اس کے بعد خود بھی جلدی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

”پھر..... کیا کہا اس کہنے نے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔  
”میں نے غفور کے سے اس کی بات کرادی تھی۔ وہ مطمئن ہو گیا تھا۔ باقی معاملات میں نے طے کر  
لئے ہیں۔ اب ہمیں غفور کے کو ساتھ لیتا ہوگا۔“ وہ تفصیل بتانے لگے۔ میں نے بے چینی سے درمیان  
میں کہا۔

”انکل! انہوں نے کب اور کہاں آنے کا کہا؟“

”لالہ زار سنگم پر پرانے ریٹ ہاؤس کا پتہ بتا دیا ہے۔“ لالہ زار کے علاقے سے میں واقف تھا۔ یہ  
ڈونگا گلی اور تنہا گلی کے درمیان میں واقع تھا۔ جبکہ یہاں سے لالہ زار کا جنگلاتی علاقہ یہ مشکل اڑھائی  
کلومیٹر فاصلے پر تھا۔ انہوں نے آج رات ایک اور ڈیڑھ بجے کے درمیان کا وقت دیا ہے۔“ انکل اعظم  
خان نے وقت بتایا۔

”ٹھیک ہے انکل! آپ نے ان سے ڈن کر لیا؟“ میں نے فرط جوش سے تیز ہوتی سانسوں پر قابو  
پاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولے۔

”کون سی بات؟“

”وہ بھند ہیں کہ غفور کے کو تم ہی لے کر آؤ۔ حالانکہ میں نے خود یہ قدم اٹھانے کا سوچ رکھا تھا۔“  
”نہیں انکل! آپ کا غفور کے جیسے اشتہاری مجرم کے ساتھ جا کر یہ ذیل کرنا یوں بھی مناسب نہ ہو  
گا۔ انہوں نے میرا انتخاب کر کے گویا اپنی موت کا انتخاب خود کیا ہے۔“ میں آخر میں دانت پیس کر بولا۔

”تو ٹھیک ہے..... تم آج شام ہی آ جاؤ میرے پاس۔“ وہ بولے اور رابطہ منقطع کر دیا۔ میری  
کنپٹیاں جوش غیظ سے سنسنائے لگیں۔ شام اور پھر رات تک کا انتظار مجھ سے نہیں ہو پا رہا تھا۔

غفور کے اور اغواء کنندگان کا یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس میں مجھے اپنے دونوں دیرینہ دشمنوں شاہ میر اور  
نظیر حیات کی شمولیت کا شبہ نہیں ہو رہا تھا۔ یہ ساری کارروائی غفور کے کے اپنے ساتھیوں کی تھی۔ کیونکہ  
اس سے پہلے غفور بھینا طویل عرصے تک اپنے انہی ساتھیوں کے پاس پناہ گزین رہا ہوگا۔

وقت گزرنے کے لئے میں اخبار منگوا کر اس کا مطالعہ کرنے لگا تو اچانک ایک خبر پر میں بری طرح  
ٹھٹکا۔ یہ خبر مسٹر جواد کے بارے میں تھی۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔

اخبار میں رات والے واقعے کی تفصیلی خبر شائع ہوئی تھی، جب میں بھی وہاں موجود تھا۔ میں دھڑکتے  
دل کے ساتھ پھر اس سنسنی خیز خبر کی تفصیلات پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ تفصیل پڑھنے کے بعد میں بے  
لتھیا ایک گہری ہنکاری بھر کر رہ گیا تھا۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جو مسر غزالہ نے کہا تھا۔ اس نے پولیس کو یہی روایتی سبایان دیا تھا کہ وہ  
نامعلوم نقاب پوش چوری کی غرض سے ان کے بنگلے میں داخل ہوا لیکن بتول جواد کی عین موقع پر آنکھ کھل  
گئی۔ وہ معذور تھا مگر اپنے نیچے کے نیچے پستول رکھتا تھا۔ اس نے بتول نکالنے کی کوشش کی مگر بد قسمتی  
سے قاتل کو اس پر خنجر سے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ پھر اس نے حیدان صاف پا کر غزالہ کی عزت پر بھی  
حملہ کرنے کی کوشش کی تو مزاحمت کے دوران کسی طرح اس نقاب پوش کا پستول غزالہ کے ہاتھ لگ گیا  
اور یوں اس نے اپنے دفاع میں اسے بھی ہلاک کر ڈالا۔ تاہم پولیس کی تفتیش جاری تھی اور ابھی بہت  
سے سوالات جواب طلب تھے اور پولیس نے مسر جواد کو گرفتار کر لیا، وغیرہ۔  
میں نے اس عجیب و غریب اور پراسرار معاملے پر ایک اور لعنت بھیج کر اخبار ایک طرف پھینک دیا۔

ذرا دیر بعد میری جیب طوفانی رفتار سے لالہ زار سنگم کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

\*\*\*

اغواء کنندگان نے جس دھڑلے سے مجھے ”اس ہاتھ لے، اس ہاتھ دے“ کی ڈیل کے لئے بلائے اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ غورے کا پولیس کے زنگے میں جانا ہم دونوں کے لئے ہی مناسب نہا بہر طور، میں مقدور بھرکیل کانوں سے لیس مخو سفر تھا۔ میری جیب تنہا گلی اور ڈونگا گلی کے درمیان سے گزرنے والی سڑک پر خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑی چلی جا رہی تھی۔ ہر سو سناٹے اور تاریکی کا راج تھا۔ سڑک کے دو روہ دیوار کے درختوں قطاریں تھیں۔ دن کی روشنی میں یہ علاقہ بہت زیادہ خوب صورت اور سرسبز تھا۔ یہاں سرسبز ڈھلوانوں ہزاروں رنگ برنگے جنگلی پھول اپنی بہار دکھا رہے ہوتے ہیں۔ دو کلو میٹر تک سفر کے بعد سوا ایک بجے میری جیب لالہ زار کی حدود میں داخل ہو گئی۔ غورا خا کے ساتھ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ لالہ زار کے دائیں بائیں بیس بیس گز کے فاصلے پر لگے لیب پوسٹ کی روشنی میں سبزہ زارو چوٹی بنچیں اور لوہے کے سائبان، تہائی کے طلب گار سیاحوں کے لئے مخصوص نظر آ رہے تھے۔ انکل خان کی زبانی اغواء کنندگان نے مجھے جس پرانے ریٹ ہاؤس پر پہنچنے کی تاکید کی تھی، وہ سبزہ زار کی ایک ذیلی سڑک کے ساتھ واقع تھا۔ انکل خان نے مجھے اس کا پتہ تفصیلی سمجھا دیا تھا۔ یوں بھی یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھلا تھا۔ میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے جیب آہستہ کر لی۔ موبائل کی اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر آ رہا تھا۔

”ہیلو.....!“ میں نے کہا تو دوسری طرف سے اسی کینے شخص کی آواز ابھری۔ ”تم پہنچ گئے..... گڈ! جیب فوراً روک دو اور اپنے دائیں جانب جو سائبان نظر آ رہا ہے غورے کو لے کر خاموشی سے بیچ پر بیٹھ جاؤ۔“ اس کی آواز سن کر جوش غیظ سے میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اس کی گفتگو سے میں اندازہ لگا لیا کہ وہ کہیں قریب ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھات لگائے چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے اس میں جواب دے کر جیب سبزہ زار پر تڑپا دی۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ جیب روکنے کے بعد میں نے اپنی جیب سے میگار لیا۔ ایک عدد شکاری خنجر بھی میرے دائیں ہاتھ کی آستین کے اندر پوشیدہ تھا۔ میں نے میگار کی مہیہ غورے کی کینٹی سے لگا دی اور اسے لے کر جیب سے نیچے اتر گیا اور چند ٹاپے رک کر جیب کی آ گرد و پیش میں نظریں دوڑانے لگا۔ اس کے بعد ایک چوٹی بیچ کا انتخاب کر کے اس پر براجمان ہو میرے آس پاس لیب پوسٹ کی دو دھیا لائٹر، پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے وہاں بیٹھنے کی اچانک میرے دائیں بائیں جانب سے پانچ چھ کے قریب مسلح افراد نمودار ہوئے۔ ان سب کے ہا سیاہ رنگ کے پتول چمک رہے تھے۔ میں یہ غور ایک ایک کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ سب تیسرے درجے کے چھپے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے جنہیں عرف عام میں ”کھڑتال“ کہا جاتا تھا۔ ان میں جو بیٹھا چھری قامت اور دراز قد کا گورا چٹا مگر لمبوترے چہرے والا شخص تھا۔

جھے ان کا گروپ لیڈر محسوس ہوا تھا۔

اس کے ہونٹ بھی پتلے پتلے اور عجیب وضع کے تھے۔ اس کی زردی مائل آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ گلے میں چین جھول رہی تھی۔ اپنے ذیلے پتلے گردن پر سستا سا جیسمپر چڑھا رکھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی تو مند تھے۔ وہ چست لی شرٹ اور پینٹ پر سیاہ اور براؤن رنگ کی لیڈر چیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان سب کی خوشنظر نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا انداز کسی پرانی ٹھسی پٹی پنجابی قلم کے بدمعاشوں کا سا تھا۔

”غورے کو چھوڑ دو۔“ اس چھری قامت اور زردی مائل گورے نے چند ٹاپے مجھے استہزائیہ نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد درشت لہجے میں حکم دیا اور اس کی آواز پہچان کر میرا وجود ایک زبردست جوار بھائے کی زد میں آنے لگا۔ یہ وہی کینے شخص تھا جس نے فون پر مجھ سے رابطہ کرتے ہوئے میری ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے اور غورے کو یہاں لانے کا حکم دیا تھا۔ اب میری نظریں اس چھپکلی نما شخص پر خنجر کی طرح پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے یہ مشکل اپنے اندر کے ابال پر قابو پایا اور بدستور اسے غضب ناک نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

”میری ماں کہاں ہے؟“

میرے سوال پر اس چھپکلی نما شخص کے باریک ہونٹوں پر بڑی کینے مسکراہٹ ابھری اور وہ بولا۔

”بے فکر ہو۔ وہ خوب صورت عورت.....“

”حزای کی اولاد! اپنی زبان کو لگام دے اور مطلب کی بات کر۔“ ایک تھڑڈگری کے بدمعاش گروپ لیڈر کے منہ سے اپنی ماں کے بارے میں انویسیائی نے ایکا لگی میرے لہجے کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔ میرے گالی دینے پر وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے غورے کی گردن کے گرد اپنے بازو کا غلجھ کر رکھا تھا۔ اسے اپنی ڈھال بناتے ہوئے اس کی کینٹی سے میگار کی ٹال لگا رکھی تھی اور ساتھ ہی ان پانچوں کو اپنی نظروں کے ٹارگٹ پر رکھنے کی غرض سے اپنی پوزیشن بھی بدل لی تھی۔ اس چھپکلی نما شخص نے چند قدم میری جانب بڑھائے۔ اس کی ایک ٹک گھورتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئیں۔ وہ رک کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تمہاری ماں ادھر ہی ہے۔ پہلے غورے کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”نہیں..... پہلے میری ماں کو میرے سامنے پیش کرو۔“ میں نے بھی اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

”پہلے ہمیں یہ تسلی ہو جائے کہ تم اپنے ساتھ کسی اور کو نہیں لائے ہو تو ہم تمہاری ماں کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔“

”تم تسلی کر سکتے ہو۔ میں تمہاری آیا ہوں۔“ اس کے معتدل لہجے پر میں نے بھی ہموار لہجے میں کہا تو اس نے چند ٹاپے پر سوچ خاموشی کے بعد اپنے دو ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ دونوں اگلے قدموں واپس پلٹ گئے۔ باقی دو اس کے ساتھ کھڑے رہ گئے۔ وہ ان سے حکمانہ لہجے میں بولا۔

”تم دونوں آس پاس کا جائزہ لے کر آؤ۔ کہیں یہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ لایا ہو۔“ اس کے حکم پر باقی دونوں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب وہ تنہا کھڑا تھا۔ سیاہ پتول ہنوز اس کے دائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا اور وہ جھکا ہوا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پل کے پل میں اندازہ لگا چکا تھا کہ میں ٹھوڑی سی محنت کے بعد اس ”کھڑتال“ گروپ پر قابو پاسکتا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے ماں کے سامنے آنے کا شدید بے چینی سے انتظار

اس کے ہونٹ بھی پتلے پتلے اور عجیب وضع کے تھے۔ اس کی زردی مائل آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ گلے میں چین جھول رہی تھی۔ اپنے ذیلے پتلے گردن پر سستا سا جیسمپر چڑھا رکھا تھا۔ اس کے باقی ساتھی تو مند تھے۔ وہ چست لی شرٹ اور پینٹ پر سیاہ اور براؤن رنگ کی لیڈر چیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ ان سب کی خوشنظر نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کا انداز کسی پرانی ٹھسی پٹی پنجابی قلم کے بدمعاشوں کا سا تھا۔

”غورے کو چھوڑ دو۔“ اس چھری قامت اور زردی مائل گورے نے چند ٹاپے مجھے استہزائیہ نظروں سے گھورتے رہنے کے بعد درشت لہجے میں حکم دیا اور اس کی آواز پہچان کر میرا وجود ایک زبردست جوار بھائے کی زد میں آنے لگا۔ یہ وہی کینے شخص تھا جس نے فون پر مجھ سے رابطہ کرتے ہوئے میری ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے اور غورے کو یہاں لانے کا حکم دیا تھا۔ اب میری نظریں اس چھپکلی نما شخص پر خنجر کی طرح پیوست ہو گئی تھیں۔ میں نے یہ مشکل اپنے اندر کے ابال پر قابو پایا اور بدستور اسے غضب ناک نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

”میری ماں کہاں ہے؟“

میرے سوال پر اس چھپکلی نما شخص کے باریک ہونٹوں پر بڑی کینے مسکراہٹ ابھری اور وہ بولا۔

”بے فکر ہو۔ وہ خوب صورت عورت.....“

”حزای کی اولاد! اپنی زبان کو لگام دے اور مطلب کی بات کر۔“ ایک تھڑڈگری کے بدمعاش گروپ لیڈر کے منہ سے اپنی ماں کے بارے میں انویسیائی نے ایکا لگی میرے لہجے کو آتش فشاں بنا دیا تھا۔ میرے گالی دینے پر وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے غورے کی گردن کے گرد اپنے بازو کا غلجھ کر رکھا تھا۔ اسے اپنی ڈھال بناتے ہوئے اس کی کینٹی سے میگار کی ٹال لگا رکھی تھی اور ساتھ ہی ان پانچوں کو اپنی نظروں کے ٹارگٹ پر رکھنے کی غرض سے اپنی پوزیشن بھی بدل لی تھی۔ اس چھپکلی نما شخص نے چند قدم میری جانب بڑھائے۔ اس کی ایک ٹک گھورتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئیں۔ وہ رک کر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”تمہاری ماں ادھر ہی ہے۔ پہلے غورے کو ہمارے حوالے کر دو۔“

”نہیں..... پہلے میری ماں کو میرے سامنے پیش کرو۔“ میں نے بھی اسے گھورتے ہوئے درشت لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

”پہلے ہمیں یہ تسلی ہو جائے کہ تم اپنے ساتھ کسی اور کو نہیں لائے ہو تو ہم تمہاری ماں کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔“

”تم تسلی کر سکتے ہو۔ میں تمہاری آیا ہوں۔“ اس کے معتدل لہجے پر میں نے بھی ہموار لہجے میں کہا تو اس نے چند ٹاپے پر سوچ خاموشی کے بعد اپنے دو ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ دونوں اگلے قدموں واپس پلٹ گئے۔ باقی دو اس کے ساتھ کھڑے رہ گئے۔ وہ ان سے حکمانہ لہجے میں بولا۔

”تم دونوں آس پاس کا جائزہ لے کر آؤ۔ کہیں یہ اپنے ساتھ کسی اور کو نہ لایا ہو۔“ اس کے حکم پر باقی دونوں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

اب وہ تنہا کھڑا تھا۔ سیاہ پتول ہنوز اس کے دائیں ہاتھ میں چمک رہا تھا اور وہ جھکا ہوا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پل کے پل میں اندازہ لگا چکا تھا کہ میں ٹھوڑی سی محنت کے بعد اس ”کھڑتال“ گروپ پر قابو پاسکتا ہوں۔ لیکن ابھی مجھے ماں کے سامنے آنے کا شدید بے چینی سے انتظار



تھا۔ ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ذرا دیر بعد اس کے پہلے والے ساتھی نمودار ہوئے۔ انہوں نے میرا ماں کو دونوں بازوؤں سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ چہرے سے پریشانی کا ذرا بھی اظہار نہ ہوتا تھا۔ البتہ اس کی جگہ غصے اور طیش کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ماں کو دیکھ کر میرے جوش غیظ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ میرا جی چاہا ان سب کو اسی وقت گولیوں سے بھون کر رکھ دوں۔ مگر اس وقت ان تیسرے درجے کے بد معاشوں کی مثال ایسے گیدڑوں کی سی تھی۔ ایک شیر کو غول کی صورت میں گھیر لیتے ہیں۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ جن دو بد معاشوں نے ماں کو دونوں بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا، ان کے ہاتھوں میں اب پستول نظر نہیں آ رہے تھے۔ جب باقی ساتھی ہنوز اپنے چھپکلی مارکے گروپ لیڈر کے حکم پر اس پاس کا جائزہ لینے گئے ہوئے تھے۔ میں نے ارہ تہیہ کر لیا تھا کہ غفورے کو ان کے ساتھ نہیں جانے دوں گا۔

”تم غفورے کے ہاتھوں کی رشتی کھولو گے اور میں تمہاری ماں کو رسیوں سے آزاد کروں گا۔“ چھپکلی مارکے بد معاش بولا۔ ”دونوں ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔“

”ٹھک ہے..... مجھے منظور ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر ہم دونوں اپنے اپنے ریغالیوں کے ہاتھوں کی رسیاں کھولنے لگے۔ اس کے بعد انہیں آزاد کر دیا گیا۔ ادھر غفورے نے اپنے ساتھیوں کی جانب ایک قدم بڑھایا اور ادھر ماں نے بھی میری طرف ایک قدم اٹھایا۔

میرے پستول کی نال اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے غفورے کی پشت کی سمت اٹھی تھی۔ اس طرح چھپکلی مارکے بد معاش نے ماں پر پستول تان رکھا تھا۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ پھر جب غفورا اور ماں دھیرے دھیرے ایک ایک قدم اٹھاتے ہوئے درمیان میں پہنچ کر ایک دوسرے کے بالکل قریب سے گزرنے لگے تو اچانک دم بہ خود سناٹے میں کہیں قریب ہی گولی چلنے آواز اُبھری۔ گولی چلنے کی یہ آواز اس سمت سے آئی تھی جس طرف چھپکلی مارکے بد معاش کے وہ دونوں ساتھی غائب ہوئے تھے۔ ہم بری طرح ٹھک گئے۔ غفورا اور ماں کے بڑھتے ہوئے قدم ٹیکٹ را گئے۔ چھپکلی مارکے بد معاش اور اس کے دونوں نہتے ساتھیوں نے چونک کر غیر ارادی طور پر مذکورہ سمت طرف دیکھا تو میں نے بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھپکلی مارکے بد معاش پر گولی چلا دی جو اس گردن کے آ رہا ہو گئی۔ وہ کھٹی کھٹی کراہ تیز چیخ کے ساتھ ہنرے پر گرا۔ وہاں موجود اس کے دونوں ساتھیوں نے پھرتی سے اپنے پستول نکالنے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اپنی پستول کا رخ ان کی طرف کے حلق کے بل دھاڑا۔

”خبردار!..... کوئی حرکت مت کرنا۔ اپنے دونوں ہاتھ بلند کر لو..... جلدی۔“ یہی درشت میں نے غفورے کو بھی دیا تھا۔ وہ وہیں جم گیا اور اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ ماں نے لپک کر زہ بوس چھپکلی مارکے بد معاش کے گھاس پر گرے پستول کو اٹھالیا۔ اسی وقت مجھے اپنے داہنی جانب دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔

”ماں بھاگو۔“ کسی انجانے اور ممکنہ خطرے کی محسوس کر کے میں زور سے چلا یا۔ اور پھر ہم دونوں ماں بیٹا ایک جانب تیزی کے ساتھ دوڑتے چلے گئے۔ بھاری بھر کم گاڑیوں کے انجن کی مخصوص گھر گھر اہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب آتی آتی جا رہی تھی۔ اچانک بدلتی ہوئی انجانی خطرناک صورت حال میں غفورے کا بھی خیال نہ رہا تھا۔

میں اور ماں اب دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے تاریکی میں پراسرار ہیولوں کی طرح ایسے

درختوں کے درمیان بے تحاشا دوڑ رہے تھے۔ دونوں گاڑیاں غرائی ہوئی ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آرہی تھیں۔ ہم دونوں ماں بیٹا گاڑیوں کی تیز روشنی کی زد میں تھے۔ اچانک عقب میں گولیوں کی بھیانک ترزاٹ اُبھری۔

گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔ میں نے ماں کا ہاتھ تھاما اور سوچے سمجھے بغیر دائیں جانب مڑ گیا۔ اس میں پھرتی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ہمیں یا تو اتفاقاً کوئی گولی نہیں لگی تھی یا پھر وہ فائرنگ جیسے محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دوسری صورت زیادہ قرین قیاس تھی۔ کیونکہ بیک وقت اتنی ساری گولیوں کے چلنے پر ہمارا زدمیں نہ آتا ”اتفاق“ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ماں کا ہاتھ پکڑے جس سمت کو مڑا تھا، وہاں چیز کے درختوں کی بہتات تھی۔ لیکن بیک وقت دو گاڑیوں کے تعاقب سے ہم کب تک خود کو بچا سکتے تھے؟ اس کی امید کم ہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ دونوں گاڑیاں لکھن میں دندناتی ہوئی ہمارے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ ہمارے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ میں نے دیکھا، وہ ایک سنگل ڈور ہجیر تھی اور دوسری سرخ رنگ کی انٹر کوکرتھی۔ وہ دونوں ہمارے دائیں بائیں گویا عین سر پر پہنچ کر رک گئی تھیں اور ان میں سے چار پانچ مسلح افراد چھلانگیں لگاتے ہوئے نیچے اتر آئے تھے۔ میری اور ماں کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ ہمارے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں انکا والا معاملہ تھا۔ پھر دفعۃً میری آنکھوں نے چونکا دینے والا منظر دیکھا۔

شاہ میر اور نظر حیات، میرے باپ قادر خان کے قاتل اور میری ماں کو بدر کرنے والا خطرناک ناگوں کا ٹولا وہاں موجود تھا۔

”خبردار! حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا یاد رکھیے خان!“ نظر حیات نے مجھے چونکنا نظروں سے گھورتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ”ہمارے ساتھی ذرا بد لحاظ واقع ہوئے ہیں۔ کیوں شاہ میر؟“ اس نے آخر میں اپنے حلیف شاہ میر سے بھی تائید چاہی تھی۔

”بالکل یاد رکھیے خان! بالکل! نظر حیات ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ جواباً شاہ میر نے بھی اپنے ساتھی کی تائید میں گویا لطف اندوز ہوتے ہوئے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آ رہے تھے۔ ان کے پانچ چھ کے قریب مسلح ساتھی اپنی گنوں کا رخ ہماری جانب کے خونخوار نظروں سے کھڑے ہمیں گھورے جا رہے تھے۔

میرے اندر بری طرح ہلچل مچی ہوئی تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ بد معاشوں کے اس ٹولے کو آخر کس نے ہماری جبری کردی؟..... کیا نگینہ نے؟..... نہیں تو پھر؟..... اس ”پھر“ کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ ماں کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ اس کے برعکس اس کی بڑی بڑی دہکتی آنکھوں میں ایک ایسی نفرت کا الاؤ بھڑک اٹھا تھا۔ میں نے کن آنکھیوں سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اپنے دیرینہ دشمنوں کو دیکھ کر بری طرح تپ رہا تھا اور وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو جنوں خیر انداز میں یوں بار بار بھیجنے جا رہی تھیں جیسے شاہ میر اور نظر حیات کی گردنیں دوپٹے کے لئے بے جین ہوں۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے کچھ بولنے سے قبل ہی مٹیم ناگن کی طرح ان دونوں کو

دشت بھری لہورنگ نظروں سے گھورتے ہوئے پھنکار کر بولی۔

”شاید تقدیر کو ابھی تمہاری زندگیاں مقصود ہیں..... لیکن میں تقدیر سے زیادہ بے رحم ہوں تم دونوں کے لئے۔“

”ہا..... ہا..... رستی جل گئی مگر بل نہیں گئے شہینہ بیگم!“ نظر حیات نے ماں کی شعلے برساتی

”ہا..... ہا..... رستی جل گئی مگر بل نہیں گئے شہینہ بیگم!“ نظر حیات نے ماں کی شعلے برساتی

آواز پر استہزائیہ انداز میں ایک قہقہہ اگلے ہوئے ماں سے کہا تو ماں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھویا اپنے انتقام کا سارا زہران میں اٹھ پلتے ہوئے ترکی بڑی کہا۔

”ہاں، نظر حیات! ہاں..... رستی تو واقعی جل گئی ہے مگر اس کی راکھ میں دبی چنگاری اب ایک آتش فشاں کا روپ دھار چکی ہے جس کی جھلک تم دونوں دیکھ ہی چکے ہو۔ مگر افسوس..... خوش؟ میں بڑا کرم دونوں اپنے بھائی کا انجام کو اور قریب کر رہے ہو۔“

”واہ..... واہ شہینہ بیگم! واہ..... موت کے سامنے اچھے اچھوں کے حواس ساتھ چھوڑ دے۔ ہیں۔ تمہاری اس دیدہ دلیری کی داد دینی چاہئے۔“ یہ شاہ میر تھا۔ وہ ڈرامائی انداز میں تالیاں بجاتا قدم چلتا ہوا ماں کے قریب آیا۔ اپنا ریوا اور اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔ میں اس وقت جلتی سلا کیفیات میں مبتلا دونوں شیطانوں کو گھورے جا رہا تھا۔

شاہ میر ہمارے قریب پہنچ کر رکا اور پھر اپنی جیب سے دوبارہ پستول نکال کر اس کی نال کا رخ میر طرف کر دیا اور دھاڑ کر غضب ناک لہجے میں ماں سے دوبارہ مخاطب ہو کر بولا۔

”شہینہ! تمہیں اپنے اس لاڈلے پر فخر ہے نا؟..... میں آج اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔“ یکا یک میری ہنسی ہوئی نظریں شاہ میر کے پستول والے ہاتھ پر جم گئیں۔

”نہیں شاہ میر! نہیں۔ میرے دلیر سپوت کو اتنا کمزور مت کھنا کہ وہ تیرے جیسے گیدڑ کے ہاتھوں یوں آسانی سے ڈھے جائے گا۔“ ماں کے لہجے میں عجیب طرح کا تین تھا کہ جس نے میرے وجود کو نوا میں ڈھال دیا تھا۔

دفعۃً ایک جانب سے مزید دو مسلح افراد دوڑتے، ہانپتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ میں پہلے یہی سمجھا کہ شاید یہ اس چھپکلی مارکر زرد رو بد معاش کے ساتھی تھے مگر جب میں نے انہیں نظر حیات اور شاہ میر سے مودبانہ مخاطب ہوتے دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ایک نے کہا۔ ”جناب! غمخورا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔“

نظر حیات نے دانت بھیج کر ایک زوردار ٹھٹھراس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

”حرام زادو! تم سے ایک آدمی نہیں پکڑا گیا۔ کہاں گیا آخر وہ؟“ نظر حیات نے باؤ لے کتے طرح غرا کر کہا۔

وہ دونوں خاموش رہے۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر اپنی ناکامی کی داستان کا ایک لفظ بھی مزید کہا تو وہ تھپڑ بھی کھانا پڑے گا۔

”گلتا ہے ہمیں خود تلاش کرنا پڑے گا۔“ بالآخر نظر حیات نے غصیلے لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا شاہ میر نے میری طرف اٹھا ہوا پستول والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ نظر حیات کی طرف مڑ کر بولا۔

”کوئی فائدہ نہیں نظر حیات! یہ بتاؤ، اب ان دونوں کو ادھر ہی ختم کر کے کسی اندھیری کھائی میں پھینک دیں یا.....“

اس نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

نظر حیات بولا۔ ”نہیں شاہ میر! ان دونوں کو اپنے ساتھ لے جانا ہو گا۔ اتنی آسان موت ان کا مقنا نہیں ہے۔ ابھی تو مجھے اس سنبولے سے اپنے بیٹے کبیر کے بارے میں اگلوانا ہے۔“ اس کا اشارہ میر جانب تھا۔

”تو یہیں اگلو لو نظر حیات! انہیں اپنے ساتھ لے جانے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہو؟.....“

اس ناگن اور اس کے سنبولے کا قصہ یہیں پاک کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری اور میری بیٹی نگینہ کی زندگی میں زہر گھولا ہے۔“ شاہ میر نے ہم دونوں ماں بیٹے کو غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے نظر حیات سے کہا۔

”کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو شاہ میر! میں بھی اب ان دونوں کا قصہ جلد نمٹانا چاہتا ہوں۔“ جواباً نظر حیات نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میری جانب غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”نادر! میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ میرا بیٹا کبیر کہاں ہے؟“

ماں اس وقت مارے طیش اور جوش غضب کے اپنے آپے میں نہیں تھی۔ اس کی وجہ اپنے دشمن دیرینہ کی موجودگی تھی۔ مگر میں اس نازک صورت حال میں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا چاہتا تھا۔ لہذا نظر حیات کے سوال کے جواب میں معذلوں لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم اپنے بیٹے کبیر کی گمشدگی کی وجہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو نادرا!“ نظر حیات غرا کر بولا۔ ”جب تم نگینہ کو اغواء کر کے دھوکے سے اسے پشاور اور پھر چترال کی طرف لے گئے تھے تو میرا بہادر بیٹا نگینہ کو تمہارے خونی پنجے سے چھڑانے کے لئے تمہارے تعاقب میں گیا تھا۔ پھر تم نے نگینہ کو ورغلا کر اپنا ہم خیال بنالیا اور اس کے ساتھ واپس لوٹ آئے۔ مگر کبیر اب تک کیوں نہیں لوٹا؟“

”کیا خبر وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہو کہ ہم واپس نہیں لوٹے ہیں۔ اور وہ وہیں ہمیں تلاش کرتا پھر رہا ہو۔“ میں نے جھوٹ بول کر اسے الجھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی ایک کالیاں تھا، فوراً بولا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔ میرا بیٹا اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ وہ یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔ تم نے ہی اسے کہیں غائب کیا ہے۔“

پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، ماں نے یکدم اس سے کہا۔ ”یہ سوال تم میرے بیٹے سے ہی کیوں پوچھ رہے ہو؟ جبکہ تم یہ بات انہی طرح جانتے ہو کہ نگینہ بھی میرے بیٹے کے ساتھ تھی۔ تو وہ بھی اچھی طرح یہ بات جانتی ہوگی کہ کبیر کہاں ہے۔“

ماں کا یہ سوال ایسا تھا جس نے مجھے دھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اب تک اس اہم بات کی طرف توجہ نہ دی تھی یا پھر شاید ضرورت ہی نہیں محسوس کی تھی۔ تاہم مجھے پورا یقین تھا کہ نگینہ نے میری ہدایات کے مطابق کبیر کے سلسلے میں نظر حیات کو اور شاہ میر کو کچھ نہیں بتایا ہو گا۔ چنانچہ نظر حیات کے جواب دینے کی بجائے شاہ میر ماں سے غرا کر بولا۔

”میں نے سب سے پہلے اپنی بیٹی نگینہ سے ہی کبیر کے بارے میں پوچھا تھا..... وہ اس بارے میں لاعلم ہے۔“

ماں کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہو گئی اور وہ اسی لہجے میں اس سے بولی۔

”اچھا..... کیا تمہاری بیٹی نگینہ اندھی تھی؟“

”بکواس بند کرو اپنی۔ ورنہ ادھر ہی گولی مار دوں گا تجھے۔“ جواباً شاہ میر غضب ناک لہجے میں بولا۔

ماں سے اس کے طرزِ مخاطب پر مجھے غصہ تو بہت آیا تھا مگر ابھی میں اپنے اندر کا لاوا نہیں اگھٹا چاہتا تھا بلکہ خاموشی سے ماں کی اس چال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیونکہ میں نے ماں کی مداخلت کے بعد نظر حیات کے چہرے پر پڑ سوچ اور اُجھٹن کے تاثرات بھانپ لئے تھے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا

”نظر حیات! کیا تم اتنے ہی بے وقوف ہو کہ اتنی بڑی اور اہم بات کو یکسر فراموش کر بیٹھے؟“ ماں

جیب کو طوفانی رفتار سے دوڑاتی ہوئی ایک طرف تاریکی کے بطن میں گھس گئی۔  
جیب کے ہونٹ سے نکلنے کے بعد شاہ میر کا کیا حشر ہوا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا مگر مجھے اس کی  
پرواہ بھی نہیں تھی۔

ماں جیب کو بدستور دوڑائے چلی جا رہی تھی اور میرے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں  
نہیں آ رہا تھا کہ آخر شاہ میر اور نظر حیات کو کس طرح یہ پتہ چلا تھا کہ لالہ زار کے مقام پر انخواء کنندگان  
کے ساتھ غنورے کے بدلے ماں کی رہائی کی ”ڈیلنگ“ ہو رہی ہے؟..... ایک گمبیر سوالیہ نشان تھا جو  
ہنوز کے کی طرح میرے حلق میں انک گیا تھا۔



نہ شاہ میر کی پرواہ کئے بغیر نظر حیات سے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”حیرت ہے نظر حیات! تم نے کیا یہ بات  
اس لئے فراموش کر ڈالی کہ گمبیر تمہارے دوست کی بیٹی ہے۔ کیا تمہارے بیٹے کی اہمیت تمہاری نظروں  
میں نہیں؟“

”میں کہتا ہوں اپنی بکواس بند کر ذلیل کتیا!“ شاہ میر آپے سے باہر ہو گیا اور اس کے منہ سے ماں  
کے لئے چالی کے الفاظ نے میرے آتش فشاں کو جیسے ہبڑا کر رکھ دیا۔ میں کسی غضب ناک شیر کی طرح  
دھاڑ کر اس پر جھپٹا۔ وہ اپنا پستول والا ہاتھ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے  
ساتھ اسے دبوچ لیا اور پستول بھی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول کی نال میں اس  
کی کینٹی سے لگا چکا تھا۔

”کینے!..... ذلیل! دل تو میرا یہی چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو گالی دینے کی گستاخی پر تیری کھوپڑی  
میں ابھی سوراخ کر دوں۔“ میں دانت پیس کر خون رنگ لہجے میں بولا۔ ”لیکن اگر تو اپنی زندگی چاہتا ہے  
تو اسی وقت اپنے کتوں کو ہتھیار پھینکنے کا حکم صادر کر۔ ورنہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ یہ سب اتنا اچانک  
اور غیر متوقع طور پر ہوا تھا کہ وہاں موجود نظر حیات اور اس کے پیلے ہکا بکارہ گئے تھے۔

”نادر!..... شاہ میر کو چھوڑ دو۔“ نظر حیات نے کمزور سی آواز میں کہا۔ جبکہ شاہ میر کے حلق سے  
گھنی گھنی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ وجہ یہی تھی کہ میرے دائیں بازو کا ٹکڑھ مضبوطی سے اس کی گردن  
کے گرد جکڑا ہوا تھا جبکہ بائیں ہاتھ میں پستول تھا جس کی نال میں نے اس کی کینٹی کے ساتھ لگا رکھی تھی۔  
پھر میں نے اسے بولنے کا موقع دیتے ہوئے اس کی گردن کو ذرا ڈھیلا چھوڑا تو وہ پھنسی پھنسی آواز  
میں نظر حیات سے بولا۔

”نن!..... نظر حیات! ان!..... ان دونوں کو جانے دو۔“ خ..... خدا کے لئے!..... ان  
دونوں کو جانے دو۔“

میں نے کن اکھیوں سے نظر حیات کی طرف دیکھا۔ وہ بری طرح شش و پنج میں مبتلا تھا۔ لیکن پھر  
دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ انہوں نے ایک طرف قطار بنالی۔ میں  
نے اس سے چلا کر اسے گاڑی کی طرف بڑھنے کو کہا۔ ماں نے فوراً ایسا ہی کیا۔

میں نے بھی شاہ میر کو ڈھال بنا کر اپنے ساتھ گاڑی کی طرف کھینچا۔ ماں ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ  
کھول کر اندر سوار ہو چکی تھی۔ چالی انیشن سوئچ میں موجود تھی جسے ماں نے فوراً ہی کھما دیا۔ گاڑی  
اشارات ہو گئی۔ یہ شاہ میر ہی کی سٹکل ڈور بجیر تھی۔ پھر میں نے پستول والے ہاتھ سے اپنی طرف کا  
دروازہ کھولا تو اچانک شاہ میر نے میرے پیٹ میں کھنی رسید کر ڈالی۔ یہ حملہ اچانک تھا۔ میرے حلق سے  
بے اختیار اوغ کی آواز نکلی۔ اس کی گردن پر میرے بازو کی گرفت از خود ڈھیلی پڑ گئی تو اس نے ایک وار  
میرے پستول والی کلائی پر رسید کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے جھوٹ کر گر پڑا تو میں نے خود کو سنبھال لیا اور  
اسے دھکیل کر صورت حال کی خطرناکی کو بھانپتے ہی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ماں نے فوراً گیر بدلا، جیت کو  
تیزی سے یوٹرن دیا۔ نتیجے میں شاہ میر سامنے آ گیا۔ اس کے عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ کئی  
گولیاں ٹھک ٹھک کی آواز سے جیب کی باڈی میں پیوست ہو گئیں اور کھڑکی کے شیشوں پر بھی لگیں جو  
چھتا کے کی آواز سے ٹوٹ گئے۔ ہم دونوں ماں بیٹے نے فوراً سر جھکا دیئے تھے مگر ماں نے ایک سیلیٹر سے  
پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔

اس لمحے شاہ میر میری جیب کے ہونٹ سے نکل آیا اور اچھل کر دور جا گرا۔ ماں نے دوبارہ سر اٹھارا اور

پس عزم و حوصلے کا ہتھیار ہے۔  
 ”وہ تو ٹھیک ہے ماں! مگر ہمیں.....“  
 ”تم جاسکتے ہو۔“ ماں نے روکھے لہجے میں یہ کہتے ہوئے میری بات کاٹی اور میرا وجود کٹنے لگا۔  
 ”ماں! میں بھلا تمہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں؟“  
 ”بس تو پھر تیار ہو۔“ ابھی ماں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک بائیں جانب عقب سے کسی گاڑی کی تیز روشنی نظر آئی۔ ماں نے سرسرا تے لہجے میں کہا۔ ”وہ آ رہے ہیں۔“  
 میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے ماں سے کہا۔ ”ماں! تو گاڑی سے نیچے اتر جا۔ میں دشمنوں کا راستہ روکوں گا۔“

”نہیں..... میں کچھ اور کرنا چاہتی ہوں۔ تم بس ذرا محتاط ہو کر بیٹھے رہو۔“  
 ماں نے کہا اور پھر اس نے انکیشن سوچ میں چالی گھنٹائی۔ رات کے دم یہ خود سکوت میں جیپ کا انجن ہولے سے غرا کر اسٹارٹ ہو گیا۔ ماں نے ہیڈ لیمپس گل کر دیے تھے۔ پتہ نہیں ماں کیا کرنا چاہتی تھیں؟ مگر میں اب ان کی ہدایات کے مطابق محتاط ہو کر بیٹھ گیا تھا۔  
 گاڑی لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ نظر حیات کی سرخ انٹرکولر ہی تھی۔ پکی سڑک بل کھاتی ہوئی تھی اس لئے ایک محتاط اندازے کے تحت انٹرکولر کی رفتار ساٹھ ستر سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس بل کھاتی سڑک پر یہ رفتار بہت تیز تھی۔ پھر جیسے ہی وہ ہمارے ذرا قریب پہنچی، ماں نے گیر بدلایا اور ایکسپلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ ہماری جیپ کا انجن وحشی دندنے کی مانند غرا اور جیپ ایک جھٹکے سے پختہ سڑک کی طرف دوڑی۔ ماں کا اندازہ نہایت درست ثابت ہوا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی وہ انٹرکولر نزدیک پہنچ کر ہمارے قریب سے گزرنے لگی، ہماری جیپ دھاڑتے ہوئے دندنے کی طرح اچھل کر پختہ سڑک کی طرف بڑھی اور سامنے سے گزرتی ہوئی انٹرکولر کے عقبی حصے کے ساتھ زوردار دھماکے سے ٹکرائی۔ ششے ٹوٹنے کی چھنکے دار آواز گونجی۔ ہمیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ انٹرکولر کے عقبی حصے سے ہماری جیپ ٹکرانے کے نتیجے میں انٹرکولر کا توازن بگڑ گیا۔ اس کا عقبی حصہ پختہ سڑک پر گھوما تو انٹرکولر بے قابو ہو گئی۔ اس کے ذرائعور بے دھوا سی میں اپنی ذوقی انٹرکولر کے بریک لگا دیئے۔ نتیجتاً انٹرکولر الٹ کر ایک دھماکے سے پختہ سڑک پر گر کر دور تک کھٹکتی چلی گئی اور کچے میں جا اتری۔

”ماں!..... نیچے اتر دو..... جلدی۔“ میں نے ماں سے کہا اور پھر ہم دونوں نہایت پھرتی کے ساتھ نیچے اتر آئے۔ انٹرکولر خاصی دور جا کر سڑک کے کنارے الٹ کر قدرے نیچی کچے میں جا گری تھی۔ میں اور ماں چیز اور صنوبر کے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے احتیاط سے مذکورہ سمت کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھ رہے تھے۔

صاف اور روشن آسمان کی وجہ سے ہمیں ذرا دور الٹی ہوئی انٹرکولر صاف نظر آرہی تھی۔ وہ بالکل الٹ چکی تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹا تیز تیز قدموں اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ذرا ہی قریب پہنچے تھے کہ انٹرکولر ایک سماعت شکن دھماکے سے شعلوں کی زد میں آ گئی۔ میں نے اور ماں نے خود کو غیر اختیاری طور پر زمین پر گر دیا۔ انٹرکولر دھڑا دھڑا جل رہی تھی۔ آگ کے شعلے اسے نگل رہے تھے۔ شاید فیول ٹینک نے آگ پکڑ لی تھی۔ شعلوں کی پیش ہم تک پہنچ رہی تھی۔

”ماں! واپس پلو۔“ میں نے ماں سے کہا اور وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ہم دونوں جلتی سلاکتی انٹرکولر سے ذرا دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ ”ماں! یہاں سے نکل چلو۔ ورنہ آبادی کے لوگ ادھر کا رخ کریں گے“

تقدیر کا بے رحم کھیل جاری تھا۔ میں اور میری ماں دشمنوں کے لگائے اس پھندے سے تو آئے تھے مگر وہ سوال ابھی تک اہم تھا، ہماری اس ڈیلنگ کا شاہ میرا اینڈ کمپنی کو کیسے علم ہوا تھا۔ گھوم کر ایک ہی شخصیت میرے ذہن کے پردے پر ابھر رہی تھی۔ عقل اس کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ دل..... دل بھلا ایسی بات کیوں کر مانتا؟..... عقل کا کہنا تھا، یہ کام نگینہ نے کیا اور دل کا فرما تھا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ میری محبت ہے اور یہ محبت یک طرفہ نہیں، دو طرفہ ہے۔ اگر میں اس چاہت میں ہوش و خرد سے بیگانہ ہوں تو وہ بھی میری خاطر پہاڑوں سے ٹکرانے کا عزم رکھتی ہے۔ مجھ کے مکتے شگونوں نے میری جان کے مساموں کو اپنی دلفریب خوشبو سے مہکا رکھا ہے تو یہی محبت اس کے رگ و پے میں حیات کا پیغام بن کر دوڑ رہی ہے۔ اسی لئے یہ بات تسلیم ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ نگینہ میرے خلاف اپنے باپ سے بخبری کر سکتی ہے۔ میری سوچیں گاڑی کی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھیں۔ اچانک ماں کھائی اور میں خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں آ گیا۔ ہم نے اپنے دشمنوں خلاف ایک معرکہ جیت لیا تھا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں ماں بیٹے نے شاہ میر اور نظر حیات جیسے دیرینہ دشمنوں کے روپروہ آزمائی کی تھی۔ مجھے خوشی تھی کہ ہمارے حصے میں ہی آئی تھی۔ لیکن ماں تو اس سے بھی مطمئن نہ تھیں۔ وہ تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہتی تھیں۔ جبکہ اغواء کنندگان کے مقابلے میں بھی مجھے فتح حاصل تو ہوتی مگر نصف۔ یعنی میں ماں کو حاصل کر چکا تھا لیکن غمخوار فرار ہو چکا تھا۔ اگرچہ میں نے غمخوار چھاپ رکھا تھا مگر شاہ میر اور نظر حیات کے اچانک ٹپک پڑنے کی وجہ سے غمخوار ہاتھ سے نکل گیا تو بہر طور مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ ماں کو میں آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے لئے یہی بہت تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ جیپ کا رخ بتدریج بدل رہا ہے۔ یہ کوئی چونکنے والی بات نہ تھی۔ مگر ٹھنکا اس وقت جب ماں نے پکی سڑک چھوڑ کر کچے میں جیپ اتار لی اور اسے بریک لگا دیئے اور سو آف کر دیا۔

”کیا ہوا ماں.....؟“ میں نے قدرے چونک کر ماں سے پوچھا۔ ماں کے چہرے پر جوش غیظ سرخی مترشح تھی۔ پھر وہ پزیرش لہجے میں بولیں۔

”ناور! وہ ضرور اس سڑک سے گزریں گے۔“

میں ماں کی بات کا مطلب سمجھ کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دوبارہ بولی۔ ”دشمنوں سے نمٹنے کا یہ سنہ موقع میں ضائع نہیں جانے دوں گی۔“

”ماں ماں!..... ہم نیچے ہیں اور وہ.....“

ماں نے یکدم میری بات کاٹ کر کہا۔ ”تم کب سے کھلونوں کے محتاج ہو گئے ہو ناور بیٹے! ہمار۔“

اور ہم ان کی نظروں میں آجائیں گے۔“ میں نے ماں سے دوبارہ کہا۔

شعلوں کی آگنی دہک میں اس کا چہرہ آسودہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ ایسا ہی لگتا تھا کہ نظر حیات اور شاہ (جس کے بارے میں ہم دونوں ماں بیٹے کا یہی خیال تھا کہ زخمی ہونے کے بعد نظر حیات نے اسپتال پہنچانے کے لئے اپنی انٹرکولر میں ہی سوار کر دیا ہو گا بشرطیکہ وہ زندہ ہو) بھی جل مرے تھے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اُس جگہ پہنچے جہاں ہماری (شاہ میر کی) جیب پختہ سڑک پر ترچھی کھڑ تھی۔ انٹرکولر کے عقبی حصے کو ٹکڑا مارنے کے بعد اس کے بونٹ کی حالت قدرے خستہ ہو رہی تھی۔ پتہ یہ اب وہ اشارت بھی ہوتی کہ نہیں۔ تاہم قریب پہنچ کر ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ اس بار میں نے سنبھالی۔ میں نے انکیشن سوچ میں چابی کھمادی مگر انجن ہولے۔ گھر گھر اگر خاموش ہو گیا۔ دو ایک بار مزید کوشش کر کے دیکھ لی مگر بے سود۔

”نہیں ہو رہی اشارت؟“ ماں نے استفسار کیا۔

”اتر کر دیکھنا پڑے گا۔“ میں نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اُترا۔ بونٹ کی طرف بڑھا مگر بونٹ اس طرح چپک کر ٹائٹ ہو چکا تھا کہ پوری کوشش اور طاقت کے باوجود اوپر نہ اٹھا۔ میں پریشان سا گیا۔ دور انٹرکولر سے ہنوز شعلے بلند ہو رہے تھے۔ مجھے قریب کی آبادی سے لوگوں کی ”ہنگامی آمد“ کا بھ خدشہ لاحق تھا۔ ماں بھی نیچے اتر آئی تھی۔

”ماں! ہمیں پیدل ہی نکلنا پڑے گا۔ ورنہ ہم مقامی لوگوں کی نظروں میں آجائیں گے۔“

”لیکن نادر!..... پیدل ہم کہاں تک چلیں گے؟“ ماں نے کہا۔ ان کے لہجے میں پریشانی

شائبہ تک نہ تھا۔

”لالہ زار تک تو جانا ہی پڑے گا۔ وہاں ہماری جیب یقیناً موجود ہوگی۔ کیونکہ میں غفور سے کو اس میں بٹھا کر وہاں تک پہنچا تھا۔“

میری بات پر ماں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

وہ مقام وہاں سے تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ماں بیٹے جیسے تھے، گرتے پڑتے لالہ زار کے مقام پر پہنچے۔

وہاں چھپکلی مارکے بد معاش کے ساتھیوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں۔ میں نے سب سے پہلا اپنا میگارد تلاش کیا۔ اس کے بعد مجھے قریب ہی اپنی جیب کھڑی نظر آ گئی۔

تقدیر ہم یں بیٹے کا ساتھ دے رہی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ ڈرائیو دیر بعد ہم گرین لاج کی طرف گامزن ہو گئے۔

گرین لاج پہنچتے ہی ماں نے مجھ سے کہا کہ میں اعظم خان کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کر ڈالوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ماں نے بھی ان سے تفصیلی گفتگو کی۔

اعظم خان نے غفور سے کے فرار پر تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اس کے جواب میں، میں نے اپنی پرانی بات کو دہراتے ہوئے کہا۔

”انکل! میرا خیال ہے کہ غفورا ہمارا کام خود ہی آسان کر ڈالے گا۔ کیونکہ وہ پولس کو انتہائی مطلوب مجرم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور وہ ہمارے خلاف پولیس کے پاس ہرگز نہیں جائے گا۔ بلکہ وہ پولیس سے دور رہنے کی ہی کوشش کرے گا۔“

”لیکن نادر بیٹے! تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے دشمن اس کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور وہ

اسے تم دونوں ماں بیٹے کے خلاف ہتھیار کی صورت میں استعمال کر سکتے ہیں۔“

اعظم خان کی بات پر مجھے سخت اچنبھا ہوا۔ میں نے کہا۔ ”انکل! ہمارے دشمن کون ہیں؟ میرا نہیں خیال کہ نظر حیات اور شاہ میر زندہ بچے ہوں؟“

”ہاں..... ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی اس کی تصدیق تو نہیں ہوئی۔“ وہ بولے۔ ”بہر حال، تم ماں بیٹا اپنے معمولات پر توجہ دو اور خفیہ طور پر نظر حیات اور شاہ میر کی سگن بھی لیتے رہو کہ آخر ان کا کیا بنا؟ کیا وہ واقعی ہلاک ہو چکے ہیں یا پھر.....“

انہوں نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد دوبارہ بولے۔ ”تم دونوں ماں بیٹا محتاط رہو۔ ابھی پولیس کا ردوائی ہوگی اور پولیس کا شبہ لامحالہ تم دونوں پر ہی ہوگا۔ ویسے تم نے اپنی موجودگی کا جائے وقوع پر کوئی ثبوت تو نہیں چھوڑا ہے؟“

”نہیں انکل.....!“ میں نے مختصراً کہا۔ اس کے بعد انہوں نے ماں سے بھی چند باتیں کیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔

\*\*\*

ہم ماں بیٹے کی زندگی کا گزشتہ شب والا واقعہ اہم ترین تھا۔ میں نے آج زندگی میں پہلی بار ماں کے چہرے پر ایک انوکھا اور خاص رنگ دیکھا تھا۔ ایسا رنگ اور ایسا انوکھا پن جو آج تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ماں کو خوش دیکھ کر میں بھی ایک گونہ خوش محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جانے کیوں میرے دل کو وہ خوشی، وہ مسرت نہیں مل رہی تھی جو ماں کی طرح ہونی چاہئے تھی۔ میری خوشی اور مسرت کے آگے کوئی ان دیکھی رکاوٹ تھی جو ایک تنگی سی پیدا کر رہی تھی۔ کھل کر خوش ہونے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ ایک سوچ تھی، ایک ابھرنے والی، کوئی پھانس تھی۔

’کیا اس کی وجہ..... نگینہ تھی؟‘ اچانک میں نے خود سے سوال کیا۔ ’نہ..... نہ..... نہیں۔‘

’بھلا نگینہ اس کی وجہ کیسے ہو سکتی ہے؟‘ میں گھبرا سا گیا۔

’ہاں نادر!..... اگر شاہ میر واقعی مر گیا تو نگینہ کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟‘ میرے اندر کوئی سرد مہری سے بولا۔

’کیا نگینہ کو دکھ نہ ہوگا؟ وہ یتیم ہو جائے گی۔ اس کا باپ کے سوا کون ہے؟‘ دوسرے ہی لمحے میرے دل نے توجہ ہر پیش کی۔

’نگینہ اپنے باپ کے کالے کرتوت سے واقف ہے۔ وہ اسے اپنے باپ کے منطقی انجام پر محمول کرتے ہوئے خاموش ہو جائے گی۔ اور پھر وہ اکیلی کب ہے؟ میں اس کے ساتھ ہوں..... اُس کا نادر۔ اس کی پہلی اور آخری محبت!‘

’مومنہ..... دماغ نے استہزائیہ کہا۔ ‘اچھا بہانہ ہے۔ لیکن نادر میاں! یہ کیوں بھول رہے ہو کہ نگینہ نے تم سے ایک عاجزانہ درخواست بھی کی تھی۔ انتہائی عاجزانہ درخواست..... کہ اس کے باپ کو معاف کر دیا جائے۔‘

دل بھلا دماغ کو خاطر میں لاتا ہے۔ فوراً ہی جواب آیا۔ ’لیکن معافی کا اختیار تمہیں کب تھا نادر؟ تم کون ہو اپنی ماں کے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے والے؟ تم اپنے باپ کے قاتل کو معاف کر سکتے ہو لیکن میں تم گزیدہ عورت کے شوہر کے قاتل کو معاف کرنے کا بہر حال کوئی اختیار نہ تھا۔‘

’بے شک.....! دماغ نے حسب معمول غیر جذباتی انداز میں کہا۔ ‘مگر تم نے اپنی منتقم مزاج ماں کا

اس کے باپ کو معاف کرے گی؟

پھر نگینہ نے اپنے باپ کو بھی منا لیا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اسے گرین لاج بھی لے آئی تھی۔ شاہ میر اپنی بیٹی کے ساتھ خود چل کر مجھ سے اور ماں سے معافی مانگنے آیا تھا۔ ماں اس وقت گرین لاج میں نہ تھی مگر شاہ میر اور نگینہ کو گرین لاج سے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا تھا۔

بعد میں ماں کو نگینہ اور شاہ میر کی اس طرح اچانک گرین لاج میں آمد پر خاصا طیش آیا تھا اور میرے تشفی دینے کے باوجود کہ ان دونوں باپ بیٹی کو مایوس لوٹنا پڑا تھا، ماں مجھ پر برہم ہوئی تھیں کہ میرے ہوتے ہوئے شاہ میر گرین لاج سے زندہ کیوں واپس لوٹا تھا؟

رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ ہر لمحہ آئندہ آنے والے روشن دن سے قریب کر رہا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر لیٹ گیا کہ ماں اپنے ہاتھوں میں کافی کے دوگ لے اندر داخل ہوئیں۔

”ماں! آپ نے کیوں زحمت کی؟ کافی میں بنا لیتا۔“ میں نے کھڑے ہو کر احتراماً کہا مگر ماں نے بری بات کو یکسر نظر انداز کر دیا اور ایک گم میری جانب بڑھاتے ہوئے متانت سے بولیں۔

”نادر! تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ دونوں ضیث جل مرے ہوں گے؟“

”آں..... ہاں..... شاید نہیں۔“ ماں کے اس اچانک سوال پر میں ذرا گڑبڑا کر بولا۔

”ہمیں اس وقت وہاں ٹھہر کر یہ اطمینان کر لینا چاہئے تھا۔“ ماں نے سانسے والے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔ کافی کا گم انہوں نے اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ کافی کے گم سے اٹھنے والی بھاپ کے عقب سے ان کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”اگر ہم وہاں مزید ٹھہرتے تو مقامی لوگوں کی نظروں میں آسکتے تھے۔“ میں نے ہولے سے کہا اور کافی کا ایک گھونٹ لیا اور مزید بولا۔ ”کل صبح تک معلوم ہو جائے گا۔“

”تمہیں شاہ میر کی اس موت پر دکھ تو نہیں؟“ ماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اچانک مجھ سے پوچھا۔

”میرے اور ماں کے درمیان جاری غیر محسوس جنگ میں یہ سوال نہایت خطرناک تھا۔ مگر مجھے اس کی توقع تھی۔ مزید یہ کہ اس ضمن میں میری آنا کافی اس سرد جنگ کو طول دے سکتی تھی۔ اس لئے میں نے یک گہری ہمکاری بھر کر صاف گوئی سے کہا۔

”ماں!..... دکھ کی بات نہیں ہے۔“

”تو پھر خوشی کی ہوگی۔“ ماں نے یکدم میری بات کاٹ ڈالی۔ مجھے ان کا لہجہ طنز یہ لگا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

”ماں! اگر ایک شخص کو اپنے گھٹاؤ نے جرم کا احساس ہو جائے اور وہ خود چل کر ہمارے دروازے پر معافی کے لئے آئے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“ میں نے گیند ماں کے کورٹ میں پھینکی۔ مجھے پورا یقین تھا، ماں طیش میں آجائیں گی۔ مگر وہ خلاف توقع بے تاثر مسکراہٹ سے بولیں۔

”میں اپنے شوہر کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتی۔ اگر تم اپنے باپ کے قاتل اور ماں کے مجرم کو معاف کر سکتے ہو تو یہ تمہارا اپنا فضل ہوگا۔“

”ماں! معاف تو خدا بھی کر دیا کرتا ہے۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”تم پہلے خود سے پوچھنا دو! کیا تم اپنے باپ کے قاتلوں کو معاف کر سکتے ہو؟“

”ماں! میں صرف شاہ میر کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

بہر حال ساتھ دیا۔

”میں اس کا بیٹا ہوں..... میں چیخ پڑا۔

”تم نگینہ کی محبت بھی تو ہو۔“ داغ چلایا۔

دل و دماغ کی اس تکرار نے مجھے بری طرح تہہ تیغ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آزمائش کی ایک ٹھنک میری منتظر تھی۔ میں نگینہ اور ماں کے سچ معلق ہو گیا تھا۔

میں ”محبت“ اور ”ممتا“ کے درمیان گویا بل صراط پر کھڑا تھا۔ ایک طرف نگینہ کی محبت تھی تو دوسری طرف ماں کی ممتا..... ایک طرف محبت کی پاسداری تو دوسری طرف ممتا کی قرض داری۔

ایک طرف فرض تھا تو دوسری جانب قرض تھا..... اور میں درمیان میں ایک لاعلاج مریض کی طرح معلق تھا۔

یہ کشمکش نہ جانے کب تک جاری رہنے والی تھی۔ اور مجھے کوئی اندازہ نہ تھا، فتح کس کی ہوگی۔ مجھ کی یا فرض کی۔

میں نے سر جھٹکا اور اپنی توجہ دوسرے معاملات کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے لمحے میرے تصور میں جلتی ہوئی انٹرکولر کا منظر روشن ہو گیا۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے انٹرکولر کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔ عموماً ایسی صورت میں کسی کا زندہ بچ جانا ممکن نہیں ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے

ایسا محسوس ہو رہا تھا، شاہ میر اور نظر حیات اس تصادم کے بعد بھی بچ گئے تھے۔ میرے پاس اپنے خیال کی کوئی دلیل نہیں تھی مگر کہیں اندر سے کچھ ایسی ہی صدا اٹھ رہی تھی۔ تیرے دشمن ابھی اس دھرتی

سائس لے رہے ہیں۔

میں ان سوچوں میں تھا۔ پھر میرے تصور میں اپنی ماں کا پشاش پشاش اور شکستہ چہرہ جھلک گیا۔ رام والے واقعے کے بعد سے اس کی پڑمردگی اور افسردگی دور ہو گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا اس نے اپنے دونوں

دشمنوں کی موت کا یقین کر لیا ہو۔

”مگر میں کیوں بے چین ہوں؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔ ”جب کہ ماں مطمئن ہے۔ میرے چہرے پر بھی اس خوشی و مسرت کا رنگ جھلکنا چاہئے تھا۔ میں ان دونوں کی موت پر خوش ہونے کی بجائے۔

چین اور افسردہ کیوں ہوں؟..... کیوں ہوں؟“ میں نے کئی بار اپنے آپ سے یہ سوال کیا اور پھر اچانک نگینہ کی صورت میں مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

”ہاں..... شاید اس لئے کہ وہ نگینہ کا باپ تھا۔“

کیا میں نہیں جانتا تھا کہ نگینہ یتیم ہو؟..... کیا میں شاہ میر کی متوقع موت سے بے چین تھا؟ آ

نگینہ کی محبت نے مجھے اتنا ہی خود غرض بنا دیا تھا کہ میں اپنے دوست کے قاتل کی موت نہیں چاہتا تھا؟ آ

میں اس ستم گزیدہ ماں کے دکھوں کو فراموش کر چکا تھا جسے عین جوانی میں بیوگی کا داغ بہت بڑا تھا اور جس نے..... جس نے اپنی جوانی جموئے الزام کی پاداش میں حبس زنداں ہو کر گزار دی تھی۔ میں آ

کے شوہر کے قاتل کی متوقع موت پر بے چین تھا..... مجھے تو خوش ہونا چاہئے تھا۔ پھر ایسا کیوں تھا میرے لہو کی آگ کیوں بجھنے لگی تھی؟

شاید اس کی وجہ چند روز پہلے نگینہ کی مجھ سے وہ ہر سوز البتھا تھی جس نے بڑی حسرت و یاس کے ساتھ مجھ سے معافی کی درخواست کی تھی..... معاف تو خدا بھی کر دیا کرتا ہے۔ بھلا اسے بڑھ کر اور انتقام ہو سکتا ہے؟ لیکن میں نے نگینہ سے یہ بھی کہا تھا کہ میری معافی تو بعد کا معاملہ ہے، کیا میری ما



ہوئے ماں بیٹے کے درمیان بھی دراڑ ڈال دی۔ ٹھیک ہے، اگر دشمنوں کے ظلم کا یہ حال ہے تو میرا حوصلہ بھی کمال ہے۔ اس لئے میں اپنی ممتا کا گلا گھونٹ سکتی ہوں۔ مگر اس زخمی عورت کو نہیں مار سکتی کہ مجھے اپنے اس روپ پر تاثر عمیق رہے گا۔ مجھے اب تمہارے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی حتمی اور سخت فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ دشمن بڑی مکاری کے ساتھ ایک خوب صورت ہتھیار کے ذریعے میری ممتا پر سینڈھ لگا چکا ہے۔ مگر ہمیشہ کی طرح انہیں اس بار بھی ناکامی ہوگی۔“ یہ کہہ کر ماں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

میں اپنی جگہ سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ ماں کے لہجے کی گھن گرج ابھی تک میری سماعتوں میں گونج رہی تھی۔ میرا پورا وجود گویا آندھیوں کی زد پر تھا۔ میرے اندر کوئی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر رہا تھا۔ میں..... نادر علی خان، جس نے آج تک نامساعد حالات کی تیز و تند آندھیوں کا ڈٹ کر اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا تھا اور بڑے بڑے نامی گرامی بد معاش میرے سامنے ریت کی دیوار بن کر ڈھیر ہو چکے تھے، آج ماں کے ان بے رحم جملوں سے خود ٹوٹ کر ڈھیر بن رہا تھا۔ مجھ پر آج یہ ہولناک انکشاف ہوا تھا کہ ماں..... میری پیاری ماں مجھ سے بدظن ہو چکی تھی۔ وہ مجھے دشمنوں کا آلہ کار سمجھ رہی تھی۔

گنیز کے حوالے کو وہ دشمنوں کی خوب صورت سازش اور ہتھیار سمجھ رہی تھی۔ میں ماں کے دل و دماغ سے یہ کریہہ غلط فہمی دور کرنے کی جس قدر سرتوڑ کوشش کر رہا تھا، حالات کی طرف کاری ہم ماں بیٹے کے درمیان اتنی ہی تیزی سے فاصلے وسیع کر رہی تھی۔

ماں کے آخری الفاظ کے ”مجھے اب تمہارے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ کوئی سخت اور اٹل فیصلہ کرنا ہو گا“ نے مجھے حیرت زدہ کر رکھا تھا۔

ماں میرے بارے میں کون سا سخت فیصلہ صادر کرنے والی تھی؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تاہم مجھے حالات کی ہولناکی کا کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا۔

کیا میرے اور ماں کے درمیان سرد جنگ کا خاتمہ کسی تکلیف دہ فیصلے پر مبنی ہونے والا تھا؟ یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کی نیس پھٹنے لگیں۔

میرے جی میں تو آئی کہ اسی وقت ماں کے سامنے جا کر اس کے قدموں میں سر رکھ دوں اور رور کر اسے یقین دلاؤں کہ میں اپنے باپ کے قاتلوں کو بھولا ہوں اور نہ ہی میں نادانستگی میں ان کا آلہ کار بن چکا ہوں۔

لیکن ماں نے میرے لئے بولنے، کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔ گزشتہ شب والے واقعے کے دوران شاہ میر اور نظر حیات کا عین وقت پر نازل ہو جانا، ماں کے شبے کو تقویت دینے کا باعث بنا تھا۔ اس پر میرا گنیز سے ماں کے اغواء کا ذکر کرنا بھی ماں کی غلط فہمی میں اضافے کا سبب بنا تھا۔ حالانکہ اس وقت وہ نہیں تھی جو ماں سمجھ رہی تھی کیونکہ گنیز کو جب میں نے پوری بات سے آگاہ ہی نہیں کیا تھا اور کر ہی دیتا تو مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری ہدایت کے بعد اپنے باپ شاہ میر سے ہرگز اس کا ذکر نہیں کرتی۔ تو پھر..... آخر شاہ میر اور نظر حیات کو کیسے پتہ چلا اس بات کا؟ یہی ایک پھانس تھی جو مجھے بے یقینی میں مبتلا کئے ہوئے تھی۔

”کیا مجھے اس سلسلے میں گنیز سے استفسار کرنا چاہئے؟“..... میں نے خود سے پوچھا۔ جواب اثبات میں تھا۔ مگر امید مجھے پھر بھی نہ تھی۔ اس نے میرے منع کرنے کے باوجود اپنے باپ سے ماں کے اغواء کا

”اس لئے..... کہ وہ گنیز کا باپ ہے؟“  
”یہ بات نہیں..... رہا سوال آپ کے پہلے سوال کا، میری معافی آپ ہی کی مرضی پر کرتی ہے۔“

”میں تمہیں شاہ میر کو معاف کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“ ماں نے حتمی لہجے میں کہا۔ پھر میرے چہرے پر اپنی نگاہیں جماتے ہوئے مستفسر ہوئیں۔ ”کیا تم نے ہی گنیز کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے شاہ میر کو مجھ سے معافی طلب کرنے کے لئے مجبور کرے اور وہ اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر یہاں چلا آئے تمہارے ہوتے ہوئے وہ اپنے پیروں پر واپس چلا گیا۔“

”نہیں! میں نے گنیز سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔  
چند ثانیے اعصاب شکن توقف کے بعد ماں نے کہا۔ ”نادر! شاہ میر بڑی مکاری کے ساتھ اپنا گنیز کو ہمارے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ تم اس کی یہ چال سمجھنے کی کوشش کرو سازش میں گنیز براہ کی شریک ہے۔ اس کا ثبوت شاہ میر اور نظر حیات کا عین اس وقت لالہ زار پہنچا جب تم غصے کے بدلے مجھے اغواء کنندگان سے حاصل کرنے والے تھے۔“

”ہاں! اس بات پر مجھے بھی تعجب ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
”مجبب نہیں کہو نادر بیٹا! یقین کر لو، گنیز نے تم سے انکوار کیا تھا کہ ہمارے درمیان اغواء کنندگان کب اور کہاں ”ذیل“ ہونے والی ہے اور یوں دونوں نے ایک پتہ دو کاج کے مصداق غصے کرنا چاہا۔“ ماں نے جیسے خود ہی خود بے لاگ تجزیہ کر ڈالا۔  
”یہ غلط ہے! میں نے تو گنیز سے اس سلسلے میں کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کی تھی۔“ میں نے کہا۔  
”تم نے گنیز سے میرے اغواء کا ذکر تو کیا ہوگا؟“ ماں نے اچانک دوسرا سوال کیا اور میں ایک سانس لے کر رہ گیا۔ پھر جواب بولا۔

”ہاں! صرف اتنا کہ ماں کو چند نامعلوم افراد نے اغواء کر لیا ہے اور میں.....“  
”بس..... اتنی اہم بات کو تم معمولی سمجھ رہے ہو۔“ ماں نے طنز آمیز حیرت سے کہا۔  
”لیکن! میں نے اسے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ ان نامعلوم اغواء کنندگان نے غصے کے عوض اور کہاں ہم سے ذیل کرنی ہے؟“

”تم آدھا جی اور آدھا جھوٹ بول کر مجھے چکر نہیں دے سکتے نادر بیٹا! میں تمہاری ماں ہوں اور سمجھتی ہوں۔ اس لئے مجھ سے بحث نہ کرو اور اپنی دنیا میں گن رہو۔“ ماں کے زہریلے جملوں نے جگر پھٹتی کر دیا۔

”ماں! میری بات کا یقین کریں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔  
”سچ ثابت ہو چکا ہے۔“ ماں نے سرد مہری سے کہا اور خالی گت تپائی پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں کے بعد چند ثانیے مجھے عجیب اور پُر سوچ نگاہوں سے سمجھتی رہیں۔ پھر جب بولیں تو مجھے ان کا لہجہ نہیں بلکہ ایک منتقم عورت کا محسوس ہوا۔

”نادر! ایک بات میری دھیان میں رکھنا..... میں اگر ایک ماں ہوں تو ایک زخم کھائی عورت بھی ہوں اور مجھے اپنا زخمی عورت والا روپ زیادہ عزیز ہے اور رہے گا۔ میرے شاطر اور دشمنوں نے پہلے میرے شوہر کا بے دردی سے قتل کیا اور پھر مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ ان کی چیرہ دستیوں میں کمی نہ آئی۔ اور اب انہوں نے میرے خلاف ایک اور گھناؤنی سازش

اس سوال پر میں نے خود کو فوراً سنبالنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”ہاں..... مگر یہ حملہ براہ راست نہ تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے گزشتہ شب کے خونی معرکے سے مختصر آگاہ کر دیا اور آخر میں بولا۔ ”تمہارے پیا اور نظر حیات نے اچانک وہاں پہنچ کر ہم پر حملے میں پہل کی تھی۔“

”اور تم ماں بیٹے نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی؟“ نگینہ نے تلخ لہجے میں گویا اپنے تئیں بات مکمل کر دی۔

میں نے بھی سپاٹ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تمہارا کیا مطلب تھا کہ ہم دونوں ماں بیٹا تمہارے پیا اور نظر حیات کے مسلح آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے؟“

میرے اس بچے تلے جواب پر نگینہ کو ایک لاجواب سی چپ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے دوسری طرف سے نگینہ کے بے اختیار سسک کر رونے کی آواز سنائی دی۔ میں پریشان ہو گیا اور بے اختیار بولا۔

”نگینہ! کیا ہوا؟..... تبت..... تم روری ہو؟“

”ہاں نادرا! میں روری ہوں..... کہ اب رونا ہی تو میرے مقدر میں لکھا ہے۔“ اس کی گلوگیر آواز ابھری اور میری پریشانی بڑھ گئی۔

”نادرا! میں..... میں آخر کب تک دو ہاتھوں کے درمیان پستی رہوں گی؟ میں..... میں آخر کب تک باپ اور محبوب کی سولی پر جھوٹی رہوں گی؟..... سولی پر چڑھنے والوں کو تو ایک ہی جھکے سے موت آ جاتی ہے۔ پھر..... پھر مجھے موت کیوں نہیں.....“

”خدا نہ کرے نگینہ! یہ..... یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟“ میں چیخ پڑا۔ ”آخر ہوا کیا ہے؟..... کچھ تو بتاؤ۔“

”نادرا! میں..... میں اور پیا..... خود چل کر..... تم سے اور تمہاری ماں سے معافی مانگنے آئے تھے نا؟“ اس کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا اور میں بکھر رہا تھا۔

”ہاں، ہاں۔“ بے اختیار میرے لرزیدہ لبوں سے نکلا۔

”اور..... اور پیا کو بھی..... اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا..... ہے نا..... وہ..... وہ مجھ سے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ..... اگر تم اور تمہاری ماں انہیں اپنے ہاتھوں سے سزا دینا چاہیں بھی تو ان خود کو تم دونوں کے سامنے سر جھکا کر حاضر کر دوں گا۔“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”مگر میں جانتی ہوں نادرا!“ نگینہ ہسٹریائی لہجے میں چلائی تو میں نے بھی تکی سے کہا۔

”تو پھر اس رات انہوں نے ہم ماں بیٹے پر کیوں قاتلانہ حملہ کیا تھا؟ اس لئے کہ تمہارا باپ شاہ میر کو تمہاری نگاہوں میں مجرم ثابت کر کے صبح کا بھولا بن جانا چاہتا تھا۔ تاکہ..... تاکہ ہم دونوں کی بت میں دراڑ ڈال سکے۔ میرے اور میری ماں کے بچے تو دراڑ پڑ ہی چکی ہے۔“

”خدا نہ کرے نادرا! کہ ہمارے پیار میں کوئی تلخ حائل ہو۔“ دفعۃً نگینہ نے یہ جملہ کہا اور جیسے میرا پورا فوڈر شار ہو گیا۔

”نگینہ! آخر تم بتاتی کیوں نہیں کہ.....“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ نگینہ میری بات کاٹ کر سسکتے ہوئے بولی۔ ”نادرا! پیا کا شمار زندوں میں نہ نہر دوں میں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے انکی ہوئی سانس تلے پوچھا۔

مختصر اُ بھی ذکر کیا ہو۔ اور کیا بھی ہوتا (جس کا مجھے بہر حال یقین نہ تھا) تو انہیں بھلا کیسے معلوم ہوا؟ ماں بیٹا انہیں مری اور تھیا گلی کے اس لالہ زار سنگم پر ملیں گے۔ یہ بات انکھن آمیز تھی۔

بہر طور اس وقت تو یہ دیکھنا تھا کہ طلوع سحر اپنے ساتھ کون سے رمز آشکار کرنا چاہتی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کوشش کے باوجود بیڈ پر دراز ہونے کے بعد نیند میری آنکھوں کو سوں دور تھی۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی ابھرا تھا کہ کیا مجھے اس وقت نگینہ سے رابطہ کرنا؟ تھا؟ میں نے بے اختیار دیوار گیر کھاک کی طرف دیکھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ میں اٹھا، موبائل نکال۔ یہ قول نگینہ کے اس کاموبائل خراب تھا اس لئے جب میں اس کے رہائشی ٹیلی فون نمبرز شیخ کرنے کچھ سوچ کر رک گیا۔

میرے اندر کسی نے چلا کر پوچھا۔ ”نادرا! تم نگینہ کو طلوع سحر سے پہلے کون سی خوش خبری سنا رہے ہو؟ اپنے اور اپنی ماں کے کارنامے کی؟..... یا پھر..... اس کے باپ کے انجام کی؟“

میں نمبر ملاتے ملاتے رک گیا۔

ابھی شاید نگینہ سے رابطہ کرنا قبل از وقت تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شاہ میر اور نظر حیات کا کیا ہوا تھا؟ کاش دونوں ہی جہنم واصل ہو چکے ہوں۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے لیکھت ایک لرزا دینے تشویش ناک خیال نے مجھے بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ماں نے مجھے جس امتحان میں ڈالا تھا، ابھی اس کا نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اور اگر شاہ میر اور نظر ہلاک ہو چکے تھے تو پھر ساری عمر میں ماں کے دل سے یہ غلط فہمی دور نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ اُ ذریعہ ہی نہ بچتا غلط فہمی دور کرنے کا۔ شاہ میر اور نظر حیات کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ایک نظروں کے سامنے اس کا بیٹا بھی جیتے جی مر جاتا اور میں ساری عمر شاید ماں کے دل سے یہ غلط فہمی کرنے میں ناکام ہی رہتا کہ وہ جو میرے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ سراسر غلط اور ایک ہولناک کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک پھانس ماں کے دل و دماغ میں میری طرف سے انک کر رہ جاتی جو مجھ درگور کر کے رکھ دیتی۔

بے اختیار میرا دل دشمنوں کی زندگی کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔

\*\*\*

میں نے وہ رات آنکھوں کے بجائے سولی پر کالی۔ اچانک فون کی کھنٹی بجی۔ میں بیڈ سے اتر کر رے نکلا۔ ماں شاید سو رہی تھیں۔ بڑھ کر ریسور میں نے ہی اٹھایا۔

”ہیلو! کون؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”نادرا!..... تم نے آخر پیا سے انتقام لے ہی لیا نا.....“ دوسری طرف سے نگینہ ابھری۔ گلوگیر اور جانکاہ آواز۔ جس میں شکایت بھی تھی اور ٹھگی بھی۔ محبت کی پاسداری کا درد بھی ا التجا کو ٹھکرا دینے کا کرب بھی۔ میری بے ترتیب سانس سنے میں ہی انک کر رہ گئیں۔ پھر بڑی سے میں نے اپنے شکستہ وجود کی طاقت کو زبان پر سمیٹا اور اتنا ہی بول سکا۔

”سک..... کیا ہوا؟“

”اوہ..... کیا ہوا؟ جیسے تم جانتے ہی نہیں۔“ نگینہ کے غم ناک لہجے میں طنز کی بڑی زہرا تھی۔ پھر جیسے وہ حقیقت جان لینے کے انداز میں دوبارہ بولی۔ ”کل رات..... تم نے اور تمہا نے..... پیا پر قاتلانہ حملہ کیا تھا؟“



”اونہیں جی! یہی نمبر ہے۔ میں نے خود دو مرتبہ بات کی تھی ٹھیکے دار رب نواز سے۔ لوجی، میں ابھی کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے وہی نمبر اپنے موبائل سے ملایا اور کان سے لگا لیا۔

”ہیلو جی! ٹھیکے دار رب نواز صاحب..... جی کڑا کے..... او جی نہیں، یہ میرا تکیہ کلام ہے۔ لیس جی، نادر صاحب سے بات کریں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے موبائل اپنے کان سے لگا دیا اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے وہی نسوانی اور پُرشوخ آواز ابھری۔

”اوہ..... تو گویا آپ کو میری آواز پسند آگئی ہے جو اب کسی اور موبائل کے ذریعے مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا ہے۔ ویسے میری آواز کے ساتھ میرے سینڈل بھی پیارے ہیں۔ اس کا نمبر بتاؤں؟“

میں نے بری طرح بوکھلا کر فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر فیجر مشتاق سے دھاڑ کر بولا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے فیجر! اس عمر میں تمہیں یہ شوخیاں زیب نہیں دیتیں۔“ فیجر مشتاق کی حالت دیدنی ہو گئی۔ وہ واقعی جی کڑا کے لرزتی آواز میں بولا۔

”جی..... جی کڑا کے..... سر جی! اوہ..... وہ.....“

”کیا وہ، وہ..... تم ہر بار وہی راگ نمبر ملارہے ہو۔“ میں نے آنکھیں نکال کر غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

”اونہیں جی! ابھی ابھی ٹھیکے دار رب نواز نے مجھ سے اپنی بھاری اور مردانہ آواز میں بات کی تھی، جی کڑا کے..... لائیے، میں دیکھتا ہوں دوبارہ۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ دوبارہ نمبر ملانے لگا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے غالباً مطلوبہ آواز سن کر بولا۔

”یہ کیا مذاق کر رہے ہیں آپ ٹھیکے دار جی! آپ بات کیوں نہیں کرتے نادر صاحب سے؟.....“

یہ لیس جی۔“ فیجر مشتاق نے ڈرتے ڈرتے اپنا موبائل پھر میری جانب بڑھایا اور میں نے موبائل اپنے کان سے لگاتے ہی ہیلو کہا۔

”بتائے دیتی ہوں۔ میری سینڈل کا نمبر نو ہے اور بہت تیزی سے سرگنجا کر کے رکھ دیتی ہے۔“

دوسری جانب سے پھر وہی پُرشوخ نسوانی آواز ابھری اور میں نے غصے سے چراغ پا ہو کر موبائل فیجر مشتاق کو پہنچا دیا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی ڈرا ہوا تھا لہذا موبائل باؤنسر کی طرح اس کی ناک پر لگا۔ اس کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

”نان سنس!..... دفع ہو جاؤ یہاں سے، گدھے!..... اٹو!“ میں چراغ پا ہو کر دھاڑا۔ فیجر مشتاق کی حالت دیکھنے والی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی گود میں گرے ہوئے موبائل کو اٹھایا۔ حیران پریشان سا اٹھ کر جانے لگا تو میں نے اسے آواز دی۔

”سنو.....!“

وہ رک گیا۔

”ٹھیکے دار رب نواز کے دفتر یا رہائش گاہ کا کوئی ٹیلی فون نمبر ہو گا تمہارے پاس؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بے چارہ ڈرتے ڈرتے منتناقی آواز میں بولا۔ ”ہے تو سہی..... تم..... مگر.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور میں اس کی ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بے اختیار ہنس دیا۔

”مجھے نمبر بتاؤ۔“

”اوی دو دن پہلے کا وعدہ تھا۔ آج چوتھا دن جا رہا ہے۔ ادھر رضوی صاحب نے بھی مقرر مال نہ ملنے پر سودا منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی ہے، جی کڑا کے۔“

”تو اس نے آخری تاریخ کون سی مقرر کی ہے اب؟“

”پرسوں دوپہر تک کی مہلت دی ہے۔“

”تو کل کا دن ہے ہمارے پاس..... ٹھیک ہے، میں کل ٹھیکے دار رب نواز سے بات کروا“

”اونہیں جی سر! اس سے آج ہی رابطہ کرنا پڑے گا۔ پورا ایک دن تو کٹائی اور فہمیر بنانے جائے گا۔ پھر دوڑوں میں لوڈ بھی کرانا ہے جی کڑا کے۔“

”تم ایسا کرو جی کڑا کے..... اونہہ.....“ میرے منہ سے بے اختیار اس کا تکیہ کلام گیا۔ کجخت بار بار جو اس لفظ کی گردان کر رہا تھا۔

”تم ایسا کرو کہ اسی وقت ٹھیکے دار رب نواز سے میری بات کراؤ۔ اس کے بعد رضوی سے کروانے کا کرایہ وغیرہ تم خود طے کر لیتا۔“

”بہت بہتر جی۔“ وہ ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھانے لگا۔

”موبائل نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“

”ہے جی..... مگر.....“

”اگر مگر چھوڑو..... مجھے اس کا نمبر بتاؤ۔ میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کو اور ساتھ ہی اپنی جیب سے موبائل بھی نکال لیا۔ پھر فیجر مشتاق نے مجھے ٹھیکیدار رب نواز کا نمبر موبائل پر پینچ کرنے کے بعد میں نے اپنا موبائل کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف رنگ جاری تھی اس کے بعد خلاف توقع ایک ہلکتی ہوئی زنانہ آواز ابھری۔

”ہیلو!..... کون؟“

میں ذرا گڑبڑا سا گیا اور گھور کر سامنے بیٹھے فیجر مشتاق کو دیکھا۔ اس کجخت نے شاید غلط نمبر ”کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے یا پھر میری آواز کے سحر میں کھو گئے ہو؟..... بولتے کیا کون ہیں آپ؟“ مجھے خاموش پا کر دوسری طرف پُرشوخ آواز مگر تند لہجے میں پوچھا گیا تو بات کرنا پڑی۔

”میں دراصل ٹھیکے دار رب نواز صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا مگر.....“ میں نے دانہ ادھورا چھوڑا تو دوسری طرف کھٹکھٹاتی ہوئی ہنسی کی آواز ابھری۔

”اوہ..... آئی سی۔ شاید راگ نمبر مل گیا ہے۔ لیکن کہیں آپ مجھ سے ڈر کر تو نہیں ہیں؟“ آواز میں تازگی اور لہجے میں پُرشوخ اٹھان تھی۔ تاہم میں اب گفتگو کو طول دینے کے تھا اور اول جلول فیجر مشتاق کی خبر لینے کی غرض سے بات ختم کرتے ہوئے اس طرح دار، دار والی لڑکی سے بولا۔

”آئی ایم سوری.....“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور فیجر مشتاق کی طرف گھوم کر بے وقوف!“

”کیا فون پر ہے، جی کڑا کے؟“ فیجر مشتاق نے اٹوؤں کی طرح دیدے پھاڑ کر مجھ سے ”فون کے نیچے! تم نے غلط نمبر دے دیا تھا۔ دوبارہ چیک کرو۔“ میں نے گھورتے ہوئے جھڑکا۔ وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے گڑبڑا کر بولا۔

اس نے نمبر بتایا۔ نمبر دفتر کا تھا۔ میں نے اپنے سامنے میز پر دھرے ٹیلی فون سیٹ سے نمبر ملایا۔ وہ ہیں موجود تھا۔

”ہیلو.....!“ اس کی بھاری آواز ابھری۔

”ٹھیکے دار رب نواز صاحب؟“ میں نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

”ہاں، ہاں..... بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟“ گھیر آواز میں کہا گیا۔

”مری ٹال سے نادر علی خان بات کر رہا ہوں۔“

”ہاں، بولیں۔ کیا بات ہے؟“ رکھائی سے پوچھا گیا۔

میں نے بھی سپاٹ لہجہ اختیار کیا اور جواباً اسی رعوت سے بولا۔ ”میرا منیجر بتا رہا تھا کہ آپ نے منٹ لینے کے باوجود ابھی تک شاہ بلوط کی دوسری کھپ نہیں بھیجی ہے؟“

دوسری طرف چند ٹاپے پر سوچ خاموشی طاری رہی اور پھر ٹھیکے دار رب نواز کی آواز ابھری۔

”ہاں..... بھیج دیں گے..... دو تین روز میں..... دراصل.....“

میں نے اس کی بات کاٹ کر قدرے سختی سے کہا۔ ”رب نواز صاحب! ہمیں مال آج ہی چاہئے ہمارا ایک پارٹی سے سو داؤن ہو چکا ہے۔ آپ کو یہ مال وعدے کے مطابق تین روز پہلے ہی بھیج دیا جائے تھا۔ اب تاخیر ممکن نہیں رہی۔ ہمیں لاکھوں کا نقصان ہو گا۔“

”میں آپ کی مجبوری سمجھ رہا ہوں۔“ دوسری طرف رب نواز کی آواز ابھری۔ ”دراصل ہم نے خود لکڑی ہزارہ سے منگوائی تھی..... بارشوں کی وجہ سے ٹرک پھنس کر رہ گئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟“

”کون سے علاقے میں ٹرک پھنسے ہیں آپ کے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ اس نے فوری جواب نہ دیا۔ چند ٹاپے کی پرسوج خاموشی کے بعد بولا۔ ”حویلیاں سے آتے ہو طوفانی بارشوں سے ایک ٹیل ڈھے گیا تھا۔“

”تو گویا ٹرک وہیں کھڑے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً۔“

”آپ نے ٹرک نکلوانے کے لئے کیا انتظامات کروائے ہیں؟“

”ظاہر ہے، اب ہاتھ پر ہاتھ دھرے تو ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ کچھ نہ کچھ تو کر ہی رہے ہیں۔“ وہ اہو کر بولا۔

میں اب کیا کہہ سکتا تھا۔ ناچار رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد رضوی صاحب سے بات کی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”جناب! معافی چاہتے ہیں..... بات دراصل یہ ہے کہ.....“

میں نے اسے مجبوری بتائی۔ میرا خیال تھا وہ ناک بھوں چڑھائے گا۔ مگر وہ خوش اخلاقی سے! ”تم نادر علی خان!..... مرحوم حیدر گل کے بھانجے تو نہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔

”اللہ بخشے حیدر گل کو۔ بڑا ہی نفیس اور بھلا مانس تھا۔ میرے اس سے محض کاروباری روابط ہی نہ بلکہ برادرانہ تعلقات بھی تھے۔ کوئی بات نہیں..... دراصل مجھے مال جلدی چاہئے تھا اور میں نے اسے اس لئے ملنے دیا۔ میں نے غصے میں آکر تمہارے منیجر کو سودا منسوخ کرنے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔“

وئم

ن روز کی تاخیر قابل برداشت ہو سکتی ہے۔“

مجھے وہ بڑا ہی نفیس انسان لگا۔ چنانچہ میں نے بھی انکار سے کہا۔ ”نہیں جی رضوی صاحب! یہ آپ کا بڑا پین ہے۔ درحقیقت قصور ہمارا بھی نہیں ہے۔ جس ٹھیکے دار نے ہمیں لکڑی سپلائی کرنا تھی، اس کے ایک حویلیاں میں تیز طوفانی بارشوں کے باعث پل ٹوٹنے سے وہیں پھنس کر رہ گئے ہیں۔“

”اوہ، اچھا..... ویسے کون سے ٹھیکے دار سے منگوائی ہے لکڑی؟“ رضوی صاحب نے پوچھا۔

”رب نواز سے۔“ میں نے بتایا۔

”رب نواز.....“ رضوی صاحب نے عجیب لہجے میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ایک نمبر کا چیئر ڈبی ہے۔ تمہارے ماموں حیدر گل نے تو اس سے سودے بازی ہی منسوخ کر رکھی تھی۔ تمہیں شاید نہیں معلوم، اس نے تمہارے ماموں کو ایک دفعہ دیمک زدہ لکڑی فراہم کر دی تھی اور صاف مگر گیا تھا۔“

”کیا.....؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

”ہاں۔ تمہارے منیجر مشتاق کو بھی اچھی طرح علم ہو گا۔ پورے ساٹھ لاکھ تمہارے ماموں سے وصول کرنے کے باوجود انہیں دیمک زدہ لکڑی دے ڈالی تھی۔ تمہارے ماموں بے چارے امن پسند آدمی تھے، اس بات کو کوڑا واگھونٹ سمجھ کر پی گئے۔ کیونکہ رب نواز کچھ اچھی شہرت کا آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو نڈے بھی پال رکھے ہیں۔ خیر، تم ڈرنا مت بیٹا!“

رضوی صاحب نے کہا اور میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ پھر گم صم سے لہجے میں ان کا شکریہ ادا کر کے ریسپور کرڈیل پر رکھتے ہوئے سامنے بیٹھے منیجر مشتاق کو گھورنے لگا۔ وہ اٹھ کر ٹھٹکے لگا۔

”بیٹھو!“ میں اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولا۔ ”رضوی صاحب بتا رہے تھے کہ اس مردود ٹھیکے دار رب نواز نے ہمیں کچھ عرصہ پہلے ساٹھ لاکھ کے عوض دیمک زدہ لکڑی دے دی تھی؟“

”نہیں..... جی لڑا کے۔“ وہ منمنائی آواز میں بولا تو میں غصے سے چلا کر بولا۔

”بھاڑ میں گیا تمہارا، جی کڑا کے..... ہاں یا نہ میں جواب دو۔“

”وہ..... وہ..... جی، یہ..... بہت پرانی بات ہو گئی۔ آپ کے ماموں حیدر گل نے معاملہ طے کر دیا تھا۔“ وہ جواباً ڈرتے ڈرتے بولا۔

میں نے اس کے چہرے سے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ لہذا گھورتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”کس طرح معاملہ طے کیا تھا ماموں نے؟“

”چھوڑیں سر جی! مٹی ڈالیں۔ یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے۔“ وہ بولا تو میں نے دانت کچکپا کر سے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں مٹی تمہاری قبر پر ڈالوں گا منیجر! اور وہ بھی زندہ تمہیں زمین میں گاڑ کر۔“ میری بات پر اس کے وقت سے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے اسے پرانی قبض کی تکلیف ہو۔

”جب تمہیں معلوم تھا کہ رب نواز نے پہلے بھی ہم سے دھوکا کیا تھا تو پھر تم نے اس سے دوبارہ کیوں کاروباری مراسم استوار رکھے؟“ اور ٹھیکے دار مر گئے تھے؟“

”سر جی! شاہ بلوط اور شیشم جیسی قیمتی لکڑی کی سپلائی کا واحد ٹھیکے دار رب نواز ہی ہے۔ اور پھر فوری طور پر یہی ہمیں مال دے سکتا تھا۔“ وہ منمنائی آواز میں بولا۔

”سے وقوف!“ میں دانت پیس کر بولا۔ ”اچھا اب مجھے یہ بتاؤ کہ ماموں حیدر گل نے ٹھیکے دار رب نواز سے رقم واپس لیا یا نہیں؟“

وہ سمجھ گیا کہ بات اب میرے کان میں پڑ چکی تھی لہذا بولا۔ ”نہیں جی! وہ حرام کا جتنا سارے ہرپ کر گیا تھا، جی کڑا کے۔“

”جی کڑا کے نہیں، بغیر ڈکار لئے۔“ میں نے دانت پیس کر گویا تصحیح کی۔

وہ مزید گھبرا گیا۔ ”آپ کے ماموں نے اس کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی تھی۔ مگر سوائے پیشیاں بھگتتے کے انہیں کچھ نہ ملا۔“

”تو اور ہماری عدالتوں میں کیا ہوتا ہے؟..... فریادی کو ہی جائز و ناجائز کیس بھگتنا پڑتا ہے میں تنگی سے بڑایا۔“ خیر..... اس کے دستاویزی ثبوت یا کوئی تفصیلات؟“

”جی ہاں۔“ اس نے سر ہلایا تو میں نے تھکنا نہ کہا۔

”کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میری ٹیبل پر پیش کرو۔“

میری بات پر وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ”سکس..... سر جی! وہ..... وہ رب نواز بڑا ڈاکہ خطرناک آدمی.....“

”تم اپنی کھال میں رہو۔ ورنہ مجھ سے اتروالو۔“ میں پڑٹش لہجے میں دھاڑا۔

”جی..... جی اچھا..... ابھی لایا۔“ وہ یکدم گھبرا کر اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں غصے کے مارے بری طرح پھنک رہا تھا۔ ٹھیکے دار رب نواز نے ماموں حیدر گل کے ساتھ،

لاکھ کا دھوکا کیا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تک نہیں تھا۔ درحقیقت اس میں ماموں حیدر گل کی بد

دعوت نہ تھا۔ وہ اپنے تئیں دغا باز رب نواز سے نمٹنے کی کوشش کرتے بھی رہے ہوں گے۔ مگر انہوں نے

گنیمت معاملہ اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ جس طرح شاہ میر اور نظر حیات کے سنگین معاملے سے مجھے

رکھے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ مجھے اب پورا یقین تھا کہ ٹھیکے دار رب نواز اس بار مجھ سے بھی فراڈ

چاہتا تھا اور اس نے یقیناً مجھ سے جھوٹ بولا ہوگا کہ اس کے ٹرک حویلیاں کے مضافات میں پھنس

گئے ہیں۔

میں سوچنے لگا کہ مجھے نہ صرف اس بات کی تصدیق کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانا پڑے گا بلکہ

لاکھ کی رقم بھی اس کے حلق میں ہاتھ ڈال کر نکلوانا پڑے گی۔ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔

گنگینہ کی گھی۔ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

”ہاں گنگینہ! کہو، خیریت تو ہے؟“ خیریت کہاں تھی، یہ تو رواروی میں میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

اُس کی پشمرہ آواز ابھری۔ ”نار! ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ مجھے پیا کو لے کر آنا

جانے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا (SPINAL CORD) حرام مغز متاثر ہوا ہے۔“ وہ غمزہ لہجے میں

میں پریشان ہو گیا۔

”نت..... تو پھر..... تم کیا کرو گی؟“ میں نے مرقش لہجے میں پوچھا۔

”نار! تم جانتے ہو کہ پیا کے سوا میرا اس دنیا میں اور کون ہے..... میں نے سیٹیں کنفرم

ہیں۔ آج شام کی فلائٹ سے میں اٹینس روانہ ہو رہی ہوں۔“

میں جامد ہو کر رہ گیا۔ گنگینہ کی غم ناک آواز میرے دل و جگر پر آرے چلا رہی تھی۔ پھر اپنے

رقت آمیز کیفیت پر قابو پا کر میں اس سے بولا تو مجھے اپنی آواز دل کے عمیق گوشوں سے ابھرنی

ہوئی۔ اس میں شکست خوردگی بھی تھی، غدا امت بھی اور درد آگیاں کک بھی۔

”گنگینہ! میں بری طرح پس رہا ہوں۔ میں تم سے محبت کا بھی دعوے دار ہوں اور تمہیں زخمی زخم

کر رہا ہوں۔ نن..... گنگینہ! یہ..... یہ کیا امتحان ہے؟..... یہ کیسی آزمائش ہے؟ کیا..... کیا

ہمیں ایک دوسرے کے دشمنوں کے گھر میں ہی پیدا ہونا تھا؟ کاش..... کاش گنگینہ! ہم ترائیوں میں آباد

کسی غریب کی جھونپڑی میں پیدا ہوتے۔“ میری آواز رندھ گئی۔ لہجہ لرزش زدہ تھا۔ ”گنگینہ! ام.....

مجھے معاف کر دو گی؟..... مم..... مجھے معاف کر دو گی نا؟“ میں رو پڑا۔

”نار! میں سمجھتی ہوں، تمہارا بھی کوئی دوش نہیں۔“ گنگینہ کی مہین آواز ابھری۔ ”مجھے تمہاری آزمائش،

تمہاری پوزیشن کا احساس ہے اور شاید تمہاری مجبوری سمجھنے کے لئے ہی تقدیر مجھے ایسی آزمائش سے گزار

رہی ہے۔ جہاں تم ایک ماں کے بیٹے ہو تو وہاں میں بھی ایک باپ کی بیٹی ہوں مگر..... میرا باپ تمہارا

اور تمہاری ماں کا بھرم ہے۔ یہ میں بھی سمجھتی ہوں۔ مگر..... مگر نار! بھی کبھی بس مجھے یہ بات اندر سے

بے چین کر دیتی ہے کہ ہم لوگوں کے روپوں میں یک، ایک دوسرے انسان کے لئے کیوں نہیں آتی؟ ہم

ایک دوسرے کو معاف کرنے کا حوصلہ کیوں نہیں رکھتے؟“

”گنگینہ! تم صحیح کہہ رہی ہو۔“ میں نے ماں کی طرف سے اس کا اشارہ سمجھ کر اعتراف کیا۔ ”مگر گنگینہ!

معافی بھی تو درپردہ اعتماد اور بھروسے پر مشروط ہوتی ہے۔ اگر تمہارا باپ شاہ میر سچے دل اور سچی نیت

سے اس روز تمہارے ساتھ ہم ماں بیٹے سے معافی مانگنے آیا تھا تو پھر اس نے نظر حیات جیسے کہینے کے

ساتھ مل کر ہم ماں بیٹے پر اس رات شب خون کیوں مارنے کی کوشش کی تھی؟“

میری اس بات پر گنگینہ نے پہلے کی طرح خاموشی اختیار کر لی اور پھر جیسے موضوع بدل کر بولی۔

”نار! میں پیا کو لے کر امریکہ جا رہی ہوں..... کیا میں تم سے اپنے پیا کی صحت یابی کے لئے

دعا کی درخواست کر سکتی ہوں؟“

میں اس کی بات پر خاموش رہا تو گنگینہ نے ہی شاید میری خاموشی بھانپ کر کہا۔ ”نار! میری محبت کی

قسم، جو مجھے تم سے ہے اور تاباں رہے گی کہ خداتم دونوں ماں بیٹے کو لمبی عمر دے کہ شاید میرے سچے دل

سے نکلے ہوئی دعا چلت جائے۔ اچھا، خدا حافظ!“

”گنگینہ! خدا تمہارا حامی و ناصر ہو..... خدا حافظ!“ میں نے بھی کپکپاتے لہجے میں کہا۔ اچانک

گنگینہ نے پوچھا۔

”تم مجھے سی آف کرنے آؤ گے؟“

”تم کیا کہتی ہو؟“

”تمہاری مرضی۔“

”تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو گنگینہ؟“

”ہرگز نہیں..... کیونکہ ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ کڑی آزمائش کے بل صراط سے ایک دوسرے کے

ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گزریں گے۔“

”اوہ، گنگینہ! آئی لو یو..... ایکسٹریملی آئی لو یو نوٹج۔“ میں نے سرت آگیاں لہجے کی

گہرائیوں سے کہا۔

”آئی لو یو۔“ گنگینہ نے بھی ایسے ہی لہجے میں کہا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔

ریسور رکھ کر میں نے تھکے تھکے انداز میں ریوالوگ جیپر کی چوڑی پشت گاہ سے کمر نکادی اور آنکھیں

موند لیں۔

”سر جی!..... یہ فائل۔“ منیجر مشتاق کی آواز پر میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔



کے مسئلے پر توجہ دینے کا ارادہ کیا۔

اس کے بعد میں اپنی جیب میں بیٹھ کر اسی وقت ٹھیکے دار رب نواز کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ غیر مشتاق سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس دعا باز ٹھیکے دار رب نواز کا دفتر تنہا گلی کی طرف جاتے ہوئے کھڈانہ چوک کے دائیں ”جھیکا گلی“ کی طرف تھا۔

چنانچہ کھڈانہ چوک پہنچ کر میں بغیر رکے دائیں جانب جھیکا گلی کو مڑ گیا۔ اب میں شاہ بلوط، صنوبر اور چیز کے گھٹے اور خوب صورت درختوں کے بیچ بل کھائی پختہ سڑک سے گزر رہا تھا۔

تقریباً چھ سات کلومیٹر تک خوبصورت ہوٹلوں کی قطار میں ایک عدد گالف کورس اور دیدہ زیب پارک سے گزرتا ہوا جب میں ”بھور بن“ جانے والے راستے پر آیا تو دائیں جانب مجھے ایک خاصے وسیع و عریض سرسبز سطح قطعہ اراضی پر سفید رنگ کی عمارتی لکڑی کے دفاتر نظر آئے۔

میں اپنے مطلوبہ دفتر کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ جیب سے اتر کر میں احاطے پر بنے گیٹ پر پہنچا تو ایک چوکیدار نے مجھے بتایا کہ رب نواز اپنے گھر جا چکا تھا۔

میں نے اپنی رستہ آج میں وقت دیکھا۔ ابھی دن کے گیارہ ہی بجے تھے۔ پھر چوکیدار کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔ ”تمہارے صاحب اتنی جلدی گھر چلے گئے؟“

”جی ہاں..... آج انہیں گھر پر ضروری کام تھا۔“ چوکیدار نے سپاٹ لہجہ میں کہا۔

مجھے رب نواز کی رہائش گاہ کا پتہ معلوم تھا۔ میں واپس لوٹ کر اپنی جیب میں آ بیٹھا۔ چند ثانیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ مجھے آج ہر حالت میں اس دعا باز ٹھیکے دار سے ملنا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے گھر پر ہی ملاقات کرنے کی کھانی اور جیب اسٹارٹ کر کے ریورس لے گیا۔ اس کی رہائش گاہ پاڑیاں سے خیرہ گل میں چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔

میں جیب دوڑاتا ہوا خیرہ گل جا پہنچا۔

ٹھیکے دار رب نواز کی کوٹھی دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ نسبتاً بلند اور آبادی سے ہٹ کر ایک وسیع قطعہ اراضی پر واقع تھی۔ کوٹھی اگرچہ ایک منزل پر ہی مشتمل تھی مگر اس کا رقبہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مجھے دور سے ہی کوٹھی کی پیشانی پر درج تلی حروف میں ”کاشانہ پلس“ نظر آ گیا تھا۔ میں ابھی جیب میں بیٹھا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے تفصیلی جائزہ لے رہا تھا اور دانت پیس کر دعا باز ٹھیکے دار رب نواز کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ضرور اس مردود اور دھوکے باز انسان نے اپنی زندگی بہرا پھیری کے سہارے ہی گزاری ہے۔ ورنہ میں نے کسی لکڑی کے ٹھیکے دار کو یوں مطراق اور شاہانہ زندگی بسر کرتے ہوئے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

میں نے گیٹ پر پہنچ کر جیب روک دی۔ وہاں دو گن مین چوکس کھڑے نظر آئے۔ میں نے ایک سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میرا نام نادر علی خان ہے۔ اور میں رب نواز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

دونوں دروازہ قامت تھے اور ہلکے نیلے رنگ کی مخصوص وردی میں ملبوس تھے۔

”کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟“ اس نے جواباً پوچھا۔

”مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ میں ان کے دفتر بھی گیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ آج جلد ہی اپنے گھر جا چکے ہیں۔“ میں نے کہا۔

دونوں نے بہ غور میرا جائزہ لیا۔ پھر دوسرے نے کہا۔ ”صاحب کی آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ آرام کر رہے ہیں۔ آپ کسی اور وقت آ جانا۔“

وہ فائل میرے سامنے لئے کھڑا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تو اس نے فائل میری طرف بڑھا میں نے ایک گہری سانس لی۔ نگینے سے گفتگو کے بعد میرے دل و دماغ پر قنوطیت سی چھانے لگی۔ امریکہ جانا مجھے گہرے فکرمیں مبتلا کئے ہوئے تھا۔ لیکن میں اسے روک بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنے کے علاج کی غرض سے جا رہی تھی۔ اس لئے میری طبیعت بوہل سی ہو رہی تھی۔ میں نے فائل کھولے بغیر میز پر رکھ دی اور غیر مشتاق سے چائے کا کہا۔

اس نے فوراً چائے منگوا لی۔ ایک کپ میری جانب بڑھایا۔ میں نے ایک چسکی بھری اور ایک ہسکاری لی۔ غیر مشتاق بہ غور میرے چہرے کو سنے جا رہا تھا۔ میرے چہرے کے تھکے تھکے، فکر مندانا کی وجہ کو اپنے تئیں بھانپ کر بولا۔

”سرسجی! اس مسئلے کی وجہ سے اللہ بخشے آپ کے ماموں مرحوم بھی بڑے پریشان رہتے تھے۔۔۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے جی، دینے کریں اس پرانے مسئلے کو۔ کیوں کڑے مردے اکھاڑ کر مزید پریشان رہے ہیں؟“

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور جھڑک کر بولا۔ ”تم اپنی چونچ بند رکھو۔“

میری بات پر اس نے یکدم ایک ہاتھ سے اپنے ہونٹوں کو چھوا۔ گویا اسے ڈر ہو کہ کہیں واقعی چونچ تو نہیں ابھر آئی۔ مجھے اس کی اس حرکت پر ہنسی تو آئی۔ تاہم میں نے ضبط کرتے ہوئے فاقہ جانب ہاتھ بڑھایا۔

اس میں چند کاغذات تھیں تھے۔ میں بہ غور ان کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ ٹھیکے دار رب کی ماموں حیدر گل سے دعا بازی والا معاملہ زیادہ رانا نہ تھا، ان کی موت سے صرف دو ایک ماہ پہلے کی بات تھی۔ اور عدالت سے بھی رجوع کیا گیا تھا مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کیس داخل ڈاکہ چکا تھا یا پھر خارج کر کے رب نواز کے حق میں فیصلہ ہو گیا تھا۔ ایک کاغذ میں ٹھیکے دار رب نواز کی رہائش گاہ اور دفتر کے نوٹ نمبر بھی درج تھے۔ موبائل نمبر بھی تھا اور مکمل ایڈریس بھی۔ میں نے یہ سب نشیں کئے تو موبائل نمبر پر میں چونکا۔ یہ واقعی درست تھا، جو غیر مشتاق نے مجھے دیا تھا۔ مگر میرے ما پر ہر بار اس شوخ لڑکی کا رانگ نمبر مل جاتا تھا۔

میری پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ ”نمبر تو وہی ہے..... پھر کیوں رانگ نمبر لگ رہا تھا؟“ گوگو انداز میں بڑبڑاتا ہوا غیر مشتاق میرے بڑبڑانے کا مطلب سمجھتے ہوئے بہ یک جنبش بولا۔

”دیکھا سر جی! آپ بلاوجہ مجھے ڈانٹ رہے تھے۔ یہی رب نواز کا موبائل نمبر تھا۔“

”ہاں، ہے تو یہی۔“ میں پڑ سوچ لہجہ میں تائیداً بولا۔ ”تو پھر..... ہر بار لڑکی کی کیوں آ رہی تھی؟ حالانکہ یہ قول تمہارے، تم نے رب نواز کی آواز بھی سنی تھی اور دوبارہ موبائل میری جانب آ تو پھر اس لڑکی کی آواز مجھے سنائی دی تھی۔“

”میں خود پریشان ہوں سر جی!“ وہ بولا۔ ”سرسجی! مجھے تو لگتا ہے رب نواز ہی آپ کو ٹالنے کی لڑکی کی آواز میں بول رہا ہوگا۔“

”نہیں..... یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ خیر، بھاڑ میں ڈالو۔“ میں نے بیزار ہو کر کہا پھر اس معاملے کی ساری تفصیل پوچھنے لگا۔ اس کے بعد میں نے ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ فوری طور پر، سب پہلے یہ قول رب نواز کے اس کے تین ٹک حویلیوں کے قریب اچانک پل ٹوٹ جانے کی وجہ سے آ رہے گئے تھے، میں اس کی تصدیق کر کے یہ معاملہ حل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد ساٹھ لاکھ والے دھوکا

میری ”راگ نمبر“ والی آواز پہچان جائے۔ اور وہی ہوا، وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے پہلے تو اپنا خوب صورت لب والا دہانہ کھولے، دلش نیلی آنکھیں پھاڑے مجھے ہلکی رہی، پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔

اس نے اُڑی اُڑی رنگ کی انتہائی ٹائٹ جینز اور اس پر چسٹ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں کورٹ شوز تھے۔ وہ اب کار سے اتر کر جیسے گھورنے کی حد تک میرا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ میں نے اپنے لیے چوڑے وجود پر لفافہ ٹائپ براؤن جینز اور اوپر ہاف دھاری دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال میرے ہمیشہ سی ہو لجر کٹ کے رہتے تھے۔ میں پورے قد کے ساتھ سانسے چیز کے درخت کی طرح کھڑا تھا اور وہ پیری کے بیڑ کی طرح اپنے پورے نشیب و فراز کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں از حد دلچسپی اور ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ہلکوارے لے رہی تھی۔

”ہائے، میرا نام کا شانہ ہے۔“ اس نے مترنم آواز میں کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے بھی ہولے سے مسکرا کر مصافحے کے انداز میں اس کا نرم و گداز ہاتھ تھاما اور ایک بار پھر اپنا نام بتایا۔ ”کا شانہ“ کے نام پر بے اختیار میری نگاہوں کے سامنے کونھی کا نام ”کا شانہ پیلس“ رقصاں ہو گیا اور ایک بار پھر ایک اندازے کے تحت میں اُنھن میں مبتلا ہو گیا کہ یہ کونھی اس کے نام سے منسوب تھی۔ ہو سکتا تھا، یہ رب نواز کی دختر نیک اختر ہی ہو۔ اگرچہ تھوڑی دیر پہلے اس نے عجیب انداز میں اپنے باپ کا نام لیا تھا۔

”آپ کو کس سلسلے میں رب نواز سے ملنا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”ایک کاروباری سلسلے میں ان سے بات کرنا تھی۔ موبائل پر غالباً.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ شرارت بھری مسکراہٹ سے بولی۔

”سوری! وہ میری ہی شرارت تھی۔ راگ نمبر نہیں تھا۔“

”اچھا..... پھر تو آپ نے میرے منجبر مشتاق بے چارے کو اچھی خاصی جھجھا پلوا دی مجھ سے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بار بار راگ نمبر ملتا رہا تھا۔“

”آپ اندر تشریف لائیں..... پلیز!“ وہ اچانک بولی۔ اس کے ”پلیز“ کہنے میں بے تابانہ اشتیاق جھلکتی تھی۔

”میں اپنی جیب اندر لے آؤں؟“ میں نے اپنی جیب کی طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ پھر اس کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ اندر ایک جانب ڈبل کیمین پک اپ بھی کھڑی تھی۔ ہم وہیں لان میں پیچھے کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

”آپ کیا لیں گے؟“ یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کی چین کے کسی بٹن کو پیش کیا تو اندر کونھی کے کسی گوشے میں کوئل کی آواز ابھری۔ یہ ریوٹ کنٹرول تیل تھی، کسی ملازم کو متوجہ کرنے کے لئے۔ نتیجے میں ایک سانولی سی، کچی عمر کی عورت نمودار ہوئی۔

”کافی پلا دیں۔“ میں نے بلا تکلف کہا۔

”کافی لے آؤ۔“ کا شانہ نے اس سے کہا۔ ملازمہ خاموشی سے لوٹ گئی۔

”ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”جی.....؟“ وہ بھرپور معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

”راگ نمبر والی بات پر میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔ جب میرا منجبر ملتا رہا تھا تو رب نواز صاحب

میں سمجھ گیا کہ دونوں ہی جھوٹے تھے، اپنے صاحب کی طرح۔ یعنی دفتر کا چوکیدار اور گھر کا چوکیدار اُس نے مجھ سے کہا کہ رب نواز کو گھر پر ضروری کام تھا اور یہ کہہ رہے تھے کہ اس کی طبیعت خراب تھی میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دیکھیں..... میں مری سے آیا ہوں اور ان سے ضروری بات کرنی ہے۔ اس بہانے ان مزاج پر سی بھی کر لوں گا۔ میرے ان سے کاروباری روابط کے علاوہ دوستانہ تعلقات بھی ہیں۔“

دونوں کچھ سوچنے لگے۔ پھر ایک نے کہا۔ ”آپ کے پاس ان کا موبائل نمبر تو ہو گا ہی۔ کیا آپ نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا؟“

”ان کا موبائل شاید آف ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے مجھ سے کہا۔ ”پھر تو آپ کا ان سے ملنا مشکل ہے آپ ایسا کریں، پھر کل ان سے دفتر میں ہی ملاقات کر لیجئے گا۔ ہم مجبور ہیں۔“

میں ہونٹ پیچھے چند تانے کچھ سوچتا رہا۔ پھر میں نے رب نواز سے موبائل پر رابطہ کرنے کا ارادہ اور ابھی میں اپنی جیب سے موبائل نکالنے ہی لگا تھا کہ اچانک عقب سے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز ابھری اور ساتھ ہی ایک چوکیدار نے مجھ سے کہا۔

”آپ ذرا ایک طرف ہو جائیں۔ چھوٹی بی بی کی گاڑی آ رہی ہے۔“

میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ایک نئے ماڈل کی چمچاتی کروڑا رنگتی ہوئی آ رہی تھی۔ چوکیداروں گیٹ کھول دیا تھا اور دائیں بائیں دست بستہ مودبانہ کھڑے ہو گئے۔

میری نظریں کار پر پڑیں۔ ایک خوش جمال، پری وٹ چہرہ نظر آیا۔ رنگت گوری تھی، بال ہوائے کر تھے، آنکھوں پر ”رے بن“ چشمہ تھا۔ خاصی الزما ماڈرن اور جوان لڑکی نظر آتی تھی۔ بالوں کا رنگ براؤن تھا یا پھر ڈائی کئے ہوئے تھے۔

اس نے میری طرف دیکھا تھا، پھر کار اندر لے جانے کی بجائے اس نے گیٹ پر ہی روک دی تھی ایک چوکیدار چالی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور گوئی کی طرح اس کی طرف بڑھا۔

”کون ہے یہ؟“ لڑکی نے چوکیدار سے بڑی سریلی آواز میں پوچھا۔ مگر میں اس مترنم آواز پر ہرما طرح چونکا تھا۔ یہ وہی کھنکٹی اور شوخ و شنگ آواز تھی۔ مجھے یاد آیا تھا، جب میں رب نواز سے موبائل رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو راگ نمبر مل جاتا اور یہی کھنکٹی ہوئی آواز میرا استقبال کرتی۔ مجھے شدید حیرت ہوئی۔ میں قریب ہی کھڑا تھا۔ چوکیدار جواباً مودبانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”بی بی جی! وہ..... وہ دراصل صاحب سے ملنا چاہتے تھے۔“

لڑکی نے پھر میری طرف دیکھا اور عینک اوپر کر دی۔ اس کی آنکھیں پر کشش اور ہلکی نیلاہٹ مائل تھیں۔ اچھی طرح مجھے بغور دیکھنے کے بعد وہ اسی باادب کھڑے چوکیدار سے بولی۔

”مگر رب نواز تو گھر پر نہیں ہے۔ یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

اس کے اندازِ مخاطب پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں اسے رب نواز کی بیٹی سمجھا تھا۔ مگر یہ اس کا یوں تا لے رہی تھی جیسے وہ کوئی معمولی ملازم ہو۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”میرا نام نادر علی خان ہے..... اور میں ٹھیکے دار رب نواز سے ملنے پہلے دفتر ہی گیا تھا۔ مگر وہاں چوکیدار نے مجھے بتایا کہ وہ گھر جا چکے ہیں اس لئے میں یہاں آیا تو یہ دونوں حضرات فرما رہے ہیں کہ وہ اندر موجود ہیں مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ میں نے دانستہ لب کشائی کی تھی تاکہ میری طرح وہ بھی

سے سفید جھوٹ بولا تھا۔ درحقیقت وہ تینوں ٹرک کہیں نہیں بھنے ہیں۔ وہ سارے گودام میں ہی کھڑے ہیں۔ کسی پارٹی نے منہ مانگے داموں ان کا سودا کیا تھا، وہ وہیں سپلائی کرنے والا تھا۔ بلکہ آج دوپہر تک وہیں پہنچا دئے جائیں گے۔“

مجھے اس کی بات سن کر رب نواز کے جھوٹ، فریب پر بری طرح طیش آیا۔

”لیکن..... ان پر ہمارا حق پہلے بنتا ہے۔ میں اس کی پے منٹ کر چکا ہوں۔ اگلی پارٹی سے میرا سودا منسوخ ہو جائے گا اور ہمیں لاکھوں کا نقصان ہو جائے گا۔“ میں نے کاشانہ سے کہا۔

”آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں؟ میں جو بیٹھی ہوں، رب نواز کے سینے پر مونگ دلنے کے لئے۔ ابھی دیکھو تیار تھا۔“ اس نے یہ کہہ کر اپنے سیل فون پر کسی کے نمبر سچ کئے اور پھر جیسے ہی دوسری جانب سے کسی کی آواز ابھری، کاشانہ نے فوراً اپنا دوسرا موبائل نکال کر اپنے سوتیلے باپ کا ایک ریکارڈ شدہ جملہ منتخب کیا اور پہلے والے موبائل کے بالکل قریب کرتے ہوئے ایک مٹن پیش کر دیا۔

”گنگل خان! گودام نمبر تین اے میں جو ٹرک کھڑے ہیں، وہ مری ٹال والوں کو اسی وقت روانہ کر دو۔ ہاں، ہاں..... وہیں حیدر گل والے ٹال میں۔“ اس کے بعد کاشانہ نے دونوں موبائل آف کر دیئے۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”بھلا یہ جملہ تم نے کب اور کیسے فیڈ کر لیا تھا؟“ میں نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔

اس کے لبوں پر اسرار بھری شاطرانہ مسکراہٹ ابھری اور پھر الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔ ”یہ وہی ٹال ہے نا، جہاں حیدر گل ہوتا تھا؟“

”ہاں..... وہ میرے ماموں تھے۔ مگر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اوہ..... دیری سیڈ!“ وہ متاسفانہ لہجے میں بولی۔ پھر بتانے لگی کہ یہ جملہ اس نے اس وقت اپنے موبائل پر ریکارڈ کیا تھا جب وہ میرے ماموں حیدر گل کے ساتھ لاکھ ہڑپ کرنے کے بعد ان کی طرف دیمک زدہ لکڑی کا ٹرک روانہ کرنے کے لئے اپنے گودام کیپر گنگل خان کو حکم دے رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک گہری ہکاری خارج کر کے مجھ سے بولی۔

”تو گویا آپ حیدر گل کے بھانجے ہیں۔ میں سمجھتی تھی آپ وہاں کام کرتے ہیں۔ خیر، اب آپ کے مطلوبہ ٹرک آپ کے ٹال تک پہنچ جائیں گے۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”دیے کیا آپ بھی..... اپنے چپا..... میرا مطلب ہے رب نواز کے دفتر۔“

”ہاں، میں بھی دفتر میں بیٹھتی ہوں۔ بلکہ وہ میرے باپ کا ہی کاروبار ہے، جس پر رب نواز نے قبضہ ہمارکھا ہے۔“ وہ میری بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں بولی۔

میں نے پھر بھی اس سے ذرا شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ ”کاشانہ صاحبہ! ویسے میرا دل تو نہیں مان رہا اس طرح کی حرکت کرنے کو لیکن.....“

”نادر صاحب! آپ کس دنیا میں رہتے ہو؟ اس سادگی کی وجہ سے تو آپ کے ماموں مرحوم نے رب نواز سے دھوکا کھایا تھا۔“ وہ بولی۔ ”زہر کو زہری کا شائبہ۔ آپ کا کام ہو گیا۔ یہ آپ کا حق ہے۔ چاہے جس طریقے سے ہو۔“

”میں ایک بار پھر آپ کی غیر معمولی ذہانت کا اعتراف کرتے ہوئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ میں نے تہہ دل سے اس ذہین وطن پریش کا شکریہ ادا کیا۔

بول رہے تھے اور جب وہ میری طرف موبائل بڑھاتا تو آپ کی آواز آتی تھی۔ کیا شرارت میں آپ چپا بھی شامل تھے؟“

”چپا؟..... کس کے چپا؟..... کون سے چپا؟“ وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔ اس کی ا کرنے کا انداز بھی نرالا تھا۔

”کیا رب نواز صاحب آپ کے چپا نہیں ہیں؟“

”وہ میری ماما کے شوہر ہیں، میرے چپا نہیں۔“ اس نے کسی قدر ہمتی سے کہا۔

”اوہ..... میں سمجھ گیا۔ غالباً وہ آپ کے اسٹیپ فادر یعنی سوتیلے باپ ہیں۔“

”چھوڑیں اس بات کو۔ آپ شرارت والی بات پوچھ رہے تھے؟“ اس نے یاد دلایا۔

”جی۔“ میں نے ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”درحقیقت میں رب نواز کو تنگ کرنے اور دق کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اکثر ان کے موبائل کی ”سم“ چرائیتی ہوں اور اپنے موبائل میں لگا کر ان کے کسٹمز کو تنگ کرتی ہوں۔ لیکن..... میرے نیجر کو رب نواز کی بھی آواز سنائی دی تھی۔ مگر جب اس نے میرے

موبائل بڑھایا تو ایک دم آپ کی آواز ابھری۔ یہ کیا معاملہ تھا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”ابھی بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے اپنی چکیلی کمر کو قیامت خیز خم دیا اور قیمت موبائل سیٹ نکال کر ایک مٹن پیش کیا۔ موبائل سے رب نواز کی ریکارڈ شدہ آوازوں کے

نشر ہو رہے تھے۔ مثلاً..... ہاں، میں رب نواز بات کر رہا ہوں۔..... ”آئی ایم سوری! کر دو..... جہاں یہ کہہ رہے ہیں وہاں مال پہنچا دو، وغیرہ۔“

اس نے مٹن آف کر دیا۔ میں ہنس پڑا۔ ”آپ تو اس طرح خاصی تنگ کرتی ہوں گی رب میں نے جیسے اسے شدہ دیتے ہوئے کہا۔“

دراصل ان دونوں کے سوتیلے پن والی حقیقت میرے لئے سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔ بالخصوص کے ان چند (TYPICAL) انداز کے جملوں نے میرے ذہن رسا کو دودھ رنگ سوچنے کی راہ بھائی

میں اب کاشانہ کی شخصیت میں اس حوالے سے اس غیر معمولی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس فریبی اور دھوکے باز ٹھیکے دار رب نواز کے گھر کی میرے لئے ایک ایسی بھیدی ثابت ہو سکتی

کی لٹکا ڈھاسکتا تھا۔

”چلیں، یہ تو مذاق ہوا۔ کیا آپ بتائیں گی کہ رب نواز کہاں ہو گا اس وقت؟“ بالآخر میں موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دفتر میں ہیں نہ گھر پر۔ اپنے کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں۔ جواہر بولی، پھر آخر میں مستفسر ہوئی۔ ”آپ کو کس سلسلے میں ملنا تھا ان سے؟“

اس کی بات پر میں نے پہلے ایک گہری سانس لی۔ میں نے اسے اس کے سوتیلے باپ کے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ مگر پہلے مال کی دوسری کھپ وقت مقررہ پر نہ پہنچانے کی شکایت

ہوئے ساری بات بتا دی۔

”ایک نمبر کا فراڈیا اور چپڑ ہے یہ رب نواز..... اس نے بہت سے لوگوں کے ساتھ دھوکا

کی ہے۔ خیر.....“ وہ رک کر بولی۔ ”رب نواز جھوٹ بولتا ہے، اس کے کوئی ٹرک جو بلیاں

پر نہیں بھنے ہیں۔ جس وقت آپ نے ان کے دفتر فون کیا تھا، میں بھی وہاں موجود تھی۔ اس

اس دوران ملازمہ ایک ٹرے میں کافی لے آئی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔ کاشانہ نے میرا مسئلہ چٹکی بجاتے ہی حل کر ڈالا تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے فیجر مشتاق سے ہار رابطہ کر کے اسے چند ضروری ہدایات دے ڈالیں۔

کاشانہ ایک جینکس لڑکی ثابت ہوئی۔ بلکہ خطرناک حد تک جینکس۔ اس کی غیر معمولی ذہانت نے جتنی حیران کن تھی، اتنی ہی عجیب و غریب بھی۔ شکر تھا کہ وہ اپنی خطرناک ذہانت کو مثبت انداز استعمال کر رہی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ کاشانہ ایک ٹک اور بڑے غور سے میرے چہرے کو رہی تھی۔ اس کا یہ انداز بڑا بے باکانہ تھا جبکہ مجھے اس سے بار بار نظریں چراتا پڑ رہی تھیں۔

”آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں گے؟ میرا مطلب ہے، آپ رہتے کہاں ہیں؟“ معا اس سے پوچھا۔ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لینے کے بعد کپ میز پر رکھا اور مختصر اپنے بارے میں بتا دیا۔ ”گویا ہماری طرح آپ کی بھی فیملی مختصر ہے۔“ وہ بولی تو میں نے اس سے رخصت چاہی۔ ہو گیا تھا۔ رب نواز سے ملنے کا اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ البتہ دوبارہ بہت جلد ملاقات کا متنی ضرور تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں اب چلوں گا۔ آپ سے دوبارہ ملاقات اب دفتر میں ہوگی۔“ وہ بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”کون سے دفتر میں؟“

”ظاہر ہے، آپ ہی کے دفتر میں ہوگی۔ ساتھ لاکھ والا معاملہ بھی تو حل کرنا ہے مجھے۔ اس سے رب نواز سے دو تین روز میں ملنے والا ہوں۔ ویسے.....“ میں اچانک کچھ کہتے کہتے رکھا، پھر کر بولا۔ ”اس گنیمت معاملے کے سلسلے میں بھی شاید مجھے آپ کے مشورے کے مطابق ہی کوئی فیما چاہئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

میری بات پر وہ دلکشین نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے پاس اس معاملہ کی بہت دستاویزی تفصیل تو ہوگی جو آپ کے ماموں حیدر گل اور رب نواز کے درمیان طے پا چکی ہوں۔ بالکل ہے۔“ میں نے برجستہ کہا۔

”میرا خیال ہے میں بھی آپ کے دفتر کا چکر لگاؤں۔ اور پھر وہیں ایک نشست میں کوئی اٹل کر لیں گے۔“

میں اس کی فراخ دلانہ پیشکش پر مسرور ہو گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ رب نواز جیسے دھوکے فریبی انسان سے نمٹنے کے لئے اتفاقاً ہی کاشانہ کی صورت میں ایک فوری اور سودمند شارٹ کٹ ملا۔ اور میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہذا میں نے انتہائی خلوص سے کہا۔

”کاشانہ صاحب! میں آپ کا پہلے ہی نہایت شکر گزار ہوں۔ تاہم مجھے بے حد خوشی ہوگی میرے غریب خانے پر تشریف لائیں تاکہ میں بھی آپ کو وہ تفصیلات دکھا کر مطمئن کر سکوں کہ آپ مسئلہ بھی جائزہ لگے۔“

”میں سب جانتی ہوں اور میں نے آپ کے ماموں حیدر گل سے بھی ان دنوں رابطہ کیا بولی۔ ”میں نے انہیں بھی یہی مشورہ.....“

وہ اچانک رکی۔ شاید اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مضطربانہ رقع ابھری اور کہا۔ ”چلیں ٹھیک ہے، میں وہیں آکر آپ سے تفصیلی گفتگو کر لوں گی۔ اس وقت اگر

آ گیا تو آپ کو یہاں پا کر بہت کچھ سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ پھر شاید میں بھی اسے ڈانچ نہ دے سکوں۔“ میں اس کی بات کا اشارہ سمجھ گیا اور واپس لوٹ آیا۔

\*\*\*

میں اپنے مال پہنچا تو فیجر مشتاق کی باچھیں خوشی کے مارے کانوں کی لوؤں تک کھچی ہوئی تھیں۔ ”آپ..... آپ نے تو کمال کر دیا سرجی! ادھر آپ گئے، ادھر مال آ گیا۔ میں نے تو چیرنے کے لئے بھی بھیج دیا، جی کڑا کے۔“ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنے مخصوص تکیہ کلام کے ساتھ خوشی سے بولا۔

”جی کڑا کے، کیوں؟ خوشی سے کیوں نہیں؟“ میں بھی ذرا موڈ میں آ گیا۔ ”اوجی، خوشی سے ہی۔ یہ تو ایسے ہی تکیہ کلام ہے۔“ وہ جھپٹی ہوئی مسکراہٹ سے بولا۔ وہ بغیر قدغن کے اپنا تکیہ کلام فٹ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

”وہیے سرجی! کیا رب نواز اتنا ہی تمہارے دلا ثابت ہوا تھا کہ آپ کو دیکھتے ہی اس پر ایسی دہشت سوار ہو گئی کہ فوراً مال بھیج دیا۔“ وہ حیرت سے بولا۔

میں اپنے آنکس روم میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے تحیر آمیز استفسار پر میرے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ یہ اس کے راگ نبر کا کمال تھا یا پھر حسن اتفاق۔ مگر وہ ذرا احق شخص تھا اس لئے ابھی میں اس سے رب نواز کی سوتیلی بیٹی کاشانہ کے سلسلے میں ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ فوراً خام مال چروا کر رضوی صاحب کو روانہ کر دے۔ نیز آئندہ وہ کبھی بھی رب نواز جیسے دھوکے باز شخص سے کوئی کاروباری ڈیل نہ کرے، وغیرہ۔

مجھے رب نواز کے اس جھوٹ پر شدید غصہ آ رہا تھا کہ اس کے ٹک ہزارہ سے آتے ہوئے حویلیاں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ جبکہ بہ قول کاشانہ کے یہ اس نے میرے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ مجھ سے کئے گئے شاہ بلوط کی لکڑی کے طے شدہ سودے کا مال وہ کسی اور پارٹی کو دینا چاہتا تھا۔

اب میں سنجیدگی کے ساتھ اپنی ساتھ لاکھ کی خطیر رقم رب نواز کے حلق سے نکلوانا چاہتا تھا جو خاصا مشکل کام تھا مگر ناممکن نہیں۔ اور پھر کاشانہ کے اچانک درمیان میں آنے سے مجھے ایک راہ بھائی دی تھی۔ کاشانہ سے مل کر میں نے اس کے بارے میں اندازہ قائم کیا تھا کہ وہی اس گنیمت معاملے میں میری مدد کر سکتی تھی۔ کیونکہ رب نواز اور کاشانہ کے درمیان نفرت کی جو فطری خلیج حائل تھی، مجھے اس سے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ وہ میرے لئے دھوکے باز رب نواز کے گھر کا بھیدی ثابت ہو رہی تھی۔ اور میں اس کے ریلے رب نواز کی لٹکا ڈھا دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہ تھا کہ میرا مقصد ناجائز تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کاشانہ بھی اپنے سوتیلے باپ کی دھوکا دہی والی فتنہ فطرت سے آگاہ تھی اور میرے سٹکے کو جائز سمجھتی تھی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ بہ قول اس کے وہ اپنے سوتیلے باپ کے سینے پر مونگ ل رہی تھی اور اسے زچ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتی تھی۔ اس میں ممکن تھا اس کا بھی کوئی اپنا ذاتی مفاد شامل ہو جو یقیناً گھریلو نوعیت کے جھگڑوں کا ہی نتیجہ تھا۔

بہر طور میرا فوری طور پر ایک مسئلہ تو حل ہو چکا تھا۔ میں اب نگینہ کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اس کا نمبر ملا یا۔

”ہیلو نگینہ!..... کیا صورت حال ہے؟“

”سب کچھ دیا ہی ہے..... میں پینگنگ کر رہی ہوں۔“ اس کی ہر مردہ آواز ابھری۔ ”نگینہ! امریکہ میں تمہارا کوئی جاننے والا نہیں؟..... میرا مطلب کوئی دور پرے کا عزیز، رشتے دار

ابو بعد میں گولی کی طرح میرے ہاتھ سے نکل کر گگل خان کی ناک پر لگا۔ اس کے طلق سے کریہہ غارج ہوئی اور بھل بھل خون بہنے لگا۔ اس کے باقی گر گئے ایک لمحے کو پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری یہ بک اور غیر متوقع حرکت کو دیکھتے رہ گئے۔

پھر ان میں سے ایک نے زنجی گگل خان کو سہارا دیا جو تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہ رہا تھا باقی دو گمشتے جارحانہ تیوروں کے ساتھ میری طرف لپکے۔ میں ریوالونگ چیئر سے پشت ٹکائے ان کی سمت تھوڑا سا گھوما اور سب سے پہلے اپنی طرف بڑھنے والے گمشتے کے پیٹ میں لات کر دی۔ وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ دوسرا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر اُچھلا۔ میں نے دوبارہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھے بیٹھے اسے گھمایا، وہ اچھل کر میری بھاری بھر کم ریوالونگ چیئر کی لمبی چوڑی گچھ سے ٹکرایا۔ میں نے تیسری بار بیٹھے بیٹھے ہی ریوالونگ چیئر گھمائی اور اپنے دائیں ہاتھ کی کہنی اس پہلو پر رسید کر دی۔ ضرب کا زور دار ہونا ضروری تھا۔ ورنہ وہ سنبھلتے ہی اتنے قریب سے بہ آسانی نہ کے سے میرے چہرے کی تواضع کر سکتا تھا۔ میری کہنی کی ضرب نے اسے ذرا دیر کے لئے بے بس دیا تو پہلا والا لات گزیدہ بد معاش مجھ پر جھپٹا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے کرسی چھوڑی اور وہ کرسی پڑا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، ٹال کے مزدور شیشے کے پار سے اس دھینگا مشقی کی جھلک دیکھ کر اس، ڈنڈے لئے اندر گھستے چلے آئے۔ میں ایک کونے میں بڑے آرام سے جا کھڑا ہوا تھا۔ پھر اس پہلے کے مزدور ان کا مار مار کر بھر کس نکال دیتے، میں نے باواز بلند ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ان کہا۔

”ابھی رک جاؤ۔ اگر ان کا دماغ پھر بھی ٹھکانے نہیں لگے تو ان کا مار مار کر قیمہ کر دینا۔“

وہ چاروں تہر و غضب کی تصویر بنے ہانپ رہے تھے اور مجھے غضب ناک نظروں سے گھورے جا رہے۔ میں نے مزدوروں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ان چاروں کو میرے آفس سے باہر دھکیل دیا۔ وہ اس خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے اپنی جیب میں جا بیٹھے اور منہ کی کھا کر واپس لوٹ گئے۔ میں نے گگل خان اور اس کے تینوں ساتھیوں کو مزہ چکھا دیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ بے غیرت۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی بجائے محاذ بنا کر اپنی ذلت کا بدلہ لینے دوبارہ ضرور آتے۔ میں زرخیز کتوں کو لاتوں کے ذریعے خوش آمدید کہا کرتا تھا۔

میں نے فیخر مشتاق کو بلا کر ٹال کی چوکیداری کے انتظامات سخت کرنے کی ہدایات دیں۔ اگرچہ اس پہلے ہی ٹال میں آگ لگنے کے واقعے کے بعد سے دو چوکیداروں کے علاوہ میں نے دو عدد لائسنس ہن بردار بھی متعین کر رکھے تھے۔ کام معمول کے مطابق چل رہا تھا جو شام تک جاری رہا۔ رضوی سب کو مال روانہ کر دیا گیا تھا۔ اب میں اسلام آباد ایئر پورٹ کی طرف نکلنا چاہتا تھا۔

میں نے رست و اج میں وقت دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ گلیز کی فلائٹ رات گیارہ بجے کی۔ میرے پاس وہاں تک پہنچنے کے لئے دو گھنٹے تھے۔ خاصی دیر کی ذہنی تھکنش کے بعد میں نے زنگینہ کو سی آف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

گلیز کو سی آف کرنے کے بعد لامحالہ گرین لاج پہنچتے پہنچتے کافی دیر ہو جاتی۔ ماں دیر سے آنے کا دریافت کر سکتی تھی۔ میں ماں سے مصلحتاً بھی اب جھوٹ بولنے کا روادار نہ رہا تھا۔ اس لئے میں نے جواب بھی سوچ لیا تھا۔ چنانچہ میں ابھی نکلنے ہی لگا تھا کہ میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ یہ کاشانہ

غیرہ؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔  
”ایسا کوئی قریبی رشتے دار تو نہیں۔ مگر پپا کے ایک دور کے رشتے کی خالہ زاد بہن وہاں درجیم (وائٹنگن) میں رہتی ہیں۔“

”تم نے رابطہ کیا ہے ان سے؟“ میں نے پوچھا۔  
”ہاں..... وہی ہمیں ریسو کرنے آئیں گی۔“  
”میں تمہیں سی آف کرنے آؤں ایئر پورٹ پر؟“ میں نے ہولے سے پوچھا۔

”نہیں نادرا! بس مجھے روانہ ہونے دو..... میں شدید ذہنی پریشانی کا شکار ہوں۔ ویسے انکل نہ حیات ہوں گے میرے ساتھ۔“ وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولی۔ اس کی بات پر میرے دل کی حالت خراب ہونے لگی اور بالآخر رابطہ منقطع کر دیا۔

اچانک میری نگاہ شیشے کے دروازے سے پار، جہاں سے ٹال کے وسیع احاطے کا منظر صاف نظر آتا تھا، بڑی تو میں ذرا چونکا۔ وہ ایک سنگل ڈور تجربہ و تجربی، جو تیزی سے اندر داخل ہوئی تھی اور یکدم بریکس کر اسے روکا گیا تھا۔ پھر میں نے ایک لمبے ترنگے شخص کو دروازہ کھول کر گویا چھلانگ لگا کر برآمد ہونے دیکھا اور اس کے ہمراہ تین مزید افراد بھی تھے۔ چاروں اپنی وضع قطع سے چھٹے ہوئے بد معاش نظر آتے تھے۔ جبکہ لمبا ترنگہ شخص کچھ زیادہ کرحٹ چہرہ تھا۔ ان لوگوں نے ٹائٹ جینز اور ہاف سیلو چسٹ ٹی شٹ پہن رکھی تھیں۔ لمبے ترنگے شخص کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی بھی تھی۔ دور سے ہی میں نے اس کرحٹ چہرے سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ تھجھ چھوڑ اور مغرور طبیعت کا مالک تھا۔ اس وقت ان کے بشرا سے جارحانہ غراہٹ کا اندازہ ہوتا تھا۔

ان کے جارحانہ تیوروں کو محسوس کر کے میری رگوں میں خون کی گردش یکثرت تیز ہو گئی۔ وہ میرا دفتر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے خود کو اس طرح ہی آرام برجمان رہنے دیا۔ دروازہ کھلا اور سب سے پہلے وہ لمبا ترنگہ شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد باقی بھی اندر آ گئے۔

”تمہارا نام نادری علی خان ہے.....؟“ لمبے ترنگے نے مجھے گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر جھپٹا لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں..... آپ کی تعریف؟“ میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔  
”میرا نام گگل خان ہے اور مجھے ٹھیکے دار رب نواز نے بھیجا ہے۔“ اس نے بتایا تو میں پل کے سمجھ گیا کہ معاملہ کیا تھا؟

”جی..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ تشریف رکھیں۔“ میں نے بدستور بے نیازی مگر اخلاقاً کہا۔

”آج صبح جو ٹرک آئے، ان کا مال ہمیں واپس چاہئے۔“ گگل خان میرے چہرے پر نظر کر کے کہتے ہوئے خراٹ لہجے میں بولا۔

”لیکن کیوں؟..... وہ مال تو میرا ہے۔ رب نواز نے خود بھیجا تھا۔ میں اس کی پے منٹ.....“  
”کیوں اس بند کرو۔ ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا تم نے۔“

گگل خان نے غرا کر مجھے گھورتے ہوئے کہا اور یکدم ہی میرے اندر کا جنگجو نادری علی خان کی

کی کال تھی۔

”فیفا سٹک نادر صاحب!..... واہ، آپ تو بڑے زبردست فائٹر ہیں۔“ میرے موبائل کا لگاتے ہی اس کی پٹانے دار آواز ابھری۔

”ایسا کیا کر دیا میں نے؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے موبائل کان سے لگائے لگائے جیب کی قدم بڑھا دیئے۔ میں تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ارے واہ..... جیسے آپ کو معلوم ہی نہیں۔“ اس کی ہلکتی ہوئی پُرشو آواز میری سماعہ ٹکرائی۔ ”آپ نے رب نواز کے خاص چیلے نگل خان کی ناک توڑ کر رکھ دی ہے اور اس کے ساتھیوں کو پیٹا، یہ کیا کم کار نامہ ہے اس کا غرور توڑنے کے لئے؟“

”ہاں..... وہ میرے آفس میں آکر بد معاشی دکھانے کی کوشش کر رہے تھے۔“ میں نے بتا تو اچھا ہوا، ان چاروں کی جنگ مجھ اکیلے تک محدود رہی۔ بہ صورت دیگر میرے مزدور اگر ذرا دیر جاتے تو ان چاروں کا بھرکس نکال دیتے۔“

”ہاں..... میں اس وقت دفتر میں ہی تھی جب وہ چاروں رب نواز کو اپنی ذلت بھری کر رہے تھے اور اس وقت رب نواز بری طرح جھلا کر نگل خان سے کہہ رہا تھا کہ اسے چوڑیاں پچائیں۔ یہ پہلا موقع ہے نادر صاحب! کہ رب نواز کے خاص الحاص چیلے نگل خان کا کسی نے یو بگاڑا ہے۔“

اس کی بات پر میں نے کہا۔ ”اگر انہوں نے دوبارہ میرے سامنے آنے کی جرأت کی تو میں پورا جعفرانی بھی بگاڑنے کی طاقت رکھتا ہوں۔“

”ایک سیلنٹ.....!“ وہ جپکنے لگی۔ ”آپ مردانہ وجاہت کے حامل ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے ہیں۔ اب تو آپ کے ساتھ دوستی کرنے میں بڑا مزہ آئے گا۔ کرو گے نا مجھ سے دوستی؟“ اس میں بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

اس کی بات پر میں ذرا گڑبڑا گیا۔ لیکن میں اسے مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب مجھے رب نواز حلق سے ساٹھ لاکھ روپے کی رقم نکالانی تھی، لہذا اسے بناتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے، آپ کی ابتداء تو اسی روز سے ملنے والے رانگ نمبر سے ہو چکی ہے۔“

”اوہ..... ویری ٹائس!..... تو پھر ڈن؟“ وہ خوش ہو کر بولی۔

”ڈن!“ میں نے بھی جواب دیا۔

”میں آپ کے پاس کل آرہی ہوں..... اوکے، بائی!“ اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

\*\*\*

میں جیب کو خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑا رہا تھا۔ میں اب اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ ماں تاخیر سے گھر آنے کی اطلاع کروں یا نہیں۔ اگر اطلاع کرتا تو لاحالہ وہ مجھ سے وجہ پوچھ سکتی تھیں بہر طور میں نے سروسٹ یہی سوچا کہ خود سے اطلاع نہ دوں۔ اگر انہوں نے خود مجھ سے رابطہ بتا دوں گا۔

سوا گھنٹے کی تیز رفتار، نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد میں اسلام آباد کی حدود میں داخل ہو: یہاں سے میں نے لال مسجد کی طرف جیب موڑ لی۔ فیصل مسجد کے مقابلے میں یہاں سے کسی

دوئم

شارٹ کٹ پڑتا تھا۔ مزید پندرہ بیس منٹ بعد میں ایئر پورٹ کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ میں جیب کو پارک کرنے کے بعد نیچے اتر آیا۔ اسلام آباد کا موسم معتدل تھا۔ ایئر پورٹ جگہ گاتی ریشیوں میں نہایا ہوا تھا۔ میں گیٹ کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار میرے بالکل قریب راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

میں ٹھک کر رک گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں کار کو پہچان چکا تھا۔ یہ انکل اعظم خان کی کار تھی در ڈرائیونگ سیٹ پر وہ خود موجود تھے۔ جبکہ ان کے برابر ان کا باڈی گارڈ وزیر خان بیٹھا تھا۔ لیکن جب وقتی سیٹ کا دروازہ کھلا تو میں ایک خاتون کو گرم کشمیری شال اوڑھے نکلتے دیکھ کر بری طرح ٹھک گیا۔ وہ بری ماں تھیں۔ ان کا چہرہ غصے اور طیش کے مارے لال بھسوکا ہو رہا تھا۔

”تم نگینہ کو سی آف کرنے آئے تھے نا؟“ ماں نے مجھے زندگی میں پہلی بار اس قدر نفرت آمیز نظروں سے گھورا تھا۔ اس دوران انکل اعظم خان بھی نیچے اتر آئے تھے اور وزیر خان بھی۔

”ہاں، ماں.....!“ میں نے اپنے اندر کی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ پھر گہری متانت سے کہا۔ ”مگر شاہ میر کو نہیں..... صرف نگینہ کو۔“

”میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھے اب زیادہ دیر نہیں بہلا سکتے۔“ ماں نے ہونٹ چبائے۔

”میں نے پہلے کب آپ کو بہلایا ہے ماں!“ میں نے دکھ سے کہا تو اچانک انکل اعظم خان نے راخت کرتے ہوئے ماں سے کہا۔

”شینہ! مجھے بات کرنے دو۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بڑے رسان سے بولے۔ ”نادر بیٹا! تم نوک کو آخر کیوں دو پانوں کے بیچ پمیں رہے ہو؟..... نہیں کچھ نہیں ملے گا۔ کیونکہ میری دور اندیش نظریں دیکھ رہی ہیں، اگر تمہارے اور ماں کے بیچ یہی حالات رہے تو مجھے ڈر ہے کہ تم نہ ادھر کے رہو گے نہ ادھر کے۔“

”انکل! میرا کیا قصور ہے؟ میں نے دشمنوں کے سلسلے میں ماں کا کب ساتھ نہیں دیا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”شاہ میر آج مردوں سے بدتر ہو چکا ہے۔ نظر حیات بھی رات والے حملے کے بعد مرتے مرتے بچا ہے۔ اور میں کیا کروں؟ رہی نگینہ کی بات تو اس کا کیا قصور ہے؟“

”اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ دشمن کی بیٹی ہے؟“ ماں نے تہرناک لہجے میں کہا۔

”یہ کوئی قصور نہیں ہوا ماں!“ میں نے کہا۔ ”یہ اس کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اس نے مجھ سے نانا توڑا ہے اور نہ ہی اب تک پولیس میں کوئی رپورٹ درج کروائی ہے۔ اور وہ بے پاری کیا کرے؟“

”ہونہہ..... بے چاری.....“

ماں نے مختارت سے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک ایسبولینس سائرن بجاتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ ہم سب ذرا چوٹے۔ ایسبولینس ہمارے قریب پہنچ کر ایک جھلکے سے رک گئی۔ اس کے عقب میں ایک پراڈو کار بھی تھی۔ وہ بھی رک چکی تھی۔

ایسبولینس کا سائرن بند کر دیا گیا تھا۔ پھر میں نے ایسبولینس کا عقبی سلائیڈنگ ڈور کھلتے دیکھا۔ اس سے نگینہ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھ کر میں چونکا تھا۔ یقیناً ایسبولینس میں زندہ لاش کی صورت شاہ میر ٹریچر پڑا ہوا گا۔ جبکہ پراڈو کار کے بھی دروازے وا ہوئے تھے اور میں نے نظر حیات کو اترتے دیکھا۔ اس کے ہمراہ دو آدمی بھی تھے۔



فلائٹ روانگی میں ابھی دو، سو دو گھنٹے باقی تھے۔ نظر حیات بھی نگینہ کو سی آف کرنے آیا تھا۔ مگر یہ شاید نظر پڑتے ہی یہ لوگ نیچے اتر پڑے تھے۔

ماحول یکا یک ہی بدل گیا تھا۔ ایئر پورٹ کی رونقیں مجھے ماند ہوتی دکھائی دے رہی تھیں۔ آج سے پچیس سال پہلے والی لرزہ خیز کہانی کے متضاد کرداروں کا ایک جگہ اکٹھے ہونا، ایک نئی ہولناک داستان کو جنم دے سکتا تھا۔ ماں کی غضب ناک نگاہیں نگینہ کے چہرے سے ہٹ کر نظر حیات جم گئی تھیں اور نظر حیات نگینہ سمیت دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا جہاں مجھے غیظ و غضب اور نفرت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔



نگینہ اور نظر حیات، دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے ہم ماں بیٹے سے چند قدم دور آ کر رک گئے۔ یہ کو نظر حیات کے ساتھ دیکھ کر میرے اندر نفرت کی لہر چلنے لگی تھی۔ دونوں کا ساتھ نظر آنا ماں کے دل پہلے سے پیدا شدہ نگینہ کے خلاف غلط فہمی کو مزید تقویت دینے کا سبب بن سکتا تھا۔ نگینہ نے دھیرے سے ماں کو سلام کیا مگر ماں نے نہایت متکبرانہ نفرت کے ساتھ اسے نظر انداز کر دیا۔ نظر حیات کو گھورنے لگی۔ جبکہ نظر حیات نے ایک اچھی سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد ماں کو رتے ہوئے کہا۔

”شینہ! تمہاری اس وقت یہاں آمد کو میں کیا سمجھوں؟“

”مجھے اس دھرتی پر ہر جگہ تم صرف اپنی موت ہی سمجھو نظر حیات! مطلب کیا پوچھتے ہو؟“ ماں نے پہلے لہجے میں نظر حیات کو جواباً گھورتے ہوئے کہا۔

”اوہ..... بہت آگ ہے تمہارے سینے میں۔“ نظر حیات نے استہزائیہ لہجے میں ماں سے کہا۔ لیکن شینہ بیگم! اس آگ میں آخر ایک دن تم خود جل کر خاکستر ہو جاؤ گی۔“

ماں نے دیکھا، ماں کے چہرے پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔ ایسی مسکراہٹ جس میں نفرت چنگاریاں اور جوش غیظ بھی تھا تو اپنے بدترین دشمن کو زیر دست کرنے کی بھرپور خود اعتمادی بھی۔ میں نہ خاموش رہا۔ شاید میں ایسے مواقع پر ماں کے دشمن کے ساتھ جوابی گفتگو میں تسکین حاصل کرتا تھا۔

”نظر حیات! جن کے سینوں میں پورا آتش فشاں دبک رہا ہو، انہیں یہ آگ کیا خاکستر کرے گی؟“ ماں کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔ ”شاہ میر کا حشر تو تم دیکھ ہی رہے ہو نظر حیات! عنقریب تم اسے اپنا ندھا بھی دو گے۔ اس کے بعد تمہاری باری آئے گی۔“

ٹھیک اس وقت نگینہ نے ماں سے روہانے لہجے میں تڑپ کر کہا۔ ”آنٹی! پلیز..... میرے پیٹا رگی اور موت کی کشش میں مبتلا ہیں۔ ہمیں جانے دیں۔“

نگینہ کے ہاتھی لہجے میں تڑپا دینے والی لاچاری تھی جس نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ مگر میں ماں کے سنے کچھ بولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اب ماں نے نگینہ کی طرف سنسناتی نظروں سے دیکھا اور پھر جانے بول اچانک میرے چہرے پر نظریں گاڑ دیں اور میں جیسے یہ خاموش راہ پاتے ہی بہ زبان خاموشی ماں سے نگینہ کے لئے سر تا پا التجا بن گیا۔

”ہم دشمنی کرتے ہیں تو اس کا وقار بھی قائم رکھتے ہیں۔ تم جا سکتی ہو۔ لیکن اس سے پہلے.....“

لیہ مستفرا نہ انداز میں ماں کا چہرہ تنکے لگی۔ میں بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ فوری طور پر میں سمجھ نہ سکا تھا کہ ماں نگینہ سے کون سا سوال کرنا چاہتی ہے۔ میرا خیال تھا، ماں نگینہ سے ہی سوال پوچھے گی۔ لیکن ماں نے اس کی بجائے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

تو دیاں سے نکلے جارہی ہوں۔ پھر بے اختیار میرا دایاں ہاتھ الوداعی انداز میں اٹھا اور میرے دل میں گونجی۔

”گنبد!..... اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ تم خیریت سے اور بہت جلد واپس لوٹو گی۔“ اس کے بعد اپنی جیب کی طرف بڑھ گیا۔ میرے سینے میں اُداسی کی لہر چھائی ہوئی تھی۔ بہت بو بھل ہو رہا تھا میں۔

دقت۔ جیب کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے اسے اشارت کیا اور آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ حرمی (تھنکلی) کی جانب تھا۔ میں اس وقت بری طرح اعصاب گزیدگی کا شکار ہو رہا تھا۔ ماں کے سرد اور بے رحم رویے کی برف کو مٹانے کی میں جس قدر سعی کر رہا تھا وہ اتنی ہی زیادہ دبیز ہوتی چلی جارہی تھی۔ اس پر گنبد کی ان

گوش حالات میں امریکہ روانگی نے میرے اعصاب کو مزید توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ گنبد کا خود سے، اپنے نا سے ہزاروں میل دور دیار غیر میں جانا اور وہ بھی اپنے باپ کے علاج کے سلسلے میں بہت پریشان کن تشویش زدہ صورت حال میں میرے لئے۔ میں سوچ سوچ کر ہی پریشان ہو رہا تھا کہ آخر گنبد تنہا کی دس میں کیا کر سکے؟ میرے پوچھنے پر وہ مجھے بتا چکی تھی کہ وہاں ور جینیا (واشنگٹن) میں اس باپ کی کوئی خالہ زاد بہن رہتی تھی۔

معاملہ دشمنی اور ماں کی غلط فہمی کا نہ ہوتا تو میں کبھی اس طرح گنبد کو تنہا امریکہ نہ جانے دیتا بلکہ میں اس کے ساتھ جاتا۔

گنبد نے ماں کے سوال کے جواب میں جو بتایا تھا، مجھے اس پر پورا یقین تھا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا۔ بیک شاہ میرا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا کہ میرے اور گنبد کے سچ بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ اُنی بعد نہ تھا کہ اس نے فون ریکارڈنگ پر کر رکھا ہو۔ مگر ماں کو اس کی سچائی پر یقین نہیں تھا۔ وہ وہی ہنسنے لگی تھی، جواب تک بہ دستور سمجھتی آ رہی تھیں۔ یعنی باپ بیٹی کا گٹھ جوڑ..... بہر طور یہ بات تو سچ ہو گئی تھی کہ ماں کو انگریزوں کے کرنے والوں کا تعلق بہر حال شاہ میر اور نظر حیات والوں سے نہیں تھا۔ پھر ابا کی ذہن میں آئی تھی کہ وہ چھپکلی مارک لیڈر کا نولہا یقیناً غفور سے ہی تعلق رکھتا تھا جس نے اپنی نانی کی قربانی دے کر غفور کو فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔

جیب تاریک اور گھنے جنگل کے سچ بل کھاتی چمکتی سڑک پر دوڑے جارہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ ٹرنگ پر جمے ہوئے تھے اور نظریں اسکرین کے پار تکی ہوئی تھیں۔ گنبد کی جدائی کا تصور ہی میرے لئے سواہن جان تھا۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھا موبائل اٹھایا۔ ”ہیلو!“

”ہیلو نادر!“ میں..... گنبد..... دوسری جانب سے گنبد کی آواز ابھری۔

”گنبد!..... گنبد!..... مم..... میں.....“ غور جذبات کے باعث مجھ سے جملہ پورا نہ ہو سکا۔

”نادر! تمہیں دل مضبوط کرنا ہو گا۔ یہ جدائی برداشت کرنا ہو گی۔ جیسے..... جیسے میں کر رہی ہوں۔“

قیدی

دوئم ”نادر! اس سے پوچھو کہ اس روز سبزہ زار پر غفور کے بدلے میں جو ڈیلیگ ہو رہی تھی، اس کے باپ شاہ میر کو کس طرح ہوا تھا؟“

میں چونک گیا اور جیسے یہ سوال گنبد کو منتقل کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ بھی سن رہی تھی، ماں بولی۔ ”میں نے اس روز اتفاقاً نادر سے فون پر رابطہ کیا تھا۔ مجھے اس کے لہجے سے پریشانی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر میرے اصرار پر اس نے مجھے ساری بات بتا دی تھی۔ لیکن بعد میں مجھے یہ چلا کہ چپانے کے لیے سیٹ ریکارڈنگ پر کر رکھا تھا۔ یوں انہیں اصل بات کا علم ہوا۔ کاش، وہ یہ گنگو شپ نہ کرتے اور آپ لوگوں کا اور مپا کا تصادم ہوتا۔“

یہ بتاتے ہوئے گنبد کی آنکھوں میں مزید نمی اتر آئی۔ میرا خیال تھا کہ گنبد کی صاف گوئی سے ضرور متاثر ہو گی۔ مگر اس کے برعکس وہ، گنبد کے غمناک چہرے کو گھور کر استہزاء سے لہجے میں بولی۔

”خوب!..... اپنے جھوٹے آنسوؤں اور جذباتی گنگو سے تم نادر کو توبے وقف بنا سکتی ہو مجھے نہیں۔ بس..... بات صاف ہو گئی۔ وہ گنگو شپ شدہ نہیں تھی بلکہ تم نے اپنے باپ کو آگاہ کیا، چلو، اس سے یہ بات تو ظاہر ہوئی کہ مجھے بر غمال بنانے والوں کا تعلق تمہارے باپ کے زرخیز کتوں نہ تھا۔ تم جاسکتی ہو۔“ ماں کے سرد اور کاٹ دار لہجے نے گنبد کے کرب میں مزید اضافہ کر دیا۔ خود

ماں کی اس غلط فہمی پر اپنا دل مسوں کر رہ گیا۔ گنبد نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر ماں نے انتہائی سرد لہجے میں اسے جانے کو کہہ دیا۔

ایک بھٹکی ہوئی شکوہ کناس نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اور پھر اپنے ساتھ کھڑے نظر حیات سے معاملہ کر دیر سے ہوئی۔

”انکل! آئیے پلیز۔ فلائٹ کا وقت ہونے والا ہے۔“

نظر حیات نے ماں اور مجھ پر ایک آخری بر مائی ہوئی معاندانہ نگاہ خار ڈالی اور گنبد کے ساتھ ماں خاموش کھڑی رہیں۔ میں نے ذرا ہمت کر کے ماں سے کہا۔

”ماں! گنبد جھوٹ نہیں کہہ رہی ہے۔“

ماں نے میری طرف سرد نگاہوں سے دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر کار کی طرف بڑھ گئی۔ انکل اعظم میرے قریب آئے اور ہولے سے میرا شانہ تھپتھا کر ازارہ نشی ہوئے۔

”حوصلہ رکھو نادر میاں!..... ایک دن انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر وہ بھی اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔ کار روانہ ہو گئی۔ میں تنہائی میں کھڑا رہ گیا۔ میرے

پیش میں جیسے سناٹا چھا گیا تھا۔ ایسا سناٹا جو میری روح کے اندر اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

ہلکی ہلکی خشک ہوا کے جھوکے چل رہے تھے۔ میرے اندر اُداس اور سرد شام اُتری ہوئی تھی۔

کتنی دیر میں اس طرح وہاں کھڑا رہا۔ میں اس وقت چونکا جب ایک تیز رفتار کار نے شاید کسی ما

سے بچنے کے لئے بریک لگائے اور ان کی چرچاہٹ سے وہاں کی فضا گونج سی گئی۔ بے اختیار

ناک نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ اسی آسمان پر کچھ دیر بعد گنبد کو لے جانے والا طیارہ

ہونے والا تھا۔

میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی جو آنسو بن کر میری آنکھوں میں جھللائے لگی۔ میں اس ط

ناک آنکھوں کے ساتھ اُداس سا کھڑا چشم تصور سے طیارے کو جیسے اپنے وجود کا ساتھ چھوڑتی ہوئی

روح کو پرواز کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کاش خبر جہاز کی کھڑکی کے قریب بیٹھی گنبد کی بھور نگاہیں

دوئم

اگرچہ یہ لوگ غفورے کے ہی ساتھی تھے مگر کھڑتالی گروپ کے ان دونوں بد معاشوں کی پشت پناہی آخر کون کر رہا تھا؟ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ غفورا انہی میں شامل ہو۔

کانی دور جا کر پراڈو جیب پنڈی روڈ سے لاہور جانے والی سڑک پر گامزن ہو گئی۔ اب میرا ہاتھ ٹھکا۔ میری جیب میں بہت کم فیول رہ گیا تھا۔ اگر یہ لوگ واقعی لاہور جانے کا قصد کئے ہوئے تھے تو میں ان کا اس قدر طویل تعاقب نہیں کر پاتا۔ چنانچہ میں نے بالآخر ان سے بھڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی جیب کی رفتار بتدریج بڑھا دی۔ سڑک دور تک تاریک اور سنسان تھی۔

اب ان کا چونک جانا لازمی امر تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے میری پالیسی اپنائی اور اپنے تعاقب کی تصدیق کی خاطر اپنی جیب کی رفتار ذرا گھٹا دی۔ میں جانتا تھا کہ اب چونکہ ان دونوں کی توجہ بری طرف ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے لالہ زار والی اس ہنگامہ خیز رات کے حوالے سے پہچان لیتے۔ اور وہی ہوا۔

جیسے ہی میری پٹھو ہار ان کی پراڈو کو کراس کرنے لگی میں نے ان دونوں کو گردنیں گھما کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے پایا۔ اور پھر جیسے انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے یک لخت ہی اپنی جیب کی رفتار تیز کر دی۔

اب مکمل اور تاریکی میں چمکتی ہوئی سڑک پر دونوں جھپیں غراتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اپنی جیب روک کر میرا دوبدو مقابلہ کریں گے۔ مگر یہ دونوں ہی تھوڑے ثابت ہوئے تھے۔ یا پھر شاید لالہ زار کی اس رات میں انہوں نے اپنے چھپکلی مارکہ لیڈر کی میرے ہاتھوں عبرت ناک موت نے شت بٹھا رکھی تھی۔ شیر کے لئے بزدل دشمن خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

یہ دونوں مجھے پہچان کر اب نکل جانا چاہتے تھے اور میں جانتا تھا کہ وہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ میری گاڑی کا فیول بتانے والی سوئی "E" کے قریب تھی۔ میں انہیں نکلنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایکسیلیٹر سے میں نے بھی اپنا پاؤں نہیں ہٹایا تھا۔

دونوں جھپیں ریس لگانے کے انداز میں اندھا دھند دوڑ رہی تھیں۔ میرے اعصاب بری طرح تنے دئے تھے اور چہرہ جوش جنوں کی غمازی کر رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں ایسی خطرناک ڈرائیونگ کسی خوف ناک حادثے کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ مگر میں بھی ہاتھ آئے شکار کو "چھاپے" کا عزم کر چکا تھا۔

ایکسپرک پر میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ دفعۃً پراڈو نے میری جیب کو سائیڈ کی۔ میری جیب کو جھٹکا لگا، اس کا توازن ذرا بگڑا مگر میری مہارت نے اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ مائے فوراً ہی اس پر قابو پا لیا۔ مگر اس لحاقی کوشش میں پراڈو آگے نکل گئی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے نے ایک قدرے تنگ موڑ دکھائی دے گیا۔ میں نے دوبارہ اسپید بڑھا دی۔ موڑ نزدیک آتا جا رہا تھا۔

دونوں گاڑیوں کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ موڑ بینتالیس ڈگری سے زیادہ کا تھا جسے کاٹنے کے لئے گاڑی کے اسپیدومیٹر کی سوئی کو نوے اور سو درمیان سے نیچے چالیں کے قریب لانا ضروری تھا۔

موڑ قریب آتا جا رہا تھا۔ دونوں جھپوں کی رفتار بھی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ پراڈو کی رفتار، فاصلے اور وقت کی پیمائش کرتے ہوئے اپنی جیب کی رفتار کو فوراً ہی گھٹا دیا اور پراڈو کو پہلے کاٹنے کا موقع دیا۔ پھر جیسے ہی وہ موڑ پر گھوی، میں نے اپنی جیب کا ایکسیلیٹر پوری قوت سے دبا دیا۔ یہ ایک چھپکلی جیب غرا کر آگے بڑھی اور موڑ کا منحنی ہوئی پراڈو سے ٹکرائی۔ نتیجتاً پراڈو، کچے میں اتر گئی اور

"سنو!..... سنو!" میں جلدی سے بولا۔ "تم نے اپنی آنٹی کو امریکہ آمد کے بارے میں خبر دی ہے؟"

"ہاں....." گینگ نے کہا۔ "وہی ایئر پورٹ پر مجھے ریسیو کرنے آئیں گی۔"

"گینگ! تم حوصلہ رکھنا۔ تم بہت ہمت والی لڑکی ہو۔ کاش، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا۔ تم جتنا وہاں رہو گی، میرا سارا حیاں تمہاری طرف ہی لگا رہے گا۔ کم از کم مجھے اپنی آنٹی کا تو پتہ دے دے وہ میں نے آخر میں کہا تو وہ جوابا بولی۔

"ہاں..... میں امریکہ پہنچنے ہی آنٹی رخسانہ کا پتہ SMS کر دوں گی تمہیں۔ اچھا..... خدا، بورڈنگ شروع ہو چکی ہے۔ چپا کو انڈینٹ لے جا چکا ہے۔ میں بھی طیارے کی طرف بڑھ رہی ہوں میرے لئے دعا کرنا۔ ایک مرتبہ پھر خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے موبائل کو دوبارہ ڈیلیٹ بورڈ پر رکھ دیا۔

جیب خاصی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ اچانک ایک تاریک اور تنگ موڑ کا ٹھٹھے ہونے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ میری اچانک ہی بیک ویو مرر پر نظریں پڑی تھیں۔ عقب میں آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹ نظر آ گئی تھی۔ میں اسے تعاقب تو نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ عقب میں سڑک ویران ضروری نہ تھا کہ میرا ہی تعاقب ہو رہا ہو۔ کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ تاہم، جانے کیوں میری جھپ خطرے کا الارم بجارہی تھی۔

میں نے اپنے اس شبے کو دور کرنے کی غرض سے اپنی جیب کی رفتار دانستہ دھبی کر دی۔ اب گاہے گاہے عقیقی منظر پیش کرنے والے آئینے میں عقب سے آنی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنی رفتار ساتھ بدستور دوڑی آ رہی تھی اور لمحہ بے لمحہ اس کا فاصلہ میری جیب سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے احوال تن گئے۔ حالات ہی ایسے تھے کہ مجھے اپنے سائے تک سے بھی محتاط رہنا پڑتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی گاڑی میرے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے دوسرے فرد کو ہانپنے کی نظروں سے دیکھا اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک پرانے ماڈل کی ڈبل کیمین پراڈو جیب کے اندر صرف دو ہی افراد موجود تھے۔ جیب آگے نکل گئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے بھی اپنی پٹھو رفتار بڑھا دی۔

میرے اندر زبردست ہلچل ہو رہی تھی۔ مجھے وہ دونوں چہرے شناسا معلوم ہوئے تھے۔ لیکن فوراً ہی یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے دونوں کو کب اور کہاں دیکھا تھا۔ لیکن چونکہ میرے ذہن میں شناسگئل بدستور جل بجھ رہا تھا اس لئے فوراً ہی مجھے لالہ زار کی وہ شب ہنگامہ یاد آ گئی جب غفور۔ بد لے ماں کی واپسی کا معاہدہ طے پا رہا تھا۔ یہ دونوں چہرے اس چھپکلی مارکہ بد معاش کھڑتالی ٹو۔ شامل تھے جو اپنے لیڈر کے میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوتے ہی غفورے سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اب ذہن کا سنگل پوری طرح روشن ہو گیا تھا اور ساتھ ہی میری رگوں میں خون کی گردش بھی مٹھ ہونے لگی۔ چنانچہ میں ان کے تعاقب میں لگ گیا۔ یہ لوگ بھی شاید میری طرح اسلام آباد سے جا رہے تھے۔ میں نے تعاقب کو شک و شبہ سے بچانے کی خاطر پراڈو سے اپنی پٹھو ہار کا درمیانی خاصا بڑھا رکھا تھا۔

میں نے اب ان کے تعاقب کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا اور جانا چاہتا تھا کہ یہ لوگ کس کے آدمی

بڑھ چکی تھی۔ جیب کے اندر سے نسوانی چمچیں ابھی تک بلند ہو رہی تھیں جس نے میرے ابھرنے پر تجسس کو مزید بڑھا دیا تھا۔ میں نے جیب میں ٹھوسا ہوا میگارد نکال کر جیب کے کنارے کا نشانہ لیا اور لمبی دبا دی۔ تار کی کے باوجود میرا نشانہ حیرت انگیز طور پر کامیاب ثابت ہوا۔ سماعت شکن دھماکے سے جیب کا تار برست ہوا اور وہ ایک طرف جھک گئی۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ جیب رک چکی تھی۔ اس کے اندر سے دشمن دروازہ کھول کر آنا فانا قریب کی تاریک جھاریوں میں گم ہو گیا۔ میں نے دو تین مزید فائر جھونک مارے لیکن وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں دوڑ کر پراڈو کے پاس پہنچا اور کھڑکی سے اندر جھانکا۔ پراڈو جیب کے اندر مدھم رشتی میں ایک جوان العمر عورت کو دیکھ کر میں بری طرح چونکا تھا۔

وہ رن بستہ حالت میں جیب کے فرش پر پشت کے بل پڑی ہوئی تھی۔ مگر میرے چونکنے کی وجہ اس کی مجھ سے شناسائی تھی۔ یہ غزالہ تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونک اٹھی تھی۔ ذہن نشین مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً پلٹا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ کسی نے اچانک ہی عقب سے میری کھوپڑی پر کسی ٹھوس شے سے وار کیا تھا۔ مجھے اپنا ذہن تار کی میں ڈوبتا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

\*\*\*

یہ دس بائی بارہ کا کمرہ تھا جس کے محدود ماحول میں ہوش آنے کے بعد میری آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ روشن تھی جبکہ کمرہ ہم دونوں کے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ یعنی میرے علاوہ سپاٹ کمرے کے ننگے فرش پر غزالہ بھی موجود تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر مقتول جواد احمد کی بیوی غزالہ کو غفورے کے ساتھیوں نے کیوں اغواء کیا تھا۔ یہ لوگ یقیناً اسے اسلام آباد سے اغواء کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔ مگر غزالہ پنڈی میں رہتی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس رات والے عجیب و غریب واقعے اور اپنے بد نصیب شوہر جواد احمد کے قتل کے بعد اسلام آباد میں کہیں مقیم ہو اور یہ لوگ نو کیرکٹوں کی طرح اس کی بوسٹھکتے ہوئے وہاں تک جا پہنچے ہوں۔ مگر کیوں؟..... غزالہ کی غفورے کے ٹولے کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟ اب مجھے یہ غزالہ ہی بتا سکتی تھی۔

اس رات جب غزالہ پراسرار طور پر مجھے مدد کی غرض سے بعد اصرار اپنی رہائش گاہ میں لے گئی تھی، آج شاید اس پراسرار ڈرامے کا پردہ گرے والا تھا۔ بہر طور شکر تھا کہ مجھے رن بستہ نہیں کیا گیا تھا جبکہ غزالہ بھی اب جٹو بندیوں سے آزاد میری طرح ننگے فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔ اسے بھی اب ہوش آنے لگا تھا۔

مجھے اپنے سر کے پچھلے حصے میں ٹیس سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ میں نے ہاتھ رکھ کر چوٹ کو سہلایا تو وہاں ایک گمڑا کا ابھار محسوس ہوا۔ مجھے وہاں خون کی چچپھاہٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔

میں نے اس معمولی چوٹ کو خیر باد کہا اور غزالہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ”ہلک روز“ رنگ کے مہین سپرنگ گاؤں میں لمبوس تھی اور اس کے پُر شباب جسمانی خطوط تو بہ شکن انداز میں اپنی قیامت خیز جھلک دکھا رہے تھے۔

”یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟“ میں نے سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد پوری طرح ہوش میں آئی ہوئی غزالہ سے پوچھا۔ وہ خود دہشت زدہ نظر آرہی تھی۔ یکدم فرش پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ

الٹے الٹے بچی۔ اس کا انجن بند ہو گیا۔ میرے لئے اتنا وقت کافی تھا۔ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اترتا تو اچانک میں نے غفورے کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھی۔ وہ دروازہ کرینچے اتر آیا۔ میں نے کھڑکی کی آڑ لیتے ہوئے سب سے پہلے نہایت پھرتی کے ساتھ ڈرائیور کی طاقت ور گھونسا جڑ دیا۔

اس کے منہ سے ”اوغ“ کی ہلکی سی آواز خارج ہوئی اور پھر وہ گردن ایک طرف ڈال کر بے ہو گیا۔ مین اسی وقت اس کے ساتھی نے مجھ پر پستول سے فائر کر دیا۔ ایک دھماکا ہوا مگر میں یکدم ہٹ کر جیب کے بونٹ کی آڑ میں ہو گیا۔ میگارد ہر وقت میرے ساتھ ہوتا تھا۔ میں نے فوراً ہی نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ غفورے کے ساتھی نے ابھی میرے ہاتھ میں پستول کی جھلک نہیں دیکھی مگر وہ مجھ سے بہر حال محتاط تھا اور شاید مجھے نہتا سمجھ کر ہما ہوا تھا ورنہ وہ کب کا لالہ زار والی رات کی بھاگ چکا ہوتا۔

میں نے جھکے جھکے بونٹ کی آڑ لیتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کیا اور ساتھ ہی ڈرائیور ابھار کر دوڑ میں نے دشمن کو غائب پایا۔ ایکا اکی میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح ایک خدشہ ابھرا اور پھر ہی میں اسپرنگ کی طرح اچھل کر بونٹ پر چڑھ گیا۔ ٹھیک اسی وقت پراڈو کے نیچے گولی چلنے کی آہٹ تھی۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ دشمن نے نیچے جھک کر میرے پیروں پر گولی چلانے کی کوشش کی تھی۔ ناکامی کی صورت اور بونٹ پر میرے اچھل کر چڑھنے کی دھمک نے اسے جیسے ہی غیر ارادی سیدھا کھڑے ہونے پر مجبور کیا تو میں نے اس پر اپنے میگارد سے گولی چلانے کی بجائے اس کے چہرے پر اپنے بوٹ کی ایک زوردار ضرب رسید کر دی۔ وہ بھیانک انداز کی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ کئی قدم میں لڑکھڑا کر جھاریوں میں جا گرا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ میں بھلا اب کہاں موقع دینے والا تھا۔

میں ایک ایجنٹ تھی۔ چنانچہ میں نے وہیں سے ایک لاگ جیب لگائی اور فضا میں اڑ سیدھا دشمن پر جا پڑا۔ میری دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر جم کر پڑیں تو یقیناً اس کے سینے کے فٹا پٹیاں ٹوٹ کر اس کے پچھلے حصوں میں پھنس گئیں۔ وہ جاں نثاری سے اپنے بچاؤ کی صرف اس قدر کوشش کی کہ اپنے وجود کو سکڑ لیا۔ میں اس پر گرا۔ وہ کراہ آمیز انداز میں چیخا۔ میں نے ہانپتے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اسی وقت میری سماعتوں سے جیب کے اشارت کی مخصوص آواز ابھری۔

ایک لمحے کے لئے میری توجہ ہٹ گئی۔ میں نے گردن موڑ کر غیر ارادی طور پر عقب میں دیکھا۔ والا دشمن ہوش میں آتے ہی جیب اشارت کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ توجہ ہٹنے ہی میں دوسرے زبردست دشمن کو مجھ پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے جما کر اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا میرے جڑے پر رسید کر دیا۔ ضرب کی شدت نے میرے دماغ کو جھجنا دیا۔ پہلے والے دشمن کی جیب اشارت کرنے کی کوشش جاری تھی۔ مجھے زبردست دشمن کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ مجھے گھونسا رسید کر کے گواہ نے میرے وجود کی آتش جنوں بھڑکا دی تھی۔ میں نے ایک ہی زوردار شیخ مار کر اسے لمبا کر ڈالا۔ اسی وقت مجھے ایک تیز اور ہسٹریائی انداز کی نسوانی چیخ سنائی دی۔

یہ آواز جیب کے اندر سے ابھری تھی۔ میرے پاس حیرت میں پڑ کر وقت ضائع کرنے کا کوئی نہ تھا۔ میں غراتا ہوا جیب کی طرف بڑھا۔ اس اثناء میں جیب اشارت ہوتے ہی ایک جھٹکے سے

کہ اس دوران جب میں نے انکل اعظم خان سے یونی غفورے کے متعلق پوچھا تھا تو انہوں نے مجھے یہ بات بتائی تھی کہ غفورا درحقیقت پروڈیوسر اشفاق شاہین کا ہی گرگا اور خاص گناہ تھا۔ جبکہ خود پروڈیوسر اشفاق شاہین انڈر ورلڈ فلم مافیا کا ایک ”ڈان“ تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک معروف فلمی اداکارہ ”سپنا“ کو غفورے کے ہاتھوں قتل کروایا تھا۔

”کیا سوچنے لگے؟“ مجھے سوچنا یا کر اچانک غزالہ نے پوچھا تو میں نے کہا۔  
”کچھ نہیں..... تم اپنی بات ختم کرو اور مجھے بتاؤ کہ وہ رات والا آخر معاملہ کیا تھا؟ نیز تمہارے شوہر جواد احمد کو کیوں قتل کیا گیا تھا؟“

میری بات پر غزالہ نے دوبارہ اپنی داستان کا سلسلہ جوڑا۔ ان غیر یقینی حالات میں ہم دونوں کا پہلے ہی ان باتوں سے آگاہ ہونا اشد ضروری تھا۔ کیونکہ غفورے اور غزالہ کے ڈانڈے مجھ سے آن ملے تھے۔  
”اشفاق شاہین ایک بہت سنگ دل اور سفاک انسان ہے..... اس نے میری بہن سپنا کا قتل کروایا تھا۔“

”کیا..... اداکارہ سپنا تمہاری بہن تھی؟“ میں بری طرح چونکا۔  
”ہاں.....“ وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ”میں اپنی بہن کے قاتل سے نمٹنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے مجھے اشفاق شاہین کے ہاتھوں کھلونا بھی بننا پڑا مگر میں اپنی عزت گوانے کے باوجود اس رذیل انسان سے اپنی بے گناہ بہن ”سپنا“ کے خون کا انتقام نہ لے پائی اور الٹا اسے اپنا دشمن بنا لیا۔ میں اس سے دور ہو گئی۔ اس سے دور ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ درحقیقت ایک شیطان تھا۔ خراب الاخلاق فلم بنانے والی ایک بین الاقوامی فلم کمپنی سے اس کے خفیہ تعلقات تھے۔ وہ مجھے اس میں کام کر کے دولت مند بنانے کا لالچ دینے لگا۔ میں نے انکار کیا تو مجھ پر دباؤ ڈالنے لگا۔ میں اس سے دور ہو گئی۔ پھر اس رات، جب میں تم سے مدد لینے راتوں رات پنڈی سے مری آئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس رات اشفاق شاہین نے اپنے ایک ساتھی شوکی کو مجھے گن پوائنٹ پر لینے کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے کسی طرح شوکی کو بے وقوف بنا کر اسے ایک کمرے میں محبوس کر دیا۔ پریشانی کے عالم میں مجھے یہی طریقہ سوچا تھا۔ اور جب میں تمہیں لے کر واپس اپنے گھر پہنچی تو وہ بدبخت شوکی جانے کس طرح آزاد ہو کر میرے شوہر کو قتل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بعد میں، میں نے بھی تمہاری آنکھوں کے سامنے مغلوب الغضب ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔ میں سمجھتی تھی، یہ بلائیں ہی ساری اس خبیث اور ابلیم صفت شخص اشفاق شاہین کی تھی۔ یعنی میرے شوہر کو قتل کر کے مجھے تباہ کرنا۔ کیونکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں اپنے شوہر کی وجہ سے اس گناہوں کے منصوبے کی تکمیل سے انکاری ہوں۔ اس کے بعد میں اپنی پنڈی والی رہائش گاہ کو فروخت کر کے اسلام آباد میں ایک کرائے کا اپارٹمنٹ لے کر رہنے لگی۔ مگر اشفاق شاہین نے میرا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ اتنا تباہ کر خاموش ہو گئی۔

میرے سینے میں بری طرح ہلچل ہونے لگی۔ غفور اس قدر خطرناک لوگوں کے گردہ سے تعلق رکھتا تھا، مجھے اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا۔ اس کو یہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کہ جس کا تذکرہ کرنا بھی شاید معیوب بات ہو۔ لیکن ”فاشی“ اور ”معیوب“ کا نام دے کر بھلا کب تک بعض کڑوی حقیقتوں سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔ خراب الاخلاق فلموں کی ترسیل و فروخت ایک طویل عرصے سے جاری ہے جوئی نسل کے اخلاق و کردار کو تیزی سے برباد کر رہی ہے۔ اس قسم کی فلموں کو ”تھری ایکس“ کی مخصوص اصطلاح کا نام دیا گیا تھا۔ یہ تو خیر ایک پرانا مسئلہ تھا ہی اور اس گندی و باہر قابو نہ پانے کی وجہ سے آج نوبت یہاں

خاصی ہر اسان نظر آرہی تھی مگر میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ میری موجودگی پر وہ متحیر ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے مطمئن بھی نظر آنے لگی تھی۔  
”تنت..... تم..... تمہاری ان لوگوں کے ساتھ کیسے مڈ بھیڑ ہو گئی؟“ وہ اپنے بے ترتیب سلسلے گھاؤں کو درست کئے بغیر مجھ سے بولی۔

”پہلے میرے سوال کا جواب دو۔“ میں نے سرد مہری سے کہا تو وہ جوابا بولی۔  
”یہ لوگ مجھے اسلام آباد سے اغواء کر کے لے جا رہے تھے۔ اوہ گاڈ!..... لک..... کبھی انہیں پتہ تو نہیں چل گیا کہ اس رات تم بھی وہاں میری پنڈی والی رہائش گاہ میں موجود تھے، جب میرے شوہر کو شوکی نے قتل کر ڈالا تھا اور بعد میں وہ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا؟“ یہ کہتے ہوئے وہ مزید ہراساں نظر آنے لگی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ہراس میری جان مصیبت میں پڑنے کی وجہ سے تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کون سی ہولناک رات کا حوالہ دے رہی تھی۔ مجھے اس پر اسرار اور ہولناک رات کا منظر اچھی طرح یاد تھا۔ جب میں اپنے نال سے نکل رہا تھا تو غزالہ اچانک اپنی کار میں پنڈی سے مری میرے پاس نال پر پہنچ گئی اور مجھے کچھ بتائے بغیر اپنی مدد کی خاطر اپنے ساتھ اپنی پنڈی والی رہائش گاہ تک لے جانا چاہتی تھی۔ وہاں پہنچ کر ایک سلخ نقاب پوش سے مڈ بھیڑ ہوئی تو مجھے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ یہ سارا جیکر غزالہ نے مجھے پھنسانے کے لئے چلایا تھا۔ مگر پھر جب میں نے اس کے شوہر کی خواب گاہ میں معذور جواد احمد کے پیٹ میں خنجر اتر ہوا دیکھا تو دلیل کر رہ گیا تھا۔ غزالہ نے بھی اپنے شوہر جواد احمد کو بیڈ پر نرمہ حالت میں پایا ہوا ہسٹریائی انداز میں چلائی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے پھنسانے کے لئے ڈرامہ کر رہی تھی۔ مگر جب اس نے میرے اس نقاب پوش کے ساتھ مارا ماری کے دوران ہاتھ سے چھوٹ کر گر جانے والے پستول سے نقاب پوش پر فائر کر کے اسے ہلاک کر ڈالا، تب مجھے احساس ہوا کہ معاملہ میری سوچ سے بھی بڑھ کر پر اسرار اور گھبرانہ تھا۔ مگر غزالہ نے مجھے کچھ بتائے بغیر واپس جانے پر اصرار کیا تھا۔ یوں میں بھی اس گھن چکر پر ایک عدد لعنت بھیج کر لوٹ آیا تھا۔ آج شاید اس پر اسرار واقعے کے بارے میں پردہ اٹھے والا تھا۔

غزالہ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کسی شوکی کا نام لیا تھا، جس نے غزالہ کے معذور شوہر جواد احمد کا قتل کر دیا تھا اور بعد میں خود بھی غزالہ کے پستول کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ چنانچہ جب غزالہ نے مجھ سے ہراساں لہجے میں کہا کہ کہیں ان لوگوں کو اس بات کا علم تو نہیں ہو گیا کہ اس رات میں بھی وہیں تھا تو میں ساری بات سمجھ گیا کہ یہ لوگ شوکی کے ہی ساتھی تھے اور غزالہ کو اس جرم میں اغواء کر کے لے جا رہے تھے کہ اتفاق سے راستے میں مجھ سے بھی مڈ بھیڑ ہوئی۔

میں نے اس کی آگہی کے لئے یہ بتایا کہ یہ لوگ میرے ایک دشمن جو درحقیقت ہمارا شکار تھا، غفورے کے ساتھی تھے تو غزالہ نے میری مختصر صراحت سننے کے بعد ایک گہری ہمکاری لے کر اپنا تفصیلی حال سناتے ہوئے ایک چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا۔

وہ نقاب پوش، شوکت عرف شوکی درحقیقت غفورے اور اشفاق شاہین کا ہی ساتھی تھا۔ نیز شکوراناڈ شخص غفورے کا رگا بھائی تھا اور شکوراناڈی چھپکلی مار کہ بد معاش تھا جس نے میری ماں کو اغواء کیا تھا جسے بعد میں، میں نے لالہ زار میں ماں اور غفورے کے تبادلے کی ڈیلنگ کے دوران واصل جہنم کر ڈالا تھا۔ میں اس انکشاف کے علاوہ اشفاق شاہین کے ذکر پر بھی بری طرح چونکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد

دوئم

77

قیدی

تھا۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ میری ماں کو اغواء کرنے کے بعد فون پر مجھ سے اس قدر لہجہ اور زہینہ گفتگو کیوں کر رہا تھا؟ اس لئے کہ وہ اشفاق شاہین جیسے مکروہ شخص کا ساتھی تھا۔ میں دانت پس کر بولا تو غزالہ کی حالت مزید تشویش ناک ہو گئی۔ وہ اب بہت زیادہ خوف زدہ اور ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ پھر سہکاتے لہجے میں بولی۔

”تم..... تم نہیں جانتے نادرا! کہ تم نے نادانستگی میں کیسے خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی ہے۔ شکور اور غفورا دونوں گئے بھائی ہیں اور اشفاق شاہین کے مقرب الحاح بھی۔ اودھ خدایا!..... مجھے امید نہ تھی کہ یہ معاملہ اس قدر سنگین صورت اختیار کر لے گا۔“

اس بات پر مجھے بھی اگرچہ ایک جھکا لگا تھا تاہم میں نے اس کے ہراساں چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے استہزائیہ مسکراہٹ سے کہا۔

”حیرت ہے..... تم اپنی بہن پشنا کا اشفاق شاہین جیسے ایک بڑے اندر ورلڈ ٹینکسٹر سے انتقام لینا چاہتی تھیں اور اب اس سے خوف بھی محسوس کر رہی ہو؟“

میرے طرز پر وہ برا منائے بغیر بولی۔

”میں علی الاعلان اس سے ٹکرانے کی بجائے دو تہی ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ میں پہلے اس کے قریب آنا چاہتی تھی مگر قریب آنے کے بعد ہی مجھے اس حقیقت کا احساس بھی ہو گیا کہ اسے ہلاک کرنا اتنا آسان نہ تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔ شاید میں اتنی بہادر نہ تھی۔ تاہم یہی بات میرے اٹا گلے پڑ گئی۔ میں نے اپنی عزت تو اس کے ہاتھوں گواہی دے دی تھی مگر جان گوانے کا مجھ میں حوصلہ نہ ہو پایا تھا۔ تاہم میں موقع کی منتظر ضرور تھی۔ لیکن جب اتنی آتیں گلے پڑنے کے مصداق اس مردود نے مجھ پر نفس ظلم ہندی کا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تو میں آہستہ آہستہ اس سے دور ہونے لگی۔ مگر جلد ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھے اپنے شیطانی جنگل میں جکڑنے والا تھا۔ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لئے بہانہ کر دیا تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ بس یہی میرے شوہر جواد احمد کی موت کا سبب بنی۔ یوں اس رات اشفاق شاہین نے شوکت عرف شوکی کو میرے شوہر کے قتل اور مجھے لانے کے لئے بھیجا تھا۔ اب اشفاق شاہین مجھ سے اس بارے میں کڑی باز پرس کرے گا۔ مگر تم یہ بات ہرگز اس سے مت کرنا کہ تم بھی اس رات.....“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں نے سوچا کہ کمرے کی اکلوتی ٹیوب لائٹ بجھا دوں۔ مگر میں ایسا نہ کر پایا۔ دروازہ دھڑاکے سے کھلا اور تین افراد ہاتھوں میں گتھیں سیدھی کئے اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک شخص کو پہچان کر میری کنٹینیاں سنسانے لگیں۔ وہ غفورا تھا جو مجھے شعلہ باز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اُس کا ذہن کی طرح پلا ہوا وجود غیظ و غضب کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھیں کیفیات سے میں واقف تھا۔ کیونکہ بہ قول غزالہ کے میرے ہاتھوں جہنم داخل ہونے والا وہ چھپکلی مارک بد معاش شکور اس کا رگ بھائی تھا۔

”دل تو میرا ابھی جھٹکتا ہے کہ اسی وقت تجھے گولیوں سے بھون ڈالوں..... لیکن.....“

مجھے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے وہ دانت کچکچا کر بولا اور دانستہ اپنا جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ یہ میری سرشت تھی کہ ایسے نازک مواقع پر میں جوش کو خیر باد کہہ کر ہوش سے کام لیتا تھا۔ لہذا بولا۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارا بھائی تھا۔ لیکن اس نے بھی میری ماں کو اغواء کرنے کا گھناؤنا اور ناقابل معافی جرم کیا تھا۔“

تک آنکھی ہے جو شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اب اندر ورلڈ فلم باغیا نے زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خاطر اپنے وطن عزیز میں بھی ایسی بلیو فلمیں غفیہ طور پر بنانا شروع کر دی تھیں، جن کے باقاعدہ کاروباری مراسم امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کی معروف بلیو فلم کمپنی سے استوار ہو چکے تھے اور انہی کے تعاون سے ان کی ڈسٹری بیوشن پورے ملک میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہو رہی تھی۔ باہر کا گند باہر دالے جائیں مگر ہمیں اپنے ملک سے تو کم از کم اس برائی کو ختم کرنا چاہئے۔ یہاں یہ مذموم اور شرم ناک کاروبار شروع ہو چکا تھا۔ اب مجھے غزالہ بتا رہی تھی کہ یہاں اس کا چیف اشفاق شاہین تھا اور غفورا اس کا دست راست تھا۔

”کیا سوچنے لگے نادرا؟“

معاً مجھے دوبارہ سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر غزالہ نے الفاظ کو ٹھوکا دیا تو میں چونک کر خیالات کے بھونچے سے ابھر کر پھر ایک گہری ہکاری لے کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے، ہم دونوں ہی اس وقت بہت خطرناک قسم کے کرمنل اور اندر ورلڈ کے ایک بہت بڑے ٹینکسٹر کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔“

”ہاں نادرا!..... مجھے بھی سب سے زیادہ یہی پریشانی ہو رہی ہے۔“ میری پرتشویش بڑبڑاہٹ سن کر وہ بھی متوحش لہجے میں بولی۔

”خیر، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ میں نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔ ”میں ذرا کمرے کا جائزہ لے لوں۔“ یہ کہہ کر میں اٹھا۔

یہ کمرہ ہم دونوں کے علاوہ ہر شے سے عاری تھا۔ حتیٰ کہ اس کی چار دیواری میں کوئی کھڑکی تک نہ تھی سوائے چھوٹے سے چوکور روشندان کے، جو کمرے کی جنوبی سمت کی دیوار پر حاسی بلندی پر تھا اور اس کے چوکھٹے پر موٹی موٹی آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ میں کچھ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ حسب توقع اس میں ایک ذرا سی بھی جھری تک نہ تھی۔ روشندان سے مقدور بھر نظر آنے والے تاریک آسمان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ابھی رات اپنے پچھلے پہر پر ہی تھی۔ میں نے غزالہ کی جانب پلٹ کر اس سے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس وقت اس خبیث اور اٹلیس صفت شخص اشفاق شاہین ہی کی قید میں ہیں؟“

”مجھے سو فیصد یقین ہے۔“ وہ مستحکم لہجے میں جوابا بولی۔ ”کیونکہ جو لوگ ہمیں یہاں لائے ہیں، انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ لوگ اشفاق شاہین کے ہی گماشتے ہیں۔“

مجھے اب اس بات پر ایک نئی تشویش نے آن گھیرا تھا۔ اگر یہ لوگ اشفاق شاہین جیسے خطرناک اندر ورلڈ ٹینکسٹر کے آدمی تھے تو یقیناً غفورا سمیت چھپکلی مارک زرد رو بد معاش لیڈر بھی اشفاق شاہین کا خاص آدمی ہو گا جس نے میری ماں کو بریغال بنایا تھا اور اس کی رہائی کے بدلے لالہ زار میں غفورے کا رہائی کی ڈیلنگ کے دوران وہ میرے ہاتھوں جہنم داخل ہو چکا تھا۔ اس کے نتیجے میں غفورا فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ گویا اب اشفاق شاہین کی توپوں کا رخ میری جانب ہو سکتا تھا۔

میں نے غزالہ کو اس چھپکلی مارک بد معاش کے حلیے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تو وہ مزید ہراساں ہو گئی اور خوف زدہ نگاہوں سے میری جانب نکلتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولی۔ ”کک..... کیا تم نے..... شکورے کو قتل کر ڈالا؟“

”اس کا میرے ہاتھوں یہی انجام ہوتا تھا۔ اس نے میری ماں کو اغواء کرنے کا ناقابل معافی جرم کیا تھا۔“

جوازہ لے رہی تھیں۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کسی ولن ہی جیسی نظر آتی تھی۔  
”تمہارا نام کیا ہے.....؟“ اس نے بدستور اپنی تیز بھانپتی ہوئی نظریں میرے وجود پر مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”نادر علی خان۔“

”غزالہ سے تمہاری کب سے دوستی ہے؟“ اس نے اگلا سوال پوچھا۔ لہجہ خشک تھا۔

”میری اس سے دوستی نہیں ہے۔“

”تم اسے جانتے بھی نہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”ہوں.....“ اس نے ایک لمبی سی سرسری ہرکاری خارج کی۔ ”یہ سچ کہہ رہا ہے غزالہ؟“ اس

نے اس بار غزالہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ جبکہ ادھر میں بھی اس کے بارے میں  
”جینی“ اندازہ لگا چکا تھا کہ یہی اشتقاق شاہین تھا۔ انڈر ورلڈ فلم مافیا کا ڈان اور ایک خطرناک گینگسٹر۔

جواباً غزالہ نے مرتعش آواز میں اس سے کہا۔ ”ہاں..... یہ سچ کہہ رہا ہے۔“

اس کے بعد اشتقاق شاہین نے غفورے کے ساتھ کھڑے اپنے دو ساتھیوں سے کہا۔ ”اے یہاں  
سے لے جاؤ۔“

اشارہ غزالہ ہی کی طرف تھا۔ مگر اپنا یک غفورے نے مداخلت کرتے ہوئے اشتقاق شاہین سے  
دُبانہ کہا۔ ”یہ جھوٹ بول رہی ہے، چیف!“

میں اور غزالہ سناٹے میں آ گئے۔ اشتقاق شاہین خاموشی سے غفورے کا چہرہ نکلنے لگا۔ وہ اپنے چیف کی  
اٹوٹی مگر مستفسرانہ نظروں کا مطلب بھانپتے ہی مزید بولا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے نادر کی ڈھال بن کر اس کی مجھ سے جان بخشی کی سفارش کی تھی۔“

غفورے کی اس بات پر اشتقاق شاہین نے تیز اور سنسناتی نظروں سے غزالہ کو گھورا۔

”مجھ سے جھوٹ بولنے کا انجام جانتی ہو؟“

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ جواباً غزالہ نے ہراساں ہونے کے باوجود قدرے سکون سے  
اب دیا وہ شاید خود کو کسی حد تک سنبھال چکی تھی۔ ”غفورے نے ایک دم ہی اس پر اپنی گن تان لی تھی۔

اسے ہلاک کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ یہ خون ریزی میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔“ غزالہ نے جواب دیا۔

”لے جاؤ اسے۔“ اشتقاق شاہین نے کھر کھراتے لہجے میں کہا۔

”دونوں ساتھی، چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آئے اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اب  
میں ہم تین افراد رہ گئے تھے۔

”تم بیٹھو!“ اشتقاق نے غفورے سے کہا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”تم نے ہمارے ایک اہم آدمی، شکورے کا قتل کیا ہے۔ اس کی سزا تم خود تجویز کرو گے۔“ معا  
فاق نے میری طرف گھور کر سرسراتے لہجے میں کہا تو میں نے بھی اسے وہی جواب دے ڈالا جو ذرا دیر

میں غفورے کو دے چکا تھا۔ مگر اشتقاق شاہین میرے اس جواب سے متفق نہ ہوا۔ اس کی عجیب  
سیت تھی، یک وقت وہ سرد مزاج اور سفاک انسان بھی محسوس ہوتا تھا اور تحمل بھی۔ اس نے غفورے کو

لب کر کے گمبیر لہجے میں کہا۔

”یہ تمہارا مجرم ہے۔ اس نے تمہارے بھائی کو ہلاک کیا ہے۔ اس کی سزا بھی تم خود بخود تجویز کر لو۔“

”یرغمال تو تم نے مجھے بھی بنا رکھا تھا، بلا کسی سبب کے..... کیوں؟“ وہ بدستور غضب ناک لہجے  
میں بولا۔ میں نے کبھی بلا تامل کہا۔

”ہم تمہیں پولیس سے تحفظ دینا چاہتے تھے۔ کیونکہ ایس پی ظہیر قریشی اور ڈپٹی رانا مشتاق تمہاری  
تلاش میں چھاپے مار رہے تھے۔ تمہارا پولیس کے ہاتھ آ جانا، ہمارے دشمنوں کے مفاد میں تھا۔

”جھوٹ مت بولو نادر علی خان!“ وہ زنجی دندنے کی طرح غرایا۔ ”حقیقت یہ تھی کہ تمہارا وہ نام نہاد  
انگل اعظم اور تمہاری ناگن صفت ماں مجھے قتل کر ڈالنا چاہتے تھے تاکہ ملک سردار خان کے قتل کا کیس

ہمیشہ کے لئے داخل دفتر ہو جائے۔ میری نمک حلائی کا یہ صلہ ملا ہے؟“

”اس میں تمہاری جلد بازی کا دخل تھا۔“ میں نے لہجے کو پُر سکون رکھتے ہوئے کہا۔

”بکو اس بند کرو..... اب اپنی بھیا یک موت کے لئے تیار ہو جاؤ نادر علی خان!“ وہ غضب ناک

لہجے میں غرایا۔ اس کے خطرناک تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے اسی وقت گولیوں سے بھون دے  
کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے وجود میں تنفسی پھیل گئی۔ اس کے باقی دونوں مسلح ساتھی میری جانب اپنی گنوں کا

رخ کئے نہایت مستعد کھڑے تھے جبکہ غزالہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ میری عقابانی نظریں  
بظاہر غفورے کے پیش آور چہرے پر جمی ہوئی تھیں لیکن ساتھ ہی ٹرائیک پر اس کی انگلی کا بھی جائزہ لے

رہی تھیں۔ اب کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

”نہیں..... ٹھہرو..... پلیز ٹھہرو۔“ اچانک غزالہ میرے عقب سے چلائی اور پھر میری ڈھالی  
بن کر غفورے سے ملاتیانہ لہجے میں بولی۔ ”مجھے چیف صاحب سے ملوؤ۔ ان سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔“

اس کی بات پر غفورے کے گینڈے جیسے بد صورت چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”لگا  
ہے، نیا یار پال لیا ہے۔ چلو..... ہم تم دونوں کو اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔“ دوسرے ہی لمحے

وہ درشت لہجے میں بولا۔

میں نے بے اختیار طویل سانس لی۔ وہ ہمیں شاید اپنے چیف اشتقاق شاہین کے پاس لے جانے  
کے لئے آیا تھا۔ ہم دونوں نے ان کی رائفلوں کے اشارے پر حرکت کی اور کمرے سے باہر آ گئے۔ ایک

روشن رامداری سے چلتے ہوئے نشست گاہ کی طرز کے کمرے میں آ گئے۔ اس دوران میں نے گرد و پیش کا  
جائزہ لیا تھا۔ یہ کسی شاہانہ طرز کی کونشی کا اندرونی حصہ تھا۔

میری نظر سامنے پڑی، ایک لگژری طرز کے فیملی صوفے پر وہ بھاری بھر کم شخص اپنا دایاں بازو صوفے  
کی پشت گاہ پر پھیلائے ہوئے شاہانہ کدو فر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

پینتالیس، پچاس کے درمیان میں اس کی عمر کا اندازہ ہوتا تھا۔ جسم بھاری بھر کم ضرور تھا مگر توند مند  
سر کے بال بہت لمبے، گھنے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ قلمیں لابی لابی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندی چٹا

تھیں جن میں خباثت بھری چمک تھی۔ اس نے عام سی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ شاید  
کاشب خوالی کا لباس تھا۔ تاہم مجھے حیرت تھی کہ رات کے اس آخری پہر میں اسے ہماری ”پیشی“ کرا۔

کی اتنی جلدی کیا پڑ گئی تھی۔  
اس نے غزالہ پر تو ایک اچھتی سی نگاہ ڈالی تھی جبکہ میرے چہرے پر اس کی تیز سرسراتی ہوئی نظر

کر رہ گئی تھیں۔

”بیٹھو!“ اس نے کھر دے لہجے میں کہا۔

ہم دونوں اس کے سامنے کے صوفے پر براجمان ہو گئے۔ میری نظریں ابھی تک اس کے چہرے





پھر جب اس کی آواز دور چلی گئی تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوبارہ کھجے کی طرف بڑھا۔ اس کھجے پر چڑھنا بھی آسان نہ تھا۔ یہ بالکل گول تھا۔

میں اس سے لپٹ کر اپنے دونوں ہاتھوں پیروں کی مدد سے دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ بہت مشکل اور مشقت طلب کام تھا۔ ابھی میں نصف کھجے تک ہی چڑھ پایا تھا کہ بری طرح ہانپنے لگا۔ رکنا بھی کارِ محال تھا۔ تقاضا یہی تھا کہ کارِ مسلسل جاری رکھا جائے ورنہ کھجے میرے ہاتھوں سے پھسل جاتا اور میں نیچے آ رہتا۔ میں نے ہمت مجتمع کی، پھر کوشش شروع کر دی اور بالآخر سرے تک جا پہنچا۔ سرے پر اتنا ضرور تھا کہ دو عدد آہنی راڈ منسلک تھے تاکہ ان پر بے آسانی تک کر ڈی پی باکس میں کام کیا جاسکتا تھا۔ جبکہ میرا ”کام“ دوسرا تھا۔ میں نے اندر کونھی میں جھانکا۔ یہ کونھی کی اصل عمارت کے عقبی احاطے کی دیوار تھی۔ درمیان میں خلا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی گمنام گوشے سے روشنی کا جگمگا پھیلا ہوا تھا۔ اب میں غصے کا شکار تھا۔ ٹیسٹر تو تھانہیں کہ تاروں میں برقی رو کی موجودگی کو چیک کر سکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں آہنی پول پر تھا۔ آہنی باڑ پر اگر کم واٹ کی برقی رو دوڑ رہی تھی تو وہ میرے آہنی پول پر ہونے کی وجہ سے مجھے ذہل شاک پہنچا سکتی تھی۔ اور خود میں ”ٹیسٹر“ بننے کا رسک بہر حال نہیں لے سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے فون کے کھجے پر نصب آہنی راڈ کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ دھمکی تھی۔ اس کے ”نٹ“ آدھے باہر نکلے ہوئے تھے جبکہ بولٹ غائب تھے۔ میں نے انگلیوں کی مدد سے اٹھیلے پڑے ہوئے نٹ کھول کر نیچے پارسل کئے اور آہنی راڈ نکال لی۔ اس کے بعد میں نے اس طرح کمال مہارت سے آہنی راڈ کو دو روہ آہنی باڑ پر اچھالا کہ وہ دونوں سے ٹکرائے اور اندر گرنے کی بجائے اہری گرتے۔

ایسا ہی ہوا۔ راڈ دونوں سے ٹکرائی اور نیچے گر گئی مگر کوئی چنگاری نہ چھوٹی۔ تسلی ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے ہاتھ بڑھا کر ایک فولادی بریکٹ کو پکڑا اور پھر اچھل کر دیوار کی منڈیر پر آ گیا۔ اب میرا زیادہ دیر بلندی پر نکلے رہنا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میں کسی کی نظروں میں بھی آ سکتا تھا۔ میں نے نوڈ کو خاردار باز میں الجھنے سے بچایا۔ اندر کی طرف نیچے جھانکا۔ اس جانب دیوار پر بلندی میں واٹر ٹینک غائب یہاں سے مسلسل اوور فلو ہونے کے باعث کونھی کے اس عقبی حصے میں خاصی سیلن تھی اور کافی زدہ بجائیاں سی نیچے آ گئی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ میں احتیاط سے نیچے کود گیا۔ نیچے سیلن زدہ کالی میں جمع شدہ پانی میں جھپکے سے گرا اور پھر وہیں جم کر سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔

خیر خیریت ہی رہی۔ میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ اب اندر داخل ہونے کا مسئلہ تھا مگر مجھے امید تھی کہ اس مسئلے کے حل کے لئے کوئی دروازہ کھلا ہی جائے گا۔ میں نے جیسے ہی مدھم روشنی میں آگے قدم بڑھائے، اچانک مجھے ہلکی سی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ یہ عقب سے آئی تھی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ عقب میں مڑ کر دیکھا تو سکتے میں آ گیا۔ ایک قد آور، اعلیٰ نسل کا اسیٹن کتا مجھے اس دخل در مقولات پر خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں ایسے پالتو کتوں کی سرشت سے واقف تھا۔ یہ بھونکتے کم تھے اور شکار پر جھپٹ کر اسے بری طرح بھنبھوڑ دینے کے عادی ضرور تھے۔ اس کے ادھ کھلے ہیاں تک بڑوں سے دونوں کیلئے شکاری دانت خونخواری جھلک دکھا رہے تھے۔

پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگا دی۔ دو بدحووانی مقابلے اس سے پہلے تجربہ ہو چکا تھا۔ ماموں حیدر گل کے ساتھ ایک بار شکار پر میں گیا تھا اور واسطہ ایک

یہ سب سوچتے ہی میں نے غزالہ کو ان شیطانوں کے ٹولے سے رہا کرانے کا حتمی ارادہ باندھا اور جیب کو ویران اور سنان سڑک پر تیزی سے یوٹرن دیا۔ چند ثانیے بعد ہی میں، خدائی فوجدار کی طرزِ اشفاق شاہین کی کونھی کی طرف تیزی سے اپنی جیب دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ میں گلیبرگ سے زیادہ دور نہ گیا تھا۔ وہاں سے بہ مشکل چند کلومیٹر تک کا ہی تو فاصلہ طے کیا تھا۔

تاہم گلیبرگ کے علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک بلاک پہلے ہی اپنی جیب کی تاریک گوشے میں کھڑی کر دی اور خود نیچے اتر آیا۔ میں نے براؤن جینز اور ہاف آسٹین کی سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر لیدر کی سیاہ جیکٹ تھی۔ میگارد میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تھا۔

میں قدرے تیز تیز قدموں سے اشفاق شاہین کی کونھی کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میرے دونوں طرف کٹھیں اور بنگلوں میں ویرانی مسلط تھی۔ ہلکی ہلکی روشنی بھی ان کے وسیع احاطوں سے پھوٹی نظر آ رہی تھی۔ تقریباً ہر پر شکوہ کونھی کے آہنی گیٹ پر لگے ستونوں پر سفید گلوب روشن تھے۔ اشفاق شاہین کی کونھی میرے دائیں ہاتھ کی قطار میں تین کٹھیں کے بعد آتی تھی۔

میں دبے پاؤں چل رہا تھا۔ مگر پھر جانے کیسے کونھی کے اندر احاطے میں چھوڑے ہوئے کسی اعلیٰ نسل کے کتے نے میری باہر موجودگی کو محسوس کرتے ہی زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ میں ذرا ٹھنکا اور پھر تیز تیز قدموں سے آگے نکل گیا۔ پھر اپنی مطلوبہ کونھی کے سامنے سے گزرنے لگا۔ کونھی میں ویرانی مسلط تھی۔ یہاں زیادہ تر کٹھیاں ایک منزلہ ہی تھیں۔ میں اپنی مطلوبہ کونھی سے آگے نکلتا چلا گیا۔ یہ کارنامہ واقع تھی۔ دائیں جانب ایک چوڑا گلی نما راستہ تھا جو غالباً آگے جا کر مین شاہراہ سے ملتا تھا۔ یوں مٹر مطلوبہ کونھی کی جنوبی دیوار کے ساتھ ہی اس راستے پر مڑ گیا اور ذرا ٹھہر کر گرد و پیش پر نظر ڈالنے کے بعد دیوار کی بلندی کا جائزہ لینے لگا۔ دیوار نو فٹ سے زیادہ بلند نہ تھی۔ مگر اس کے سرے پر تقریباً چھ فوٹ کے فاصلے پر آہنی بریکٹوں پر تین روہ خاردار آہنی باڑ منسلک تھی۔ ان میں برقی رو موجود ہو سکتی تھی۔ مٹر آگے بڑھا اور اس طرح کونھی کی جنوبی دیوار کے ساتھ عقبی دیوار کی طرف آ گیا۔ اس حصے کے سامنے ایک چوڑا راستہ اور پھر وسیع میدان تھا۔ میں وہاں کھڑا ہو کر عقبی حصے کا ذرا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ یہاں بھی وہی صورت حال تھی۔ یعنی دیوار کے اوپری سرے پر آئرن بریکٹوں سے خاردار آہنی تاروں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ گویا نقب لگانے کی راہیں مسدود ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک میری نگاہ اپنی بائیں جانب ایک دبیلے پتلے پول پر پڑی۔ یہ ٹیلی فون کا کھمبا تھا اور مذکورہ کونھی کی عقبی دیوار کے کسی قدر قریب بھی۔ میرے ذہن میں قریب ترین کھمبے کو استعمال کرنے کا خیال ابھرا۔ کھمبے کے سرے پر ڈی پی باکس نصب تھا اور یہ دیوار سے کافی اونچا تھا۔ ابھی میں نے اس کھمبے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کہیں قریب سے تیز سیٹی کی آواز ابھری اور ساتھ ہی کسی نے بلے آواز میں چلا کر کہا۔

”ہوشیار..... خبردار..... جاگتے رہنا۔“

یہ آواز کسی گشتی چوکیدار کی تھی۔ جو ہر طرف پھیلے سناٹے کو دور تک چیرتی چلی گئی۔ میں سمجھا شاید اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی ہے۔ میں نے بے اختیار آواز کی سمت دیکھا۔ یہ میرے دائیں جانب سے ابھری تھی۔ پھر مجھے ایک ہیولا نظر آیا جس کے ایک ہاتھ میں لائٹن اور دوسرے میں لاشی تھی۔ میں فوراً دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں جانب سے آتا ہوا شینہ چوکیدار جب اندر کی ایک گلی میں مڑ گیا تو مجھے نے سکون کی سانس لی۔

ساتھ حیران و پریشان غزالہ کھڑی تھی۔ وہ کھڑ پڑی کی آواز پر شاید اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔  
 ”ت..... تم.....!“ اس کی لکنت زدہ آواز میں خیر تھا۔  
 ”شش.....!“ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی میں کہا۔ ”آ جاؤ..... جلدی۔“  
 میرے کہنے کی دیر ہی، وہ بلا توقف حرکت میں آ گئی۔ کمرے سے باہر آتے ہی میں نے آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر کے کٹا لگا دیا۔  
 ”نن..... نادرا!..... تم یہاں کیسے؟“ وہ میرے ساتھ ساتھ دے پاؤں مختصر راہداری میں چلتے ہوئے مجھ سے بولی۔  
 ”یہاں سے نکلنے کی کرو..... پھر باتیں کر لیں گے۔“ میرے لہجے میں ہدایت تھی۔

اب ہمارا بیرونی گیٹ سے نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ سردست میں نے باہر تک واپسی کے لئے وہی زینہ اور بالکونی والا راستہ اپنایا۔ بالکونی کی ریلنگ سے میں نے پہلے غزالہ کو سنبھالا دیتے ہوئے نیچے کھڑی ہائی روف وین کی چھت پر اتارا اور اس کے بعد خود بھی اتر گیا۔ پھر ہم ہائی روف کی پھسلوں چھت سے پھسل کر نیچے اتر گئے۔  
 غزالہ اب بھی متوش ہی نظر آ رہی تھی۔ تاہم آزادی کی امید نے اسے کسی قدر حوصلہ ضرور بخش دیا تھا۔ میں نے یہاں لمحے بھر کو کھڑے ہو کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ غزالہ کو اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ایسا لگتا تھا کہ اشتقاق شاہین کے گرگوں کی تعداد یہاں کچھ کم ہی تھی۔ جتنے بھی تھے، وہ سب نرم اور آرام دہ بستروں پر خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ممکن ہے اس کے بیوی بچے بھی یہیں ہوں۔

گیٹ کے قریب مجھے ایک مختصر سا بنگر نما گارڈ کیبن نظر آیا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر تاریکی تھی۔ غالباً محافظ چوکیدار بھی اندر مست الاست پڑا خرائے لے رہا تھا۔ گیٹ کے قریب پہنچے تو میں نے اندر سے اسے مقفل پایا۔ اب گیٹ کے آہنی دروازے پر ہی طبع آزمائی کر کے اوپر سے باہر چھٹا لیں لگانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم اچانک میرے ذہن میں ایک بہل راہ ابھری۔  
 اگر میں گارڈ کیبن کے اندر داخل ہو کر چوکیدار پر قابو پانے کی کوشش کرتا تو یقیناً اس کے پاس سے جالی برآمد ہو سکتی تھی۔ بصورت دیگر آہنی گیٹ کو چڑھ کر پار کرنا بھی بڑے خطر اور محال تھا۔

چنانچہ یہ سوچ کر میں نے غزالہ کو پہلے قریب ہی دو روہ بڑے بڑے گملوں کے چھتارے سے پودوں کی آڑ میں کھڑے ہونے کا کہا اور خود دے پاؤں کیبن کی طرف بڑھا۔ اندر اندر ہوا تھا۔ کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا کہ آیا اندر کتنے افراد تھے؟ ایک سے زائد محافظ ہوتے تو میری اب تک کی یہ ساری مہم اکارت چلی جاتی۔

میرے پاس موبائل میں لگی مارچ تھی۔ چنانچہ میں نے کیبن کی چوٹ پر پہنچ کر اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اس کے سر پر لگے بلب کو دھڑکتے دل کے ساتھ روشن کر دیا۔ روشنی ہوتے ہی میں نے چانک ایک قد آور اور بھاری بھر کم شخص کو خود پر دو ٹاپی بندوق تانے کھڑے ٹھہرتے پایا۔ موبائل میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بجا۔ اندر تاریکی اور باہر مدھم روشنی کے باعث وہ مجھے تو دیکھ سکتا تھا اور جانے کب سے میری حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ جبکہ میں اندر دیکھنے سے قاصر تھا۔  
 ”دونوں ہاتھ اوپر کر لو۔ ورنہ کا تو س فائر کر کے تمہارا جسم چھتی کر دوں گا۔“

وہ خوف ناک لہجے میں غرا کر مجھ سے بولا۔ اس کی بڑی بڑی گھنی مونچھوں میں غضب کا تناؤ محسوس

بھورے خونخوار بھیڑیے سے پڑا تھا۔ ماموں حیدر گل آگے نکل چکے تھے۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ بھونے اچانک عقب سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ بندوق میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی۔ پھر مجھے خونخو جیم بھیڑیے سے دو بدو بزدل بازو مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ”کٹس پوز“ کی مہم کے دوران بھی میں ایک آ سے گزر چکا تھا۔ اس کے علاوہ شاہ میر کی کوشی پر بھی ایسے حالات سے واسطہ پڑ چکا تھا۔

چنانچہ جیسے ہی اس خونخوار اسٹیشن کتے نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگائی، ”ڈسک“ پھینکنے کے ماہرانہ ایتھلیٹ انداز میں ایک ٹانگ پر گھوما اور میری دوسری ٹانگ کتے کی تھو پڑی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی۔ کتے کے حلق سے ”کون“ کی آواز ابھری اور اس کا قد آور وچ زود دیوار سے جا ٹکرایا۔ ہلکی سی ”دھپ“ کے ساتھ وہ کالی زود جھازیوں میں گرا اور چند ثانیے بڑھا کے انداز میں ہلے چلنے کے بعد دوبارہ سنبھلا۔ مگر مجھے اب فوراً اس کا تیا پانچا کرنا تھا۔ لہذا جیسے سنبھل کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرنے لگا، میں نے جھپٹ کر اپنے دائیں ہاتھ کا ”لاک“ اس کی گردن پر فٹ کرتے ہی زوردار جھکا دیا۔ وہ کوئی آواز نکالے بغیر ٹھنڈا پڑ گیا۔

میں نے کتے کی لاش کو جھازیوں میں پھینک دیا اور پھر سامنے کے رخ پر آگے بڑھنے کا ارادہ کر کے عقب میں بڑھا۔ دائیں جانب ایک گلی تھی، یہاں کاتھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ میں آواز پیدا کر کے آگے بڑھنے لگا۔ پھر بیرونی دروازے والے حصے کی دیوار سے ذرا ابھر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ خاموشی اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے کوشی کے بیرونی محرابی دروازے کی طرف قدم بڑھائے مگر اسے بند پایا۔ پھر مجھے منزل کی بالکونی نظر آئی جس کے نیچے ایک ہائی روف کھڑی تھی۔ مگر یہ بالکونی گیٹ کے رخ پر وچ وہاں مجھے کسی چوکیدار کے ہونے کا شبہ تھا۔ میں سب سے پہلے دے پاؤں آگے بڑھ کر وہاں کسی کی موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد بہ آہستگی احتیاط ہائی روف کی چھت پر چڑھ گیا۔ پھر فینسی ٹاپر کی جانب ہاتھ بڑھا کر جھول گیا اور پھر اپنے نچلے دھڑ کو جھٹک کے انداز میں سیکڑ کر اوپر چڑھ گیا۔ بالکونی کے سامنے مجھے ساگوان کی خوب صورت محرابی چوٹ نظر آئی جس پر کوئی دروازہ نہ تھا۔ نے دے پاؤں جھک کر آگے بڑھنا شروع کیا اور ہال میں آ گیا۔ ہال خالی تھا۔ یہ مجھے ہی وی لاؤ محسوس ہوا۔ یہاں زیرو پاور کے دو سبز بلب روشن تھے۔ اب کسی ممکنہ خطرے کے پیش نظر میرا دل پسلیوں کی بجائے میرے حلق میں دھڑک رہا تھا۔

میں کسی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ تاہم مجھے اپنی مہم جوئی پر بھروسہ تھا۔ میں اسی احتیاط کے ساتھ پیش کا جائزہ لیتا ہوا زینے کو دیکھتے ہی اس جانب بڑھا اور پھر دھیرے دھیرے زینے طے کرتا ہوا آیا۔ یہاں سے مجھے اس حد تک محل وقوع کی شناسائی ہوئی کہ جس کمرے میں مجھے اور غزالہ کو مقید تھا، وہ بائیں جانب کی مختصر راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب بھی اسے وہیں رکھا ہوگا۔

میں دے پاؤں مذکورہ راہداری میں آ گیا۔ یہاں دیوار گیر فینسی لیمپ کے اندر کم واٹ کا چلا روشن تھا۔ جلد ہی میں مطلوبہ کمرے کے دروازے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے باہر سے کٹا تھا۔ قفل لگانے کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ ظاہر تھی۔ لہذا میں نے سانس روک کر کٹے کو دھیرے گھما کر کھول اور پھر دور سے ہی لمحے دروازے کو اندر کی جانب آہستگی سے دھکیلا۔ سامنے نگاہ پڑنا میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

میں نے فیول بتانے والی سوئی پر نظر ڈالی۔ فیول ختم ہونے کے قریب تھا۔ یقیناً ان لوگوں نے اس میں فیول ڈلوادیا ہوگا۔ کیونکہ میری جیب میں فیول تھوڑا ہی رہ گیا تھا۔ ان لوگوں نے اپنی پراڈو کا ٹائر برست ہونے کے بعد یقیناً میری پٹھو ہار کو استعمال کیا تھا۔

بہر طور میری مہم کامیابی سے دوچار ہوئی۔ میں جیب کو دران شاہراہ پر دوڑائے جا رہا تھا۔ غزالہ میرے برابر کی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ مجھے ماں کی طرف سے فکر ہو رہی تھی کہ وہ میرے ابھی تک ایئر پورٹ سے گرین لاج نہ پہنچنے پر کس قدر پریشان ہو رہی ہوں گی۔ اگرچہ انہوں نے ابھی تک موبائل پر مجھ سے رابطہ نہ کیا تھا مگر میں نے بھی سردست رابطہ نہ کیا۔ اب ویسے بھی میں گرین لاج ہی تو جا رہا تھا۔ فیول بھروانا ضروری تھا۔ ایک پمپ اسٹیشن سے میں نے یہ کی پوری کی اور پھر موٹروے کا رخ کیا۔ غزالہ کی مسلسل اسرار بھری جیب مجھے تحفے میں ڈال رہی تھی۔ میں نے کن انھیوں سے اس کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ”تمہیں آزادی ملنے پر خوشی نہیں ہوئی؟“

وہ جیسے اپنے اندر کے پُر سوچ بھنور سے ابھر کر قدرے چوکتے ہوئے بولی۔ ”آں..... ہاں..... شاید.....“ مجھے اس کے عجیب سے جواب پر حیرت ہوئی۔

”شاید..... کیا مطلب؟“

”تم نے یہ سب اچھا نہیں کیا نادرا!“ وہ اسکرین پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے بلاوجہ اشفاق شاہین جیسے شیطان سے ٹکر لے لی۔“

مجھے اس کی بات پر غصہ تو آیا مگر تحمل سے بولا۔ ”وہ خبیث تمہارا جانے کیا حشر کرتا۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا ہی نہیں کیا کہ تمہیں ان شیطانوں کے سچ چھوڑ جاؤں۔ میں نے اپنی جان جو کھم میں ڈال کر تمہیں آزادی دلائی اور تم ہو کہ.....“ میں نے آخر میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری بات پر غزالہ نے ذرا گردن موڑ کر میری جانب دیکھا مگر میں نے اپنی نگاہیں سامنے اسکرین کے پار ہی مرکوز رہنے دیں۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

”مجھے غلط مت سمجھو نادرا!..... میں نہیں چاہتی تھی، تم جیسا شریف انسان ان خبیث لوگوں کے ساتھ اچھے۔ رہی میری بات تو میں کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کو قیاس کر رہی ہوں۔“

”اگر مجھ سے ان لوگوں نے اچھے کی کوشش کی تو میں انہیں منہ توڑ جواب دوں گا۔“ میں نے دانت پٹیں کر کہا۔ ”ویسے تو ان خبیثوں کے کالے کروت سے واقف ہونے کے بعد اب میں خود بھی سنجیدگی کے ساتھ ان لوگوں کے خلاف کارروائی کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم بہادری کے ساتھ میرا ساتھ دو گی۔ مگر تم تو خود ہی ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس سمجھتے ہوئے ہو۔“

میری بات پر غزالہ نے قدرے چونکنے کے انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ پھر بے اختیار میرے کانہ سے پراپنا نرم و گداز ہاتھ رکھتے ہوئے جوش و خوشی سے لرزتی آواز میں بولی۔

”کک..... کیا واقعی..... سچ کہہ رہے ہو؟“

”ہاں.....“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ان خبیث لوگوں نے جانے اب تک کتنی معصوم لوگوں کو ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر پامال کیا ہوگا۔ ایسے لوگ ہمارے سماج میں زہر گھول رہے ہیں، ہماری آنے والی نسلوں کو بے راہ روی کے کنوئیں میں دھکیل کر انہیں مفلوج بنا رہے ہیں۔“

”نادرا! کہیں ایسا تو نہیں کر انہوں نے تمہیں با آسانی چھوڑ دیا اور تم انہیں کمزور سمجھ رہے ہو۔“

”میں دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی کبھی نہیں کرتا غزالہ! اور یہی میری عادت ہے۔ مجھے اب تک دشمنوں پر

ہو رہا تھا۔ ایک موٹا سا کالا مسہ اس کے دائیں گال پر آنکھ کے قریب، اس کی صورت کو مزید خونخوار بنا تھا۔ ناچار میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔ وہ میرے سینے پر دو تالی بندوق نکائے دھکیلے ہوئے کیمین سے باہر نکل آیا۔ میرا ذہن اچانک خطرناک پڑنی جوشن پر تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک تو یہ تھی کہ یہ ایلیا ہی اندر تھا۔ دوسرا سہمی ہوتا تو اسے قابو کرنا مشکل ہی ہوتا۔

”کدھر ہے وہ لڑکی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے ساتھ کھڑی تھی؟“ اس نے اطراف میں نگاہیں ڈالتے ہوئے درشت لہجے میں مجھ سے کہا اور مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ آخر غزالہ اچانک کہا غائب ہو گئی تھی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اسے اب تک نظر آ جانا چاہئے تھا۔ اس کی بات میں نے غیر ارادی طور پر لگے چھتار پودوں والے گملوں کی طرف دیکھا تو مجھے وہاں نظر نہ آئی۔

”پتہ نہیں۔ ابھی تو ادھر ہی تھی۔“ میں نے کہا تو اچانک مجھے اس کرخت رو چہرے والے گارڈ عجب سے غزالہ نمودار ہوتی نظر آئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑا سا گملا تھا۔ میرے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے گارڈ نے بھی میری نظروں کی سمت آور آنکھوں میں ابھرنے والی ہنڈ کو بھانپتے ہی غیر ارادی طور پر اپنے عقب میں گردن موڑ کر دیکھنا چاہا تھا۔ مگر تب تک غزالہ وہ بھاری گملا اٹھائے اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔

تو مند اور خراش صورت گارڈ کو خود پر زیادہ ہی زعم تھا۔ میرے سینے پر بندوق کی نال نکا کر سمجھا کہ مجھے وہ بے بس کر چکا تھا۔ اس لئے جیسے ہی اس نے اپنے عقب میں دیکھا تو میں بے آسانی اس گملا موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مگر پہلے منظر تھا غزالہ کے گملے کی کارگزاری کا۔ چنانچہ میری مطمئن نظروں نے دیکھا، جیسے ہی موچیل محافظ کو اپنے عقب میں خطرہ محسوس ہوا اور اس نے گردن کو نصف دائرے میں کسی روباٹ کے سر کی طرح گھمایا، غزالہ نے بھی عین وقت پر اسے محتاط ہوتا دیکھتے ہی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گملا اس کے سر پر دے مارا۔

گارڈ کے حلق سے ایک عدد خراش رسیدہ کراہ خارج ہوئی اور ادھر میں نے اس ڈر سے کہ کہیں کجنت کی انگلی لہبی پر غیر ارادی طور پر ندب جائے، ایک ہاتھ سے بندوق کی نال پکڑ کر اوپر کر دی۔ آخر نیچے کر زردار آواز کے ساتھ پاش پاش ہو گیا۔ محافظ ضرب کی شدت سے کھڑے کھڑے لہرا گیا تھا کجنت سخت جان ثابت ہوا تھا۔ باقی کی کسر میں نے پوری کر دی تھی کہ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھلا پڑتے ہی بندوق میں نے کھینچ کر جھپٹی لی اور اسے نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھمانے کے انداز میں اس کے سر پر رسید کرنا چاہی مگر اس سے پہلے ہی وہ زمین پر جا گرا۔

میں نے لپک کر اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ میری توقع کے عین مطابق چابی اس کے پاس تھی۔ مگر پھرتی سے اٹھا۔ ایک ٹھکی ہوئی نگاہ کوٹھی کے مرکزی دروازے پر ڈالی۔ گملا نوٹنے کی آواز سے کوئی نیلہ جاگا تھا۔ پھر میں تیزی سے گیٹ کی جانب بڑھا اور ٹھل کھول دیا۔ پھر آہستگی سے دروازے کا ایک ہنڈ کر کے ہم دونوں باہر آ گئے۔

”میری جیب وہاں کھڑی ہے، بھاگو!“ میں نے باہر تاریکی میں آتے ہی غزالہ سے کہا اور پھر دونوں دوڑ پڑے۔

جیب کے نزدیک پہنچ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر اسے جب تک اسٹارٹ کیا تو غزالہ بھی لپک کر میرے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر براجمان ہو چکی تھی۔ اسٹارٹ ہوتے ہی میں نے گیر بٹرل کر ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔

[illegible]

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ماں نے اسی وقت انکل اعظم خان سے فون پر رابطہ کیا۔ غورے

”چلا تو جاؤں میں، جی کڑا کے سر جی!..... مگر ایک ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔“ فیجر مشتاق نے منہ بسور کر کہا۔ کاشانہ مسکرا کر رہ گئی۔

”کون سی بات؟“ میں نے قدرے چونک کر مشتاق سے پوچھا۔

”رب نواز کا فون آیا تھا۔ دھمکی دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا، اپنے نادرمیاں سے کہنا، وہ میری بیٹی کے کانڈھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی بزدلانہ حرکت نہ کرے، جی کڑا کے۔“

”کب آیا تھا فون؟“ میں نے دانت پیس کر پوچھا۔

”دو گھنٹے پہلے آیا تھا، جی کڑا کے۔“

”تم نے کیا جواب دیا؟“

”میں نے کیا جواب دینا تھا سر جی! جی کڑا کے۔“ فیجر مشتاق منہ پھلا کر بولا۔ ”میں نے تو صرف یہ کہا کہ نادرا صاحب آجائیں تو یہ بات آپ ہی ان سے کہہ دیجئے گا، جی کڑا کے۔“

”ہوں..... ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ میں نے کہا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے کاشانہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ اس نے جینز کے اوپر ڈھیلی ڈھالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بوائے کٹ بالوں میں پیرے کر رکھا تھا۔ فیجر مشتاق کی بات اس نے بھی سن لی تھی اور اس کا دلکش چہرہ ایک دم ہی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے یونہی ازراہ نقض کاشانہ سے کہا۔

”سن لیا آپ نے اپنے ابا حضور کا دھمکی آمیز فرمان؟“

میری بات پر وہ بے اختیار ہنسی اور اس کا غصہ چنگی بجاتے ہی کافور ہو گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ غبیہ ہو کر بولی۔ ”میں آپ سے کہہ چکی ہوں، وہ میرا باپ بننے کے لائق نہیں ہے۔ اور نہ ہی بن سکتا ہے۔ وہ صرف میری ماما کا شوہر ہے اور بس۔“

”خیر چھوڑیں، میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔ رب نواز کھیانی ملی کی طرح کھانا نوج رہا ہے۔ لیکن بری کچھ میں نہیں آ رہا، آخر اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ شاہ بلوط کی دوسری کھپ کی واپسی آپ کی ہن منت ہو سکی تھی؟“

”میں سمجھ گئی۔“ وہ یکدم کچھ سوچے ہوئے بولی۔ ”ضرور میرا وہ موبائل اس کے ہاتھ لگ چکا ہوگا اس کے اندر میں نے رب نواز کے چند ”کارآمد“ اور ٹیٹیکل جملے ریکارڈ کر رکھے ہیں۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”میرا موبائل دو دن پہلے کھو گیا تھا۔“ وہ پُر سوچ انداز میں بتانے لگی۔ ”مجھے یاد تھا، جب میں اپنے ترمشکی تو میں نے اپنے دونوں موبائل دراز میں رکھے تھے۔ بعد میں مجھے ان میں سے ایک پڑا ہوا دھرا کم تھا۔ آج وہ جب مجھے دوبارہ وہیں پڑا ملا تو میں نے ریکارڈ شدہ جملے سننے چاہے تو پتہ چلا اس ڈیٹا Delete ہو چکی تھی۔ اب میرے شبے کی تصدیق ہو گئی کہ یہ اس کیسے کگل خان کی ہی حرکت کرتی ہے۔“

”خیر چھوڑیں اس بات کو۔ آپ سنائیں، کیسے آنا ہوا“ میں نے کہا۔ پھر جیسے کچھ یاد آیا۔ ”ارے، میں بھول ہی گیا، آپ کیا پتہ لگ گئی؟“

”اچھی سی چائے پلوادیں۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولی۔

میں نے انزکام پر فیجر مشتاق کو چائے بھجوانے کا کہا تو اس نے عادت کے مطابق یکدم لقمہ دیا۔ ”سر! یہ کن خرابہ ہے؟ اس سے جان چھڑائیں۔ کچھ ٹھیک کردار کی لڑکی نہیں لگتی، جی کڑا کے۔“

چند ثانیے بعد ہی میں نے اس گرے کھر کی کار کو گیٹ کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس میں دو افراد تھے۔ دونوں ہی گردنیں موڑے اندر دیکھ رہے تھے۔ میں نے گیٹ پر متعین اپنے دو گن بردار محافظوں میں سے ایک کو کار کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ شاید ان سے یہاں رکنے کا مقصد پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ محافظ کے کار تک پہنچنے سے پہلے ہی کار اچانک تیزی کے ساتھ بڑھ گئی۔

میں ان کی اس مشکوک حرکت پر ٹھٹکا اور تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر آ گیا اور دور ہوتی اس گرے کھر کی کار کو جاتے دیکھتا رہا۔ رفتار غیر معمولی تیز تھی۔ محافظ مجھے دیکھ کر ذرا خفیف ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ”کتے افراد تھے؟“

”جناب! وہی تھے۔“ وہ مودبانہ بولا۔ اس اثناء میں میرا فیجر مشتاق بھی اپنی طوطے جیسی ناک پھٹکی پر اڑکوں کے دیدوں جیسی گول گول عدسوں والی عینک نکائے وہاں آن پہنچا تھا۔

”کوئی بات کی انہوں نے؟“

”نہیں جی۔“

”کیسے لگتے تھے؟“

”مقامی تو ہرگز نہیں لگتے تھے جی، یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ محافظ نے بڑے اعتماد ساتھ جواب دیا۔

”کیا ہوا سر جی؟“ معافی بخش مشتاق نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے محافظ سے کہا۔

”تم محتاط رہو۔ ہو سکتا ہے، یہ لوگ دوبارہ یہاں سے گزریں۔“

”ٹھیک ہے جناب! آپ بے فکر رہیں۔“

”سر جی! وہ شانہ..... بہ شانہ..... اوہ میرا مطلب ہے جی کڑا کے.....“ فیجر مشتاق دوبارہ لقمہ دیا اور میں اس کے ہمراہ واپس اپنے گلاس کیمین آفس کی طرف بڑھ گیا۔

اندرا کاشانہ بے چینی سے میری منتظر تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے گداز لبوں پر دلکش مسکراہٹ اُبھری۔ ”ہیلو..... کاشانہ! کیسی ہیں آپ؟ معافی چاہتا ہوں، آپ کو میرا بہت انتظار کرنا پڑا۔“ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ اس نے حسب عادت فوراً مصافحے کے لئے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھا دیا طوعاً و کرہاً مجھے اس کا ہاتھ تھامنا پڑا۔ ایک طرف بولنے کے جن کی طرح کھڑا فیجر مشتاق اُلوؤں! دیدے گھماتا ہوا ہولے سے بڑبڑایا۔

”جی کڑا کے.....“ شاید کاشانہ کے مجھ سے بے باکانہ انداز میں ہاتھ ملانے پر اس کی طوطے منفعی سی ہو گئی تھی۔

”جی..... آپ نے کچھ کہا؟“ معافی کاشانہ نے اپنی گردن ذرا موڑ کر پاس کھڑے فیجر مشتاق سے پوچھا۔

”نہیں جی، شاخیا نہ صاحب! میں نے بھلا کیا کہا، جی کڑا کے! وہ منہ بسور کر بولا تو میں نے نظر اُسے گھورا پھر کاشانہ سے مسکرا کر بولا۔

”یہ اس کا کیہ کلام ہے۔ یوں ہی اونگی ہو گئی لارتا رہتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے فیجر مشتاق سے کہا۔ ”آپ جائیں یہاں سے۔“

”تم خود آکر کہہ دو۔“ میں دانت پیس کر بولا۔

”م..... میں چائے بھجواتا ہوں، جی کڑا کے۔“ وہ یک دم شپٹا کر بولا اور میں نے مسکرا کر کام کار سیور رکھ دیا۔

”نادر صاحب! وہی بات ہوئی جس کا ذکر تھا۔“ وہ گہری متانت سے بولی۔ ”اب آپ کا ساٹھا والا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا ہے۔ خبر، آپ فکر نہ کریں۔ میں کچھ تحریری ثبوت اکٹھے کر رہی ہوں اور آپ دکھانے کے لئے اسے ساتھ لائی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے خوب صورت سے ہینڈ بیگ کو میز اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور پھر اس کی زپ کھولنے کے بعد اندر سے چند کاغذ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ سودے کی تفصیل ہے جو آپ کے مرحوم ماموں حیدر گل اور رب نواز درمیان طے پایا تھا اور دیگر خطوط بھی ہیں۔“

میں نے کاغذات کا وہ مختصر پلندا اس کے ہاتھوں سے لیا اور یہ غور جائزہ لینے لگا۔ ان میں سودے تفصیل کے علاوہ ماموں حیدر گل کی طرف سے احتجاجی خطوط بھی تھے جس میں ساٹھ لاکھ کی مالیت دیکھ زدہ لکڑی بھیجنے پر احتجاج کیا گیا تھا۔ نیز اس میں عدالتی سن ٹائپ بھی تھے جو سرکاری بیلٹ ذریعے رب نواز کو ارسال کئے گئے تھے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی تھی۔

”یہ ناکافی ثبوت ہیں۔“ میں نے ان کا سرسری جائزہ لینے کے بعد انہیں ایک طرف رکھتے ہوئے دلی سے کہا۔ ”تاہم آپ کے تعاون کے لئے میں شکر گزار رہوں گا۔“

میری بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ جانے کیوں مجھے اس کی نگاہوں کی چلن عجیب سی گہرائی محسوس ہونے لگی۔ پھر وہ اسی گہرے پن سے مجھ پر بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”نادر صاحب! اس میں شکریے کی کون سی بات ہے؟ آپ کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے اور آپ کا حق ملنا چاہئے۔ لیکن شاید آپ یہ سمجھیں کہ میں رب نواز کے ساتھ اپنی ذاتی محاصرت کی وجہ سے ایسا کر رہی ہوں تو یہ بھی غلط ہے۔ ٹھیک ہے، میں اسے ناپسند کرتی ہوں لیکن وہ میری ماما کا شوہر۔ میری ممانے اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ دیکھا جائے تو سارا قصور میری ماما کا ہے۔ مگر نادر صاحب! میں اپنے پاپا کے بہت قریب تھی۔ وہ میرے پاپا بھی تھے، میرے دوست بھی۔ وفات کے بعد میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ میرے اندر ایک خلا آباد ہو گیا تھا۔ میری ماما کو چاہا کہ وہ اپنی ممتا کے ذریعے یہ خلا پُر کرنے کی کوشش کرتیں لیکن وہ اپنی زندگی میں مگن رہتی تھیں۔ پھر انہوں نے بیوہ ہونے کے بعد رب نواز سے شادی کی تو میرے اندر کا خلا اور وسیع ہو گیا۔ میرے احساس محرومی مزید گہرا ہو گیا۔ بالآخر میں اس قدر دل برداشتہ ہوئی کہ پورے ایک سال تک دنیا پر نکل گئی۔ جب میں نے دنیا دیکھی تو پتہ چلا کہ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اور جتنی حسین، اتنی ہی ناچھی۔ مگر یہ غیبتیں بھی خود انسان ہی اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے۔ اصل زندگی، جس میں ایک الویغی راز پنہاں ہوتا ہے، وہ محض دوسروں کے کام آنے میں ہی ہے۔ دوسروں کے کام آنا، دوسروں کے بھلائی کرنا، دل و جان کو کس قدر تسکین پہنچانا ہے۔ بس نادر صاحب! میں اس تسکین کی بھوک ہوں

آپ کی مدد کرنے کے پیچھے درحقیقت میرا یہی جذبہ کارفرما ہے۔“

وہ اپنی رو میں جانے کہاں سے کہاں چلی گئی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی باتیں سچی تھیں۔ ایک آزمائش اور پختہ تجربے کا نچوڑ تھیں۔ وہ اس وقت واقعی ایک عجیب لڑکی کے روپ میں نظر آ رہی تھی کہ بیک وقت دو روپ تھے۔ ایک جذباتی و شجیہ جبکہ دوسرا کھلنڈرا اور لا اُبالی۔

”ارے..... یہ میں کیا اول فول بک گئی۔“ وہ اچانک منفعلسی ہو کر بولی۔ ”میں آپ کو بہت جلد وہ اہم ثبوت بھی لا دوں گی جن کی بنا پر آپ رب نواز کے خلاف.....“

”کاشانہ صاحبہ!“ میں نے اچانک اس کی بات کاٹ لی اور گہری متانت سے بولا۔ ”آپ کے والد..... سوری، میرا مطلب ہے رب نواز کی اس دھمکی کے بعد یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ آپ اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کر رہی ہیں۔ میں اس کی دھمکی کو اڈل تو درخور اعتنا سمجھتا ہی نہیں ہوں لیکن اب میرا غصہ یہ گوارا نہیں کرے گا کہ میں سوتیلے باپ بیٹی کے ذاتی عناد سے فائدہ اٹھا کر اپنا آٹو سیدھا کرنے کی کوشش کروں۔ لہذا میں اب آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اس معاملے سے الگ ہو جائیں۔ میں اب خود رب نواز کے طلق میں ہاتھ ڈال کر ساٹھ لاکھ کی رقم وصول کروں گا۔“

میں نے دیکھا، میری اس بات پر کاشانہ کے دلکش چہرے پر غیر مرئی سارنگ آ کر گزر گیا۔ اس کی بڑی بڑی کجراہی آنکھوں کی جھل میں اُداس چاند کا عکس جھلملانے لگا تھا۔ اسی اثناء میں ایک ملازم چائے اور بسکٹ لے آیا۔

ہم دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

”آپ نے میری بات کا برا تو نہیں منایا کاشانہ صاحبہ؟“ میں نے معاً اس کے خاموش اور پھیکے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بے تاثر مسکراہٹ سے بولی۔

”نہیں نادر صاحب! میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ گئی ہوں اس لئے اب اصرار بھی نہیں کر سکتی۔ بہر حال کبھی ضرورت پڑے تو مجھے یاد کر لیجئے گا۔ کیونکہ ایک انسان ہی دوسرے انسان کے کام آتا ہے۔ میں اب چلوں گی۔“

وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں بھی احتیاطاً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں اسے باہر اس کی کار تک چھوڑنے آیا۔ پھر جب وہ جانے لگی تو بڑی گہری نگاہوں سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے عین لہجے میں بولی۔

”نادر صاحب! میں دعویٰ تو نہیں کرتی مگر میں نے ایک دنیا دیکھ رکھی ہے جس کا ماخذ یہی ملا کہ زندگی فقط انجوائے منٹ کا نام ہے۔ مجھے آپ کی آنکھوں میں اُن کے درد کی کک محسوس ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر ایک طوفان چھا ہوا ہے۔ آپ ایسا کریں، کبھی میرے ہاں تشریف لائیں۔ دنیا کے آزاروں سے ہٹ کر ہم تھوڑا مل بیٹھ کر اچھا وقت گزاریں گے۔ پھر دیکھئے گا، آپ خود کو حالات کے سامنے سننے سے تازہ اور پُر عزم محسوس کریں گے۔ کیونکہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے سے دل و دماغ کا بوجھ بھی تو ہلکا ہو جاتا ہے..... اچھا، اب میں چلتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔

اس کی باتوں میں مجھے انوکھا اور عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے مجھے پُرانا تازہ کر دیا ہو۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا ضرور تھا، جس نے مجھے چند ٹائپ کے لئے مہبوت کر کے رکھ دیا تھا۔

”سرہی! آپ تو مجھے کام سے، جی کڑا کے۔“

کاشانہ کے کار ریورس کر کے لے جانے کے بعد میں وہیں کھڑا رہا تو اچانک نہ جانے کب فیجر مشاق میرے قریب آ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ میں ذرا چونکا، پھر اس کی طرف گھوم کر ”شٹ اپ“ کہا اور اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے پیچھے میرے آفس میں چلا آیا۔

وہ سارے انتظامات میں نے فیجر مشتاق کے سپرد کر رکھے تھے۔ میرے اس فعل سے مال کے دیگر زورداروں پر بہت اچھا اثر پڑا تھا اور وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔

بہر طور میں نے فیجر مشتاق کو رخصت کیا اور اس گروے کار والوں کے متعلق سوچنے لگا جنہوں نے اب تک میرا تعاقب کیا تھا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے؟ اور ان کا میرے کس دشمن سے تعلق تھا؟..... ہم گیت پر موجود میرے گن بردار گارڈ کے مطابق وہ مقامی ہرگز نہیں لگتے تھے۔ میں نے سوچا، کہیں تو نہ تھا کہ اپنے جوڑی دار شاہ میر کا عبرت ناک انجام دیکھنے کے بعد نظر حیات نے کسی اور علاقے کو لوگوں کو میرے پیچھے لگا رکھا ہو۔ ایک خیال اشتقاق شاہین کی طرف بھی جا رہا تھا۔ مگر مجھے اس کی بے یوں فوری رد عمل کی توقع نہ تھی۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟..... اچانک میرے ذہن میں ہنسا کا ہوا۔ کیلاش وادی کی پُر خطر اور جاں گسل مہم کا خیال ابھرا اور عامل عاروب کی مکروہ صورت کی نگاہوں میں گھوم گئی جسے میں نے گولی مار دی تھی مگر مجھے اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ وہ زندہ تھا یا عدم درمل ہو چکا تھا۔

میں نے رست و اج میں وقت دیکھا، شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ میں نگینہ کو ایک پل کے لئے نہیں بھولا تھا۔ میں نے امریکہ اور پاکستان کے وقت کا اندازہ کیا اور نگینہ سے موبائل پر رابطہ کرنے کی ش کرنے لگا لیکن رابطہ ممکن نہ ہو سکا۔ کبھی ٹون بگڑ رہی تھی تو کبھی نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔ میں ان اور منتظر ہو گیا۔ ساتھ ہی مجھے یہ پچھتاوا بھی ہونے لگا تھا کہ کاش میں اس کی درجینا (واشنگٹن) آئی کی رہائش گاہ کا فون نمبر ہی لے لیتا۔ میں نے چند گھنٹوں بعد ڈرائی کرنے کا سوچ کر موبائل اپنی میں ڈالا اور پھر جیب میں بیٹھ کر ٹال سے روانہ ہو گیا۔

ٹال سے گرین لاج کی طرف روانہ ہوتے وقت میرا دل و دماغ نگینہ کی طرف الجھا ہوا تھا۔ شام کی ہونے لگی تو مال روڈ سے میں تنہا گلی کی طرف مڑا اور بتدریج جیب کی رفتار بڑھا دی۔

مجھے گرین لاج پہنچنے سے پہلے ماں کو انکل اعظم خان کے گھر سے لیتا تھا اس لئے میرا رخ انہی کی ش گاہ کی طرف تھا۔ وہاں پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ ماں مجھ سے پہلے ہی گرین لاج جا چکی تھیں۔ مجھے ت تو ہوئی۔ اعظم خان بھی گھر پر نہ تھے۔ ان کے ملازم سے معلوم ہوا کہ وہی ماں کو ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے کار میں گرین لاج چھوڑنے گئے تھے اور پھر واپس نہیں لوٹے تھے۔

میں واپس پلٹا۔ اب میرا رخ گرین لاج کی طرف تھا۔ سڑک دور تک ویران تھی۔ میں خاصی تیز کی سے جیب دوڑائے جا رہا تھا۔ اطراف کے بیڑوں پر کجاری شام اترنے لگی تھی۔ فضا میں سرد لہجی اتر آئی تھی۔ میں نے کھڑکیوں کے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ البتہ اندر بیٹھ جلائے کی ضرورت نہیں کی تھی۔

موز کاٹنے ہی اچانک مجھے بریک پینڈل پر پاؤں رکھنا پڑا۔ اگر میں موڑ کاٹتے ہی بروقت بریک نہ تو میری جیب کا سامنے سڑک پر ترچھی کھڑی اس کار سے تصادم ہونا لازمی تھا۔ جیب کے ٹائر زوردار سے چڑچڑائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے سامنے راستہ روکے ترچھی کار پر اپنی نظریں رکھ کر دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش بکھٹ تیز ہو گئی۔ یہ وہی گرے کھڑکی کار تھی جس نے غائب کیا تھا۔ مگر مجھے اس کے اندر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایک ایسی مجھے خطرے کی بو محسوس ہوئی..... سٹے کو ذہن میں خیال ابھرا کہ اسکیلیر دبا کر اور کار کے عقبی حصے کو کھدیراٹا ہوا نکل جاؤں مگر میں یاس نہیں کیا اور پھر ہی کے ساتھ اپنی جیب سے میگا رنکال کر ہاتھ میں پکڑا اور دروازہ کھول کر باہر اتر

”ویسے سرجی! یہ تھی کون، جی کڑا کے؟“ میرے چیخ پر براجمان ہوتے ہی وہ بھی سامنے کی کرسی بیٹھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”یہ ٹھیکے دار رب نواز کی سوتیلی بیٹی کا شانہ تھی۔“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا اور فیجر مشتاق کا اس کی آنکھوں کی طرح کھلا رہ گیا۔ پھر اس کے بعد کسی مشین میں اٹکنے والی گزاری دار آواز میں بولا۔

”سبس..... سرجی! آپ سچ کہہ رہے ہیں، جی کڑا کے؟“

”بغیر جی کڑا کے سچ کہہ رہا ہوں، ہمیں شبہ ہے میری بات پر؟“ میں نے اسے گھورا۔

”نن..... نہیں، میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا جی کڑا کے کہ وہ تو آپ سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے آپ دونوں میں بہت پرانی اور گہری شناسائی ہو، جی کڑا کے۔“

”ہاں..... مگر وہ اپنے سوتیلے باپ سے بالکل مختلف ہے۔“

”سرجی! کب سے آپ دونوں کے سچ یہ سلسلہ چل رہا ہے؟“ اس نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟“

”جج..... جی..... کچھ نہیں۔ بس ویسے ہی زبان پھسل گئی، جی کڑا کے۔“ وہ میرے پیور دیکھا

بوکھلا گیا تھا۔

”تم مجھے ایک بات ذرا سوچ کر بتاؤ۔“

”جی سرجی! پوچھیں۔“

”جس روز رب نواز نے دیمک زدہ لکڑی بھیجی تھی، کون یہ مال لایا تھا؟“

”مہی گنگل خان لایا تھا ٹرک بھرا کر۔ اس وقت میں بھی موجود تھا۔“

”ماموں حیدر گل نے اسی وقت مال چیک کیا تھا یا بعد میں پتہ چلا تھا؟“

”اور سرجی! آپ کے ماموں حیدر گل تو آنکھیں بند کر کے سب پر بھروسہ کر لیتے تھے۔ لیکن اگر

غیر موجودگی میں مال میں نے ہی اتر دیا تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے مردان شاہ کو، اس نے تو اسی چند ہتیر دیکھ کر ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دیمک زدہ ہیں لیکن.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا اور اس کا

ندامت سے سرخ ہو گیا۔ میں نے سرسراتے لہجے میں اسے گھور کر کہا۔

”مشتاق! تم جھوٹ نہیں بولتے ہو اور میں سچ سننا چاہتا ہوں۔“

”جی..... جی سرجی! غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اس وقت بے چارے مردان شاہ کی باند

توجہ نہیں دی تھی اور سارا مال اتر دیا تھا۔“ وہ منغفل ہو کر بولا۔

مجھے اس پر غصہ تو آیا لیکن اب کیا فائدہ؟ فیجر مشتاق ہمارا پرانا آدمی تھا اور بہت مخلص اور دیانت

بھی۔ اس میں یقیناً اس کی بدعتی کا دخل نہ تھا۔ تاہم وہ بے پرواہی کا ضرور مرتکب ہوا تھا۔ البتہ

مردان شاہ کے ذکر پر مغموم ضرور ہوا تھا لیکن میں نے اس کے قاتل کا لانا گ کو بھی جہنم واصل کر

مردان شاہ کے خون کا حساب برابر کر دیا تھا۔

چونکہ مردان شاہ نے میری خاطر اپنی جان کی قربانی دی تھی اور وہ اپنے بوڑھے باپ اور ایک

واحد سہارا تھا۔ اس لئے میں اس کی قربانی کے بعد اس کے باپ اور بہن کو ہر مہینے اتنی معقول رقم بھیجتا

کرتا تھا جس سے ان دونوں باپ بیٹی کی گزراوقات اچھی طرح ہونے لگی تھی۔ یہی نہیں، میں نے مر

شاہ کی جوان بہن کی شادی کا بندوبست اور اس مد میں ہونے والے متوقع اخراجات کا ذمہ بھی اپنے

لے رکھا تھا۔

آیا۔ چہار نو دھڑکتی ہوئی اسرار بھری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دفعۃً ایک ٹھوس شے میرے ہتھول ہاتھ سے ٹکرائی اور میگارد میرے ہاتھ سے چھوٹ کر سڑک پر جا گرا۔ میں نے ابھی سنبھلنے کی کوشش ہی کی تھی کہ معادہ افرو دائیں بائیں کی تاریک جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں باؤں ہوئے پستول نظر آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ پر لگنے والا پتھر سڑک پر پڑا تھا جو یقیناً انہی دو میں سے شاخسانہ ہو سکتا تھا۔

”خبردار!..... کوئی حرکت مت کرنا۔ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔“ ان دو ایک نے کرخت آواز میں کہا۔ میں بغور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ دونوں درمیانے قد کے مگر متانمند نظر آتے تھے۔ یہ مجھے کہیں سے بھی مقامی محسوس نہیں ہوئے۔ ان کی رنگت سرخ و سپید تھی اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا تھا جن میں حد درجہ خونخواری کی چمک ہلکورے لہر انہوں نے شلو کے دار شلوار قمیضیں پہن رکھی تھیں۔

”کون ہو تم لوگ؟“ میں نے ایک سے درشت لہجے میں پوچھا۔

”سوال کرنے کا کوئی حق نہیں تمہیں۔“ دوسرے نے خونخواری لہجے میں غرا کر کہا۔ ”چلو.....

بیٹھو۔“

”ٹھک ہے..... میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔“ میں نے چالاکी سے نرم پڑتے ہوئے ”مگر کم از کم مجھے اتنا تو بتا دو کہ تمہاری مجھ سے آخر کیا دشمنی ہے؟ ہو سکتا ہے، تم لوگوں کو میرے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو؟“

میری بات پر پہلے والے نے دانت پیس کر انتہائی زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ہم دشمنوں کو پچھلے معاملے میں کبھی غلطی نہیں کرتے ہیں۔ کاش ہمیں تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہوتا تو آج سانس نہیں لے پاتے..... چلو اب۔“ مجھے یہ سن کر تسلی ہو گئی کہ کم از کم ان کا مجھے فوری طور پر کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ میں نے ذرا ہمت کر کے دوبارہ کہا۔ ”لیکن تم نے ابھی تک میرے جواب نہیں دیا۔“

”بیٹو!..... یہ ایسے نہیں مانے گا۔“ دوسرے نے دانت پیس کر اپنے ساتھی سے کہا اور اٹھ کر ”بھٹکڑی نما حلقے دار زنجیر نکال لی۔ مجھے دونوں ہاتھ پشت پر کرنے کا درشتی سے حکم دیا جبکہ پہلے سے دس بارہ قدموں کے فاصلے پر اپنا پستول تانے چوکس کھڑا تھا جس کا نام بیٹو تھا۔ یہ نام بھی مجھے صورتوں کی طرح غیر مقامی محسوس ہوا تھا۔

”بیٹو! اگر یہ ذرا سی بھی چالاک کی کرے تو اس کی ٹانگ پر گولی چلا دیتا۔“ بھٹکڑی بہ دست پستول بردار ساتھی سے کہا۔ یہ دونوں میری سوچ سے بڑھ کر چالاک اور محتاط تھے۔ میں نے ہاتھوں ہاتھ پشت کی طرف کر دیئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ شخص میری پشت کی جانب بڑھا اور مجھے بھٹکڑی پہنانے لگا تو میں نے بل کے بل دونوں کی پوز اندازہ کیا۔ اور پھر جیسے ہی میرے عقب والے نے مجھے بھٹکڑیاں پہنانے کے لئے میرے ہاتھوں میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی پوری قوت کے ساتھ اس کا ہاتھ پکڑ کر بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنے کراچی ڈھال بنالیا۔ بیٹو نے گولی چلا دی۔ مجھے چونکہ ”ٹارگٹ“ کا بیٹنگی علم تھا اس لئے میں ہی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دی تھیں۔ نتیجتاً گولی بھٹکڑی والے کی ٹانگ پر بیہوش ہو گئی۔ اسی سے بچ خارج ہوئی مگر میں نے اسے بدستور ڈھال بنائے رکھا۔ بیٹو نامی وہ شخص مارے





میں پوچھا۔

”کبیر! یہ دونوں کون ہیں؟ اور مجھے یہ ریغال کیوں بنانا چاہتے تھے؟“

”میں نہیں جانتا.....“ کبیر نے نہایت غصیلے انداز میں جواب دیا اور اس کے پستول کی لمبی پیریری انگلی نے یکدم جنبش کی۔ رات کے تاریک اور دم بہ خود سنائے میں گولی کی دھماکے دار آواز ابھری اور وہ کبیر کے پیروں کے بالکل قریب سڑک پر چنگاری چھوڑتی ہوئی اچٹ گئی۔ کبیر پہے اختیار خوف زدہ ہو کر اچھل پڑا۔

”جھوٹ نہیں چلے گا کبیر!“ میں غصے سے دانت پیس کر دھاڑا۔ ”تمہیں میرے ہاتھوں کالا ناگ کا انجام تو یاد ہے نا..... مگر اب میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ میرے لہجے کی خوف ناک گھن گرج نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا اور وہ بولا۔

”ان دونوں کا تعلق کیلاشی عامل عاروب سے ہے اور یہ لوگ اس کا انتقام لینے کے لئے تمہیں ریغال بنا کر کیلاش وادی لے جانا چاہتے تھے۔“

اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”مگر وہ تو مر چکا تھا؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”تو کوئی ان لوگوں سے اپنی جان بخشی کا معاہدہ کرتے ہوئے تم نے مجھے ریغال بنانے کے سلسلے میں ان کی مدد کی ہے اور یہاں تک ان کی رہنمائی بھی کی۔“ میں نے زہریلے لہجے میں اس سے کہا تو وہ نہایت ڈھٹائی آمیز صاف گوئی سے بولا۔

”ظاہر ہے۔ اور میں کیا کرتا؟..... جب تم نے ان کی خانقاہ میں خون ریزی پھیلائی تھی اور کالا ناگ کو ہلاک اور عامل عاروب کو زخمی کر کے نگینہ کے ساتھ فرار ہو گئے تھے تو مجھے ان لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ یہ تو شکر رہا کہ مشعل ہو کر عاروب کے پیروکاروں نے مجھے ہلاک نہیں کیا۔ کیونکہ وہ میرے ذریعے تم اور نگینہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔“

”نگینہ.....“ میں زیر لب سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ”نگینہ سے بھلا ان کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟“ میں نے کسی قدر الجھن آمیز پریشانی سے کہا۔

”اس لئے کہ عامل عاروب کے پیروکار اسے اپنے مقدس دیوتا دابولا میزری پر قربان کرنے کا پختہ عزم کر چکے ہیں۔“ اس نے بتایا اور یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے سے مجھے غضب کا کینہ ٹپکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”ہوں.....“ میں نے ایک گھبرائی اور پُر سوچ ہمکاری لی۔ اب میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرے جی میں تو آئی کہ ان تینوں کو اسی وقت جہنم واصل کر ڈالوں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور کبیر سے بولا۔

”کبیر!..... میں تمہیں اس بار چھوڑ رہا ہوں۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کی یا نگینہ کے سلسلے میں ان خبیثوں کی مدد کرنا چاہی تو یاد رکھنا، مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“ یہ کہہ کر میں چوکے زخمی ساتھی سے غضب ناک غراہٹ کے ساتھ بولا۔

”اور تم.....“ اپنے اس کتے عامل عاروب کو جا کر بتا دینا، اگر اس نے نگینہ کا بال بھی بیکا کرنے کی کوشش کی تو میں اسے وہیں آکر کتے کی موت ماروں گا۔ اب تم اپنے ساتھی کو اٹھاؤ اور میرا پیغام لے کر اسی وقت کلاش آؤ۔“

یہ آواز کبیر کی تھی..... وہی کبیر، جو میرا زبردست رقیب بھی تھا اور جانی دشمن بھی۔ اس نے اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع موجودگی پر ایک لمحے کو میں ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔

”شاید میری آواز پہچان گئے ہو؟“ عقب سے اور بالکل قریب ہی اس کی استہزائیہ آواز ابھری۔ میں نے بیوقوفانہ شخص کے اس ساتھی کی گردن چھوڑ دی، جس کی ٹانگ پر اس کے اپنے ہی ساتھی کے پستول کی گولی لگی تھی۔ چنانچہ میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے دائیں پاؤں کی ایڑھی پر اپنے بائیں بازو کی کہنی پوری قوت سے کبیر کے بائیں پہلو میں رسید کر ڈالی۔ اس کے لئے یقیناً اچانک ثابت ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے حلق سے بھیانک کراہ خارج کرتے ہوئے بے اختیار ڈھرا، تکلیف کی شدت کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ کر گر پڑا تھا۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دینے بغیر ہی ایک زوردار گھونسا اس کے جھکے ہوئے چہرے پر بھی دیا۔ ادھر بیٹو نے چلا کر اپنے زخمی ساتھی کو میرے سامنے سے ہٹ جانے کا کہا۔ اس کے ہاتھ تک پستول دبا ہوا تھا۔ اگر اس کا زخمی ساتھی میرے آگے سے ہٹ جاتا تو بیٹو یقیناً بلاتا خیر مجھ پر دیتا۔ لمحے کے ہزاروں جھمکے میں، میں نے صورت حال کا تجزیہ کیا اور دوبارہ بجلی کی سی تیزی کے حرکت میں آ گیا۔

میں نے اس کے زخمی ساتھی کو نہ صرف دوبارہ دبوچ لیا بلکہ اسے اپنی ڈھال بنائے بنائے قریب سڑک پر پڑے کبیر کے پستول پر گرا اور بہ سرعت پستول اچک کر لینے لیتے بلا توقف بیٹو پر گولی دے کر اہمیت انگیز چیخ کے ساتھ سڑک پر گرا۔ میں اپنے میگاڈ کی طرف لپکا۔ میں بیٹو کو کوئی موقع نہ چاہتا تھا۔ وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ میں موجود پستول سے میرا نشانہ لینا چاہتا تھا۔ مگر بدن میں گویا برقی رو دوڑ رہی تھی اور میں خود بھی برقی کی مانند حرکت میں تھا۔ اس سے پہلے کہ بائیں ہاتھ، میں دوڑتا ہوا عین سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر پاؤں کی ٹھوک دی۔ پستول سڑک پر پھسلتا ہوا کچے میں آگے خود روتا ریک جھاڑیوں میں جا پڑا۔

اب میرے دونوں ہاتھوں میں پستول تھے۔ دائیں ہاتھ میں میرا میگاڈ تھا جسے میں نے فورا جیب میں اڑس لیا تھا اور کبیر والا پستول ان پر تان لیا۔ بیٹو کو میں ”خبردار“ کر چکا تھا جبکہ کبیر دوسرا ساتھی سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے انہیں ساکت ہو جانے کا حکم دیا۔

بیٹو ابھی تک سڑک پر اوندھے منہ پڑا کراہ رہا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے بائیں پیوست ہو گئی جہاں سے خون کا اخراج جاری تھا۔ جبکہ کبیر کی ٹانگ سے بہنے والا خون اس کے مزید بھیانک بنائے دے رہا تھا جسے وہ اپنے رومال سے روکنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ باوجود ان دونوں کی قہر ناک نگاہیں میری جانب مرکوز تھیں۔ میرا اور ان دونوں کا فاصلہ زیادہ لمبا نہ تھا۔ میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ یہ کہہ کر مشعل مار نظر دوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا نگینہ یاد آ رہی تھی؟“

”ہاں!..... کیا ہم کسی اور موضوع پر بات نہیں کر سکتے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی بے اختیار میرے منہ سے ایسے جیسے ہوئے الفاظ برآمد ہوئے تھے یا پھر شاید یہ شب بیداری کا چڑچڑاہٹ تھا۔  
”بہت سچ ہوتے چارہے ہوتے۔ کیا اب مجھ سے بھی بات کرنا نہیں برا محسوس ہونے لگا ہے؟“ ماں کے لہجے میں بھی جھین تھی۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے کہا۔  
”ہاں! ایک بات پوچھوں آپ سے؟“

”ہاں!..... پوچھو!“ ماں نے بھی میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔  
”ہاں! آپ کو یاد ہو گا کہ ایک دن آپ نے مجھے بڑے متاثرہ پار سے میری پیشانی پر بوسہ دے کر پوچھا تھا کہ نگینہ مجھے اچھی لگتی ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا اور آپ نے مجھ سے یہ خوش خبری نگینہ کو سنانے کے لئے بھی کہا تھا کہ آپ کو میری اور نگینہ کی شادی پر کوئی اعتراض نہ ہو گا بشرطیکہ نگینہ اپنے باپ شاہ میر کو بھی منائے؟“  
”ہاں!..... مجھے یاد ہے، اچھی طرح۔ اور آج بھی میں اپنی اس بات پر قائم ہوں۔“ میری بات مکمل ہوتے ہی ماں نے بغیر کسی تذبذب یا تردد کے کہا۔  
”تو پھر ماں!..... یہ سب کیا ہے؟“ میں نے کرب ناک لہجے میں ان سے پوچھا۔  
”کیا!..... کیا ہے؟“ ماں نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔

”آپ کا دل ابھی تک نگینہ کی طرف سے صاف کیوں نہیں ہوا؟ اُلٹا آپ مجھ سے بھی بدظن ہونے لگی ہیں۔“ میں نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا تو ماں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔  
”ناور بیٹے! نگینہ کی طرف سے میرا دل کبھی صاف نہیں ہو سکا۔ لیکن تمہاری اور نگینہ کی شادی پر میں معترض نہیں ہو سکتی اس لئے کہ مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔ میں ان روایتی ماؤں میں سے نہیں ہوں جو اولاد کی خوشیوں کو اپنی ذاتی اتا کی بھینٹ چڑھا دیتی ہیں اور پھر یہاں تو کسی اتا کا سوال ہی نہیں۔ یہ تو ایک جنگ ہے..... حق اور انصاف کی جنگ..... جرم اور قصاص کی جنگ۔ ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور جان کے بدلے جان.....“ ماں نے تھوڑا توقف کیا پھر دوبارہ بولیں۔ ”رہی یہ بات کہ میں تم سے بدظن ہوں تو یہ سراسر غلط ہے۔ بھلا ماں بھی اولاد سے ناراض یا بدظن ہو سکتی ہے؟ میں نے تو تم سے صاف اور سیدھی بات کی تھی جسے میں اب بار بار دہرانا نہیں چاہتی۔ ناشتہ کرو، ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ ہاں، تم آج ٹال پر نہ جانا چاہو تو کوئی بات نہیں، آرام کر لو۔“  
وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں۔

”ماں! ایک اور بات پوچھوں؟“ میں نے آخر میں کہا۔

”ہاں، پوچھو۔“

ماں نے اپنے لئے تو س پر کھن لگاتے ہوئے بظاہر سرسری لہجے میں کہا۔  
”آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے بارے میں آپ کوئی سخت فیصلہ کرنا چاہتی ہیں۔“  
میری بات پر ماں کے تو س پر کھن لگاتے ہوئے ہاتھ ایک لمحے کو رک گئے۔ ان کی جھنجکی نظریں میری جانب اٹھیں۔ ہونٹوں کے گوشے کچھ بولنے کو کھپکھپائے۔ میں سر تا پا ان کا حکم سننے کو بے چین تھا۔ انہوں نے بولنے کے لئے لب کھولے مگر دوسرے ہی لمحے سختی سے بھینچ لئے۔ ایک لمحے بعد پرسکون انداز

میرے انداز اور دو ٹوک رویے پر وہ دونوں مجھے خونخوار نظروں سے گھورنے لگے تھے۔ ان کا لب لباب چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبا جاتے۔ اپنی بات مکمل کر کے میں نے کبیر کے پستول سے گولیاں نکال کر ان کی طرف تاریک جھاڑیوں میں اچھال دیں اور پستول سڑک پر پھینک کر اپنی جیب کی طرف بڑھ گیا۔  
ذرا دیر بعد ہی میں گرین لاج کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔

\*\*\*

گرین لاج پہنچا تو میں نے سیکینہ سے پہلے ماں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ بی بی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔ میرے دل کو ہونسا لگا۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی ماں میرے بغیر کھانا نہیں کھایا تھا۔  
”آپ کے لئے کھانا لگا دوں چھوٹے صاحب؟“ سیکینہ نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا۔  
”نہیں!..... مجھے ہوک نہیں ہے۔“

میں نے کہا اور اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ ماں کے روز بروز بڑھتے ہوئے رویے نے مجھے خاصا اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ میں موجودہ حالات و دگرگوں کی کشاکش سے اس قدر متاثر ہوا تھا جتنا ماں کی طرف سے مجھے پریشانی اور تشویش لاحق تھی۔ میرا دل و دماغ گونا گویا آماجگاہ بن رہا تھا۔ نگینہ کی طرف سے الگ مجھے فکر تھی۔ وہ جانے کس حال میں ہو گی؟  
ادھر نظر حیات بھی دانت نکوسے ہوئے تھا۔ بددیانت ٹھیکے دار رب نواز سے الگ میری چپقلش شروع ہو چکی تھی۔ جبکہ انڈر ورلڈ کنٹیکسٹر اشفاق شاہین کو بھی میں نے اب غزالہ والے واقعے کے بعد اپنے پیچھے لگایا تھا اور اب کبیر اور کیلاشی عامل والا دیرینہ معاملہ ابھر کر سامنے آ گیا تھا۔ پھر کبیر کی زبانی سنسنی خیز انکشاف کہ کیلاشی عامل عاروب اور اس کے پیڑوار نہ صرف میری جان کے دشمن بن چکے بلکہ انہوں نے اپنے خود ساختہ دیوتا، ابولا ممیزی کے آگے اب نگینہ کی قربانی دینے کا پختہ عزم کر لیا تو نگینہ کی طرف سے سردست مجھے اس حد تک تو اطمینان تھا کہ ابھی ان خبیث لوگوں کے ناپاک ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ وہ امریکہ جا چکی تھی۔

پریشان خیالات کا ایک جھمکا تھا، جس نے میرے دل و دماغ کو جھجھوڑ ڈالا تھا۔ حالات نے ناچو کھی جنگ میں دھکیل کر رکھ دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پہلے کون سے معاملے میں ہاتھ ڈالوں، کون موخر کروں؟ جبکہ میرے ارد گرد دیدہ و نادیدہ دشمنوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ہر کوئی میری گھات مہم تھا اور وار کرنے کا منتظر۔ ایک جنگ تھی جس کا کوئی بظاہر اختتام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سوچتے سوچتے میرے دماغ کی نیس ڈیکھنے لگیں تو میں یکدم سارے پریشان کن خیالات ذہن سے جھٹک کر سونے کو کشش کرنے لگا۔ مگر نیند بھی جیسے میری آنکھوں کا راستہ ہی بھولے ہوئے تھی۔ میں بھی اس طرح بے پروا نہیں بدلتا رہا اور بالآخر اس طرح میں نے وہ رات گزار دی۔

صبح غسل وغیرہ کے بعد میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو ماں بھی موجود تھیں۔ ماں نے مجھے ناشتے کا ڈبہ بھی نہیں بھیجا تھا۔ تاہم میں نے ماں کو ہولے سے سلام کیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر شاید شب گزشتہ صبح اور بیداری کی جھلک میری نیم غنودہ آنکھوں سے محسوس کر کے ماں نے ہولے سے پوچھا۔  
”ناور بیٹا! کیا ساری رات جاگتے ہی گزاری تھی؟“

”ہاں ماں!..... نیند نہیں آئی تھی۔“ میں نے بے خیالی میں کہہ ڈالا اور فلاسک سے اپنے ایک خالی کپ میں چائے اٹھیلنے لگا۔

دوئم میں گویا ہوئیں۔

”ہاں..... مجھے یہ بھی یاد ہے مگر..... گلینز کی امریکہ سے آمد تک میں نے اپنا یہ فیصلہ محفوظ رکھا۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں ماں! کہ وہ کڑا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے بھی پوچھ ہی لیا۔  
”ابھی میں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتی۔“

یہ کہہ کر انہوں نے سیکنے کو آواز دی اور اسے چائے گرم کرنے کا کہا۔ پھر توش کھانے کے دوران اخبار کا مطالعہ کرنے لگیں۔ اس کے بعد پورے ناشتے کے دوران ہمارے درمیان خاموشی رہی۔ ناشتے کے بعد میں اٹھا۔ تب بھی ماں کچھ نہ بولیں۔

میں نے جیب کی چابیاں اٹھائیں اور جیب میں بیٹھ کر ٹال کی طرف نکل گیا۔ ٹال پہنچا تو ایک بار رنگ کی ہنڈائی کار کو کھڑے پایا۔ میں نے جیب احاطے میں روکی اور نیچے اتر آیا۔ اسی وقت دفعۃً ٹال کے جن کی طرح نیچر مشتاق نازل ہو گیا۔ اس کے چرخ منہ پر بارہ بج رہے تھے اور وہ خاصا گھبرایا نظر آتا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی وہ بوکھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

”سس..... سری! وہ..... وہ آیا ہے..... جی کڑا کے..... ٹھیکے دار رب نواز۔ اس کے ہمراہ وہی دو غنڈے بھی ہیں جو پہلے.....“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا، میں اس کی بات کو نظر انداز کرتا اپنے آفس میں داخل ہوا۔ میرے عقب میں میرے دو مسلح محافظ اور چھ سات مزدور بھی کئی متوجہ بدزنگی کے پیش نظر چلے آئے تھے۔ مگر میں نے انہیں وہیں سے واپس لوٹا دیا۔

اندرا ایک کرسی پر ٹھکنے قد کا بد وضع شخص سیاہ کوٹ پینٹ میں ملبوس براجمان تھا۔ اس کے برابر والا کرسی پر گنگل خان بھی بیٹھا تھا۔ جبکہ اس کے دونوں ساتھی ان کے عقب میں کھڑے تھے۔ یہ تینوں وہاں بد معاش تھے جو ایک دو روز پہلے مجھے دھمکانے آئے تھے اور منہ کی کھا کر واپس لوٹنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ جبکہ یہ قول نیچر مشتاق کے سونڈ بوٹڈ بد وضع سا شخص ٹھیکے دار رب نواز ہی تھا۔ مگر میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے قریب بیٹھے گنگل خان کو گھورتے ہوئے پڑٹیش لے لیا۔

”تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟ گیٹ آؤٹ..... گیٹ لاسٹ۔“  
اس کا چہرہ غصے سے بگڑ گیا مگر رب نواز نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے گیمیر لےجے میں مجھ سے کہا۔  
”نادر علی! آرام سے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ تم بیٹھو۔“

”میں کہتا ہوں تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں کوئی بات نہیں کروں گا۔“ میں نے پھر ٹھیکے دار رب نواز کو نظر انداز کرتے ہوئے گنگل خان کو مخاطب کرتے ہوئے بلند لےجے میں کہا تو ٹھیکے دار رب نواز نے بالآخر ان تینوں کو وہاں سے باہر نکل جانے کا اشارہ کیا۔

گنگل خان مجھے جلتی سلکتی نظروں سے گھورتا ہوا اپنے دونوں ساتھیوں سمیت میرے آفس سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے بعد میں تفحیک آمیز ہنکارا بھرتے ہوئے اپنی بھاری بھر کم چیز پر بیٹھنے کے بعد سامنے بیٹھے ٹھیکے دار رب نواز سے دانستہ سرد لےجے میں بولا۔

”آپ کی تعریف؟“  
”میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم میرے آدمی گنگل خان کو دیکھ کر سمجھ چکے ہو گے..... خیر، بتائے دنا ہوں۔ میرا نام رب نواز ہے۔ ٹھیکے دار رب نواز، جس کے شیشم اور شاہ بلوط کے ٹرک تم نے دھوکے سے

دوئم

”جھپٹا لے ہیں۔“ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔“ میں نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری کوشش تھی کہ میرے تاثرات سے اُن جھن کا اظہار بھی ہو۔ پتہ نہیں میں اس میں کامیاب رہا یا نہیں۔ جواباً وہ ایک زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

”تم نے انجان نہ بنو میاں نادرا!“

میں نے بھی سپاٹ لےجے میں کہا۔ ”وہ چاروں ٹرک تمہارے یہ تینوں کتے لے کر خود آئے تھے جو ابھی باہر گئے ہیں۔“ میرا اشارہ گنگل خان اور اس کے دو ساتھیوں کی طرف تھا۔

”وہ دھوکے سے یہاں لے آئے تھے۔“ وہ بولا۔

”تم نے بھی مجھے جھوٹ بول کر دھوکا دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ ٹرک حویلیاں کے ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پھنس چکے ہیں۔ اور ہاں..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جب تمہیں ہم نے پیشگی پے منٹ کر دی تھی تو ان ٹرکوں پر ہمارا ہی حق بنتا تھا۔ پھر تمہیں آخر اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ہے؟“

میری بات پر وہ لا جواب سا نظر آنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے ڈھٹائی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ مگر تمہارے والے ٹرک میں کچھ دنوں بعد پہنچا دیتا۔ لیکن تم سے پہلے جس پارٹی نے مجھے پیشگی رقم دی تھی، انہیں.....“

”دیکھو رب نواز! مجھے تمہارے لےجے سے بددیانتی کی بو آ رہی ہے۔ تم نے ہمیں مقررہ وقت پر مال دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ ہم نے بھی تو آخر دوسری پارٹی کو بروقت مال پہنچایا تھا۔“

وہ میری دونوں گفتگو پر جزیز ہوئے بغیر بولا۔ ”ٹھیک ہے، میں اپنا تصور مانتا ہوں۔ اب ایسا کرو مجھے ان دونوں ٹرکوں کا مال واپس لوٹا دو۔ میں چند دنوں کے اندر اندر تمہیں تمہارا مال پہنچا دوں گا۔“

مجھے اس کی بات پر بری طرح طیش آ گیا اور طنزیہ لےجے میں بولا۔ ”جس طرح تم نے میرے ماموں حیدر گل کو مال پہنچایا تھا..... دیکھ زوہ؟“

”ان کی بات چھوڑو۔ وہ پرانی بات ہو گئی۔“

”وہی پرانی بات اب نئی ہو گئی ہے ٹھیکے دار رب نواز!“ میں نے اسے گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ”اچھا ہوا تم آ گئے۔ ورنہ میں خود تمہارے پاس ساٹھ لاکھ کے مال کے سلسلے میں آ رہا تھا جو تم نے آج سے کچھ مہینے پہلے میرے ماموں مرحوم حیدر گل کو دیکھ زوہ لکڑی کی صورت میں پہنچایا تھا۔“

میری بات نے اس کے چہرے کے تاثرات کو مزید بگاڑ دیا تھا۔

”نادر میاں! اس معاملے کو بھول.....“

”نہیں بھولوں گا ٹھیکے دار رب نواز! تمہیں ہر قیمت پر وہ ساٹھ لاکھ مجھے ادا کرنے ہوں گے۔“ میں اس کی بات کاٹ کر ٹھوس لےجے میں بولا۔

”میں تمہارے پاس اپنے دو ٹرکوں کی واپسی کے سلسلے میں آیا ہوں۔“

”انہیں بھول جاؤ اور میرے ساٹھ لاکھ دینے کی بات کرو۔“

وہ میرے مسئلے کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا اور میں اس کے مسئلے کو۔ اور حق بجانب تو بہر حال میں ہی تھا۔ وہ دانت کچکا کر بھنائے ہوئے لےجے میں بولا۔

”میں اچھی طرح جانتا ہوں، تم کس کے بل بوتے پر اتنا اڑ رہے ہو؟..... مگر کا شانہ ایک بے خوف اور غیر سنجیدہ لڑکی ہے۔ اس کے کہنے پر چلو گے تو کسی دن منہ کی کھاؤ گے۔“

”ہیلو کاشانہ! میں نادر بات کر رہا ہوں۔“ رابطہ ملتے ہی میں نے ٹیلی فون کے مائیکروفون میں کہا۔ میری آواز سنتے ہی دوسری طرف سے کاشانہ کی پُرسرت آواز ابھری۔

”ہیلو نادر صاحب! آپ نے مجھے فون کرنے کی زحمت گوارا کر لی بالآخر۔ بہت بہت شکریہ! کیسے ہیں آپ؟“

”بالکل ٹھیک..... آپ سنائیں۔“ میں نے قدرے بے تکلفی سے کہا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ کب تشریف لارے ہیں میرے غریب خانے پر؟“

”غریب خانہ کہاں..... آپ کا گھر تو پورا نکل ہے۔ ویسے آپ اس وقت اپنے گھر پر ہی ہیں؟“ میں نے آخر میں پوچھا۔

”ہاں..... اور آپ؟“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”میں اپنے ٹال پر ہی ہوں اس وقت۔ آپ سے ملاقات کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔“

”زہے نصیب۔ مجھے یقین نہیں آ رہا، میری آنکھیں آپ کے انتظار میں فرشِ راہ ہیں۔ پھر آ رہے ہیں آپ؟“ وہ مسرت سے لبریز لہجے میں بولی۔

”نہیں..... ابھی نکل رہا ہوں۔“

”تشریف لے آئیں..... میں سرتا پا آپ کی منتظر ہوں۔“ اس نے بے تابلی ظاہر کی اور میں نے گفتگو کا اختتام کر دیا۔

موبائل آف کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھا اور جیب کی چابیاں سنبھالیں۔ اپنے آفس سے جیسے ہی باہر نکلا، اچانک ایک نیلے رنگ کی آٹوموبیل گیسروالی بی ایم ڈیو تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ میں ٹھنک کر وہیں رک گیا۔ کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر صرف ایک ہی شخص موجود تھا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر کار سے نیچے اُترا تو اسے پہچان کر ایک ایک کی میرے پورے وجود میں چوٹیاں سی ریگنے لگیں۔

وہ اشتاق شاہن تھا۔ انڈر ورلڈ مافیا کا ڈان..... مجھے اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر دو باتوں پر حیرت ہوئی۔ پہلی تو یہ تھی کہ وہ بالکل تنہا تھا۔ دوسری یہ کہ لاہور سے ہی آ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی رہائش گاہ لاہور گلیبرگ کے علاقے میں تھی۔

اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور سیدھا میری طرف آیا۔ میں نے اپنی اندرونی مضطربانہ کیفیات پر قابو پاتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ سجا کر اس کا ہر تپاک استقبال کیا اور فوراً ہی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

”یہ تمہارا دفتر ہے؟“ مجھ سے گویا طوعاً و کرہاً ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے سامنے میرے آفس کیمین کی طرف اشارہ کر کے سرد لہجے میں کہا۔

”آں..... آؤ، خیریت تو ہے؟ ویسے مجھے خوشی ہوئی۔“ میں نے مکاری سے کہا۔ میں جانتا تھا کہ کہاں اور کب مکاری سے کام لینا چاہئے۔

میں اسے لے کر اپنے دفتر میں پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے پاس کیوں آیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ میرے چہرے کو بھانپتی ہوئی نظروں میں لئے ہوئے تھا۔

”نچھو..... پہلے مجھے یہ بتاؤ، تم کیا بوجے؟“ میں نے خوش دلی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے بل کے بل اشتاق شاہن کے سلسلے میں ایک مربوط حکمت عملی ”پلین“ کر لی تھی کہ مجھے اس کے ساتھ کس طرح پیش آنا تھا اور کس طرح اس غلیظ انسان کی جج کئی کرنی تھی۔

میرے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اور پھر میں اسی لہجے میں اسے بر ماتی ہوئی فون سے گھورتے ہوئے بولا۔

”رب نواز! جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ تم نے بڑی مکاری سے میرے ماموں جیو! ساتھ لاکھ لاکھ دیا اور اب بیٹیتیس لاکھ کے قریب مجھ سے بھی ہتھیانا چاہتے تھے۔ میں اب بہن ساتھ لاکھ تمہارے حلق سے برآمد کرنے والا ہوں۔“

میری چبھتی گفتگو پر وہ چند ثانے اپنی آنکھیں سکیڑے سنسنی خیز نظروں سے میری طرف گھورتا رہا ایک سرسراتی ہوئی ہکاری خارج کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔

”نادر میاں! تو گویا تم میرا مال واپس نہیں کرو گے؟“

”بالکل نہیں..... بلکہ اب تم میرے ساتھ لاکھ دینے کی بات کرو۔“ میں نے بھی سرسراتے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

”تمہارا ٹال اپنے بطن میں ایندھن سوئے ہوئے ہے۔ جسے آگ پکڑنے میں ایک لمحے کی مح نہیں لگے گی۔“ وہ بالآخر دھمکیوں پر اُتر آیا۔ مجھے طیش تو آیا مگر میں ضبط سے کام لے کر استہزائیہ لہجے ساتھ بولا۔

”ہاں..... یہ بالکل ممکن ہے۔ تم نے اچھا کیا، مجھے پہلے سے بتا دیا تاکہ اپنے ٹال میں لگنے کے بعد میں ادھر ادھر بھٹک کر وقت ضائع کرنے کی بجائے تمہارے ہتھیار کی والے دفتر سمیت تمہا عالی شان محل نما کوشی کی طرف اپنی ٹال کی آگ کا رخ موڑ سکوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اب تم جاؤ۔ لیکن میرے ساتھ لاکھ روپے ذہن میں رکھنا۔“ میری بے نیازی اور دھمکی کے جواب میں دھمکی کو وہ مزید بھنایا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

”میں تم سے منٹ لوں گا۔“ وہ دانت پیس کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”شیو!“ میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ ”میں منتظر ہوں۔“

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا میرے دفتر سے نکلتا چلا گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی منیجر مشتاق داخل ہوا اور اپنی عرق آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے مجھ سے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”شکر ہے سرجی! یہ بلائی۔ ورنہ تو آج یہاں اکھاڑا ہی لگ گیا تھا۔“

”خاطر جمع رکھو منیجر!..... یہ بلائی نہیں ہے۔ اب تو یہ نازل ہوتی رہے گی۔“ میں نے زہر مسکراہٹ سے کہا۔

”اچھا سرجی!“ وہ کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں اپنے دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

میں نے کرسی سے پشت لگا لی اور ان ساتھ لاکھ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اسے مزید تازہ چاہتا تھا۔ اچانک مجھے کاشانہ کا خیال آ گیا۔ اگرچہ میں نے اس سلسلے میں کسی قسم کی مدد لینے سے انکار دیا تھا اور میں اپنی بات پر قائم بھی تھا۔ مگر اتنا تو میرا حق بنتا ہی تھا کہ میں رب نواز جیسے دھوکے باز فریبی انسان کے سینے پر مرمک دل سکوں۔ کاشانہ گزشتہ دن ہی مجھ سے دفتر میں مل کر گئی تھی۔ بڑی بڑے وغریب گفتگو کے بعد مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی..... مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس باتیں مجھے جتنی عجیب لگتی تھیں، اتنی ہی پُر کیف بھی محسوس ہوتی تھیں جو میرے درمائدہ دل کو تسکین دیتیں۔ میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کاشانہ کا نمبر شیخ کرنے سے پہلے منیجر مشتاق کو دہاں جانے کا اشارہ کیا۔

آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا۔ اس شوق میں، میں اس قدر آگے جا چکا ہوں کہ میں نے انٹرنیٹ پر بنی امریکہ کی ایسی تھری ایکس بلیو فلمیں بنانے والی کمپنیوں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں سے رابطہ بھی کر رکھے ہیں۔ وہ تو مجھ سے کہتے ہیں کہ اگر میں ان کی کمپنی میں کام کروں تو وہ خود اپنے خرچ پر مجھے امریکہ بلوائیں گے اور ہزاروں ڈالر منافع بھی دیں گے۔ یہی نہیں، نیٹ فون اور ویڈیو کیمرہ کے سامنے مذکورہ ڈائریکٹر اپنی کمپنیوں کی گوری چمڑی والی عورتوں اور جوان لڑکیوں سے بھی میری باتیں کر داتے ہیں۔“

میں کہتا جا رہا تھا اور وہ حیرت سے منہ پھاڑے مجھے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ مجھے یوں حیرت بھری نظروں سے نکلے جا رہا تھا جیسے اس کے سامنے اس کا بھی باپ بیٹھا ہو۔ مجھے یہ ساری معلومات غزالہ کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں اور آج میں اس کا فائدہ اٹھا رہا تھا۔

”آپ کیا نہیں گے اشفاق صاحب؟..... بلکہ ٹھہریں، میں آپ کے لئے دی بھلے منگواتا ہوں، گلاب جاسن ڈلو کے۔“

”نہیں..... نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بس چائے منگوا لو۔“ اشفاق شاہین نے جلدی سے کہا۔ اس کا اہل اب جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے اپنی چوٹیں لگانے کا سلسلہ جاری کیا۔ ”واہ..... واہ اشفاق شاہین صاحب! یہ سالی انگریز عورتیں بھی کیا شے ہیں..... بالکل فری شکل محبت کرتی ہیں۔ ارے میں تو بھول ہی گیا.....“ میں نے آخر میں دانستہ خود کو بے وقوف ظاہر کرنا چاہا تھا۔ پھر تیل بجا دی۔ ذرا دیر بعد ایک ملازم اندر داخل ہوا۔ میں نے اسے چائے اور کیک بیٹریوں کا آرڈر دیا۔ وہ واپس چلا گیا۔

”ہاں تو اشفاق صاحب! میں کہہ رہا تھا کہ.....“ میں پھر شروع ہونے لگا تو وہ بول پڑا۔

”ناور صاحب! آپ کے ساتھ خوب جمنے گی۔ اچھا، آپ یہ بتائیں آپ شادی شدہ ہیں؟“

”نہیں جی..... انجی تو نہیں کی۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر خوش امید مسکراہٹ سے بولا۔ ”اشفاق

صاحب! تو پھر میں آپ کے دولت کدے پر کب حاضر ہو جاؤں؟ اور..... اور کیا آپ مجھے اپنی اس کم میں کام کرنے کا چانس.....“ میں نے جھپٹی جھپٹی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا جملہ دانستہ ادھورا پھوڑا تو وہ ہلے سے ہٹکھار کر بولا۔

”مگر تم کس طرح ایسی فلم میں کام کر سکتے ہو؟..... ہمارے پاس تو ایسی فلموں میں کام کرنے کے مخصوص پیشہ ور آدمی ہوتے ہیں جو گناہ ہوتے ہیں۔ جبکہ تم کو یقیناً بہت سے جاننے والے لوگ ہوں۔ ہم ان لوگوں کو منظر عام پر بھی نہیں لاتے۔ بلکہ وہ گناہی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔“

”جی ہاں..... آپ کی یہ بات تو درست ہے۔“ میں نے اس کے متوجع جواب پر بڑی چالاکی سے بات کو دوسری طرف موڑتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ”لیکن آپ کسی اور طریقے سے ہی، بس مجھے اپنے کاروبار میں کسی طرح شریک کار بنالیں۔ یہ بزارنگین اور دلچسپ کاروبار ہے۔ لیکن

ب سے بڑی بات یہ کہ اس میں منافع اور دولت کمانے کے بے حساب مواقع ہیں۔ میں کسی وقت حاضر ہوں گا آپ کے دولت خانے پر۔ یوں تو میں آپ کے ہاں ایک بارغزالہ والے حوالے سے آ تو چکا ہوں لیکن..... پھر بھی ذرا تفصیلی پتہ اور اپنا تکلیف ممبر دے دیتے تو اچھا تھا۔

میری بات پر اس نے جیب سے ایک وزینگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ ”اس میں بڑی گہرک والی جگہ کا پتہ موجود ہے اور میرا فون نمبر درج ہے۔ آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر دینا۔“

”تم نے کل رات میری رہائش گاہ پر نقب لگائی اور غزالہ کو لے آؤ۔“ کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے خشک لہجے میں مجھ سے دریافت کرنا چاہا تو میں نے ذرا ڈر پوک انسان کا رول پلے کرتے ہوئے اپنے لہجے میں حیرت آمیز پزیرائی سمجھ کر اس سے کہا۔

”کیا؟..... یہ..... تم کیا کہہ رہے ہو؟..... میں تو تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے رات سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے جانے کی اجازت دی تھی۔ اور ساتھ ہی غفورے کا بھی کہہ دینے مجھ سے معاہدہ کر لیا کہ آئندہ ہم دونوں میں سے کوئی کسی کا راستہ کھونا کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور پھر بھلا مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں غزالہ کی خاطر ایسی خطرناک مہم جوئی کرتا پھروں۔“

میں نے کسی خوف زدہ انسان کے سے انداز میں ایک ہی سانس میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس سے کہا اور اپنی اداکاری کی اثر پذیری کے نتیجے میں اس کے چہرے کی سرد مہری کو ابھن آمیز تڑپ میں تبدیل ہوتے دیکھا اور مجھے بھی کچھ حوصلہ ہوا۔

”ہوں..... تم سچ کہہ رہے ہو؟“ وہ میرے چہرے کی طرف کھوجتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ”اس میں جھوٹ کی گنجائش ہی نہیں ہے اشفاق صاحب!“ میں نے پہلے سے بھی زیادہ اپنے جھوٹے لہجے کو پُر اعتماد بناتے ہوئے مکاری سے کہا۔ ”تم خود سوچو، بھلا مجھ جیسا عام کاروباری اور امن پسند آدمی ایک انڈر ورلڈ فلم مافیا کے ڈان کے ساتھ ایسی بے وقوفانہ قسم کی غلطی کر سکتا ہے؟“

میرے انداز اور تبصرے پر اس کی آنکھوں میں ایک تیز چمک ابھری۔ یہ ایک حیرانی کی چمک تھی! میں جو چال اشفاق شاہین جیسے خطرناک گینگسٹر کے ساتھ چلنا چاہ رہا تھا، اس کا یہ تقاضا تھا کہ میں بھم ایسی باتوں کو اس کے سامنے کھل کر بیان کر ڈالوں کہ ایک تو مجھے اس پر ذرہ برابر شبہ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ مجھے ”شوقین مزاج“ آوارہ نوجوان سمجھے۔

”میرے بارے میں تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ اس نے معاً اپنی آنکھیں سکیز کر مجھے دیکھتے ہوئے اسرا بھرے لہجے میں کہا۔

”ارے چھوڑیں جی۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے، آپ خفیہ قسم کی بڑی مسالے دار فلمیں بھی بناتے ہیں میں خود ایسی فلموں کا جنون کی حد تک کربز رکھتا ہوں۔“ میں نے اداشانہ لہجے میں ایک آنکھ معنی خیز انما میں مچ کر کہا تو اس کے چہرے پر ویرانی سی پھیلنے لگی۔

”تنت..... نہیں..... یہ کیسے پتہ چلا؟“

”اور کون بتائے گا؟..... اس چھنل، غزالہ نے ہی بتایا تھا۔ مگر یقین کریں اشفاق صاحب! تم تو یہ سن کر حیران رہ گیا تھا کہ یہاں بھی ایسی زبردست اور گرما گرم فلمیں بنتی ہیں۔ میں تو اس سلسلے میں خود آپ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ پلیز..... مجھے ایسی فلمیں بناتے ہوئے نظارے تو کرائیں۔ اب تک میں نے صرف ٹی وی اسکرین پر ہی دیکھا ہے۔ ذرا حقیقی طور پر بننے ہوئے بھی تو دیکھوں۔ انا لطف ہی الگ ہو گا۔“

میں بدستور اس کے لئے حیرت کا سامان مہیا کئے جا رہا تھا۔ میری اپنی بھی کوشش یہی تھی کہ اشفاق شاہین جیسے خبیث ہاتھی کو چوٹی بن کر اس کی سوئی میں گھس کر مارنا چاہئے تھا اور اس کے لئے ضروری کہ میں اس کے سامنے خود کو زیادہ سے زیادہ شوقین مزاج ظاہر کروں۔ یہی سب تھا کہ میں نے اس لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی حیرت کے دوران ہی اس پر مزید رعب ڈالنے کی غرض سے کہا۔

”میں تو اب اپنے کمپیوٹر پر بھی ایسی مخصوص ویب سائٹس پر دھا کر قسم کے ٹوٹے دیکھتا رہتا ہوں

دوئم

نظر ہونے میں مدد دی ہے؟ بلکہ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، یہ کام آپ ہی کے کسی غدار کا لگتا ہے۔“

”ہاں..... اب تم سے ملنے کے بعد میرا بھی یہی خیال ہے۔“ وہ پُر سوچ لہجے میں اپنے سر کو ہلے سے اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ میں دل ہی دل میں اپنی شاطرانہ چال پر خوش ہونے لگا کہ میں نے آدھے بج اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اسے اپنی طرف سے بھٹکانے پر کامیابی حاصل کر لی تھی۔ تاہم ابھی مجھے یہ دیکھنا تھا کہ وہ غزالہ کے سلسلے میں کون سا لائحہ عمل ترتیب دینا چاہتا ہے؟ یہی بات کہ میں اپنی بات کہنے کے بعد مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ نکلنے لگا تھا۔ مگر وہ میری بات کا تلی بخش جواب دیے بغیر رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہوا تو میں نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ وہ مجھ سے دوستانہ انداز میں مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”میں تمہاری آمد کا منتظر رہوں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“

میں نے بھی دوستانہ گرم جوش دکھاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر باہر احاطے میں کھڑی اس کی کار تک اسے چھوڑنے آیا۔ ذرا دیر بعد وہ واپس چلا گیا تو میں اپنی جیب میں بیٹھ کر ”کاشانہ پیلس“ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اشفاق شاہین جیسے بڑے ٹیکسٹر کو اتنی آسانی سے اُٹو بنانا میری ایک غیر متوقع اور اچانک کامیابی تھی۔ اپنی اس چوکھی جنگ میں اپنے ایک حریف کو میں پھندا ڈال چکا تھا۔ جب کہ رب نواز اور کبیر بہت کیلاشی عامل عاروب کے کارپردازوں کا مسئلہ نمٹاتا تھا۔ بالخصوص میں نگینہ کی امریکہ سے واپسی سے قبل عامل عاروب والا معاملہ نمٹانا چاہتا تھا۔ کیونکہ کبیر اور کیلاشی عامل عاروب کے دو کارپردازوں سے ٹکرانے کے بعد مجھے یہ معاملہ زیادہ سنگین محسوس ہونے لگا تھا۔ مجھے اس بات کا ذرا بھی خوف نہ تھا کہ میں عامل عاروب کو زخمی کرنے کا باعث بنا تھا اور اب اس کے جیروکار مجھ سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ بلکہ سنگین پہلو یہ تھا کہ ان کا اصل ٹارگٹ نگینہ تھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے خود ساختہ دیوتا دابلا میزیز پر نگینہ کی جان کی بحیثیت چڑھانا چاہتے تھے اور کبیر اس سلسلے میں ان کی پوری رہنمائی کر رہا تھا۔ عامل عاروب کے جن جیروکاروں سے میرا ٹکراؤ ہوا تھا ان میں سے ایک کے پیٹ میں گولی مار چکا تھا جو پتہ نہیں اب زندہ بھی تھا یا نہیں؟ تاہم دوسرے ساتھی کا نام مجھے معلوم نہ تھا۔ اگرچہ اس کی ٹانگ میں بھی گولی لگی تھی، غالب خیال یہی تھا کہ دونوں یا کوئی ایک میرے ہاتھوں منہ کی کھانے کے بعد واپس کیلاش وادی واپس آ گیا ہو۔

”کاشانہ پیلس“ پہنچ کر میں نے اپنی جیب جیسے ہی وسیع و عریض احاطے کے گیٹ کے سامنے روکی، وہاں محافظوں نے فوراً گیٹ کھول دیا۔ غالباً کاشانہ نے انہیں میری متوقع آمد کے بارے میں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ مگر پھر جیسے ہی میں نے اپنی جیب اندر سبزہ زار کے احاطے میں داخل کی تو مجھے ایک جانب چند قدموں کے فاصلے پر کاشانہ چہل قدمی کرتی نظر آئی۔ تاہم میری جیب دیکھتے ہی وہ فوراً میری جانب بڑھی۔ میں جب تک انیشین سوچ آف کر کے اور دروازہ کھول کر جیب سے نیچے اترا۔ کاشانہ بھی اس کی کوری کوری سے چلتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی جس کے پانچ بٹل تھے۔ اس بار اس نے جو ہاف آسٹین کی شرٹ پہن رکھی تھی، اس کے کارمردانہ تھے۔ شرٹ پینٹ کے اندر اسی ہوئی تھی جس کے باعث اس کے مدور شیبہ و فراز بھجان خیز منظر پیش کر رہے تھے۔ اپنے

اپنی چالاکي پر میرا دل خوشی سے بلیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے کارڈ اس شیطان کے ہاتھ سے فوراً لے کر اس پر ایک نظر ڈالی پھر آخر میں پوچھا۔ ”کیا آپ ایسی فلمیں وہیں اپنی رہائش گاہ میں بھلائے یا.....؟“ میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

یہ باتیں اب وہیں ہوں گی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے۔..... ویسے آپ مجھے اپنے اس منافع بخش کاروبار میں شامل تو کریں گے؟“

”ہاں..... اسی لئے تو بلا رہا ہوں۔ سوچنا پڑے گا کہ تمہیں کیا کام دیا جائے۔“ وہ بولا۔

اسی دوران ملازم چائے وغیرہ لے آیا۔ ہمارے درمیان ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ پھر میں اچانک غزالہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”اشفاق صاحب! غزالہ کا کیا معاملہ ہے؟..... کیا وہ بھی ایسی کی طرح کام کر چکی ہے یا پھر اپنا معاوضہ بڑھانا چاہتی ہے؟“

میری بات پر اس نے ایک پوری بیٹری نکلنے اور چائے کے چند بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگا۔

”کہا۔“ وہ ذرا ٹیڑھی لڑکی ہے۔ حالانکہ وہ ہماری ہی قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر پھر جانے کیا وہ..... مگر یہ تو بتاؤ، تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ اس نے اچانک پوچھا۔

”میں تو اسے ہرگز نہیں جانتا۔ یہ تو میں آپ کو وہیں بتا چکا تھا، آپ کی رہائش گاہ پر۔“ میں جواب دیا۔

”ہوں.....“ اس نے ایک گہری ہمکاری لی اور جیب ہو گیا۔ دراصل اس موضوع پر میرے اشفاق شاہین کے درمیان گفتگو وہی چلی تھی۔ اس وقت غفورا بھی وہیں موجود تھا۔ مگر میں نے بڑی صورتی اور چالاکي کے ساتھ اپنی بات ان دونوں غنڈوں کے پہچان لئے جانے پر موڑ دی تھی جنہیں کر میں چونکا تھا۔ ان دونوں کا تعلق جہنم واصل چھپکلی مارکہ کھڑتال گروپ لیڈر سے تھا جو میرے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا تھا۔ جو حقیقت میں غفورے کے ساتھی نکلے تھے اور یوں غزالہ کے سے بات آئی گئی ہوگی۔

”مگر اس نے تمہیں میرے اور میرے اس خفیہ کاروبار کے بارے میں جو تفصیل بتا ڈالی ہے! مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ وہ اب ہمارے لئے خطرناک ہو سکتی ہے اور ہمارے پیچھے کسی خفیہ سرکاری کو لگا سکتی ہے۔“ وہ چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے گمبیر لہجے میں بولا اور پھر اچانک سے پوچھا۔ ”اس نے ہمارے متعلق اور بھی کچھ تمہیں بتایا تھا؟“

”نہیں تو..... بس اتنی ہی باتیں بتائی تھیں۔“ میں نے کہا اور فوراً ہی کچھ سوچتے ہوئے الگ رنگ آمیزی کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو جی، اس حادثاتی ملاقات کے دوران میری اچھی خاصی دوسری گئی تھی اور مجھے اپنے گھر بھی آنے کی دعوت دی تھی۔ تاہم وہ آپ لوگوں سے بہت خوف زدہ بھی ہے اور آپ سے پچھا چھڑانا چاہتی ہے تاکہ اپنی الگ تھلک پُر سکون زندگی بسر کر سکے۔ میں تو کہا جناب! اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اگر اسے چھیڑنے کی کوشش کی تو“

”کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔“

یہ ساری باتیں بتاتے وقت میں نے یہ بھی ضرور کہا تھا کہ غزالہ نے مجھے یہ ساری باتیں اس وقت بتائی تھیں جب ہم دونوں کو اشفاق شاہین نے اپنی گلبرگ والی رہائش گاہ کے کمرے میں مقید کر رکھا تھا۔ لہذا آخر میں، میں نے یہ کہنا ضروری سمجھا۔

”اشفاق صاحب! یہ بات تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آخر غزالہ کو کس نے آپ کی

دوئم  
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پیٹا اچانک نمودار ہوں گے اور مجھے بالکل ایک ننھی ننھی بچی کی طرح اپنی گود میں بھر لیں گے۔ وہ اپنی رو میں کہتی جا رہی تھی۔ میری نظریں اس کے غم ناک چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی لابی پلکیں بیگنی بیگنی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اچانک جیسے وہ حسرت و اندوہ کے بھور سے ابھر کر تدرے چوکتے ہوئے بولی۔

”ارے..... یہ میں کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ میں نے تو آپ کو کچھ کھانے پینے کا ہی نہیں پوچھا۔“  
پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ ”آپ لٹچ کر کے ہی جائیں گے۔ میں پہلے آپ کے لئے کولڈ ڈرنک منگواتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے کسی ملازمہ کو آواز دی تو ایک ادھیڑ عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ کاشانہ نے اسے کولڈ ڈرنک لانے کا کہا۔ وہ چلی گئی تو میں نے ذرا کھنکھار کر کاشانہ سے کہا۔

”آپ لٹچ کا بکھیرا رہنے دیں۔ کولڈ ڈرنک ہی بہتر رہے گا۔“

”جی نہیں..... ہر وقت آپ کی مرضی نہیں چلے گی۔“ وہ جیسے یکدم اپنی کھنڈری خو میں آتے ہوئے بولی۔ ”میں نے آپ کے لئے اسپیشلی بکرے کی ران کا تنوری چرغہ اور بکھر چکن تیار کروایا ہے اور بلوچی تنور والے سے بڑے بڑے نان..... اور سوینڈ ڈشٹا میں ٹرائفل کسٹروڈ..... مزہ آجائے گا۔“

”واہ..... آپ تو کھانے پینے کا بڑا شوق رکھتی ہیں..... حالانکہ آپ کی عمر کی لڑکیاں تو کھانے پینے سے دور بھاگتی ہیں کہ کہیں موٹی نہ ہو جائیں۔“ میں نے ازراہ تفسن کہا تو وہ بے اختیار چلبے انداز میں ہنس پڑی۔

”میں ایسے کسی احقانہ کریم میں مبتلا نہیں ہوتی۔ جو کرنا ہے وہ کرنا ہے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ انسان کو کوئی حسرت دل میں نہیں رکھنی چاہئے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور دھیمے دھیمے مسرت انگیز لمحات جہاں اور جیسے میسر ہوں، انہیں کشید کر لینا چاہئے۔“

اس کی باتوں میں عجیب سا سحر تھا۔ میٹھی میٹھی آج تھی۔ میں خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ”رب نواز آیا تھا میرے پاس۔“

”دہاٹ؟..... کب؟“

”آج۔“

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”یہی کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور اب مجھے میرا مال واپس لوٹا دو۔ یہی کہہ رہا تھا۔“

”تو پھر..... آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہہ دیا تھا کہ اس مال پر میرا حق بنتا تھا، جس کی پے منٹ میں اسے کر چکا تھا۔ لہذا اب وہ میرے ساتھ لاکھ روپے دینے کی بات کرے۔“

”ویری ٹائس..... پھر کیا کہا اس نے؟“ وہ پُر اشتیاق لہجے میں بولی۔

”آپ کے حوالے سے بات کر رہا تھا کہ میں یہ سب کس کے بل بوتے پر کر رہا ہوں۔“

”ٹائفنٹ۔“ وہ نفرت خیز لہجے میں دانت پیس کر بولی۔ ”آپ نے کہہ دینا تھا پھر کہ تم جیسے بد دیانت شخص کے ساتھ ہر طرح کا حربہ جائز ہے۔“

”میں نے اس سے ملنا جلتا جواب ہی دیا تھا اسے۔“

”نادر صاحب! آج کل اسٹی کرپشن کے ایک سرکل آفیسر باہر وڈانچ کے ساتھ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس سے ایک ملاقات کریں اور اپنا مسئلہ بیان کریں تو آپ کا کام بن سکتا ہے۔“ اس نے

دوئم  
ہوائے کٹ بالوں کو اس نے ڈائی کیا ہوا تھا۔ گداز بھرے ہوئے ہونٹوں پر پُر کشش، دعوت کا مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ جب وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تو بائیں گال پر بغیر ساڈپل ابھرا۔ آج میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی فیٹی آنکھوں پر سایہ کی ہوئی سیاہ پلکیں غیر معمولی طور پر لمبی تھیں۔

”زے نہ نصیب!..... نادر صاحب! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ واقعی مجھ سے ملنے دوسری بار آئیں۔“ وہ مترنم لہجے میں بولی۔

”نہیں..... آپ سے ملنے تو پہلی بار ہی آیا ہوں۔“ میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

”وہ کس طرح؟“

”پہلی ملاقات میں آپ کے پیٹا..... میرا مطلب ہے رب نواز سے ہی کرنے آیا تھا مگر آپ ہو گئی۔ اس بار تو بالخصوص آپ سے ہی ملنے آیا ہوں۔“

میری بات پر وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔

”آپ بھی بس.....“ وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ”جلیں، اندر تشریف لائیں۔“ وہ بے

سے میرا ہاتھ اپنے نرم و گداز ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے بولی۔

میں اس کے ہمراہ سبزہ زار کے درمیان بنی خوب صورت روش پر چلتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف

بڑھ گیا۔ وہ مجھے اندر ایک شانہ طرز کے کمرے میں لے آئی۔ یہ ایک کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ پورے

بیش قیمت جدید آرٹسٹ اشیاء سے آراستہ و پیراستہ۔ اس نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا کہا اور خود

سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئی۔

میں نے ارد گرد پوئیی نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”گلٹا ہے مگر میں اس وقت آپ اکیلی ہیں۔“

”ہاں..... ماما، رب نواز کے ساتھ کہیں دعوت پر گئی ہیں۔ رات بارہ بجے سے پہلے ان کی

ممکن نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو آپ اتنا طویل وقت یونہی بیٹھے گزار دیتی ہیں؟..... میرا مطلب ہے آپ بھی ذرا آؤنگ

نکل جایا کریں۔ اکیلی تو آپ بور ہو جاتی ہوں گی۔“

میری بات پر وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولی تو مجھے اس کی آواز کہیں دور سے آئی،

محسوس ہوئی۔ ”نادر صاحب! پتہ نہیں، کیا بات ہے۔ پیٹا کے انتقال کے بعد میں جیسے اپنے ہی خول

بند ہو کر رہ گئی ہوں۔ کسی چیز میں دل ہی نہیں لگتا۔“

”اوہ..... لگتا ہے، آپ اپنے پیٹا سے بہت قریب تھیں۔“

”ہاں..... بہت قریب۔ ماما سے بھی نہیں، جتنا مجھے اپنے پیٹا سے محبت تھی۔ وہ میرے

تھے۔ میرے خیالات، میرے افکار غرضیکہ مجھ سے وہ ہر چیز شیئر کرتے تھے۔“

”اور ماما؟“

”ماما کو اپنی سوشل لائف سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔“ اس نے تلخی سے کہا۔ ”انہوں نے مجھ

لائف میں بہت نظر انداز کیا۔ اب تو جیسے وہ مجھ سے دور ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ بہت دور چلی گئی ہیں

ان کی طرف دیکھتی ہوں تو مجھے مزید تنہائی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور پیٹا کی یاد بھی اتنی شدت

ساتھ آتی ہے۔ درحقیقت نادر صاحب! پیٹا کی موت کا غم مجھ سے بھلائے نہیں جھوٹا۔ اس کی وجہ

تھی کہ..... لکھا..... اور غم متاثر ہوئی..... دو سال کا عرصہ ہوتا ہی کتنا ہے۔ مگر

عنداز اور دلکش لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ سموتے ہوئے بولی۔ ”اگر یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“

”سنگ..... کیا سوال؟“ میں نے ذرا گڑبڑا کر کہا۔

”یہی کہ آپ نے اب تک اپنی زندگی کا کوئی ساٹھی منتخب کیا؟“

”ہاں.....“ مجھ سے جھوٹ نہ بولا گیا۔ اس نے قدرے چوک کر میری جانب دیکھا پھر ہولے بولی۔

”پوچھ سکتی ہوں وہ کون خوش نصیب ہے؟“

”ہاں..... وہ بھی آپ ہی کی طرح من موہنی صورت والی لڑکی ہے۔ بالکل آپ جیسی۔“

میری بات پر کاشانہ کی ہنسی پلکوں والی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔ کشمیری سیبوں جیسے گالوں پر

نن رنگ قوس قزح کی جھلک ابھری۔

”نام بتائیں گے آپ اس کا؟“

”گنیز۔“ میں نے بتایا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا پھر بولی۔

”بہت خوب صورت نام ہے..... کیا آپ اس سے بہت محبت کرتے ہیں؟“

”ہاں..... بہت..... وہی میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں نے جیسے گنیز کی خوشبو کو اپنی

سانسوں کے ذریعے اندر سینے میں اتارتے ہوئے کہا۔

”وہ بھی یقیناً آپ سے بہت محبت کرتی ہوں گی؟“

”ہاں..... بلکہ ہم دونوں کو ہی یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ محبت کرتا ہے۔“

”دیری فٹنسلک اینڈ ویری ناس ٹرو ٹو اسٹوری.....“

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ پھر جیسے بہ غور میری آنکھوں، میرے چہرے کو بھانپتی ہوئی نگاہوں سے

تکتے ہوئے کہا۔ ”مگر نادر صاحب! محبت کرنے والوں کی آنکھوں میں تو الوہی مسرتوں کے چراغ سے

تلخ بجھتے رہتے ہیں ہر سے۔ ان کے چہرے نو دمیدہ کلی کی طرح کھلنے کے لئے بے چین سے رہتے

ہیں۔ ان کی باتوں سے محبت بھرے پھولوں کی خوشبو میں سی اُمڈی رہتی ہیں۔ مگر نادر صاحب! آپ کی

آنکھیں تو کسی اور ہی غیر مرئی منظر پر مرکوز رہتی محسوس ہوتی ہیں مجھے۔ ایسا منظر جہاں اندیشوں کی آگ

سنگ رہی ہو اور آپ کا چہرہ جیسے بے رحم وقت کی شورش زدگی کا شکار ہو اور..... اور آپ کا لہجہ جیسے

آتش خوں رنگ کی جھلک دیتا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کے اندر کی محبت کی آگ سے زیادہ

کی اور یہی جذبہ خوں رنگ کی تپش سنگ رہی ہو۔ آپ بیک وقت دو متضاد آتشیں حالات کا شکار ہوں۔

یامیں سچ کہہ رہی ہوں نادر صاحب؟“

میں اس کی غضب کی قیافہ شناسی پر ہکا بکا رہ گیا۔ کاشانہ کی انہی باتوں نے ہی تو مجھے نہ چاہتے

تھے بھی کشاں کشاں اس کی ”سنگت“ پر مجبور کیا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل اٹھارہ انیس برس ہی تھی مگر اس

کی باتوں میں برسوں کے تجربے کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔ بظاہر لا املی اور کلندری طبیعت کی نظر آنے

والی اس لڑکی میں ایسی گہرائی میرے لئے حیرت ہی کا باعث تھی۔ مجھے کسی گہری اور پُرسوج خاموشی میں پا

راں نے دھیرے سے کہا۔

”آپ کی خاموشی میرے اندازے کی درستی کو ظاہر کر رہی ہے نادر صاحب!..... دیکھیں، دوستی

بے نہایت اعلیٰ و ارفع جذبہ ہوتا ہے۔ اس ناتے سہی، مجھ سے اپنے اندر کی کیفیت شیر کریں۔ میں نے

تو آپ کو اپنا ایک اچھا اور سچا دوست سمجھ کر اپنے دکھ سے آگاہ کیا اور یقین جانیں، مجھے اپنے دل کا

مجھے صائب مشورہ دیا۔

”اچھا..... معاملہ کیا ہے؟“ میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ تلخی سے بولی۔

”کیا معاملہ ہوتا ہے، سوائے فراڈ کے۔ جس طرح انہوں نے آپ کے ماموں حیدر گل سے فراڈ

تھا، اسی طرح رب نواز نے کسی اسماعیل گوندل کے ساتھ بھی یہی دھوکا کیا تھا۔ تمہارے ماموں

چارے تو خاموش ہو گئے تھے مگر اسماعیل گوندل رب نواز کے گلے پڑ گیا۔ کیونکہ وہ اینٹی کرپشن کے

آفیسر بابر وڑائچ کا چچیرا نکلا۔ اب تو اس نے اپنی رقم کے علاوہ نقصانات کا حکیم بھی کر دیا ہے۔ رب

بہت پریشان ہو گیا ہے۔“

”بابر وڑائچ رہتا کہاں ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”میں آپ کو ان کا تفصیلی ایڈریس لے دوں گی۔“ وہ بولی اور اس اثناء میں ملازمہ ایک ٹرے پر

کولڈ ڈرنک اٹھا لائی۔ ہم دونوں خاموشی سے کولڈ ڈرنک پینے لگے۔

کولڈ ڈرنک ختم کرنے کے بعد کاشانہ نے صوفے سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے مجھ سے کہا

”آئیے نادر صاحب! میں آپ کو اپنا کمرہ دکھاؤں اور پیپا کی البم بھی۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے لے کر ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے میں آگئی۔ یہاں ایک طرف بیڈ

ہوا تھا۔ ایک ایڑی چیئر بھی تھی۔ دوسرے کونے میں ایک ٹیبل پر کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ کاشانہ نے مجھے بیڈ

بیٹھنے کا کہا اور پھر بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز سے نیلے رنگ کی البم نکالی اور میرے بالکل قریب بیڈ پر بیٹھ گئی

اس کے پُر شباب وجود سے بڑی مسرور کن خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس نے البم کھول کر میرے زانو پر رکھ دی

اس طرح اسے ٹھوڑا میرے چہرے کے قریب جھٹکا پڑا تو اس کی سانسوں کی تپش مجھے اپنے چہرے

صاف محسوس ہونے لگی۔

البم میں کاشانہ کی اپنے باپ کے ساتھ بچپن سے لے کر جوانی تک ساری ہی تصاویر موجود تھیں۔

تصاویر میں سیر گاہیں اور تفریحی مقامات بھی تھے۔ مجھے باپ بیٹی کے سوا اور کوئی نظر نہ آیا تھا۔ یعنی اس

ماں کی کہیں ایک بھی تصویر نہیں تھی۔

”یہ البم میں اپنے نیکے کے نیچے رکھ کر ہی سوتی ہوں اور ہر روز رات کو سونے سے پہلے اسے

دیکھتی ہوں۔ ان سے باتیں کرتی ہوں۔“ وہ پھر اپنی رو میں ہنسنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”مس کاشانہ! اس میں شک نہیں کہ بعض دکھ انسان کو ادھ موا کر کے رکھ دیتے ہیں

لیکن انسان کے آگے بڑی زندگی ہے۔ اگر وہ دکھ کو اپنے گلے سے لگا لے تو نہ صرف ساری زندگی

انسان کے اس ایک دکھ کو سینے سے لگائے گزر جاتی ہے بلکہ اس طرح مرے ہوؤں کی روح کو بھی جھلک

پہنچتی ہے۔ آپ خوش رہا کریں..... بلکہ میں تو آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ کسی ایسے لڑکے کا انتخاب

کے اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لیں۔ آپ کی زندگی کے اس دکھ کا بدلہ اسی خوشی میں ہے اور اس

آپ کے پیپا کی روح کو بھی یقیناً سکون ملے گا۔“ میں نے اسے نیک نیتی سے دوستانہ مشورہ دیا تو

نے بے اختیار ایک گہری ہنکارتی پھر مجھ سے البم لے کر دراز میں ڈال دیا۔ اس کے بعد

میرے چہرے کی طرف دیکھ کر بولی۔

”مجھے آج تک اس کا موقع ہی نہیں ملا۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”آپ اپنے خول سے نکلیں۔ مواقع مل جائیں گے۔“

”ہاں..... شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔“ وہ گونگو سے مگر گہرے لہجے میں بولی۔ اس کے بعد



”اب یہ بھی ممکن نہیں رہا۔“ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر فوراً بولا۔

”میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔“ کاشانہ چند ٹاپے کی پُرسوج خاموشی کے بعد بولی۔ ”اگر کسی طرح نظر حیات کو یہ ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیں تو سارے حالات خود بہ خود ٹھیک ہو جائیں گے۔“ کاشانہ کی یہ بات میرے دل کو کسی حد تک قابل قبول لگی تھی۔

”مگر کیسے؟“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”بہت آسان طریقہ ہے اس کا۔ آپ اسے واشگاف الفاظ میں یہ دھمکی دے ڈالیں کہ اگر اسے اپنی زندگی بھاری ہے تو یہ ملک چھوڑ کر خاموشی سے چلا جائے۔ اگر وہ نہیں مانتا تو آپ اسے ذہنی طور پر اتنا ہار چ کر دیں کہ وہ خود ہی یہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔“

اس کی بات پر میں ایک لمحے کو حیران رہ گیا۔ وہ جس طرح میرے اور نگینہ اور ماں کے مسئلے کو پورے غلوں دل کے ساتھ شیر کر رہی تھی، ایسا کوئی اپنا ہی کر سکتا تھا۔ جب کہ کاشانہ میری کیا لگتی تھی؟ صرف ایک اچھی دوست..... اور اس دوستی کو بھی چند ہی دن بیٹے ہوں گے۔ اگرچہ میں اس کی آنکھوں میں اپنے لئے جلتے ہوئے جگنو وغیرہ محسوس طریقے سے بھانپ چکا تھا۔ تاہم وہ بڑی صدق نیت کے ساتھ مشاورت کر رہی تھی۔

عام حالات میں ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی لڑکی کسی کو پسند کرتی ہے تو وہ رقابت کے فطری جذبے سے مجبور و مغلوب ہو کر دوسرے کا راستہ کاٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن کاشانہ اس معاملے میں ایک باوقار اور اعلیٰ ظرف لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ مجھ پر اپنے دل کا حال ظاہر کئے بغیر میرا بھرپور ساتھ دینے کے لئے کوشاں تھی۔ میں نے پہلی بار گہری نظروں سے کاشانہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں مجھے بے لوث جذبات کی تہ میں ایک ان کہا کرب سا جھلکتا صاف محسوس ہو رہا تھا۔ اور اس نامعلوم کرب کی پرچھائیں مجھے اس سے پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس سے پہلے وہ نگینہ سے واقف نہیں تھی۔ یا یہ کہ نگینہ کا ذکر اس کے سامنے نہیں ہوا تھا۔ مجھے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا، وہ کچھ ٹوٹ سی گئی ہے۔ اس نے شاید مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ مگر میں بھلا اس کی توقعات و خواہشات کے سامنے کیوں کر سرنگوں ہو سکتا تھا۔ میں تو نگینہ کے درخسن و الفتات کا سوالی تھا۔ وہی نگینہ جو میری جان تھی، میری آرزوؤں اور تنہاؤں کا محور تھی۔

”کیا سوچنے لگے نادر صاحب؟“ میری طویل اور پُرسوج خاموشی پر معاً کاشانہ نے اپنی مترنم آواز کا ٹوکا دیا تو میں خیالات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں واپس لوٹ کر بولا۔

”آں..... نن..... نہیں، کچھ نہیں۔ بس آپ کی اس معقول تجویز پر غور کر رہا تھا۔“ میں نے اپنی اصل سوچ کو خود تک محدود رکھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

”جلیں..... کھانا تیار ہو گیا ہوگا، پلیز.....!“ وہ اٹھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرا کر بولی تو میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

کھانا واقعی بہت پر تکلف اور لذیذ تھا جسے کاشانہ کی قربت نے گویا دو آہنہ کر دیا تھا۔

کھانے کے بعد میں نے روائگی کا ارادہ کیا۔ وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئی تھی۔

”مہربان ملاقات ہوگی؟“ اس نے میرے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد پوچھا۔

”اب آپ زحمت کریں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے گھر پر۔“ میں آپ کو اپنی ماں سے ملواؤں گا۔“

”ہاں..... مجھے بھی آپ کی کمی سے ملنے کا شوق ہو رہا ہے۔“ اس نے پُر اشتیاق لہجے میں جواب

بوجھ کم ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ پلیز نادر صاحب! کیا آپ مجھے اس بارے میں مکمل کر نہیں بتائیں گے؟ آپ کی اور نگینہ کی محبت کن ناپیدہ جگڑندیوں کی زد میں ہے؟..... اگر ایسا ہے تو مجھے آپ کے کہہ کر بے پایاں خوشی ہوگی۔“

میں نے اس کی بات پر ایک گہری سانس خارج کی اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بولا۔ ”ہاں کاشانہ! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میری اور نگینہ کی محبت واقعی ایک پل صراط سے گزر رہی ہے۔ اس کا انجام کیا گا، میں نہیں جانتا۔“ پھر میں نے اسے ماں اور نگینہ کے حوالے سے ساری کھٹانا ڈالی۔

میری ساری پتہ کی صراحت کے بعد کاشانہ خاصی دیر تک پُرسوج اور گہری خاموشی کا شکار رہی اس کے بعد بولی۔ ”نادر صاحب! مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے مجھے کسی لائق جان کر اپنے بارے میں حقیقت بیان کر دی۔ مگر نادر صاحب! ایک بات میں آپ کو پورے یقین سے بتائے دیتی ہوں کہ مجھ کی سچی اور بے لوث راہ پر چلنے والوں کو مشکلات کا سامنا ضرور رہتا ہے۔ لیکن یہ سب وقت گزرنے ساتھ عارضی ثابت ہوتی ہیں۔ اچھا یہ بتائیں، نگینہ کے امریکہ جانے کے بعد اس نے یا آپ نے نوٹک رابطہ کیا؟“ اس نے آخر میں پوچھا۔

”میں نے ایک بار کوشش کی تھی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔“ میں نے مختصراً کہا تو وہ دوبارہ مستفسر ہوئی۔ ”وہ درجنی میں اپنی جس آتنی کے ہاں مقیم ہیں، ان کا ٹیلی فون نمبر وغیرہ؟“

میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں..... نہ اسے دینے کا موقع ملا اور نہ ہی میں لے سکا۔“ ”یہ تو بڑی عجیب اور پریشانی والی بات ہو جائے گی نادر صاحب! آپ کے لئے۔“ کاشانہ فگن سے بولی۔ ”اب دیکھئے نا، نگینہ کہاں اور کس حال میں ہوگی، اس کا آپ کو علم کس طرح ہوگا؟“ ”اس کے پاس میری رہائش گاہ ”گرین لاج“ کا پانی سی ایل نمبر موجود ہے۔ مجھے امید ہے تھوڑے دنوں میں وہ مجھ سے رابطہ کرے گی۔“ میں نے کہا۔

”نادر صاحب! میں سمجھتی ہوں آپ کی سب سے اہم جنگ محبت کی جنگ ہے۔ رہا آپ کی مسئلہ تو وہ بھی اپنی جگہ غیر اہم نہیں۔ آپ ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کریں اور میرا خیال ہے جیسا آپ نے مجھے بتایا ہے، آپ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کی امی کے دل آپ کی طرف سے غلط فہمی پیدا ہونا، میں سمجھتی ہوں ایک فطری رد عمل ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے آخر آپ کی امی کا مسئلہ کیسے حل ہو؟“ کاشانہ نے پُر خیال لہجے میں کہا تو میں بولا۔

”امی والا مسئلہ میرا ہی ہے اور اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے نظر حیات کی موت۔“

”یہ قانونی جنگ کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔“

”مگر قانونی جنگ ہم ہار چکے ہیں۔“ میں نے سچی سے کہا۔

”تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے، بجز اس کے کہ آپ بھی نظر حیات کا وہی حشر کریں جو آپ کی ماں

شاہ میر کا کیا ہے۔“

”ہاں..... اب یہی ہو سکتا ہے۔“

”ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔“

”کون سی؟“

”بہ قول آپ کے نگینہ نے معافی طلبی کروانے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اپنے اکل نظر چلا



دوئم ”سہا کہہ رہی تھی گنیمت؟“ معاماں نے پوچھا۔ میں نے مختصراً ان کے کام کی بات بتادی۔ وہ چند ثانیے کسی گہری سوچ میں ڈوبی رہنے کے بعد جیسے مجھے ”ہدایات“ دیتے ہوئے بولیں۔

”گنیمت سے رابطے میں رہنا۔ تاکہ ہمیں یہ معلوم ہوتا رہے کہ شاہ میر زندگی سے کتنا دور اور موت سے کس قدر قریب ہے؟“

”اچھا ہاں!“ میں نے مختصراً کہا۔ آتش دان میں شعلے بج رہے تھے۔ پھر چند ثانیوں کی دم بہ خود خاموشی کے بعد ماں نے سرسراہٹے لہجے میں کہا۔

”ناور بیٹا! ہمیں اپنے دشمن نظر حیات پر بہت جلد ایک اور فیصلہ کن وار کرنے کا سنہری موقع ملا ہے۔“ ماں کے لہجے سے جوش غیظ کی پیش ترخ تھی۔ ماں کی طرف سے اچانک موضوع بدلتے ہی میں ان کی گفتگو میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا اور نظر حیات کے ذکر پر ماں کی زبانی کسی سنہری موقع کا سنتے ہی ایکا ایکا میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہو گئی۔ ماں نے مزید بتایا۔ ”وہ مردود پرسوں دوپہر میں کسی وقت ہنڈی سے یہاں تنہا گلی میں مقیم اپنے ایک ٹھیکے دار دوست کے ہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ دونوں برٹانی لومڑیوں کے شکار کی غرض سے بٹ راس اور کمال بن کے گھنے جنگلات جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”ماں! یہ تو بہت اہم خبر ملی آپ کو۔“ میں نے بے اختیار جوش مسرت سے کہا۔ ”لیکن ماں! یہ اہم اطلاع آپ کو کس نے دی ہے؟“

ماں نے اچانک میری بات کاٹ کر کہا۔ ”اعظم خان کے آدمی وزیر خان نے۔“

”اے اتنی اہم خبر کیسے ملی؟“

”اتفاق سے نظر حیات کے ٹھیکے دار دوست کے ایک آدمی سے باتوں باتوں میں اسے اس بات کا علم بس اتفاقی ہو تھا اور اس نے فوراً ہی یہ خبر اعظم خان تک پہنچا دی۔“

”نظر حیات کے ٹھیکے دار دوست کا نام؟“ میں نے کسی دھڑکتے خیال کے تحت پوچھا۔

”رب نواز۔“

”کیا.....؟“ میں اس نام پر بری طرح چونکا۔

”کیا تم اسے جانتے ہو؟“ میرے ردعمل پر ماں نے بھی قدرے چونک کر پوچھا تو میں نے زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے صرف اس قدر ہی بتانا مناسب سمجھا کہ اس سے میرے بھی کاروباری روابط رہ چکے تھے، وغیرہ۔

”کیا تمہیں اس کی رہائش گاہ کا علم ہے؟“ ماں نے پوچھا تو میں نے جواباً اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

”ہاں ماں!“

”تو بس ٹھیک ہے پھر۔“ ماں نے اچانک پُر جوش قطعیت سے کہا۔ ”ہمیں پرسوں صبح ہی سے ٹھیکے دار رب نواز کی رہائش گاہ کا محاصرہ کرنا ہو گا۔ اور جیسے ہی وہ دونوں روانہ ہوں، ہمیں ان کا تعاقب کر کے راستے میں ہی نظر حیات کو جہنم واصل کرنا ہو گا۔“

”میرے ذہن میں ایک اور طریقہ بھی آتا ہے ماں!“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو ماں متفہم نہ لگا ہوں سے میرا چہرہ ہنسنے لگیں۔

”نظر حیات جیسے خطرناک دشمن کو ہلاک کرنے کے لئے ہمیں تعاقب کا رسک لئے بغیر پہلے سے جال بچا کر گھات لگانا زیادہ بہتر ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر ہم پہلے سے بٹ راس یا کمال بن کے جنگل

”ان کا کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں دیا تھا گنیمت نے تمہیں؟“

”نہیں۔“

”تو پھر اب یہ کیسے معلوم ہو کہ شاہ میر زندہ ہے یا مر چکا ہے؟“ ماں کے لہجے میں ایکا ایکا شعلوں پیش عود کر آئی۔ میں نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ تپائی پر رکھا اور بولا۔

”میں دوبارہ موبائل پر گنیمت سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ صورت دیگر اب گنیمت خود ہی سے رابطہ.....“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

”فون دیکھو۔“ ماں نے مجھ سے گنیمت لہجے میں کہا مگر میں پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ میں سیدھا فون طرف بڑھا اور ریسور اٹھا کر کان سے لگایا اور بیلو کہا۔

”ہیلو ناور!..... میں گنیمت بول رہی ہوں۔“ دوسری جانب سے گنیمت کی مدھر آواز نے میرے مسرتوں کی بجلیاں دوڑا دیں۔

”ہاں..... ہاں گنیمت! میں..... میں ناور بات کر رہا ہوں۔ ت..... تم کیسی ہو؟ میں نے سے موبائل پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر.....“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ابھی موبائل پر انٹرنیشنل روٹنگ نہیں کھلی ہے اس لئے اس پر رابطہ نہیں سکے گا۔“ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ”میں اپنی آئی فرحت کے ہاں سے بول رہی ہوں۔ پیا کو پیا سینٹ جان ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ نیوروسرجن نے کچھ امید تو دلائی ہے۔ دیکھیں کیا بنتا ہے۔ تم سناؤ، کیسے ہو؟..... آئی کیسی ہیں؟ میرا ان سے سلام کہتا۔“

”ہاں..... وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔“ میں اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر یہ مشکل قابو پا رہے بولا۔ ”خدا کا شکر ہے تم خیریت سے ہو۔ میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ، کتنے روز لگیں۔ تمہیں وہاں؟“ میں نے آخر میں پوچھا۔

”ابھی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”بس تم اپنا خیال رکھنا ناور!“

میری فکر نہ کرو۔“

”ہاں.....“ میں نے مختصراً کہا۔ ماں کی موجودگی کے باعث میں اس سے زیادہ کھل کر گفتگو کر پارہا تھا اور شاید گنیمت نے بھی یہ بات میرے لہجے اور میری بے تابانہ گفتگو کی بے ربطی سے محسوس کر

تھی، بولی۔

”کیا آئی تمہارے آس پاس ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے پھر مختصراً جواب دیا اور اچانک اس سے بولا۔ ”گنیمت! تم اپنی آئی فرحت کا ٹیلا نمبر مجھے دے دو۔ میں اسی نمبر پر بات کر لیا کروں گا۔“

”میں گھر پر تو کم ہی ہوتی ہوں۔ زیادہ تر ہسپتال میں پیا کے پاس ہوتی ہوں۔ خیر، میں آئی کے ساتھ ہسپتال کا نمبر بھی دے دیتی ہوں۔“ اس نے کہا اور پھر نمبر بتانے لگی۔ میں نے اپنے موبائل دونوں نمبر نوٹ کر لئے۔ اس کے بعد گنیمت نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں چند ثانیے مگمگ کھڑا رہا۔ گنیمت کی مدھر آواز میرے دل و دماغ میں کئی لمحات تک گونجتی رہی۔ اس کے بعد اچانک پھر

ماں کی یہاں موجودگی کا خیال آیا اور پھر میں ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ریسور رکھ کر ماں پاس رگھی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

ماں کی سپاٹ مگر سرائت کرتی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پر جیسے گڑ کر رہ گئی تھیں۔

میں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر گھات لگاؤں تو ہمیں شکار کو چھانسنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔“  
میری بات پر ماں کچھ سوچ میں پڑ گئیں۔ اس کے بعد بولیں۔  
”یہ ہمارا ایک غیر نسلی بخش عمل ہو گا۔ گھات لگانے سے پہلے یہ تسلی کرنا زیادہ ضروری ہے کہ  
وقت اور کہاں کا رخ کرنے والا ہے۔ اس لئے بہتر طریقہ تعاقب کے سوا مجھے نظر نہیں آتا۔“  
”لیکن ماں! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ اگر یہ کام مکمل طور پر میری صوابدید پر چھوڑ دیں تو میں  
اور بہت جلد اس اہم کام کو نمٹا لوں گا۔“

”نہیں، شاہ میر کا اپنے ہاتھوں حشر خراب کر کے میرے سینے کی آگ کو جو تسکین حاصل ہوئی  
اب وہی تسکین میں خود اپنے ہاتھوں سے نظریات کی جان لے کر دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔  
کے لہجے میں شعلوں کی لپک بھی جسے محسوس کر کے میں نے ہولے سے اثبات میں سر کو جنبش دی اور  
”ٹھیک ہے ماں! جیسے آپ کی مرضی۔ میں تیار ہوں۔“  
”میں نے اعظم خان کو اپنے لاکھ عمل سے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے کچھ آدمی بھی میری مدد  
چاہتے تھے مگر میں نے صاف انکار کر کے ان سے کہہ دیا تھا کہ اپنے دشمن کو ٹھکانے لگانے کے لئے  
اور میرا بیٹا نادر ہی کافی ہے۔“

ماں کی اس بات پر میرا رواں رواں مسرت سے جھوم اٹھا۔  
”آپ نے بالکل ٹھیک کہا انکل اعظم خان سے۔ بلکہ میں تو اکیلا ہی کافی تھا۔ مگر آپ.....“  
نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو ماں مسکراہٹ بھرے لہجے میں بولی۔  
”میں جانتی ہوں نادر بیٹا! کم از کم نظریات کے معاملے میں تم مجھ سے بد دینا حتی نہیں کر سکتے۔“  
ماں کی اس بات پر اچانک میرے دل پر ایک گھونٹہ لگا۔ انہوں نے یہ بات شاید اس لئے کہی تھی  
وہ گنیز کا باپ نہیں تھا۔ میں بد مزگی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کی بات سے مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر میں  
خاموش رہتا ہی مناسب سمجھا۔ ماں نے بھی مزید کوئی بات نہ کی تھی۔ پھر ہم دونوں خاصی دیر بیٹھے  
کی صورت حال پر غور کرتے رہے۔

اگلے دن صبح تک ہم ماں بیٹا ایک مضبوط اور مربوط لاکھ عمل ترتیب دے چکے تھے۔ مگر میں نے  
منصوبے کو مزید سرعت کے ساتھ انجام دینے کی غرض سے ماں کے علم میں لائے بغیر تھوڑی ترمیم کی  
ذرا اپنے انداز سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے فوری طور پر ایک منصوبہ بنایا۔

ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد میں جیب لے کر گرین لاج سے ٹال کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات  
جیب کی رفتار میں نے ذرا ہلکی کرتے ہوئے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور کاشانہ سے رابطہ کیا۔  
”ہیلو نادر! خیریت؟“ دوسری طرف سے اس کی دل موہ لینے والی خوب صورت آواز ابھری۔  
کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔ شاید اسے میرے اتنی جلدی دوبارہ رابطہ کرنے کی توقع نہ تھی یا پھر  
مجھے سمجھی کہ گنیز کا فون آیا ہو گا اور اب میں اس کو مطلع کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ یہ کسی حد تک درست سمجھا  
تاہم میں نے کہا۔ ”ہاں! خیریت ہی ہے۔ تم سے ایک بات کرنا تھی۔ بہت ضروری۔“

”ہاں، ہاں..... کہو۔ کیا گنیز کا فون آیا تھا امریکہ سے؟“ حسب توقع اس نے میری اچانک  
کا یہی مطلب لیا تھا۔ تاہم میں نے اسے گنیز کے فون کے بارے میں مختصراً آگاہ کرنے کے بعد  
”مگر میں نے تم سے کسی اور سلسلے میں بات کرنا تھی۔ پہلے یہ بتاؤ، اس وقت تم ہو کہاں؟ میرا مطلب  
گھر پر ہو یا کہیں باہر؟“

”میں گھر پر ہی ہوں۔“  
”تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
”آ جاؤ..... یا پھر میں آ جاتی ہوں تمہارے ٹال پر۔“  
”نہیں، تم ایسا کرو، مری پارک میں آ جاؤ۔“  
”ٹھیک ہے..... آ جاتی ہوں۔“ اس نے بلا توقف آمادگی ظاہر کی۔  
”پھر ابھی نکل رہی ہو؟“  
”ہاں۔“ اس نے گویا یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے..... میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر کے جیب کی رفتار  
بڑھا دی۔ مری پارک زیادہ دور نہ تھا۔ مال روڈ پر ہی تھا۔ پہلے یہ ”باغ شہیدان“ کے نام سے موسوم تھا۔  
مگر یہ بہت اجازت اور خود رو جھاڑیوں کا منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات تھی۔ اب اسے نئے  
سرے سے بنایا گیا تھا اور عام مقامی لوگ اسے باغ شہیدان کی بجائے مری باغ ہی کہنے لگے تھے۔  
بہر طور میں سیدھا وہاں پہنچا تو تھوڑی دیر بعد ہی کاشانہ بھی اپنی کار میں وہاں آ پہنچی۔

”خیریت تو ہے نادر! کیا بات ہے؟“ کار سے اترنے کے بعد کاشانہ نے مجھ سے پوچھا۔ اس نے  
اپنی کار میری جیب کے قریب ہی کھڑی کر دی تھی۔ ہم باغ میں چہل قدمی کرنے لگے۔ میں نے جواباً  
اسے ماں کو ملنے والی اطلاع کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر اسے حیرت کا جھکا لگا۔

”یہ تو بڑی حیرت انگیز اور سنگین اتفاق ہے۔“ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”خیر..... رب  
نواز ان دنوں معمول کے مطابق لومڑیوں کے شکار پر جاتا تو ہے لیکن مجھے یہ علم نہ تھا کہ اس کا پرسوں ہی  
جانے کا پروگرام ہے اور وہ بھی نظریات کے ساتھ۔ چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ دونوں سے ایک ساتھ ہی  
نمٹنے کا نہیں موقع مل جائے گا..... لیکن.....“

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموش ہو گئی تو میں نے پوچھا۔ ”لیکن کیا؟“  
”میرا خیال ہے نظریات کو ہلاک کرنے کی بجائے تمہیں میرے ہی مشورے کے مطابق اسے خوف  
زدہ کرنا چاہئے۔“

”لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ یہ ماں کا منصوبہ ہے۔ اور سب سے پہلے اسے ہی یہ بات معلوم  
ہوئی ہے۔ میں ان کی مدد تو کر سکتا ہوں لیکن ان کے منصوبے میں کسی قسم کی ”ترمیم“ کرنے کی جرات  
نہیں کر سکتا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔ مگر رب نواز کا کیا کرو گے؟“ اس نے پوچھا تو میں کہنے لگا۔  
”وہ بھی زد میں آ سکتا ہے۔ لیکن ہمارا اصل شکار نظریات ہی ہو گا۔“  
”نادر! نظریات کی موت سے تم ماں بیٹا مشکل میں بھی پھنس سکتے ہو۔ پولیس کا شک سیدھا تم ماں  
بیٹے کی طرف ہی جائے گا۔ ابھی شاہ میر والا مسئلہ بھی تازہ ہے۔ بے شک اس سلسلے میں حریف کی طرف  
سے کوئی قانونی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی مگر اب بقول تمہارے نظریات کا بیٹا کبیر بھی واپس آ چکا  
ہے۔ لہذا اگر بڑا امکان سو فیصد ہے۔“

”کوئی ثبوت چھوڑیں گے تو پکڑے جائیں گے نا۔“ میں نے کہا۔  
”کچھ بھی سہی، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی معمولی سی غلطی یا بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔“ وہ مدبرانہ  
انداز میں بولی۔

تیر لہجے میں پوچھا۔  
 ”سر جی! ہمارا لاکھوں کا مال چوری ہو گیا۔“ اس نے کپکپاتے لہجے میں کہا۔  
 ”کس طرح؟..... کون سا مال؟“ میں جیسے ایک جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔  
 ”سر جی! ہم نے آج صبح ہی صبح تڑکے ”دیدہ زیب فرنیچر مارٹ“ والوں کو شیشم اور شاہ بلوط کے جو تین ٹرک روانہ کئے تھے، وہ راستے میں ہی اڑا لئے گئے۔“

”کیا؟..... ت..... تمہیں کیسے پتہ چلا؟..... پھر تو چوری نہ ہوئی، ڈکیتی کی واردات ہوئی۔“ میرے جیسے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ ان ٹرکوں میں پورے نوے لاکھ مالیت کے شیشم لہجے ہوئے تھے اور آج صبح چھ بجے وہ مال سے لاہور کے لئے روانہ کئے گئے تھے۔

”سر جی! اندر آئیں۔ ایک ڈرائیور ہانپتا ہانپتا یہاں پہنچا تھا۔ وہ خاصا زخمی ہے۔ میں نے اسے آپ کے آفس میں.....“ منیجر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ میں گولی کی طرح اپنے آفس کی طرف لپکا۔ وہ ڈرائیور لمبی سی سیٹی پر دروازہ کراہ رہا تھا۔ اس کے سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور ایک بازو میں کچھیاں باندھ کر گلے سے جھپٹتی بینڈیج کی پٹی سے سپورٹ دے رکھی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوالال خان! یہ سب کیسے اور کب ہوا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ وہ اکثر ہمارا مال لاتا، لے جاتا رہتا تھا۔

”صاحب جی! ہم جیسے ہی روانہ ہوئے تو میں بچپس کلومیٹر کے فاصلے پر دس بارہ مسلح نصاب پوشوں نے ہمارے تینوں ٹرک روک لئے اور ہمیں گن پوائنٹ پر نیچے اتار دیا۔..... ہم نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو ہمیں بری طرح زخمی کر دیا گیا۔ میں خود بڑی مشکلوں سے جان بچا کر کسی سے لفٹ لے کر یہاں تک پہنچا اور سب سے پہلے ایک قریبی کلینک میں مرہم پٹی کروائی تاکہ خون بہتا بند ہو۔ اور پھر یہاں آ گیا۔“

میں نے بغور اس کی بات سنی اور پھر قریب کھڑے منیجر مشتاق سے کہا۔ ”تم اسے لے کر سیدھا قلعے طے جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں، یہ کس کی حرکت ہے۔“

یہ کہہ کر میں جیب میں سوار ہو کر آندھی طوفان کی طرح روانہ ہو گیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ حرکت ٹھیکے دار رب نواز اور اس کے غنڈے گنگل خان کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ میرا رخ رب نواز کے آفس کی طرف تھا۔ میں آندھی طوفان کی طرح جیب ابڑاتا ہوا نواز ووڈ چٹ کے دفتر پہنچا تو وہاں چوکیدار اور ایک چڑاسی کے سوا کوئی نہیں ملا۔ میں نے چڑاسی سے پہلے گنگل خان کے اہلے میں دریافت کیا۔ پھر چالاک کے ساتھ اس کے گوداموں کا جائزہ لیا مگر مجھے اپنے ال کی ذرا بھی جھلک نہ دکھائی دی۔

وہاں سے میں جیب میں سوار ہوا اور سیدھا ڈرائیور لال خان کے بتائے ہوئے پتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اچانک مجھے کاشانہ کا خیال آیا۔ وہ ٹھیکے دار رب نواز کے گھر کی بھیدی تھی۔ رب نواز نے میری پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا اور میں اسے اچھی طرح سبق سکھاتا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے جیب کی رفتار راہیسی کر کے موہاں پر کاشانہ سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میری بات سن کر ایک لڑکھو وہ جیسے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر مضطرب لہجے میں بولی۔

”نادر! تم جوش میں آ کر ابھی کوئی ایسا دیا قدم مت اٹھانا۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ ویسے تمہاری طرح نئے اس بات کا پورا یقین ہے کہ یہ حرکت رب نواز اور گنگل خان ہی کی ہو سکتی ہے۔“ اتنا کہہ کر چند

”لیکن اب کیا، کیا جاسکتا ہے؟ ماں کو سمجھانے بجھانے کی پوزیشن میں تو دیسے میں نہیں ہوں۔ یہ بار بھی انہوں نے جانے کیسے مجھے بتا دی ہے۔ ورنہ تو نگینہ والے معاملے کے بعد سے ماں نے تو ایشیا کنایوں میں مجھے شاہ میر اور نظر حیات والے معاملے سے ہی الگ کر دینے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔ اگر میں نے کوئی ذرا سی بھی آنا کافی کی یا بحث کرنے کی کوشش کی تو ماں کے دل میں میرے خلاف غلط مزید تقویت حاصل کر لے گی۔ لہذا اب میرے لئے بھی ماں کے دل سے اپنے خلاف غلط فہمی دور کرنے ایک سنہری موقع ہے جسے میں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا۔ بلکہ ماں نے تو یہ بات مجھے بتاتے ہوئے اور مجھے اس مہم میں شامل کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں یہ بھی کہا تھا کہ ”نادر بیٹے! مجھے یقین ہے کہ کم از کم نظر حیات والے معاملے میں مجھ سے بددیانتی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ نگینہ کا باپ نہیں ہے۔“

”ہوں..... تمہاری بات درست ہے۔ بہر حال مجھے بتاؤ، میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر ہوں؟“ اس نے استفساریہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”تم فقط اتنا کرنا کہ نظر حیات کی آمد پر مجھے بروقت اطلاع کر دینا اور ان دونوں شیطانوں پر دو گرام پر ذرا نظر رکھنے کی کوشش کرنا تاکہ یہ بات کفر ہو جائے کہ ان لوگوں کا شکار پر جانے کا پروا ہر سونے کا پکا ہی ہے۔“

”ٹھیک ہے..... اتنا تو میں کر ہی سکتی ہوں۔“ کاشانہ نے مسکرا کر جواب دیا۔  
 ہم دونوں ذرا دیر باغ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے چہل قدمی کرتے رہے۔ میرے اور نگینہ والے معاملے کے سلسلے میں اس کی دلچسپی اور درپردہ مشاورت و گفتگو نے مجھے اس کی ہمراہی میں رہنے پر کر دیا تھا۔ ہم نے کافی پی، اس کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر لوٹنے لگے۔ کاشانہ دوسرے سے کار نکال لے گئی۔ اور میں جیب کی طرف پلٹنے لگا تو اچانک مجھے شخص چند قدموں کے فاصلے پر کب تیز قدموں سے ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔

اسے دیکھ کر میرے ذہن میں کل سہ پہر کا واقعہ تازہ ہو گیا جب میں لنچ کرنے کے بعد کاشا رہائش گاہ سے نکل رہا تھا اور مجھے کوئی شخص تیزی کے ساتھ سامنے کی کھنی جھاڑیوں میں گھستا نظر آیا اب اس وقت کبیر کو یوں اچانک جاتا دیکھ کر یوں میرا خیال اس طرف چلا گیا تھا اور مجھے لگا کہ اس سے کچھ نہ کچھ تعلق تھا۔ کیا خبر یہ وہی ہو۔ تیز تیز چلنے کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ تھوڑا پہلے وہ یہاں موجود تھا اور میری اور کاشانہ کی حرکات و سکنات کو نظروں میں لئے ہوئے تھا۔ اتنا یقین تھا کہ وہ میری اور کاشانہ کے دریاں ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا ہو گا۔ تاہم اس مقام پر موجودگی خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ دل میں تو آئی کہ اسے آواز دوں۔ مگر پھر یہ سوچا سکتا ہے وہ میرا وہم ہو اور کبیر اپنے ہی کسی کام سے یہاں آیا ہو۔ وہ گیٹ سے نکل کر باہر غائب تھا۔ میرا ذہن انجمن کا شکار ہو گیا تھا۔ بہر طور میں نے اپنی جیب کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور طرف روانہ ہو گیا۔ ٹال پہنچا تو سارے مزدور ایک جگہ اکٹھے جمع کی صورت کھڑے تھے۔ منیجر مشتاق ان کے درمیان موجود تھا۔ اس کے چہرے سے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں جیسے ہی جیب سے ہانپتا کاشا میری جانب بڑھا۔

”سن..... سر جی! وہ غضب ہو گیا، جی کڑا کے!“ میرے قریب آ کر اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔  
 ”کیا ہوا؟..... جلدی بتاؤ۔“ میں نے اپنے دل کی بڑھتی ہوئی ہڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے

دوئم  
ٹائیے تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”تم مجھے تھوڑا سا وقت دو، میں کچھ کرتی ہوں۔ پھر تمہیں کال کر دوں گی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ تم میری کال کا انتظار کرنا۔“

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں سیدھا ڈرائیور لعل خان کے بتائے ہوئے اس نہ پہنچا جہاں یہ واردات ہوئی تھی۔ وہاں چار اطراف دیرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔

البتہ ایک جگہ مجھے سڑک کے دائیں جانب ڈرا دور اونچا سا ”منہ“ نظر آیا جس پر سے دھواں اٹھتا تھا۔ قریب ہی دھواں اٹھتی چنی بھی نظر آئی۔ یہ اینٹوں کا بیٹھا تھا۔ میں جیب لے کر فوراً کچے ٹھکانے پر پہنچا۔ وہاں سے میں نے مزدوروں سے معلوم کیا کہ انہوں نے ٹرکوں کو کہیں نیچے کی طرف جاتے دیکھا تھا؟

”ہاں صاحب! ابھی دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔“ ایک مدقوق سے مزدور نے پُر جوش میں بتایا۔ ”وہاں سامنے سڑک پر تین ٹرک ٹھوڑی دیر تک تو رکے رہے، پھر سڑک کی دوسری طرف کچے علاقے میں اتر گئے تھے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے جیب میں سوار ہو کر واپس سڑک کی طرف چلا آیا۔ میں نے اس کا مقام پر مجھے ایک خاصا چوڑا مگر کچا اور بل کھاتا راستہ ترائی میں جاتا نظر آیا۔ راستے پر ہولیا۔ میرے دائیں بائیں چبڑ، صنوبر اور دوسری اقسام کے درخت ایستادہ تھے۔ ذرا نیچے کے بعد میں رک گیا اور جیب سے اتر کر کچے میں رکوع کے بل جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ میری سنسنے لگیں۔ یہاں ٹرک کے چوڑے ٹائروں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ میں فوراً دوبارہ

میں سوار ہوا اور آگے روانہ ہو گیا۔ میں نیچے ترائی میں اتر گیا تھا۔ یہ کچا راستہ شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا جا رہا تھا۔ جنگلوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا دور تک جاتا نظر آ رہا تھا۔ راستہ کچا اور بھر بھری مٹی والا۔ ہوا باعٹ ٹرک کے ٹائروں کے نشانات بہت واضح نظر آ رہے تھے۔ نصف گھنٹے بعد برف پوش پہاڑ وادی بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ ایک مقام پر مجھے آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں نے جیب مزید بڑھا دی۔

کاشانہ نے ابھی تک وعدے کے مطابق مجھ سے دوبارہ سیل فون پر رابطہ نہیں کیا تھا۔ جب کی ڈھلوانی چھتوں والے گھروں کے جا بجا بکھرے ہوئے سلسلے قریب آنے لگے تو میں نے ایک نما چائے خانے کے قریب جیب لے جا کر روک دی اور وہاں موجود چند گاہکوں کو چھوڑ کر ہوں سے تین ٹرکوں کے بارے میں دریافت کیا تو ایک نو عمر بیرے نے بتایا کہ تین ٹرک یہاں سے تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آگے روانہ ہو گیا۔

خاصی دور جا کر کچا راستہ قوس کی صورت میں بائیں جانب گھوم رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی جانب موڑی تو اچانک مجھے اس راستے سے لہبا اور کچا راستہ بائیں جانب جاتا دکھائی دیا۔ میں نے اس کی خاطر جیب روک کر نیچے اتر گیا اور جھک کر ٹائروں کے نشانات دیکھنے لگا تو یہ نشانات مجھے پر آگے جانے کی بجائے مذکورہ بائیں جانب دوسرے راستے پر گھومتے دکھائی دیے۔ یہ راستہ ٹھکر ٹرک یہاں سے جاسکتا تھا۔ البتہ سامنے سے آنے والی کسی دوسری گاڑی کو راستہ نہیں دے بہر طور میں اس راستے پر ہولیا۔ قریباً کوئی پندرہ سولہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جانب سبز میدان نظر آیا۔ اگرچہ یہاں بھی صنوبر، چبڑ کے درخت ایستادہ تھے مگر ان کی تعداد

دوئم  
جیب کی مجھے اپنی داہنی طرف ڈرا دور ایک طرف بڑی سی ڈھلوانی چھت والی مستطیل چوٹی عمارت نظر آئی اور سب سے اہم بات جس نے بے اختیار میری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی تھی، وہ یہ تھی کہ ٹرک کے ٹائروں کے نشانات اسی سمت مڑ رہے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر جیب وہیں جھاڑیوں کے جھنڈ میں روک دی اور نیچے اتر آیا۔ میرا مگارد حسب معمول میرے پاس موجود تھا مگر فاضل راؤ نڈ میرے پاس نہیں تھے۔ سردست میرے لئے یہی کافی تھا۔

میں جیب سے اتر کر درختوں اور اوک اور سلورنر کی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا مذکورہ عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا قریب پہنچا تو یکنخت میری کنپٹیوں پر خون اچھال مارنے لگا۔ عمارت کے باہر سرمائی دھوپ میں چار باغ افراد کرسیوں پر بیٹھے چائے پیتے خوش گیسوں میں مصروف تھے۔ ان میں لمبے چوڑے وجود الاجیم، گنگل خان بھی تھا۔ میری عقابانی نظریں اوک کی گھٹی جھاڑیوں کے عقب میں عمارت کا جائزہ لینے لگیں مگر میرے دل و دماغ میں یکایک ہونے والی لچل کی اصل وجہ عمارت کے سامنے کھڑے وہ تین ایک ٹرک (چھ ٹائروں والے) تھے جن میں سے سرودھ مال اتارا جا رہا تھا۔ مجھے یہ عمارت گودام ٹائپ نظر آ رہی تھی جس میں مجھے تین بڑے بڑے دیو بیکل گیٹ نظر آ رہے تھے۔ پندرہ سولہ مزدور میرے پوری شدہ ٹرکوں سے بڑے شہتر اٹھا کر اندر گودام میں لے جا رہے تھے۔

اس دیدہ دلیری پر میرا پورا وجود قہر و غضب کے مارے جلنے لگا۔ اب تو مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ رود گنگل خان نے اپنے گرو رب نواز کے ہی ایما پر اپنے چاروں ساتھیوں کی مدد سے میرے تین ٹرک پوری کر کے یہاں تک پہنچائے تھے۔

گودام کی پیشانی پر سیاہ رنگ کے بڑے بڑے حروف سے ”نواز ووڈ مرچنڈائز“ لکھا ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً ہی اپنی جیب سے زوم لینس کیمرے والا موبائل سیٹ نکالا اور تقریباً منہ گھٹے تک وہیں جھاڑیوں میں دبکا ان کی مووی بناتا رہا۔ میں نے وہاں موجود گنگل خان سمیت اس کے پانچوں قریبی ساتھیوں اور مزدوروں کے چہروں کو اور اپنے ٹرکوں، ان کی نمبر پلیٹس کے علاوہ گودام کی پیشانی پر لگے ”نواز ووڈ مرچنڈائز“ کے حروف کو بھی اچھی طرح فوکس کرنے کے بعد مووی کو محفوظ کر ڈالا۔ براؤنن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

اس دوران میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ کاشانہ کی کسی وقت بھی کال آ سکتی ہے اور مجھے پہلے ہی سے قیاطاً اپنے موبائل کی ٹون آف کر کے واہرینگ الٹ پر سیٹ کر دینی چاہئے تھی۔ مگر اس کا وقت نکل گیا تھا اور میرا فون گنگل ہا تھا۔ گودام سے میرا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ میرے موبائل کی رنگ ان اس خاموش ماحول میں ہم دھماکے کی طرح گونگی۔ گنگل خان اور اس کے پانچوں ساتھی اس آواز پر لپ اچھلے جیسے انہیں بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے موبائل آف کر دیا اور اپنی جیب سے میگارد نکال کر

نہیں پکڑ لیا اور تیزی کے ساتھ جھاڑیوں میں دائیں جانب رینگتا چلا گیا۔ ادھر گنگل خان نے بھی فوراً پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور اپنے پانچوں ساتھیوں سمیت دوڑتا ہوا اس سمت بڑھا جہاں ذرا دیر پہلے میں چھپا بیٹھا تھا۔ ان پر اس وقت خون سوار تھا۔ یہ لوگ کیونکہ رینگے فوس پکڑے گئے تھے، اس لئے ممکن تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں۔ میں دشمنوں کو گھیرنے کی خاطر مزید گھنی جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ بھی جھاڑیوں میں گھسنے لگے۔ گنگل خان نے تو اب ہٹاؤ اور پچھنی پچھنی دھڑانے آواز میں دھاڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔

”کون ہے؟..... باہر نکل آؤ..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

مگر میں ایک جگہ گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ گنگل خان کے پانچوں ساتھی اس کی ہدایت پر دو اطراف پر پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ مگر میں سب سے پہلے گنگل خان پر قابو پانا چاہتا تھا۔ اور پھر جیسے ہی وہ قریب آیا، میں چپے کی طرح اس پر جھپٹا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی لات اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کر ڈالی۔ پستول اس کے ہاتھ سے طوطے کی طرح اڑ گیا۔

پھر جب تک وہ سنبھلتا، میں نے اس پر اپنا میگا روٹان لیا اور غرا کر بولا۔ ”خبردار! کوئی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ.....“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میری کمر پر کسی نے زوردار لات رسید کر دی۔ یہ اچانک اور پشت پر حملہ تھا۔ میں مار کھا گیا اور جھاڑیوں میں گرا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گرتے ہی میں نے سنبھلنے کی کوشش کی تو گنگل خان اور اس کے دو ساتھی مجھ پر بیک وقت پل پڑے۔ مجھے قابو کر لیا۔ گنگل خان نے اپنا اور میرا پستول تلاش کر کے اپنے قبضے میں کر لیا اور میری طرف کینڈا نظروں سے گھورنے لگا..... اُس کے بد ہیئت ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”لے چلو اسے۔“ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کہا۔ تب تک اس کے باقی تین ساتھی بھی یہاں آئے۔ ”جگہ دیکھتے تھے۔ مجھے جھاڑیوں سے نکال کر باہر گودام کے سامنے والی کھلی جگہ پر لایا گیا۔ باقی مزدور بھی اپنا کام چھوڑ کر ہماری طرف ہی متوجہ تھے۔“

”تم لوگ اپنا کام کرو، جلدی۔“ گنگل خان نے مزدوروں کو جھڑکا۔ یہ بھی انہی کے زرخیز کتے لگتے تھے۔ وہ فوراً اپنے کام میں جت گئے۔ گنگل خان نے اپنے تین آدمیوں کو وہیں مزدوروں سے مال زوانے پر کھڑا رہنے کی ہدایت کی اور پھر باقی دو ساتھیوں کو لئے گودام کے اندر نسبتاً کشادہ ہال کمرے میں لے آیا۔

یہاں دو تین کھری چار پائیاں اور لکڑی کی تین بیچوں کے علاوہ چند کرسیاں بھی دھری ہوئی تھیں۔ ”گنگل خان! تم نے میرے ٹرک چوری کرنے کی جرأت کیسے کی؟“ میں نے مفتوح ہونے کے وجود سامنے کھڑے گنگل خان سے گرج دار آواز میں کہا۔ مگر وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے دونوں ساتھیوں سے تحکمانہ انداز میں بولا۔

”اس کی تلاشی لو..... اور جو بھی شے برآمد ہو اسے اپنے قبضے میں کر لو۔“ اس کی بات پر میں پریشان ہو گیا۔ تلاشی لینے کی صورت میں میری جیب سے مودی گیرے والا موبائل برآمد ہو سکتا تھا اور گنگل خان جیسا گھاگ انسان کھٹک سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر جارحانہ مزاحمت کے لئے خود کو اپنی طور پر تیار کر لیا۔ گنگل خان کے ہاتھ میں اس کا اپنا پستول تھا۔ جبکہ میرا میگا روٹان اس کی جیب میں منتقل ہو چکا تھا۔ باقی وہاں موجود اس کے دو آدمی نہتے تھے اور وہی دونوں میری تلاشی لینے کو آگے بڑھے۔

”اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“ گنگل خان نے اچانک ہی مجھے درستی سے حکم دیا اور میں اسے جلتی سسکتی نظروں سے گھورتا ہوا دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے لمحے کے ہزارویں حصے میں اس خطرناک پتھویشن کا اندازہ لگایا اور پھر جیسے ہی وہ دونوں میری تلاشی لینے کے لئے بڑھے، میں کسی طوفانی بگولے کی مانند حرکت میں آیا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ ایک کے پیٹ میں لات رسید کرتے ہی، دوسرے کو دھوئی پڑے کے انداز میں قریب ہی کھڑے گنگل خان کی طرف دھکیل دیا کہ وہ مجھ پر فوری طور پر گولی بھی نہ چلا سکے..... وہی ہوا۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ اُلجھ کر رہ گیا۔ پھر جب تک دونوں سنبھلتے، میں نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ گنگل خان پر جست لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا گودام کے پتے فرش پر آ رہا۔ اس کا سر سینٹ کے پختہ بلاک سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے زخمی نبل جیسی ڈکراہٹ ابھری۔ میں نے آٹا فانا اس کے پستول پر قبضہ جمایا مگر دوسرے ہی لمحے اس کے دونوں ساتھی مجھ پر بیک وقت پل پڑے۔ مگر اب میں ان کے قابو میں آنے والا کہاں تھا۔ جیسے ہی ایک نے مجھے عقب سے لپکتا چاہا اور دوسرے نے میرے پستول والی کلائی کو تھما، میں نے بائیں بازو کی کہنی سب سے پہلے خود



دوئم  
ایک جھٹنے کے اندر اندر اعظم خان اور ماں بھی وہاں کار میں آن پہنچے۔ ان کے ہمراہ بھی پولیس کی اچھی خاصی نفری تھی۔ اس پولیس کا تعلق میرے مری ٹال والے تھانے سے تھا جہاں متاثرہ ڈرائیور لال خان نے منجھڑی کے ساتھ میری ہدایت پر تھانے جا کر تینوں ٹرک چھینے جانے کی رپورٹ درج کروائی۔ مزید اگلے ڈیڑھ گھنٹوں کے اندر اندر ساری ضابطہ کی کارروائی نمٹا دی گئی اور ٹھیکے دار رب نواز کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے گئے۔ ماں نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے اپنے گلے سے لگا کر میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ ماں کی آنکھوں اور چہرے پر اپنے لئے بے پناہ فخر و انبساط کے تاثرات دیکھ کر میرا دل خوشی سے لبریز ہو گیا۔

”مگر بیٹا! ہمیں ایک نقصان ضرور ہو گیا۔“ ماں نے اچانک گہری اور الجھن آمیز سنجیدگی سے کہا۔ ہم اس وقت گرین لاج میں ہی تھے۔ میں ماں کی اس پرتشیش بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یعنی اس واقعے اور ٹھیکے دار رب نواز کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد نظر حیات اور ان کا ”بٹ راس“ اور ”کمال بن“ جا کر برفانی لومڑیوں کا شکار کرنے کا پروگرام ملتوی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے بڑے رसान سے کہا۔

”ماں! آپ اس کا غم نہ کریں۔ میری نظریں اصل شکار پر مرکوز ہیں۔ نظر حیات کب تک بچے گا۔ یہ درست ہے کہ اب شاید اس کا لومڑیوں کے شکار پر جانے کا پروگرام ملتوی ہو جائے۔ لیکن.....“  
”لیکن.....“ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ خود اکیلا ہی نکل جائے۔“ ماں نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میری معلومات کے مطابق سال میں ایک بار لومڑیوں کے سالانہ شکار پر نظر حیات کا جاناخص شوق یا مشغول ہی نہیں ہے بلکہ اس کا کاروبار بھی ہے۔ برفانی لومڑیوں کی کھالوں کی بہت مانگ ہے اور نظر حیات اپنی ٹیم کے ساتھ ہر سال باقاعدگی سے جاتا ہے اور ڈھیروں لومڑیوں کا شکار کرتا ہے پتہ نہیں اس بار وہ ٹھیکے دار رب نواز کو کیوں اپنی مہم میں شامل کرنا چاہ رہا تھا۔ خیر، تم بھی نظر رکھو اور ہم بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ برسوں کے پروگرام کو آج والے واقعے کی وجہ سے منسوخ نہ سمجھو۔“

”ٹھیک ہے ماں! میں سمجھ گیا۔“ میں نے پُر خیال لہجے میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ پھر موضوع کا رُوئے سخن نظر حیات سے ہٹا کر رب نواز کی طرف موڑتے ہوئے ماں سے بولا۔ ”ماں! آج والے واقعے کا ہمیں اب دہرا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں بس وکیل کوئی اچھا کرنا ہوگا۔“ یہ بتاتے ہوئے میں نے ماں کو اس ساٹھ لاکھ کے حوالے سے بھی ساری کہانی سنا ڈالی کہ اب یہ بہترین موقع تھا، اس پرانے کیس کو کھولنے کا۔ ماں نے اس سلسلے میں فوراً ہی انکل اعظم خان سے مل کر یہ کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی میں اور ماں گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ کال کا شانہ کی تھی۔ ”واؤ..... فضا سنک، نادر علی خان! تم واقعی نہ صرف ایک جینٹلمن انسان ہو بلکہ دلیر اور بہادر بھی۔“ ”دوسری طرف سے کا شانہ کی چمکتی ہوئی آواز ابھری۔

”ہاں کا شانہ!..... تم یہ بتاؤ، رب نواز پر کیا بیت رہی ہے اس وقت؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔  
”ماں کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔  
”اس کا خیال ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے اور میں نے گھر کا بھیدی بن کر اس کی لڑکا زحمت کی ہے۔“  
”اچھا..... تو تم نے کیا جواب دیا؟“

دوئم  
کو پشت سے دبوچنے والے دشمن کے پیٹ میں رسید کی۔ وہ اپنے حلق سے ”اوغ“ کی بھیا تک کراوا کر چیخ خارج کر کے پیچھے لڑھک گیا۔ پستول پر قبضہ کرنے کی کوشش کرنے والے کو میں نے سوپ کے اندر میں ٹانگ جڑ دی جو اس کی گردن پر لگی۔ وہ بھی پرے لڑھک گیا۔ جبکہ پستول ذرا پرے سرک گیا۔ اٹھ کر اسے اٹھانے کے لئے لپکا تو پیچھے بڑے گھل خان نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں منہ کے بل فز آ رہا مگر فوراً ہی اپنا چہرہ یا پیشانی فرش کی ٹکر سے بچانے کی غرض سے میں نے دونوں ہاتھ فرش پر دیئے اور ایک بیک فرش سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹانگ گھل خان کے منہ پر جڑ دی۔ وہ ایک پھر بھیا تک ڈکراہٹ کے ساتھ دور جا کر۔ میں نے لپک کر اس کا پستول اٹھا لیا اور سیدھا کھڑا ہو کر پر تان لیا۔ مگر اس اثناء میں گھل خان بھی غیر متوقع پھرتی کے ساتھ کام لیتے ہوئے جیب سے پستول نکال کر مجھ پر تان چکا تھا۔ یہ میرا ہی چھینا ہوا میگا ردتھا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ اس کے پاس میرا اور میرے پاس اس کا پستول تھا اور ہم دونوں وقت ایک دوسرے پر پستول تانے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھا جانے نظروں سے ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کے دائیں بائیں منہ کھڑے ہائپ رہے تھے۔

”میری نظریں تمہارے پستول کے ٹرائیگر پر جمی انگلی کی ذرا سی جنبش پر ہیں گھل خان!“ میں نے گھورتے ہوئے بولا۔ مگر اس بد بخت نے فوراً ایک جانب جست بھر کے گولی چلا دی۔ مگر میں بھی نہیں تھا میرے حواس پوری طرح چوکنے بلکہ بھڑکے ہوئے تھے لہذا جیسے ہی گھل خان نے جست اٹھی مجھ پر گولی چلائی، میں پہلے ہی بائیں جانب چھلانگ لگا چکا تھا۔ نتیجتاً اس کا نشانہ تو خطا چلا گیا مگر مجھے کرنے کا بعد میں اور بروقت موقع ملا گولی ٹھیک گھل خان کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کا ہاتھ چھیدتی ہوئی نکل گئی تھی اور زخمی ہاتھ پکڑے بری طرح کراہنے لگا۔ اس کے دوسرے ساتھی کو پستول کی جانب حرکت کرنے کی ہر نہ ہو سکی اور میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنا میگا ردتھا لیا اس اثناء میں اس کے دیگر تین ساتھی اندر داخل ہو گئے تھے۔

”کوئی حرکت نہیں کرے گا..... ورنہ سب کو بھون ڈالوں گا۔“ میں نے دونوں پستول ان پر ہونے و حشیانہ غراہٹ سے کہا۔ پھر ان سب کو ایک کونے میں گھل خان سمیت اکٹھا کر کے کھڑا کر خود تیزی سے باہر نکلا اور جلدی سے دروازہ بند کر کے گودام کے الگ تھلگ ہال کمرے سے باہر مزدوروں نے جو مجھے اس حالت میں دیکھا تو وہ شہتیر ڈھوتے ہوئے یوں رک گئے جیسے چابی کھلونے چابی ختم ہونے پر رک جاتے ہیں۔ میں نے ان سے چلا کر کہا۔  
”یہ چوری کا مال ہے۔ تم لوگوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ جتنا سامان اتارا ہے اسے فوراً واپس آ جلدی۔“

وہ لوگ ڈر گئے۔ لہذا فوراً انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس وقت کھڑے موبائل پر کا شانہ کے اسے ساری حقیقت بیان کر ڈالی۔ پھر اعظم خان اور مال رابطہ کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور یہاں کا اتہ پتہ بھی سمجھا دیا۔  
سب سے پہلے انکل اعظم خان نے متعلقہ تھانے فون کر کے فوری طور پر میری مدد کے لئے کافی نفری روانہ کروا دی جنہوں نے آتے ہی گھل خان اور اس کے پانچوں ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔



”میں نے یہی کہا کہ کاش! یہ کام واقعی میری وجہ سے ہوا ہوتا۔“

”اوہ..... پھر تو وہ بری طرح سے تپ گیا ہوگا؟“ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”کوئی ایسا ویسا.....“ اس کی خوشی سے معمور آواز ابھری۔ ”اس نے تو مما کو بھی میرے خلاف

آگ بگولا کر ڈالا تھا۔ دونوں ہی بچے جہاز کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ رب نواز سے تو مجھے کینٹینی کی توڑ

تھی ہی، مگر نادر! ماما بھی اس کے ساتھ مل چکی ہیں۔ ماما نے مجھ پر بہت غصہ کیا۔ ان کا بس نہیں چل

تھا کہ مجھے کاٹ کر رکھ دیں۔“ اس کی تھوڑی دیر پہلے چپکتی ہوئی آواز بھرانے لگی۔ اس میں دکھ کی رفت

بھرنے لگی تھی۔

”نادر!..... ماما نے مجھے بہت لتاڑا۔ مجھے تو وہ میری ماما محسوس ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ ایسا کیوں

ماما نے میرے ساتھ؟..... میں رب نواز کی بیٹی نہیں، مگر ماما کی تو سگی اولاد تھی۔ ان کی کوکھ سے جنم

تھا میں نے..... پھر..... پھر ماما اس قدر مجھ پر غصہ کیوں ہوئیں؟ اور تو اور بعد میں سوری بھی کیا

کیا مجھ سے کہ میرا غم تو ہلکا ہو جاتا۔ ایسے میں نادر صاحب! ام..... مجھے اپنے پیسا بہت یاد آئے.....

بہت یاد آئے۔“ یہ کہتے کہتے وہ بے چاری باقاعدہ رو پڑی۔ مجھے خود بھی دکھ ہوا۔ میں اسے حوصلہ دے

ہوئے بولا۔

”کاشانا! خود کو سنبھالو..... تم تو خود مجھے حوصلہ دیتی ہو، اب خود ہمت ہار رہی ہو۔ شاباش! ایک

اٹ ایزی۔ بہت با حوصلہ لڑکی ہو تم۔“

میرے سمجھانے بھانے پر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھالا تاہم جب وہ بولی تو گہرے دکھ سے الٹا

لہجہ اب بھی کپکپا رہا تھا۔

”نادر صاحب! جب قریبی رشتے کے لوگ ایسا رویہ اختیار کریں تو دکھ تو ہوتا ہی ہے۔ خیر.....

میں خوش ہوں، رب نواز اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کے لئے ادھر ادھر دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔“

”اچھا..... تم ایک بات بتاؤ کاشانا!“ میں نے آخر میں اچانک کسی خیال کے تحت کہا۔ ”جہم

کوئی خطرہ تو نہیں ہے نارب نواز سے یا پھر اپنی ماما سے؟“

لحہ بھر کی خاموشی کے بعد کاشانا بولی۔ ”نہیں..... وہ بھلا میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ آپ کو کونسا

معلوم، پاپا میرے تحفظ کے لئے کیا کچھ کر کے گئے ہیں۔“

”اوکے، اوکے..... اچھا، بعد میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ اوکے، خدا حافظ!“

”خدا حافظ!“

”یہ کاشانا کون ہے؟..... کیا رب نواز کی بیٹی ہے؟“ ماں نے پوچھا تو میں نے موبائل جیب

رکھتے ہوئے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

”ہاں ماں! مگر سوتیلی۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن

نے کبھی رب نواز کو اپنا باپ تسلیم نہیں کیا ہے۔ بلکہ اب تو اسے اپنی ماں سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔

”کیا کاشانا تمہاری اچھی خاصی دوست بن چکی ہے؟“

”ہاں..... بس اتفاقاً ہی دوستی ہو گئی تھی اس سے۔“ میں نے کہا۔

”دوستی اتفاقاً ہو ہی جاتی ہے۔“ ماں نے عجیب بے لہجہ میں کہا۔ ”بھی یہاں لے کر آؤ اسے۔

بھی تو دیکھوں اپنے بیٹے کی چواس۔“ ماں نے آخر میں میرے قریب آ کر میرے گال پر پیار سے

لہتے ہوئے کہا۔ ماں کو خوش اور شوخ ہوتا دکھ کر میں بھی کھل کر مسکرایا اور بے اختیار محبت سے لبریز

دوئم

میں نے ماں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ ماں کی محبت بھری متا میرے رگ و پے میں جوش اور مسرت کی

بجلیاں دوڑا رہی تھی۔ مجھے یک گونہ سکون اور قرار پہنچا رہی تھی۔ ماں نے بہت دکھ جھیلے تھے، بہت غذاب

ہے تھے، بہت تکلیفیں اٹھانی تھیں۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ چاہے ہم دونوں ماں بیٹے کے درمیان نگینہ والے معاملے کی وجہ سے لاکھ

بھری ہوئی رہی ہو مگر ہم ماں بیٹے کی محبت میں کی نہیں آئی تھی۔ ماں کے وجود سے مجھے بڑی روحانی

خوشبو اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماں نے بھی اپنے دونوں بازوؤں کی تختی کو میرے پہاڑ جیسے وجود میں

برحالتے ہوئے فرش آواز میں کہا۔

”نادر! میرے بچے! میں نے بہت تھوڑی خوشیاں دیکھی ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، تمہارے بہادر باپ

نادر خان نے میرے ساتھ طوفانی محبت کی۔ ہم دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پا

کر بہت خوش تھے۔ بہت نازاں و فرحاں۔ مگر ہماری اس محبت کی شادی کو صرف چھ سات ماہ ہی گزرے

تھے اور تم اس دنیا میں آنکھ کھولنے والے تھے مگر تقدیر کی ستم ظریفی نے ہماری خوشیوں پر ایسا شب خون

مارا کہ میں یہ وہ ہو گئی اور اس پر بھی یہ ستم کہ مجھے شاہ میر اور نظر حیات جیسے زہریلے سانپوں نے میرے ہی

شوہر کے قتل کے جھوٹے الزام میں جیل پہنچا دیا اور وہاں میں نے اپنی نوخیز جوانی کے بیس سال گزار

دیئے اور تمہیں بھی میں نے جیل کے سیلن زدہ ماحول اور تنگی اینٹوں والے فرش پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جہنم

دیا۔ پھر میں نے تمہاری آس پر دشمنوں سے بھیا تک انتقام لینے کی پیش میں جینا سیکھا۔ تم ہی میری پہلی

اور آخری آس تھے۔ پھر جب میں نے تمہیں کڑیل جوان کے روپ میں دیکھا تو مجھے تمہاری صورت میں

تمہارے بہادر باپ کی جھلک نظر آنے لگی۔ میرے اعتماد کو کبھی نہیں گلے دینا میرے بچے!.....

کبھی نہیں..... ورنہ..... ورنہ میں جیتے جی مر جاؤں گی۔“

ماں میرے کاندھے پر سر رکھے بے اختیار رو دیں۔ آج پہلی بار میں نے ماں کی آنکھوں میں آنسو

دیکھے تھے اور میرا دل بری طرح پہنچ رہا تھا۔ ماں کے آنسو میرے سینے سے بھڑکتی ہوئی آتش انتقام پر تیل

چھڑکنے کا باعث بن رہے تھے۔ میں نے ماں کو آہستگی سے علیحدہ کیا اور ان کے آنسو سے لبریز مگر پتہ پیش

اور زم زم چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جوش اور عزم سے معمور آواز میں بولا۔

”ماں! میں تیرا مان گھنے نہیں دوں گا۔ میں تیری خوشیوں کو غم میں بدلنے والوں سے بھرپور انتقام لوں

گا۔ وہ وقت اب دور نہیں رہا ہے۔ بس تو اپنے خون پر بھروسہ رکھ۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں

دشمنوں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دوں گا۔“

ماں نے اپنے آنسو پونچھے اور ہولے سے مسکرا کر بولیں۔ ”تو پھر کاشانا کو مجھ سے کب ملا رہے ہو؟“

”اسے بلانے کی دیر ہے، وہ کسی وقت بھی آ جائے گی۔“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

تاہم مجھے ماں کا کاشانا کو گھر بلانے کا اصرار عجیب ہی محسوس ہو رہا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ نگینہ کی غیر موجودگی سے ماں خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ شاید آج ماں کا رویہ

میرے ساتھ اسی امر کا ہی رہین منت تھا۔

\*\*\*

اگلے دن کا سورج اہم خبر کے ساتھ طلوع ہوا۔ ٹھیکے دار رب نواز کی ضمانت قبل از گرفتاری کی کوششیں

ناکام ہوئی تھیں اور وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے روپوش ہو گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کا کیس کمزور

پڑنے لگا۔

دوئم  
اشفاق شاہین اور اس کے مقرب خاص غفور کے درمیان میرے سلسلے میں ایک اہم میٹنگ ہوئی تھی۔  
”مجھ سے ڈیلنگ کرنا چاہتے ہیں اس معاملے میں۔“ میں نے بتایا۔  
”کیسی ڈیلنگ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ غفور مجھ سے ملنا چاہتا ہے تاکہ مجھ سے معاہدہ کر سکے کہ میں ان کے بارے میں منہ نہیں کھولوں گی۔“ اس نے بتایا۔ اس کے لہجے میں سرت آمیز طمانیت تھی۔ مگر میں اس کی بات سن کر کھٹک گیا اور دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”تو پھر تم سے غفور نے رابطہ کیا؟“

”نہیں..... وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”غزالہ! میری بات ذرا توجہ سے سنو۔ تمہاری جان خطرے میں ہے۔“ میں نے اچانک سرسراتے لہجے میں کہا اور دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

”ہیلو..... غزالہ! تم سن رہی ہو؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ہاں، ہاں..... سن رہی ہوں۔ تمہاری بات نے مجھے گنگ کر کے رکھ دیا تھا۔“ وہ بولی۔ اس کی آواز میں ہلکی سی کیکپاہٹ تھی۔ ”مم..... مگر تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟“

”اس لئے کہ تم میرے سامنے اشفاق شاہین کی اصلیت کے بارے میں منہ کھول چکی ہو اور یہ بات اسے میرے ذریعے سے ہی معلوم ہو چکی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا.....“

”مگر تمہاری بات اور ہے۔ وہ تو اب تمہیں بھی اپنا سا بھی سمجھنے لگے ہیں۔ اس اہم نشست میں اشفاق شاہین اور غفور کے درمیان تمہارے سلسلے میں بھی گفتگو ہوئی تھی۔ انہیں تم سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”غزالہ! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم ان کی رازداں ہو۔ تمہیں بہر حال ان سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یا پھر تم ایسا کرو کہ یہ شہر چھوڑ کر چلی جاؤ۔“ میں نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا تو وہ گہرے لہجے میں بولی۔

”نادر! میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ اشفاق شاہین کا ایک اہم آلہ کار میرا رازدار بن چکا ہے جو غفور کے کا بھی قریبی ساتھی ہے۔ اگر میرے سلسلے میں کوئی ایسی بات ہوئی تو وہ مجھے ضرور بتاتا۔“

”اچھا..... یہ بتاؤ، تم اسلام آباد میں کہاں مقیم ہو؟“ میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت پوچھا تو اس نے مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتہ بتا دیا۔ یہ مکان اس نے کرائے پر لے رکھا تھا۔

”میں اور طارق بہت جلدی یہ شہر ہی نہیں بلکہ یہ ملک بھی چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ طارق مجھ سے بچی محبت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہے۔ بہت اچھا انسان ہے۔“

”کیا یہ وہی طارق ہے جو تمہارا رازدار اور اشفاق وغیرہ کا ساتھی ہے؟“

”ہاں۔“

”اچھا ٹھیک ہے..... مگر بہر حال تم محتاط رہنا۔“

”ہاں..... تم بے فکر ہو۔ طارق پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ وہ آج کل اشفاق شاہین اور غفور کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا ہے تاکہ میرے سلسلے میں ذرا سی بھی کوئی خطرناک بات محسوس کرے تو مجھے فوراً خطرے سے آگاہ کرے۔“ اس نے پورے یقین اور فخر سے بتایا۔ اس کے بعد میں نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔

میرا سرودھ مال برآمد ہو چکا تھا اور اب رب نواز بری طرح قانون کی نظروں میں آچکا تھا۔ کیونکہ

دوئم  
ادھر نظر حیات کی طرف سے تازہ خبر انکل اعظم خان نے یہ دی تھی کہ اس کا کل کا شکار پرگرام پروگرام منسوخ ہو نہیں ہوا تھا البتہ رب نواز کے مسئلے کی وجہ سے موخر ہو گیا تھا۔ تاہم میں بھی اپنی طرف سے اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نظر رکھنے سے مراد میری یہ نہ تھی کہ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پنڈی رہتا تھا اور میں یہاں مری میں لیکن میں نے اس کا دوسرا طریقہ نکالا تھا۔ میں نے مختلف ناموں سے چار موہاں کنکشن کی ”سم“ خرید رکھی تھیں اور میں اصل موہاں سم نمبر کی بجائے جعلی اور اجنبی نمبروں پر نظر حیات کے گھر اور دفتر پر فون کرتا رہتا تھا۔ کبھی پی سی او سے جا کر رانگ نمبر کے بہانے، کبھی کسی دوست کے بہانے۔ اس طرح مجھے پتہ لگتا رہتا تھا کہ وہ ابھی تک پنڈی میں ہی تھا۔ اس کے علاوہ احتیاط کے پیش نظر میں نے اپنے ٹال کا ایک قابل اعتماد اور ہوشیار آدمی بھی نظر حیات کے پیچھے لگا کر کہیں کبھی اچانک اس کا شکار پر جانے کا پروگرام بن جائے تو وہ مجھے فوراً اطلاع کر دے۔

میں اگلے دن ٹال پر پہنچا تو غزالہ کا فون آیا۔

”نادر! یہ تم کون سی خرافات میں پڑنے والے ہو؟“ اس نے جیسے چھوٹے ہی کہا۔

”کیا ہوا غزالہ؟..... ایسا کیا کر دیا میں نے؟“ میں نے قدرے چونک کر اس سے کہا تو وہ بڑے مضطربانہ سی متوش آواز میں بولی۔

”وہ شیطان، اشفاق شاہین تم سے ملنے ٹال پر آیا تھا اور تم نے..... اوہ گاڈ! اب آگے بھی تبصرہ

بتانے کی گنجائش باقی ہے؟“

اس کی بات پر میں نے بے اختیار گہری سانس خارج کی مگر دوسرے ہی لمحے قدرے چونک کر

”مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟“

”اس شیطان کے دو ایک چیلوں کو میں نے بھی اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ انہی کی زبانی مجھے علم

تھا۔“ وہ جواب بولی۔

”میں اس طرح اسے زیادہ آسانی سے نابود کر سکوں گا۔ میں اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کر

رنگے ہاتھوں اسے گرفتار.....“

”تم اس کا کچھ بھی نہیں لگاؤ سکتے نادر علی!“ غزالہ اچانک میری بات کاٹ کر بولی۔ ”مجھے بھی

خوش فہمی لے ڈوبی۔ اپنی بہن پینا کے قتل کے بعد میں نے بھی تمہاری طرح یہی چال چلنے کی کوشش کی

مگر اتنا اس کے شیطانی جال میں پھنسنے پھنسنے بچی تھی۔ اب تو شاید وہ مجھ سے بالکل ہی مایوس

خاموش بیٹھ رہا ہے۔ لیکن نادر!..... تم.....“

”تمہاری بات اور تھی۔“ میں اس کا اشارہ سمجھ کر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”تم عورت تھیں

مرد ہوں۔ مجھ سے بھلا وہ شیطان کیا زبردستی کر سکتا ہے؟ میں اس کے درمیان میں رہ کر اس کی

کروں گا۔ تم بس خاموشی سے ایک طرف بیٹھی تماشا دیکھتی جاؤ۔“

”پلیز نادر! باز آ جاؤ..... تم اشفاق شاہین کو نہیں جانتے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔“

اپنی بات پر اصرار جاری رکھا۔ تھوڑے تو وقف کے بعد میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”تم

خیریت سے ہونا؟..... تم بتا رہی تھیں ابھی کہ اشفاق شاہین تم سے مایوس ہو کر بیٹھ رہا ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے کہا۔

”تمہیں کیسے علم ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”اشفاق شاہین کا ایک آلہ کار میرا قریبی دوست اور رازدار بن چکا ہے..... اس نے بتایا۔“

”بیٹا! یہ صلح کرنا چاہتی ہیں اور ہمارا نقصان بھی پورا کرنا چاہتی ہیں۔“  
میں فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا اور سمجھ گیا کہ یہاں اس وقت درحقیقت یہ خاتون اپنے شوہر رب نواز کے ایما پر آئی ہوگی۔ اور مزید یہ کہ رب نواز متوقع طویل قید سے بچنے کے لئے مجھ سے معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک لمحہ سوچا کہ یہ ایک سنہری موقع تھا۔ تاہم میں نے محتاط انداز میں مسز رب نواز سے کہا۔  
”رب نواز نے میرے ماموں مرحوم کے ساتھ ساٹھ لاکھ کا دھوکا کیا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا اور مجھے بھی دھوکا دینے کی کوشش کی۔“

”نادر صاحب! ہم آپ کے ساتھ لاکھ روپے دینے کو تیار ہیں۔“ وہ یکدم بولی۔  
میں نے بے تاثر لہجے میں کہا۔ ”وہ تو یوں بھی نہیں ملنے ہی والے ہیں۔ کم از کم رب نواز کو اس کی دھوکے بازی کی سزا تو ملنی ہی چاہئے۔“ آخر میں دانستہ میں نے اپنا لہجہ سخت بنالیا۔

”بہن! تم ہی اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، ہمیں معاف کر دے۔“ مسز رب نواز نے ماں سے ملتجیانہ کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی کاشانہ کو بھی ہولے سے ٹھوک دیا۔  
میں نے پہلی بار پھر مسز رب نواز کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا کے پیچھے چھپی نفرت کی پرچھائیاں صاف محسوس ہوتی تھیں۔ چہرے پر بھی غمزہ و انکساری کی ملمع کاری نظر آتی تھی۔ وہ سر تاپا تازہ بدلی ہوئی کینچی والی ایسی ناگن نظر آتی تھی، جس کا زہر نکالا جا چکا ہو۔

ماں نے مجھ سے مخاطب ہونے کی بجائے مسز رب نواز سے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”بہن! آپ کے شوہر نے بھی ہمارے ساتھ کچھ کم برائیاں کیں۔ اس نے چوری بھی کی اور سینہ زوری بھی کرنی چاہی۔ مگر.....“ ماں ذرا رکیں، پھر کاشانہ کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور معنی خیز لہجے میں اسے مخاطب کر کے بولیں۔ ”کاشانہ بیٹی! تمہارا کیا خیال ہے، اگر ہم صلح کر لیتے ہیں تو کیا آئندہ پھر بھی رب نواز ہم سے دھوکا کرنے کی کوشش کرے گا؟“

مسز رب نواز کے ساتھ ماں کا نرم رویہ اور پھر آخر میں کاشانہ سے استفسار کرنا میرے لئے حیرت کا باعث تھا۔ تاہم میں سردست خاموش ہی رہا۔ البتہ کاشانہ نے ماں کے سوال پر جوابا کہا۔  
”آئی! میرے خیال میں تو رب نواز کو دوبارہ ایسا سوچنے کی بھی جرأت نہیں کرنی چاہئے۔ مگر اس کا آسان حل یہی ہے کہ آپ لوگ آئندہ کے لئے اس کے ساتھ ہر قسم کے کاروباری روابط ہمیشہ کے لئے منقطع کر دیں۔ پھر دھوکے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

کاشانہ کے اس محتاط جواب پر میں نے دیکھا، ماں کے لبوں پر ہلکی سی مگر اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ تب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر گویا دونوں ماں بیٹی کی سفارش کرتے ہوئے بولیں۔

”نادر بیٹے! میرا خیال ہے، اتنا سبق کافی ہے۔ جب یہ ہمارا نقصان پورا کر ہی رہے ہیں تو ہمیں بھی صلح کر لینی چاہئے۔ اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ کاشانہ تمہاری اچھی دوست بھی ہے۔“

ماں نے کاشانہ کا حوالہ جانے کیوں دیا تھا؟ تاہم میں چند ثانیے کی خاموشی کے بعد ماں سے بولا۔  
”ٹھیک ہے ماں! جیسے آپ کی مرضی۔ مگر صلح نامے سے پہلے ان کو ہماری ساٹھ لاکھ کی رقم، علاوہ اخراجات کے ہمیں ادا کرنا ہوگی۔ میں کیس ختم کروا دوں گا۔“

”ہمیں منظور ہے۔“ مسز رب نواز نے جلدی سے خوش ہو کر کہا اور ماں سے گلے ملنے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماں نے بھی اسے گلے مل کر مسکراتے ہوئے صلح کی مبارک باد دی۔

”چلیں، اب ہم دونوں بہنیں بن گئیں۔ تم اپنا نام تو بتاؤ۔“ ماں نے خوش ہو کر پوچھا۔

میں نے نہ صرف پورا مال برآمد کر لیا تھا بلکہ مجرموں کو بھی گرفتار کروا لیا تھا۔ ان میں مکمل خان اور کے پانچ ساتھی اہم تھے۔ پانی مزدوروں کو وعدہ معاف گواہ بنالیا گیا تھا۔ کیس بہت مضبوط اور آسان اس لئے جلد فیصلے کی توقع تھی۔ ٹھیکے دار رب نواز کو میں نے بری طرح گرفت میں لے رکھا تھا۔ اچانک میرے آفس کے ٹیلی فون سیٹ پر کھنٹی بجی۔ میں نے ریسپونڈ اٹھایا۔ دوسری طرف ماں کی آواز پر میں ذرا چونک پڑا۔

”نادر بیٹا! تم مصروف تو نہیں ہو؟“ ماں نے پوچھا۔

”نہیں ماں! کچھ ایسا خاص مصروف نہیں ہوں۔ کیوں، خیریت؟“

”ہاں، خیریت ہی ہے۔ تم ذرا آ جاؤ۔“

”آ جاتا ہوں..... ویسے کیا بات ہے؟“

”بس آ جاؤ۔ تمہارے لئے ایک زبردست سرپرائز ہے۔“ ماں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے ذرا حیرت سی ہوئی کہ ماں آخر مجھے کون سا سرپرائز دینا چاہتی ہیں؟ تاہم میں نے ریسپونڈ اور منجر مشتاق کو چند ہدایات دینے کے بعد اپنی جیب میں سوار ہو کر سیدھا گرین لان پہنچا تو وسیع ریز احاطے میں مجھے ایک ششاسرائی سی پچھانی کار کھڑی نظر آئی جسے دیکھ کر ہی خود بخود میری آنکھوں کی ریز میں اضافہ ہو گیا۔

یہ کاشانہ کی کار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ماں مجھے کون سا ”سرپرائز“ دینا چاہتی تھیں۔ مجھے کاشانہ کے اچانک گرین لانج آنے پر حیرت ہی ہوئی ورنہ وہ مجھ سے ٹیلی فونک رابطہ کرنی بھی یا پھر ٹال پر ہی آ جاتی تھی۔ میں اسی آنکھن میں اندر داخل ہوا تو ڈرائنگ روم میں مجھے ایک سے زیادہ خواتین کی آپس میں گفت کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ میری ماں کی بھی آواز ان میں شامل تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو ذرا چونک پڑا۔ کاشانہ کے ساتھ ہی صوفے پر میں نے ایک فریبی مائل اور گولہ جی عورت کو بیش قیمت ساڑھی، میک اپ اور زیورات سے لدے پھندے دیکھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب کی لگتی تھی۔ مجھے اس کی صورت میں کاشانہ کی شاہت صاف محسوس ہوئی۔ میں سمجھ گیا، وہ اس کی ماں تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور فکر کے تاثرات نمایاں تھے۔ اخلاقاً خاتون کو سلام کیا اور کاشانہ سے بھی ہیلو بوائے ہوئی۔ پھر میں ماں کے قریب ہی صوفے پر براجمان ہو گیا۔ کاشانہ مجھے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”بیٹا! یہ مسز رب نواز ہیں..... کاشانہ کی امی۔ تم سے بات کرنے آئی تھیں۔“ ماں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں کسی حد تک مسز رب نواز کی آمد کا مدعا بغیر نے سمجھنے لگا۔

”جی..... فرمائیے؟“ میں نے ان کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ فوراً مجھ سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

”میں اپنے شوہر کی طرف سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ آپ پلیز انہیں معاف کر دیں۔“

”مکرماب کیا ہو سکتا ہے؟ یہ معاملہ تو اب عدالت میں جا چکا ہے۔“ میں نے بدستور خشک لہجے کہا۔ اس دوران میں نے کاشانہ کو دانستہ نظر انداز کر رکھا تھا۔

”نادر صاحب! کیس ختم بھی تو ہو سکتا ہے۔“ وہ جلدی سے امید بھرے لہجے میں بولی تو ماں نے اسے گویا اس کی بات کی سچ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام..... شاہینہ ہے۔“ مسز رب نواز نے جبراً مسکرا کر کہا۔

”اور میرا شہینہ۔“ ماں نے کہا۔ ”کتنے ملتے جلتے نام ہیں ہمارے۔ چلیں، آپ دونوں کھانا کھا کر جانا۔“ ماں نے کہا۔

”نہیں۔ ابھی میرے سر پر پریشانی سوار ہے، پھر کبھی سہی۔“ مسز رب نواز نے اپنے لیے ہر رسانیات سوتے ہوئے ماں سے کہا۔ جبکہ مجھے ماں کا اس عورت سے گلہ ملنا قطعاً اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پھر میری اور کاشانہ کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میری طرح اس کے چہرے پر بھی عجیب سی سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی۔ تاہم اس کی آنکھوں میں مجھے ان کے الفاظ کی ہلکی سی تپش کا احساس ہوا تھا۔

تاہم چائے وغیرہ کے دوران صلح نامے اور رقم وغیرہ کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی اور دوران ماں، کاشانہ سے بھی گل مل کر باتیں کرنے لگیں۔

سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے۔ بیگم رب نواز نے بلیک چیک ہمارے حوالے کیا۔ ماں نے اسے صرف ساٹھ لاکھ چیک لکھ دینے کا کہا اور باقی کا ہر جانہ وغیرہ اسے معاف کر دیا۔

دونوں ماں بیٹی رخصت ہو گئیں تو میں نے ماں سے کہا۔ ”ماں! آپ کو ہر جانے کی رقم بھی دالہا ہلا چاہئے تھی۔“

ماں نے مسکرا کر کہا۔ ”بیٹا! بس کافی ہے۔ ہمیں ہماری رقم مل گئی۔ اور پھر کاشانہ بھی تو ہماری اچھی دوست ہے۔ وہ کیا سوچے گی؟“

ماں کی بات پر میں تھلا سا گیا۔ تاہم بولا کچھ نہیں۔ ذرا دیر گزری کہ سیکینے نے آکر بتایا کہ کوٹلیماں نامی شخص مجھ سے ملے آیا ہے۔ میں ذرا چونک سا گیا۔ سلیمان میرا وہی قابل اعتماد آدمی تھا جس نے نظر حیات پر کڑی نگرانی کے لئے مامور کیا تھا۔

”بھج دو اسے اندر۔“ میں نے سیکینے سے کہا اور وہ لوٹ گئی۔

ماں مستفسر اندہ نگاہوں سے میری جانب تنکے لگیں تو میں نے انہیں بتا دیا کہ سلیمان کون ہے۔

”میرا خیال ہے، کوئی اہم اطلاع لے کر ہی آیا ہوگا۔“ ماں نے کہا۔ ”تم اس سے بات کرو، کمزورے میں چلتی ہوں۔“ مجھے پھر بتا دیا۔ ”یہ کہہ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گئیں۔“

ذرا دیر بعد ایک میرا اہم عمر نو جوان شخص اندر داخل ہوا۔ یہ سلیمان تھا۔ میں نے اس کے احساسِ ذمہ داری، محنت اور اچھی کارکردگی کے باعث مزدوروں کا مائثر بنایا ہوا تھا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی پاپا ادب سے مجھے سلام کیا، میں نے اسے بیٹھے کا کہا۔ پھر صوفے پر بیٹھے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ا مرکوز کر کے بولا۔

”کیا خبریں ہیں؟“

”سر! یہ خبر زیادہ ضروری نہ ہوتی تو میں یہاں آکر آپ کو زحمت نہیں دیتا۔ مگر بات ہی ایسی تھی مجھے اس وقت آنا پڑا۔“ وہ بولا۔ اس کے لہجے میں جوش کی آمیزش تھی۔

”بتاؤ، کیا خبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سر! نظر حیات کل صبح اپنی شکاری مہم پر اپنے نو آدمیوں کی ٹیم کے ساتھ نکلے والا ہے۔“ اس نے بتایا اور میرا دل جیسے کپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”اس ہمارا ایک دوست بھی ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ میں نے فوراً چونک کر پوچھا۔

”کوئی سیاسی شخصیت ہے۔ قومی اسمبلی کا ممبر..... چوہدری ذیشان علی کھدیڑا۔ وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔ آج رات کو وہ اپنے چار آدمیوں کے ہمراہ نظر حیات کے گھر پنڈی آئے گا اور پھر وہیں سے اگلے روز صبح تڑکے یہ مختصر قافلہ بٹ راس اور کمال بن کی جانب روانہ ہو جائے گا۔“ سلیمان نے تفصیل بتائی۔ میں ذرا سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اس کا پروگرام رب نواز کے ساتھ جانے کا تھا مگر اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد، اب ظاہر ہے وہ نہیں جاسکتا تھا۔ مگر چوہدری ذیشان جیسی بااثر شخصیت کا نظر حیات کے ساتھ جانا مجھے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... تم جاؤ۔ اور اب مجھ سے موبائل پر ہی رابطہ کرنا۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے سلیمان سے کہا۔ ”جب تک نظر حیات پنڈی سے روانہ نہیں ہوتا تم مجھ سے رابطے میں رہنا۔ اور وہ جیسے ہی روانہ ہوں، تمہیں ان کے تعاقب میں نکلنا ہوگا۔“ وہ میری ہدایت پا کر روانہ ہو گیا۔

میں ذرا دیر وہیں بیٹھا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس کے بعد ماں کے پاس آکر انہیں ساری بات بتادی۔ میرا خیال تھا نظر حیات کی شکاری مہم میں شامل ایک بااثر سیاسی شخصیت کا سر ایک لمحے کو اس بھی میری طرح الجھن آمیز تذبذب کا شکار ہو جائے گی۔ مگر اس نے اس بات کو خاطر میں لائے بغیر ہنسنے سے کہا۔

”نادر بیٹا! تقدیر ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ نظر حیات کی اس شکاری مہم سے ہمیں فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی کی مہم کو ہر قیمت پر آخری بنانا ہوگا۔“

”ماں! ہمیں اس بار ذرا محتاط ہو کر اپنے دشمن نظر حیات پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ کیونکہ اب اس کے ہمراہ کوئی عام شخصیت نہیں ہے۔“

”تم ایک ایم این اے سے گھبرا گئے؟“ ماں نے کہا۔

”بات گھبرانے کی نہیں ماں!“ میں نے گہری متانت سے کہا۔ ”میں احتیاط کی بات کر رہا ہوں۔ کیونکہ ایک ایم این اے، عوامی نمائندہ ہوتا ہے۔ اگر وہ بھی نظر حیات کے ساتھ براہ راست ہماری زد میں آگیا تو ہمارے لئے شاید یہ اچھا نہ ہوگا۔ ہمیں دشمن کے خلاف ایسا قدم اٹھانا ہوگا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“

”میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔“ ماں نے اپنے سر کو تھپی جھنسنی دی۔

”ماں! اب آپ کا جانا بہتر نہ ہوگا۔ اس مہم کو اب میں خود تنہا ہی سر کروں گا۔“ میں نے جوش سے منہمک لہجے میں کہا تو ماں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”ہاں ماں!..... آپ کا ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ میری بات مایہ اور اپنے بیٹے کے زور بازو پر مبرور کریں۔ میں ضرور کامیاب لوٹوں گا۔“

میرے سمجھانے پر ماں نے ایک گہری سانس لے کر خاموشی اختیار کر لی اور پھر میری پیشانی پر ہوسہ دیا۔

\*\*\*

رات تقریباً دس بجے مجھے سلیمان نے موبائل پر رابطہ کر کے اطلاع دی کہ شکاری مہم کی ایک ٹیم اسلام آباد سے پنڈی پہنچ چکی ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی میں صبح تڑکے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

صبح چھ بجے سلیمان نے مجھے اس کی خبر دی کہ نظر حیات اور چوہدری ذیشان دو تیز رفتار انٹر کلرز میں روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کا رخ بٹ راس کی طرف تھا۔

چنانچہ میں بھی جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ سلیمان کا کام ختم ہو چکا تھا۔ ماں کو میں شروع ہی

نہیں۔ دور سرسبز ڈھلوانوں والی پہاڑیوں پر قبضہ جمائے ہوئے بادل گرج رہے تھے۔ لکڑی کی خوب صورت عمارتیں، شوگر ان اور سری پائے جیسے بلند مقامات کی جھلکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

یہاں سے دریا پر بنے پل کو عبور کیا تو ایک اونچی پہاڑی پر بنے سید اسماعیل شہید کے مزار پر نظر پڑتی تھی۔ دور سے یوں لگتا تھا جیسے سبز پتوں میں کوئی سفید پھول کھلا ہو۔ اس اونچی پہاڑی سے پالا کوٹ کا بہترین نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ سید اسماعیل اور ان کے ساتھیوں کی شہادت اس سرزمین کی پہچان تھی جس کی فخر تاریخ نے بھی کہ دلی سے آنے والے دین اسلام کے شیر دل سپاہی نے سکھوں کی طاقت کو ختم کیا تھا اور اسی مقام پر آخری فیصلہ کن جنگ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس مزار سے نیچے گھاٹی کی طرف دریائے کپہار پھرتا، شور مچاتا بہہ رہا تھا۔

یہاں ہوٹلوں کی بھی بہتات تھی۔ راستے میں اگرچہ ذرا دیر رک کر چائے وغیرہ کا دور چلا تھا مگر مستقل ٹھکانہ نہیں کیا گیا تھا۔ میں بڑے ڈرامائی انداز میں ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ بٹ راس کا جنگل پیچھے رہ گیا تھا حالانکہ مجھے پورا یقین تھا کہ یہاں ان کا چند روز قیام ہو سکتا تھا۔ مگر لگتا تھا جیسے ان کا ارادہ بدل گیا تھا۔

اس وقت ہم سڑک سمندر سے 7500 فٹ کی بلندی پر تھے اور بڑی کاٹ دار سردی پڑنے لگی تھی۔ ہمارا سڑاب دریائے کپہار کے ساتھ ساتھ تھا۔

اچانک میں نے اس ہائی ایس وین کو اپنی جیب سے تیزی کے ساتھ کراس کرتے ہوئے دیکھا جسے میں قریباً ایٹ آباد سے ہی اپنے پیچھے آتے دیکھ رہا تھا۔ اور میرا خیال یہی تھا کہ یہ سیر و تفریح کی غرض سے نکلے ہوئے سیاحوں کی کوئی گاڑی ہے۔ تاہم اس بار اسے کراس ہوتے دیکھ کر میں نے غیر ارادی طور پر اندر موجود افراد کا بہ غور جائزہ لینا ضروری سمجھا تو ایک بات دل کو کھٹکنے لگی۔ اس میں سوار تقریباً نو دس افراد میں نو کوئی بوڑھا دیکھا تھا اور نہ ہی کوئی بچہ یا عورت۔ کبھی بٹے کئے اور جوان افراد براجمان تھے۔ ہم میں سے سوچا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی فرینڈ شپ ٹولہ ہو اور پر ہینڈ ڈویشن کے ذریعے سیر و تفریح کی غرض سے شتر کے طور پر نکلا ہو۔

سردست میرے ذہن میں کسی کے بارے میں شبہ کرنے کا کوئی عمل نہ تھا۔ رب نواز والا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اشتقاق شاہین کو میں ”رام“ کر چکا تھا جبکہ کبیر اور ان دونوں کیلاشی باشندوں کو میں ناکوں چنے ہوا چکا تھا۔ لہذا میں مطمئن ہو کر اپنے سفر پر گامزن رہا۔ ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے، یہاں دریائے کپہار کے ساتھ مکی، چاول، آلو، مٹر اور گندم کی کاشت کی جاتی ہے۔

یہاں برف باری کا موسم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ان لوگوں نے ابھی تک کسی ہوٹل وغیرہ میں کیوں نہیں بنگ کر والی۔ جبکہ ان کا رخ کمال بن سے بھی آگے برف زار دیوانوں کی طرف تھا۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے ان کا ارادہ ”کیمپنگ“ کا ہو۔ مگر پھر فوراً میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ لوگ جن تفریحی مقامات پر پہنچ کر رہے تھے، وہ ”جھاکل“ اور ”کھنیاں“ کے درمیان واقع تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ لوگ کھانے کے بازار میں واقع بہترین اور آرام دہ ہوٹلوں میں بھی رہ سکتے تھے مگر ان کے شکار کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ ویران برف زاروں کے قریب برفیلے مقامات پر ہی قیام پذیر ہو سکتے تھے۔ برفانی لومڑیوں کا ہمارا موسم میں بہترین سمجھا جاتا تھا اور اس کے شکار یوں کو بھی سخت جان ہونا پڑتا تھا۔

بہر طور جب میں نے انہیں یہاں قیام پذیر بہ الفاظ دیگر خیمہ زن ہوتے دیکھا تو میں یہاں سے ”کھنیاں“ کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں خوب صورت اور آرام دہ سرائے تھیں۔

سے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ماں کے عزائم نظر حیات سے باقاعدہ دھواں دھار جنگ کے تھے اور یہ میں نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی نظر حیات کو میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ میرے ذہن میں کلا والا منصوبہ تھا کہ میں نظر حیات پر عرصہ حیات اس قدر تنگ کر ڈالوں کہ وہ یہ ملک ہی چھوڑنے پر مجبور جائے۔ اسے اس قدر ذہنی و جسمانی طور پر تار چڑھ کروں کہ وہ ساری زندگی اپنے بچپن سال پہلے وار شرمناک جرم کی یاد کو سینے سے لگائے پچھتاوے کی اذیت ناک زندگی گزارے۔ اس کی زندگی کو موت بھی بدتر کر کے رکھ دوں کہ اسے اپنی نجات صرف موت کی صورت میں نظر آئے اور ساری زندگی سسک کر گزارتا رہے۔

اس کا مجھے اب ایک موقع تو مل رہا تھا۔ اگرچہ اس میں غیر معمولی خطرات بھی تھے مگر اب مجھے ایسے خطرات کا کھلاڑی بننا تھا۔ نظر حیات جن ویران برف زاروں کا رخ کر رہا تھا وہاں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہترین مواقع میسر تھے اس لئے میں نے اس سے واپس ہٹ کر ارادہ کر رکھا تھا۔ اگر وہ وہاں میرے ہاتھوں جہنم واصل بھی ہو جاتا تو کسی کو کیا پتہ چلتا تھا؟ یہی سب کہ میں نے اس کا تعاقب آخری مقام تک کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

میرے اندازے کے مطابق یہ لوگ انتہائی گلی سے گزر کر ایٹ آباد جانے والے راستے کا انحراف کرتے۔ یہاں سے بٹ راس اور کمال بن کا راستہ قدرے قریب اور محفوظ تھا۔

میں نے اس میں شاہراہ پر پہنچ کر اپنی جیب ایک جانب ذرا الگ تھلک روک دی اور انتظار لگا۔ سلیمان کی بتائی ہوئی اطلاع کے مطابق ان کا مختصر قافلہ کسی وقت بھی اس مقام سے گزرنے والا نہ چنانچہ میں یہیں کھڑا انتظار کرنے لگا۔

قریباً کوئی بیس پچیس منٹ بعد مجھے کشمیر پوائنٹ سے آنے والی سڑک پر دو گاڑیاں آتی دکھائی ان میں ایک نیلے رنگ کی مشوشی پچا روھی اور دوسری سرخ رنگ کی ڈبل کین انٹر کولر ٹریوٹی۔ میں فوراً محتاط ہو گیا۔ سلیمان کی دی ہوئی معلومات کے مطابق یہی میری مطلوبہ گاڑیاں تھیں۔ دوسری جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں زنانے کے ساتھ قریب سے نکلتی چلی گئیں۔ سفید فور ویکل ڈرائیو پٹھوہار جپ کی طرف دوڑا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اسے اشارت کر۔ دونوں گاڑیوں کے تعاقب میں دوڑا دیا۔

تعاقب کے درمیانی فاصلے کا میں نے خصوصی طور پر خیال رکھا تھا۔ مجھے ان کی منزل معلوم کرنے کے لئے زیادہ قریب ہو کر تعاقب کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔

میں خود کو ایک طویل سفر کے لئے ذہنی و جسمانی طور پر تیار کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے اس کے طور پر اضافی فیول کے دو تین کین ساتھ رکھ لئے تھے۔

سفر جاری تھا..... انتہائی گلی سے نکل کر ایٹ آباد والے راستے پر گامزن ہونے کے لگ بھگ ایک گھنٹے بعد گاڑیاں ہانسمہ کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئیں۔ مری سے ایٹ آباد چڑھنے کو پہلے فاصلے پر تھا۔ مل کھاتے ہوئے پر خطر راستے کی وجہ سے اسے طے کرنے میں دو یا دو سے زائد گھنٹے لگ سکتے تھے۔ لیکن ماہرانہ انداز کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ اسے ایک سے ڈیڑھ گھنٹے محدود کر سکتی تھی۔ اگلے چند گھنٹوں کے اندر شاہراہ ریشم سے گزرتے ہوئے ہم بٹ راس کے محلے کے درمیان محو سفر تھے۔ یہاں سرسبز کھیتوں میں رواں شفاف ندیاں جلتی تھیں سا شور مچا رہی تھیں۔ میں چھپے رنگین پرندوں کی قوس قزح پھیلاتی خوش رنگ اڑانیں دل و دماغ میں بڑا لطیف احساس

دوئم  
کراے لگا لیا۔ پھر ذرا ہی دیر بعد یونہی کمرے سے نکلا۔ مختصر سی راہداری ویران تھی۔ چھت میں دو بیمار برقان زدہ روشنی والے پیلے بلب نصب تھے۔ میں یونہی زینوں کی طرف بڑھا اور نیچے اتر کر سرائے سے باہر آ گیا۔ باہر ہنسنا اور خاموشی کا راج تھا۔ خون کو برف کر دینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ مجھے بھی احساس ہونے لگا کہ اس موسم میں برفانی لومڑیوں کا شکار کرنا کس قدر جان جوہم والا کام تھا۔ میں سرائے کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر عقب میں دیکھا تو سرائے کے بیرونی دروازے سے مجھے دو افراد نمودار ہوتے دکھائی دیئے۔ انہوں نے فر کے لاگ کوٹ اور سروں پر ٹوپیاں چڑھا رکھی تھیں۔ میں انہیں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ ان دونوں کا تعلق ہائی ایس کے مسافروں سے تھا جو میرے کمرے کے اریب قریب میں رہائش پذیر تھے۔ مجھے باہر تنہا کھڑے دیکھ کر دونوں نے مجھ پر ایک بظاہر اچھٹی سی نگاہ ڈالی پھر اس کے بعد سرائے کے عقبی گوشے کی طرف بڑھ گئے جہاں بڑے سے چوہنی شیڈ کے نیچے گاڑیاں وغیرہ لکڑی تھیں۔

پھر ذرا ہی دیر بعد میں نے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور دوسرے ہی لمحے میں نے سرائے کی چوہنی مشطیل عمارت کے عقب سے وہی اڑی اڑی رنگت کی ہائی ایس وین کو نمودار ہوتے دیکھا اور ڈرنا ٹھنکا۔ کیونکہ اس میں وہی دونوں افراد براجمان تھے۔ ان میں ایک ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے تھا جبکہ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وین تیزی سے غرائی ہوئی ایک طرف نکل گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ اس وقت کہاں نکلے تھے؟ میں چند ثانیے کھڑا سرخ تپوں کو دیکھتا رہا اور پھر واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔ سردیوں میں یوں بھی جلدی بھوک لگ جاتی ہے۔ مجھے بھی بھوک لگ گئی۔ میں نے بیرے سے کمرے میں ہی کھانا منگوا کر کھایا۔

کھانے سے فارغ ہوا تو اچانک مجھے باہر گاڑی کی گھر گھر اہٹ سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کے قریب آ کر ذرا جھری بناتے ہوئے نیچے دیکھا تو مجھے وہی ہائی ایس وین نظر آئی۔ وہ دونوں نیچے اتر رہے تھے۔ پھر میں نے انہیں سرائے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اسی وقت مجھے مٹانے پر پڑنے والے دباؤ کا احساس ہوا تو میں سیدھا ٹوائلٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ٹوائلٹ کی ایک طرف کی دیواریں بھی لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ خاصی سیلن چمکی ہوئی تھی۔ چانک مجھے ٹوائلٹ کی بائیں طرف کی دیوار میں ایک کپڑے کی دھجیاں پھنسی ہوئی نظر آئیں۔ مگر اس دیوار کی دوسری طرف سے مجھے باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جانے کیا سوچ کر کپڑے کی دھجیاں آہستہ آہستہ کے ساتھ پھینچیں تو مجھے ایک بڑا سا سوراخ نظر آیا۔ اس سوراخ سے دوسرے کمرے میں جانتا میووب ہی تھا مگر میں نے اس کے ساتھ اپنی ایک آنکھ چپکا دی اور دوسرے ہی لمحے میرے پاس وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

وہ کل سات افراد تھے اور کہیں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مگر ان کی "تیار یوں" میں مال و مال کی بجائے جنگی اسباب تھا۔ کوئی اپنے پستول کے چیمبر میں گولیاں ڈال رہا تھا اور کسی کو میں نے ایک کی بیٹ میں پستول اڑتے ہوئے دیکھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ لوگ کسی سے جنگ کرنے جا رہے تھے۔ مگر کسی سے؟ ..... یہ میں نہیں جانتا تھا۔ مگر یہ سب دیکھ کر میرے پورے وجود میں یونہی سی رینگنے لگی تھیں۔

میں بدستور دھڑکتے دل کے ساتھ سوراخ سے اپنی ایک آنکھ چپکائے یہ سب دیکھ جا رہا تھا۔ ان

میں نے ایک سرائے کے سامنے جیب روک دی۔ سرائے کی عمارت بڑی خوب صورت تھی۔ لہذا کا نام سرائے تھا مگر یہ کسی ہوٹل سے کم نہ تھی۔

میں جیب کے محدود اور بند گرم ماحول سے باہر نکلا تو سردی سے ٹھنرا کر رہ گیا۔ تاہم اس سردی ایک خوشگواریت کا احساس بھی تھا۔ میں اندر پہنچا اور سرائے کے مالک سے معاملات طے کرنے کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں بیڈ وغیرہ نہ تھے، بڑی بڑی چار پائیاں تھیں۔ میں نے بیرے سے ہا پر پہلے سے بچھے رضائی بسترے کو اٹھوانے کا کہہ دیا اور اپنا گرم کپل اور تپائی وغیرہ بچھا دی سرائے کے عقب میں ایک بڑا سا چوہنی شیڈ تھا۔ گاڑیاں وہیں کھڑی ہوتی تھیں۔ دوسرے ساتھ ہی بنی ہوئی تھیں اس لئے یہ مشترکہ شیڈ تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ دوسری سرائے اس سرائے مالک کے دوسرے بھائی کی تھی اور یہ ان کی مشترکہ ملکیت تھی۔ میں نے کھانا وہیں کمرے میں ہی کھا لیا۔ سرائے میں زیادہ لوگ نہ تھے۔ اس کی وجہ سیزن کا شاید آف ہونا تھا۔ ہائیکنگ اور برف بار چند شائقین سیاح جو دیگر شہروں اور ممالک سے آئے تھے، وہی نظر آ رہے تھے۔

بہر حال یہاں کا ماحول اچھا، صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات کہ جنگل آبادی سے ہٹ کر تھا۔ نظر حیات اور چوہری ذیشان وغیرہ دوسری سرائے میں فروکش تھے۔ گویا اب میں "کھدیاں" میں مقیم تھا اور نظر حیات وغیرہ "چھاگل" کے قریب۔ اب یہ مجھے تو تھا کہ وہ برفانی لومڑیوں کے شکار کے لئے کون سی اور کس طرف کی برف زار وادیوں کا رخ والے تھے۔

میں نے چوہنی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھا۔ لکڑی کی کھڑکی کے چوکھٹے سے دور برف۔ سجائے سر بہ فلک پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ سردی میں کاٹ سے زیادہ اب خوشگوار احساس ہونے لگا تھا۔ ایسا شاید تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہونے والی برف باری کی وجہ سے تھا۔ تاہم، احساس بہر حال اپنی جگہ ہمہ وقت تھا۔

اچانک میری نگاہ اس اڑی اڑی رنگت والی ہائی ایس وین پر پڑی جس کے اندر میں نے قریب افراد بیٹھے دیکھے تھے مگر میں صحیح طرح ان کی صورتیں نہ دیکھ پایا تھا۔ یہ وہی وین تھی، جسے میں نے آباد سے نکلتے دیکھا اور میرے ساتھ ساتھ ہی انہوں نے بھی آگے اور بھی پیچھے سفر کیا تھا۔ اب آسانی انہیں وین سے اترتے ہوئے ان کا ایک ایک چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مگر ان میں کوئی بھی چہرہ نہیں لگا تھا۔ یہ لوگ بھی شاید اس سرائے میں فروکش ہونے کے لئے ٹھہرے تھے۔ پھر میں نے کم کر دی اور اپنے مختصر سے سامان کا جائزہ لینے لگا۔

سفر کی ٹکان اتارنے کی غرض سے تھوڑی دیر بعد میں بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک ہلکا شور سنائی دیا۔ توجہ دینے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک سے زائد افراد کی باتوں اور آوازوں کا شور تھا۔ یونہی پڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد پاس کے کمروں میں ٹھہر چڑکی آوازیں ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ وین کے مسافر اپنے کمروں میں "سیٹنگ" کر رہے ہیں۔

میں ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر ذہن کو "ریلیکس" کرنے کی غرض سے اس طرح چار پائیاں الذہنی کی حالت میں پڑا رہا۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ نظر حیات وغیرہ کم از کم آج تو برف زار وادی نہیں کریں گے۔ کیونکہ سفر کی تھکان سے وہ آرام ہی کر رہے ہوں گے۔ ویسے بھی میں نے ان دیکھ رکھا تھا۔ میں نے وہ شام کمرے میں ہی گزار دی۔ کمرے میں آتش دان تھا۔ میں نے یہ



ی تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور جنوبی سمت والی دیوار کی آڑ میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے مذکورہ سمت سے چند لوگ آتے دکھائی دیے۔ ان کی تعداد پانچ چھ کے قریب تھی۔ دو کے ہاتھوں میں بارہیں تھیں جبکہ باقی تین افراد اپنے کانڈوں پر برف جیسی سفید رنگت کے بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔

جب وہ قریب آئے تو میں نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا۔ جن دو افراد کے ہاتھوں میں بارہیں اور کانڈوں پر بارہیں جھولتی نظر آرہی تھیں ان میں سے ایک ذرا دراز قامت اور بھاری بھر کم شخص تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی زرا دہنی ہوئی جسامت کا مگر توند شخص تھا۔ انہوں نے گرم لباس زیب تن کر رکھا تھا اور برف والے موئے گرم چمڑ پہن رکھے تھے۔ وہ لوگ آپس میں اونچی آوازوں سے باتیں کرتے ہوئے کانچ کے قریب پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر ایک جھٹکا لگا کہ ان میں نظر حیات موجود نہ تھا۔ جبکہ یہ پانچواں اور رعب دار شخصیت والا آدمی بھی میرے لئے اجنبی تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہی ایم این اے چوہدری ذیشان بگا جو نظر حیات کی شکاری مہم کا ساتھی تھا۔ یہ ممکن تھا کہ نظر حیات ابھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل کے اندر ہنوز شکار میں مصروف ہو۔ بہر طور میں نے یہ معاملہ فوری طور پر نشتانے کا سوچا اور دیوار کی آڑ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ وہ پانچوں ایک اجنبی کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکے تھے۔

”کون ہو تم؟“ بھاری جسامت اور رعب دار شخصیت کے ساتھ کھڑا وہ ٹھٹکے قد کا شخص میرے چہرے پر ارباب کی روشنی پھینکتے ہوئے ذرا تیز آواز میں بولا۔

”مجھے چوہدری ذیشان صاحب سے بات کرنی تھی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں چوہدری ذیشان ہوں۔ بولو..... کیا بات ہے؟“ اس بار رعب شخص نے گھیسر لہجے میں مجھ سے کہا تو میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”چوہدری صاحب! وقت کم ہے۔ میرے تھوڑے سے کہنے کو بہت جانے گا۔ میں کھدیاں کی ایک برائے آپ کو تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچا ہوں، یہ بتانے کے لئے کہ میں نے.....“ اس کے بعد میں نے اسے مختصر الفاظ میں ساری بات بتادی۔

”یہ مجھے انہی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے چوہدری صاحب! اسے پکڑ لیجئے۔“ اس کے گینڈے جیسی جسامت والے ساتھی نے مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے چوہدری ذیشان سے کہا۔ میں نے اس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور پھر بیکسٹر انداز کر دیا۔ میں نے جو کہنا تھا، وہ کہہ چکا تھا۔ تاہم چوہدری ذیشان کو میں نے گہری سوچ میں مستغرق پایا۔ اس کی پُرسوج نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے آخر میں اس سے پھر کہا۔

”چوہدری صاحب! میں نے انسانیت کے ناتے اپنا فرض پورا کر دیا..... میں اب چلوں گا۔“ یہ کہہ کر میں واپس جانے کے لئے مڑا تو عقب سے اس گینڈے جیسی جسامت والے شخص کو میں نے بڑاتے سنا۔

”او چوہدری صاحب! انہوں نے پھر لو..... یہ انہی کا بندہ لگتا ہے۔“

”اوسے تو چپ کر..... اسے جانے دے۔“ میں نے چوہدری ذیشان کی آواز سنی۔ میں تیز تیز فوموں سے چلتا ہوا اپنی جیب میں آکر سوار ہو گیا۔

چوہدری ذیشان سمجھ دار واقع ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا، ایک اجنبی شخص اتنی دور سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں اسے جس خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا، وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی عقل مندی کا ایک اشارہ مجھے یہ ملا تھا کہ اس نے نہ میرا نام پوچھا تھا اور نہ ہی میرے بارے میں کوئی تفصیل جاننے کی

اندھے گڑھے میں پھنس سکتی تھی۔ ناچار میں نے دوبارہ ہیڈ لائٹس روشن کر دیں۔ اب میں نے جیب کی رفتار مزید بڑھا دی۔ تھوڑی دیر گزر گئی۔ عقب میں مجھے وہ روشنی نظر نہ آئی۔ یا تو میں اسے پیچھے چھوڑ آیا تھا یا پھر وہ کسی خرابی کے باعث رک چکی تھی۔ میں نے بہر طور اطمینان کی سانس لی۔ اب ڈھلوانی جنگل کے خاصے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہیڈ لائٹ کی روشنی میں درخت اور ان کی شاخیں سے ڈھکی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں ٹاروں کے نشانات کی رہنمائی میں ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ دائیں مجھے برف سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانی چھتوں والے دو تین کانچ بھی نظر آئے تھے۔

ٹاروں کے نشان ایک کانچ کے قریب سے ہو کر آگے بڑھ گئے تھے۔ شاید نظر حیات وغیرہ کے لئے یہاں رکے تھے اور پھر آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر چند کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد اچانک سامنے ذرا بائیں جانب مہم روشنی نظر آئی۔ پھر میں اس وقت چونکا جب ٹاروں کے نشان بتدریج کی شکل میں بل کھاتے ہوئے اس روشنی کی سمت جارہے تھے۔ میں نے فوراً جیب کی بتیاں کچھ گول کر دیں اور ذرا قریب پہنچا تو روشنی کا ”خروج“ ایک چوٹی کانچ کو دیکھ کر فوراً جیب ذرا دور کی دی۔ پھر انیشن سوچ آف کر کے میں دروازہ کھول کر نیچے اترا آیا۔

باہر بڑی کاٹ دار سردی تھی۔ میرے موبائل میں نارنج تھی۔ مگر میں نے اسے روشن کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور کانچ کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا۔ یہ کانچ کا عقبی حصہ تھا جبکہ میں نے ذرا کے رخ درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ابھر کر دیکھا تو مجھے نظر حیات کی نیلے رنگ والی ملبوشتی پلا چوہدری ذیشان کی سرخ رنگ والی ڈبل کیبن انٹر کولر بھوکھری نظر آگئیں۔

میرا دل تیزی سے سینے میں دھڑکنے لگا۔ میں اپنی منزل کے بالکل قریب تھا۔ مگر صورت حال اب اور بڑے عجیب انداز میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مجھے دوسرا کام بھی انجام دینا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف شکار کو چھاپنا تھا اور دوسری طرف کے شکار کو بچانے کی کوشش کرنا پڑ رہی تھی۔ اس پر مستزاد وہ اکٹھے اور ایک ہی مقام پر موجود تھے۔

میں کانچ کے ذرا قریب آ کر ایک درخت کی آڑ سے بہ غور اس کے اطراف و اکناف کا جائزہ لگا۔ آس پاس کوئی ذی نفس موجود نہ تھا۔ یہ کانچ دو منزلہ تھا۔ روشنی کانچ کی اوپری منزل کے کمرے کے درستیج سے آرہی تھی۔ یہاں شاید بجلی کا انتظام نہ تھا یا پھر یہ روشنی کسی گیس کے ہنڈولے کی آگ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور کانچ کی طرف لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر طرح ٹھٹکا۔ دروازے پر ایک بڑا سا تالا نظر آ رہا تھا جو اس بات کی گواہی تھا کہ اندر کوئی موجود نہیں۔ میں اُلٹھے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ ان کی دونوں گاڑیاں ادھر ہی موجود تھیں تو یہ لوگ ہیں۔ پھر ایک اور خیال بھی آیا کہ ممکن ہے یہ لوگ پیدل ہی شکار کی تلاش میں کہیں قریب ہی ہوں۔ برفانی لومڑیاں بالخصوص اس موسم میں رات کو اپنے ٹھکانوں سے نکلتی تھیں۔ یہ موسم ان کا کا ہوتا تھا۔

اچانک کہیں قریب سے گولی چلنے کے دھماکے کی آواز ابھری۔ میں بری طرح ٹھٹکا۔ ذرا دوسری اور پھر تیسری گولی بھی چلی۔ اس کے بعد پھر وہی گہری اور پراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ کئی عکے بعد دیگرے آوازیں میری داہنی جانب جنگل سے ابھری تھیں۔ میرا خیال درست ثابت ہوا۔ حیات وغیرہ قریب ہی شکار کھیل رہے تھے۔ مذکورہ سمت کی جانب سے میں نے دیکھا تو وہاں جنگل میں متحرک روشنی نظر آئی اور ساتھ ہی چند انسانی ہولے بھی دکھائی دیئے جن کا رخ کانچ



ضرورت سمجھی تھی۔

بہر طور میں تیز تیز قدموں سے چلا ہوا اپنی جیب کے قریب پہنچا اور پھر اس کا دروازہ کھول کر آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ جنگل کی سمت تھا جدھر سے میں نے چوہدری ذیشان وغیرہ کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

میں خاصی تیز رفتاری کے ساتھ جیب کو دوڑائے جا رہا تھا۔ مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے بعد میں نے جیب کی رفتار دھیمی کر لی۔ کیونکہ کسی بھی وقت میرا اپنے دیرینہ دشمن نظر حیات سے "ٹانگرا" ہونے والا تھا۔ میری متلاشی نظریں دیندہ اسکرین کے پار تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ دفعۃً مجھے جنگل کے شمال کی طرف گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی درندے کی چنگھاڑ بھی ابھری۔ میرا پاؤں غیر ارادی طور پر ہریک پر پڑ گیا۔ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔ درندے کے چنگھاڑ مارنے کی گرجتی ہوئی آوازیں اب بار بار سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آواز پر غور کیا۔ یہ مجھے جنگلی ریچھ کی آواز لگی۔

میں نے جیب جنگل کی مطلوبہ سمت کی طرف موڑ دی۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے سارے ٹارچوں کی روشنی میں تین افراد دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی رائفلیں تھیں۔ قریب ایک بھاری بھر کم سفید دودھیا ہیولا دکھائی دیا۔ یہ ایک بر فانی ریچھ تھا جو کسی بڑے سے بر فانی تودے کی طرح ایستادہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پر بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے قریب زنبور پر مجھے ایک خون میں لت پت انسانی وجود بھی پڑا دکھائی دیا۔ باقی تینوں افراد اپنی رائفلوں سے اس پر اندھا دھند گولیاں برس رہے تھے۔

پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے ریچھ نے ایک دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری اور پھر چاروں بیروں پر کر ان کی طرف لپکا۔ وہ تینوں بدحواس ہو کر اٹے قدموں دوڑے۔ مگر اس خوف ناک صورت حال میں ایک شخص کا پاؤں رہت گیا۔ وہ بر فانی زمین پر گر پڑا۔ ریچھ اس کے سر پر آن پہنچا۔ اس نے اٹھ بھاگنے کی کوشش کرنا چاہی مگر ریچھ نے اسے اپنے بھاری بھر کم اور بڑے بڑے نوکیلے پنجوں میں دبوچ کر چشم زدن میں جھنجھوڑ ڈالا۔ اس بد نصیب شخص کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی کر بناک ہو۔ ولدوز تھی۔ باقی دو مختلف سمتوں کی طرف دوڑے۔ ایک کی شاید میری جیب پر نظر پڑ گئی۔ مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شکاریوں کا یہ گروپ نظر حیات کے ٹولے سے ہی تعلق رکھتا ہوگا۔ اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر میں نے فوراً اپنی جیب کا دروازہ اس کے لئے وا کر دیا۔ اس نے قریب پہنچتے ہی جیب کے اندر جست لگائی۔ اپنی رائفل وہ پہلے ہی پھینک چکا تھا۔ میں نے اس کے سوار ہوتے ہی فوراً جیب آگے بڑھا دی۔ خود خوار تو ہی الجسٹہ ریچھ اپنے دوسرے شکار کے تعاقب میں بدستور دوڑا جا رہا تھا۔

"جیب چلاؤ..... جلدی کرو..... ورنہ یہ درندہ ہمیں پھاڑ کھائے گا۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ خوف زدہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ میں نے ایک نظر اس کے دہشت زدہ چہرے پر ڈالی۔ جیب آگے بڑھا دی۔ مگر تھوڑی دور جنگل میں نکل آنے کے بعد میں نے جیب ایک جھٹکے سے روک دیا۔ پھر اس کی طرف سر و نظروں سے نکتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ شکاری ہو کر ایک ریچھ سے مقابلہ نہ کر سکتے؟" اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ اب کافی سنسنیل چکا تھا۔ جیمنی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہم شکاری تو ضرور ہیں مگر اتنے بڑے درندوں کو شکار کرنے کا ہمیں خاص تجربہ نہیں۔ ہم تو یہاں ہا لومڑیوں کا شکار کرنے آئے تھے۔"

"نہیں..... صرف تین چار افراد؟" میں نے دانستہ اسے کریدنے کی خاطر کہا۔

"نہیں..... میرے ساتھ اور بھی ساتھی ہیں۔" اس نے جواباً کہا تو میں نے یونہی ادھر ادھر تار یک جگہ میں اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو تمہارا اور کوئی ساتھی نظر نہیں آ رہا؟" "وہ آگے نکل چکے ہیں۔ ہم یہاں اس درندے کے چنگل میں پھنس گئے تھے..... مگر تم کون ہو؟ اور یہاں جنگل میں کیا کر رہے تھے؟" اس نے آخر میں بہ غور میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا تو میں نے مسکرا کر کہا۔

"میں بھی بر فانی لومڑیوں کے ایک شکاری ٹولے کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ مگر میں شکاری نہیں ہوں۔ انہیں یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اندر جنگل میں شاید تمہارے ساتھیوں کی طرح دور نکل گئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔"

میری بات سن کر وہ الجھن آمیز حیرت سے بولا۔ "یہاں تو میں نے کسی اور شکاری ٹولے کو نہیں دیکھا۔ تم کون سے شکاری ٹولے کی بات کر رہے ہو؟" اس بار اس کے لہجے میں شک کی آمیزش تھی۔ "ہم ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ اور چوہدری ذیشان صاحب سے بھی ملاقات کی تھی۔ وہ کانچ میں بیٹھ چکے تھے۔" میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیا۔ وہ قدرے مطمئن ہو کر سر ہلانے لگا۔ "مگر وہ تو بتا رہے تھے کہ ان کے ساتھ ان کا کوئی دوست بھی تھا کہیں وہ چھوٹے قد والے گینڈے جیسے شخص کی بات نہیں کر رہے تھے جو ان کے ساتھ ہر وقت سائے کی طرح چپکا رہتا ہے؟" میں نے ہلاکی سے نظر حیات کے بارے میں اگلوں کی خاطر ایسا کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"نہیں..... وہ تو چوہدری صاحب کا مشیر ہے۔ بلکہ مشیر بھی کیا ہے، ان کا لاڈلا سالا ہے۔ دوست تو ان کا نظر حیات ہے۔"

"اچھا..... مگر وہ تو ان کے ہمراہ دکھائی نہیں دیا۔" میں نے یونہی بظاہر روادی میں مگر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"وہ نہیں آ سکا تھا۔ اسے اچانک شدید فلو نے آیا تھا۔ وہ وہیں پھاگل کے "بابائیاں" والی سرائے میں رہ گیا ہے۔" اس نے بتایا اور میری رگوں میں لیکٹ خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرا "شکار" کہاں تھا، مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ اب میں نے اس سے جان چھڑانے کی خاطر خاموشی سے جیب اشارت کی، یوٹرن لے کر وہاں کانچ کی طرف موڑ دی۔

میں اب اپنے دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ سرخ ہائی الیس والے ابھی وہاں نہ پہنچتے ہوں یا پھر چوہدری ذیشان نے میری اطلاع کے بعد فوری طور پر ان سے نمٹنے کے لئے کوئی قدم اٹھایا ہو۔

میں اب اسے کانچ تک چھوڑ کر پھاگل کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ کانچ زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد جیسے ہی میں کانچ کے ذرا قریب پہنچا تو اچانک گولیوں کی بھیاں تک ترترہاٹ سنائی دی۔ میں نے اچانک ہریک لگا دیئے۔ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میرا دل یکبارگی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ گوفائرنگ کی آواز کانچ کی سمت سے آرہی تھی۔ دشمنوں سے چوہدری ذیشان کا ٹانگرا ہو چکا تھا۔ میری بروقت اطلاع سے ممکن تھا کہ اب چوہدری ذیشان کے مسلح محافظوں کو اپنے دشمن کے خلاف پہلے ہی گھات لگانے کا موقع مل چکا ہو۔ اور ظاہر ہے جسے پہلے گھات مل جائے، اس کے حریف کو مات ملنا لازمی ہے۔

"کی..... یہ..... گوفائرنگ کیسی ہے؟" میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھے چوہدری ذیشان کے آدمی

نے مرتش آواز میں کہا تو میں بولا۔

”کہیں چوہدری صاحب کے کسی دشمن نے ہلہ تو نہیں بول دیا؟“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ دانت پس کر بولا اور پھر اپنی شکاری رائفل ایک جانب پھینکنے کے بعد اپنا جب سے پستول نکال لیا اور دو دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ پھر تیزی کے ساتھ کمانچ کی طرف دوڑنا لگا۔ وہ چوہدری ذیشان کا کوئی پکا نمک خوار لگتا تھا۔ میں اب شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے جیب آگے بڑھا دی۔ میں نے اپنا جو فرض ادا کرنا تھا، کر چکا تھا۔ اب چوہدری ذیشان جانے اور اس کے نامعلوم دشمن۔

فائرنگ کی آواز مسلسل تاریک جنگل میں گونج رہی تھی۔ میں دانستہ ذرا کمانچ کی حدود سے دور ہوا۔ جب دوڑانے لگا۔ اچانک میں نے کمانچ کی سمت سے آنے والے راستے پر ایک گاڑی کا ہیولا دیکھا۔ تیزی سے دوڑی جا رہی تھی۔ میں نے فوراً اپنی جیب کی رفتار دھبی کر لی اور دو اسکریں کے پار ہجوم دوڑتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ اور پھر بری طرح ٹھنکا۔ وہ سرخ رنگ کی ڈبل کمین انٹرکولر ٹرلوی۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے تعاقب میں بھی ایک اور گاڑی کو اندھا دھند دوڑتے ہوئے دیکھا۔ وہی ہائی ایس دیگن تھی جس میں چوہدری ذیشان کے دشمنوں کا سات افراد پر مشتمل ٹولا براجمان تھا۔ مگر نہ جانے ان میں سے کتنے باقی بچے تھے؟ یہ ابھی میں نہیں جان پایا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ زبردست ”باری“ کے بعد یقیناً چوہدری ذیشان نے راہ فرار اختیار کی تھی۔ دونوں گاڑیاں اندھا دھند دوڑتی جا رہی تھیں۔ میں اپنے دوسرے راستے پر آ گیا۔ میں نے بھی جانے کیا سوچ کر اپنی جیب آگے بڑھا دی۔ براستہ ان دونوں آگے پیچھے دوڑتی گاڑیوں کے بالکل متوازی تھا۔ مگر وہ دونوں گاڑیاں میری جیب سے آگے جا چکی تھیں۔

صورت حال گمبیر تھی۔ میں بھی اپنی جیب فل اسپید سے دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نے ہائی ایس دیگ سے گولیاں چلتے ہوئے دیکھیں جو تاریک جنگل میں جگنوؤں کی طرح آگے دوڑتی ہوئی چوہدری ذیشان انٹرکولر کی طرف لپک رہی تھیں۔ پھر اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور نظروں نے چوہدری ذیشان انٹرکولر کو ایک جانب جھٹکتے دیکھا جس کے بعد بتدریج اس کی رفتار دھبی پڑنے لگی۔ اور بالآخر ایک دروازہ سے ٹکرائی۔ اس کے تعاقب میں دوڑتی ہوئی اس کے خون آشام دشمنوں کی ہائی ایس چشم زدن انٹرکولر کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں نے بھی اپنی جیب کا اسٹیرنگ موڑا اور ان کی سمت چل دیا۔ نے قریب پہنچتے پہنچتے دیکھا کہ انٹرکولر سے ایک شخص نکل کر تیزی کے ساتھ دوڑا۔ ٹھیک اسی وقت ہائی ایس سے تین مسلح افراد کو بھی اترتے دیکھا۔ ایک نے اپنی رائفل کا رخ اس دوڑتے ہوئے شخص کی طرف کر کے برسٹ چلا دیا۔ گولیوں کی مہیب ترزاٹھٹ اُبھری۔ وہ شخص چیخ مار کر گر گیا۔ تینوں جیسے ہی اس کے سر پر پہنچے تو اچانک میری طرف انہوں نے دیکھا۔ میری جیب آدھی طوفان کی طرح ان کی وحشی درندے کی طرح بڑھ رہی تھی۔ وہ تینوں بوکھلا گئے اور دائیں بائیں دوڑے۔ مگر میری جیب نے زوردار ٹکر ماری۔ دونوں اچھل کر دور جا پڑے۔ میں نے فوراً جیب کو بریک لگائے اور اپنا میگارڈ ہاتھ لیتا ہوا تیزی کے ساتھ نیچے اترتا تو تیسرے شخص نے زخمی آدمی کو اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تو میں اپنی جیب کے بونٹ کی آڑ لے کر دونوں ہاتھوں سے میگارڈ تھام کر اس کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ اس کے گن والے ہاتھ پر لگی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے گن جھوٹ کر گر پڑی۔ میں نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے دوبارہ اس کا نشانہ لیا۔ دوسری بار میرے میگارڈ نے لرزہ خیز

آتشیں قبضہ بلند کیا اور وہ شخص کر یہہ چیخ کے ساتھ گرا۔ میں تیزی سے زمین پر پڑے زخمی شخص کی طرف بڑھا تو بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ وہ چوہدری ذیشان تھا۔ اس کی بائیں ٹانگ پنڈلی کی طرف سے لہو لہان ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک موت کی زردی پھیلی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اسے اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ میں نے فوراً اسے سنبھالتے ہوئے ہانپتی آواز میں کہا

”چوہدری صاحب!..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟..... اٹھئے، جلدی کریں۔“

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور اپنی جیب کی طرف بڑھا تو اچانک میں نے ذرا دور ایک شخص کو غن سنبھالتے ہوئے لڑکھڑا کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ یہ ان دونوں میں سے ایک شخص تھا جنہیں میں نے اپنی جیب سے اس وقت ٹکر ماری تھی جب وہ دونوں اپنے تیسرے مسلح ساتھی کے ساتھ چوہدری ذیشان کو گولیوں سے چھلنی کرنے کے درپے تھے۔ مجھے فوری طور پر گولی چلانے کا موقع تو نہ مل سکا تاہم میں نے خطرہ بھانپتے ہی زخمی چوہدری ذیشان کو ایک طرف دھکا دے کر گرایا اور خود کو دوسری طرف اچھال دیا۔ ٹھیک اسی وقت دشمن کی رائفل گرجی۔ ترزتاتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ ٹھیک اس سمت پر پڑی جہاں چند باپے پہلے ہی میں اور چوہدری ذیشان موجود تھے۔ میں نے محفوظ گوشہ سنبھالتے ہی اپنے میگارڈ سے اس کا نشانہ لے کر ٹرائیگر دبا دیا۔ میرے میگارڈ کی مہیب ٹال نے تیسرا آتشیں قبضہ اگلا۔ حریف بھی ایک کایاں تھا۔ ہمیں تیزی سے جگہ چھوڑتے اور اپنا نشانہ خطا جاتے دیکھتے ہی اس نے بھی بہ سرعت جگہ تبدیل کرنے کی غرض سے ”بلینک پوائنٹ“ کی سمت جھلانگ لگا کر پیرا ٹروپنگ کے انداز میں خود کو میری چلائی ہوئی گولی کی آتشیں زد سے بچایا تھا۔ مگر میں بھی اسے سنبھلتے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لئے اوپر تلے گولیاں برساتا چلا گیا۔ وہ بھی شاید کوئی چھلدا دھشت انسان تھا کہ پھرتی کے ساتھ فلا بازیاں کھاتا چلا جا رہا تھا۔ اور مجھے اس وقت اس کی چالاکی اور اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہوا جب میرے میگارڈ سے ”ٹریج“ کی خالی آواز اُبھری۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ تاہم میں نے اس نازک صورت حال میں اپنے حواس کو قتل نہ ہونے دیا اور تیزی کے ساتھ اس کے زمین پر بے سدھ پڑے ساتھی کے قریب گری ہوئی رائفل کی سمت لپکا مگر مد مقابل نے سنبھلتے ہی مجھ پر گن تان لی اور دوری سے چلا کر بولا۔

”خبردار!..... اپنی جگہ سے بالکل حرکت مت کرنا..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

میں جہاں کا تھاں رہ گیا۔ یکایک ماحول پر اعصاب شکن خاموشی طاری ہو گئی۔ زمین پر زخمی پڑے چوہدری ذیشان کا چہرہ بھی مست کر رہ گیا تھا جبکہ میرے اعصاب پوری طرح تنے ہوئے تھے اور دل کو یا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔ میری نظریں اس گن بردار شخص پر جمی ہوئی تھیں جو اب کینہ تو نظروں سے مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر میرے قریب پہنچ کر وہ رکا اور مجھ پر رائفل تانے اٹکھیں سیڑھے بہ نور مجھے خوفناک نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر میرے دائیں جانب زمین پر زخمی پڑے کراہتے ہوئے چوہدری ذیشان سے سفاکانہ لہجے میں بولا۔

”چوہدری! تیرا آخری وقت تو آن پہنچا ہے۔ پہلے ذرا میں تیرے اس خدائی فوجدار سے بات کر لوں۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے خوف ناک لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے غرا کر بولا۔

”ہاں..... اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ گے، تم کون ہو؟“

”میں ایک شکاری ہوں۔ اور یہاں برفانی لومڑیوں کا شکار کر رہا تھا کہ میں نے تم لوگوں کو ایک نہتے آدمی پر فائرنگ کرتے دیکھا۔“ اتنا کہہ کر میں دانستہ رکا اور اس کی گھورتی ہوئی نظروں سے اپنی نگاہ یکدم

دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھانے کے بعد ایک محتاط نگاہ گرد و پیش تاریک جنگل پر ڈالنے کے بعد تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

”نوجوان! تمہاری بہادری سے زیادہ مجھے تمہارے اس سرفروشانہ اور انسانی جذبے نے بے حد متاثر کیا ہے۔“ چوہدری ذیشان اپنے زخم کی پرواہ کئے بغیر چند ثانیوں تک مجھے نکتے رہنے کے بعد گہرے لہجے میں بولا۔

”چوہدری صاحب! آپ نے شاید میری اطلاع کو جھوٹ سمجھا تھا۔ ورنہ آپ اس حال کو نہیں پہنچتے۔“ میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... ایسی بات نہیں تھی۔“ وہ مرتعش سی آواز میں بولا۔ ”میں نے فوراً اپنے ساتھیوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ ہم نے جم کر دشمنوں کا مقابلہ کیا مگر بد قسمتی سے ایک تو دشمنوں کے مقابلے میں ہماری تعداد کم تھی اور پھر ہمارے پاس خاطر خواہ اسلحہ نہ تھا۔ میرا سالا بھی مارا گیا اور میرے ساتھی بھی۔ میں بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔“ سانس لینے کے لئے اس نے تھوڑے توقف کے بعد میری طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نوجوان! سچ پوچھو تو مجھے بھی اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا۔ مگر تم نے عین وقت پر میری جان بچا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔“

”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا چوہدری صاحب!“ میں ہولے سے بولا۔ پھر گفتگو بدل کر دوبارہ کہا۔ ”آپ کو موبائل کے ذریعے علاقائی انتظامیہ کی ہیلپ تو ضرور ملنی چاہئے تھی۔“ بد قسمتی سے رابطہ نہ ہو پایا تھا اور پھر دشمن سر پر پہنچ گئے تھے۔

میں خاموش ہو گیا۔ اس پر نیم غشی سی طاری ہونے لگی تھی اور اس کا سر سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک طرف ٹپک گیا۔ میں نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے رکھے دوسرے ہاتھ سے اس کی نبض چیک کی، وہ چل رہی تھی۔ اس پر یقیناً نقاہت کی وجہ سے بے ہوش طاری ہو گئی تھی۔

میں پریشان ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اسے کہاں اور کون سے ہسپتال میں لے جاؤں۔ پہلا دیہات پھاگل ہی نظر آتا تھا۔ اگر نظر حیات اس کے ساتھ نہ تھی نہ ہوتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ درحقیقت میں چوہدری ذیشان کے ساتھ اپنے دشمن کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ نظر حیات جیسے کہینے، مکار دشمن سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ وہ الٹا چوہدری ذیشان کے دشمنوں کو خفیہ طور پر میرے پیچھے لگا دیتا

اب میں بیک وقت کئی پیچیدگیوں کا شکار ہو سکتا تھا۔ یہ پولیس کیس تھا اور ضابطے کی روایتی کارروائی میں بلاوجہ میں بھی جکڑا جا سکتا تھا۔ ناچار میں نے سب سے پہلے پھاگل پہنچ کر متعلقہ ٹھانے کا رخ کیا۔ ٹھانے کے نیند سے اٹھائے ہوئے عملے نے میرا بیزاری سے استقبال کیا۔ مگر جب انہیں ایم این اے چوہدری ذیشان کا نام معلوم ہوا تو سب الارٹ ہو گئے۔ فوراً ایک سٹری کوٹھانے دار صاحب کے کوارٹر روانہ کیا گیا۔ وہ سادہ وردی میں ہی چوہدری ذیشان کا نام سن کر بھاگا چلا آیا۔ موبائل تیار کی گئی اور فوراً چوہدری ذیشان کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا جہاں اسے فوری طور پر ابتدائی طبی امداد دے کر ہوش میں لایا گیا۔ اس کی ٹانگ کے زخموں کے معائنے اور علاج کے بعد اسے نسلی دی کر سروسٹ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں۔ پانچ گولیاں لگی تھیں۔ تین تو پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی پار ہو چکی تھیں، ایک ران کے گوشت میں بیوست تھی۔ اسے نکال دیا گیا تھا۔ جبکہ پانچویں گولی نے پنڈلی کی ہڈی کو تھوڑا بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اب انہیں کسی بڑے ہسپتال لے جانا ضروری تھا تا کہ کوئی کنسلٹنٹ آرٹھرو پیڈک سرجن ان کی ٹانگ کی ہڈی کی پراپر سرجری کر سکے۔

کچھ ایسے چوتکتے ہوئے انداز میں اس کے عقب کی جانب ڈالی گویا میں نے اس کے پیچھے کسی کو اچانک دیکھ لیا ہو۔ یہ ایک پرانا حربہ تھا جسے میں نے ذرا بدل کر بالکل فطری اور غیر ارادی اداکاری سے آزمایا تھا۔ کامیاب رہا۔ حسب توقع وہ پیچھے دیکھنے کے لئے ذرا مڑا ہی تھا کہ میں نے ”اب نہیں تو کبھی نہیں“ مصداق بجلی کی پھرتی کے ساتھ اچھل کر فلائنگ کلک کے انداز میں اپنی دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر پڑیں۔ وہ اچھل کر کئی قدم پیچھے لٹکھڑاتے ہی زمین پر گرنا تو اجمالہ اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور پڑی۔ وہ بازی ہاتھ سے نکلنے دیکھ کر فوراً ہی تڑپ کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا مگر میں اب اسے کہاں سے دینے والا تھا۔ میں نے دائیں ٹانگ کو حرکت دی اور لاگ بوٹ کی ٹو اس کی ٹھوڑی پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ میں نے لپک کر گن اٹھائی اور اس پر تان لی اور غراہٹ سے مشابہہ آواز میں بولا۔

”بس!..... اب تمہارا کھیل ختم اور ہمارا شروع۔ دونوں ہوا تھ بلند کرلو۔“ وہ مجھے قہرناک نظروں سے گھورنے لگا۔ چوہدری ذیشان بہ مشکل اپنی زخمی ٹانگ پکڑے کراہتے ہوئے بولا۔ ”نوجوان! اپنی گن مجھے دو اور تم میری گاڑی سے رتی اٹھالادو۔“

میں ذرا تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ تاہم میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر چوہدری ذیشان کو گن تھمانے پہلے میں نے مقابل کو درشت حکم دیا۔ ”تم نے سنا نہیں؟..... اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر کے دوسری طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔“

اس کے پاس میرے حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس نے بے بسی سے اپنے دانت پینے ہوئے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے چوہدری ذیشان کو رائل تھماتے ہوئے کہا۔

”چوہدری صاحب! ذرا محتاط رہیں..... آپ زخمی ہیں۔ یہ ذرا حرکت کرے تو بے دریغ اسے مار دیں۔“

”آئی نو بیٹا!..... آئی نو!“ چوہدری ذیشان ہانپتی ہوئی آواز سے بولا اور مجھ سے رائل لے اپنے دشمن کی طرف اس کا رخ کر دیا۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا انٹرکولر کے قریب پہنچا تو اچانک اُٹھنے کے عقب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی..... میں تیزی سے پلٹا اور ششدر سا رہ گیا۔ میں نے مقابل کو تیزی کے ساتھ زگ زگ انداز میں ایک طرف تاریکی میں دوڑتے دیکھا اور چوہدری ذیشان اس پر گولیاں دانے جا رہا تھا۔ اس کے دشمن نے اندھا جواہ کھلیا تھا۔ کیونکہ اسے شاید یہ خوبی اس بات اندازہ تھا کہ چوہدری ذیشان زخمی ہونے کی صورت میں اس کا بروقت اور ٹھیک نشانہ نہیں لے سکتا تھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ مقابل نے یہ اندھا جواہ بڑی کامیابی سے کھلیا اور چشم زدن میں تاریکی کا قاف اٹھا کر اندھیرے جنگل میں غائب ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ چوہدری ذیشان کے دشمن معمولی حیثیت کے نہیں تھے۔ وہ لڑائی بھڑائی میں فائز مہارت اور مشائے رکھتے تھے۔ بہر طور بھاگا ہوا دشمن ہمارے لئے اب کسی وقت بھی خطرناک بن سکتا تھا۔ تعاقب میں دوڑنا عقل مندی نہ تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا چوہدری ذیشان کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر شدید جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ میں نے اس سے قدرے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”چوہدری صاحب ہمیں اب بلا تاخیر یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ آئیے!“ یہ کہہ کر میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ اس کی زخمی ٹانگ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ کاٹ دار اور سرد ہواؤں کے ہاتھ جریان خون کم کم ہی ہو رہا تھا۔ وہ میرے سہارے جیپ تک آیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر

”معاذی کارڈ؟“  
 ”معاذی کارڈ تو میرے پاس نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”کتنے دن رہتا ہے؟“  
 ”بس، آج ہی کی رات۔“  
 ”نکالو دوسرو پے۔“

میں نے دوسرو پے جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ خانہ پری کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر ہال کے دوسرے دروازے سے ایک پتلی نیم تاریک راہداری میں لے آیا۔ یہاں صرف ایک جانب قطار اندر قطار صرف آٹھ نو کے قریب کمرے نظر آئے تھے۔ وہ مجھے لے کر سب سے آخری کمرے میں واقع ایک کمرے کے سامنے پہنچا اور پھر اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر تالا کھولا اور پھر واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک کر کہا۔

”بابا! میرا ایک دوست بھی یہاں آنے والا تھا۔ دراصل ہم برفانی لومڑیوں کے شکار کی غرض سے یہاں اکٹھے ہونا چاہتے تھے۔ اس کا نام نظر حیات ہے۔ وہ کون سے کمرے میں ہے؟“  
 میری بات پر وہ کچھ سوچا رہا، پھر بولا۔ ”نام تو مجھے یاد آتا ہے مگر..... کمرہ نمبر.....؟“ وہ کچھ سوچتا رہا پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا، بولا۔ ”ہاں..... یہ سامنے والے سے دو کمرے چھوڑ کر۔ گراب تم صبح ہی لینا۔ اس وقت دروازہ زور سے تمہیں کھٹکنا پڑے گا۔ دوسرے مسافروں کی نیند خراب ہوگی۔“  
 ”ٹھیک ہے..... میں خود بھی اس کی نیند نہیں خراب کرنا چاہتا۔ سلی ہوگئی میری کہ وہ ادھر آچکا ہے۔“ میں نے گویا اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھا مجھ سے مطمئن ہونے کے بعد واپس لوٹ گیا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ کمرے کا سرسری جائزہ لیا۔

صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر گرم بستر بھی موجود تھا جو صاف ستھرا تھا۔ ایک اٹیچڈ ہاتھ بھی تھا۔ ایک ٹھڑکی بھی جو باہر کھلتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے میکارو کے چیمبر میں گولیاں بھر لیں، اس کے بعد کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری پر دور تک نگاہ ڈالی، کوئی نہ تھا۔

میں نے بوڑھے کے بتائے ہوئے نظر حیات والے کمرے کو ذہن نشین کر لیا تھا۔ یقیناً دوسرے کمرے میں اس کے چند خدمت گار ٹاپ کے ساتھی بھی موجود ہو سکتے تھے۔ تاہم میں دبے پاؤں نظر حیات والے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ دروازہ ظاہر ہے، اندر سے بند ہی تھا۔ میں سوچنے لگا۔ اچانک مجھے اندر کمرے سے ہلکی سی گنگنائی آواز سنائی دی۔ یلکھت میرے اعصاب تن گئے۔ موبائل کی بیل تھی۔ میں دم سادھے کھڑا رہا۔ تاہم میں نے اپنا ایک کان دروازے سے چپکا دیا۔ بیل مسلسل بج رہی تھی۔ اچانک جب بیل آنا بند ہوگئی تو میں فوراً سمجھ گیا کہ اندر موجود نظر حیات نے جاگ کر کال سننے کے لئے اپنا موبائل آن کر دیا تھا۔

”ہیلو..... چوہدری صاحب! آپ..... کیا ہوا؟..... ادھ نو، لگ..... کب؟..... لگ..... کیسے ہوا یہ سب؟..... آپ ٹھیک تو ہیں نا؟..... مم..... میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“  
 یہ نظر حیات کی پوکھلائی ہوئی آواز تھی اور لگت زوہ آواز سے میں سمجھ گیا تھا کہ چوہدری ذیشان نے میاں اس سے رابطہ کیا ہوگا اور موجودہ صورت حال کی سنگینی سے باخبر کیا ہوگا۔

پھر اچانک مجھے اندر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور یلکھت میرے اعصاب تن گئے۔ وہ یقیناً پہلے اپنے دوسرے کمرے میں موجود ساتھیوں کو جگانے کے ارادے سے باہر

ہوش میں آنے کے بعد چوہدری ذیشان نے میری اندرونی پریشان کن کیفیات بھانپ لی تھیں اور اس سلسلے میں اس نے مجھے پہلے ہی مسکراتے ہوئے اس بات کی تسلی دے دی تھی کہ وہ مجھے منظر عام لانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ اثر و رسوخ والا شخص تھا۔ اس کے لئے یہ کام کیا مشکل تھا۔ چنانچہ دونوں کی آپس کی مختصر بریفنگ کے بعد میں نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ میں نے انہیں زخمی حالت میں جنگل میں پڑے پایا اور یہاں اٹھا لایا، وغیرہ۔ پھر چوہدری ذیشان اپنے دشمنوں کے خلاف بیان ایف آئی آر وغیرہ کنوائے لگا تو مجھے اس نے وہاں سے ”کھسکا“ دیا۔ یوں چوہدری ذیشان نے خوبصورتی سے مجھے معاملے سے الگ کر دیا تھا۔ بقول اس کے کہ اب اس کے لئے یہیں کافی تھا کہ زندہ بچ گیا تھا۔ اب وہ اپنے دشمنوں کو (جنہیں وہ اچھی طرح جانتا بھی تھا) ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ یہ رخصت ہوتے وقت چوہدری ذیشان نے مجھے اپنا وینٹگ کارڈ دے دیا تھا جس میں اس کا سیل نمبر بھی موجود تھا۔ میں وہاں سے واپس روانہ ہوا اور ”سرائے سیاں“ جا پہنچا۔

”سرائے سیاں“ آبادی سے ذرا ہٹ کے تھی مگر کبھی خوب صورت۔ یہ ایک چوہدری عمارت پر مشتمل تھا۔ اس وقت وہاں ویرانی کا راج تھا۔ میرا شکار ادھر ہی کسی کمرے میں پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اسے تک چوہدری ذیشان کے سلسلے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ میرے لئے فی الوقت یہ اچھا موقع تھا۔

میں نے دانستہ اپنی جیب ذرا دور درختوں کے جھنڈ میں روکی اور سرائے کی طرف بڑھ گیا۔ قریب کر میں بھی اندر احاطے میں داخل ہوا۔ سامنے بڑا ساحرابی دروازہ تھا جو اس کا داخلی دروازہ تھا اور بند تو میں نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اپنی رست و اج میں وقت دیکھا۔ چارپائی والے تھے۔ سپیدہ سحر نمودار ہونے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے باقی تھے۔ یہ سرائے تھی، اس لئے یہاں کسی مسافر کی کسی بھی وقت آمد کوئی اچھے کی بات نہ تھی۔ میں نے دوسری بار ذرا زور سے دستک دے ڈالی اندر کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے چند ثانیوں بعد ایک بوڑھے شخص نے دروازہ کھولا۔

”بابا! میں مسافر ہوں..... کمرہ چاہئے۔“ میں نے کہا۔  
 ”اندر آ جاؤ۔“ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا آتش دان سلگ رہا تھا۔ وہاں ایک خالی چارپائی اس کے قریب ہی میز کرسی دھری تھی میز پر ایک بڑا سا رجسٹر اور قلم رکھا ہوا تھا۔ ہال میں سات، آٹھ، قریب لائن میں چار پائیاں دھری تھیں۔ اوپر رضائیاں اوڑھے کچھ لوگ سوئے ہوئے تھے۔ کمرے کا گرم تھی۔ سامنے کی دیوار پر سیاہ بڑے بڑے جلی حروف سے ”کمرہ، برآمدہ اور چارپائی“ پر سونے لگے الگ ریٹ درج تھے۔

وہ بوڑھا شخص مجھے لئے میز کے قریب آ گیا اور کرسی پر بیٹھ کر رجسٹر اور قلم سنبھالتے ہوئے مجھ بولا۔ ”ہاں بھائی! کیا چاہئے؟..... کمرہ یا چارپائی؟“

”کمرہ۔“ میں نے کہا۔  
 ”کمرے کے دوسرو پے ہوں گے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“  
 ”نام بتاؤ۔“  
 ”اختر حسین۔“

نکل رہا تھا۔ میں نے بہ سرعت اپنی جیکٹ کی جیب سے اپنا میگارد نکال لیا اور پھر جیسے ہی اندر سے باہر کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا دھکا دیا۔ نظر حیات دروازے سے نکل کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

”چلو پھر..... تمہاری قسمت کو آزماتے ہیں نظر حیات! میں ایک گولی چیمبر میں ڈال کر چکری کو گھماؤں گا۔ پھر تمہاری پیشانی پر نال رکھ کر ٹرائیگر دباؤں گا..... ایسا میں تین مرتبہ کروں گا۔ اب یہ تمہاری قسمت ہوگی کہ تینوں مرتبہ پستول خالی ہی چلتا رہے یا پھر کسی ایک بار میں گولی چل جائے۔“

یہ کہہ کر میں نے وہ ایک گولی چیمبر کے اندر ڈالی اور گولی چکری کو گھمایا۔ پھر مونا سا تکیہ اٹھا کر اپنے میگارد کی نال کے آگے کیا، پھر اس کے سینے پر رکھ دیا تاکہ گولی چلنے کی صورت میں زیادہ آواز برآمد نہ کرے۔

یہ محاورے نہیں، حقیقتاً زندگی اور موت کا کھیل تھا۔ مگر صرف دشمن کے لئے۔

”نن..... نہیں..... ایسا مت کرو۔“ نظر حیات نے چلانے کی کوشش میں اپنے حلق سے یہ کہتے ہوئے آواز بلند کرنا چاہی تو میں نے دوبارہ اس کی گردن دبوچ لی۔

”خبردار!..... اب چیخنے کی کوشش مت کرنا..... ورنہ تین بار نہیں، اس وقت تک ٹرائیگر دباتا چلا جاؤں گا جب تک فائر نہیں ہو جاتا۔“ میں نے اسے غرا کر خوفناک دھمکی دی۔

اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں التجا کرتے ہوئے بولا۔

”د..... دیکھو..... تت..... تم تین بار کی بجائے..... صرف ایک بار ٹرائیگر دبا کر مجھے چھوڑ دو.....“ مگر پھر دوسرے ہی لمحے ”اندھی موت“ کے تصور سے لرز کر دوبارہ کپکپاتی آواز میں بولا۔ ”نن..... نہیں..... ایک بار بھی ٹرائیگر مت دباتا..... ورنہ..... ورنہ گولی چل جائے گی۔“

موت کے خوف نے اسے بری طرح اعصاب زدہ بنا ڈالا تھا۔

”چچ..... چچ..... اتنا خوف؟“ میں جیسے اس کی کیفیات قریب المرگ سے حظ اٹھاتے ہوئے سناگانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ”تم تو میرے سامنے بہت اکڑتے تھے۔ اب تمہاری حالت کسی چوہے سے بھی بدتر ہو رہی ہے۔“

دن کو موت سے پہلے موت کے جاں مسل خوف تلے جھلا کر کے مجھے زیادہ تسکین محسوس ہو رہی تھی۔

”بس، اب کھیل شروع ہوا چاہتا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کے سینے پر پستول کی نال کو تکیے سے لگا کر ٹرائیگر دبا دیا..... کمرے کے ہولناک ماحول میں ”ٹریچ“ کی خالی آواز ابھری۔

میں نے دیکھا، خون کو برف بنا دینے والی کاٹ دار سردی کے باوجود نظر حیات کی پیشانی پر نغشی نغشی بدنہن نمودار ہو گئیں اور اس کی سانس یوں تیز تیز چلنے لگی جیسے وہ کئی میلوں تک دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ وہ لرزہ آواز میں دوبارہ مجھ سے بولا۔

”خدا کے لئے..... اب..... اب دوبارہ ٹرائیگر مت دباتا..... ہو..... ہو..... ہو.....“

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے اپنا میگارد نکال لیا اور پھر جیسے ہی اندر سے باہر کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا دھکا دیا۔ نظر حیات دروازے سے نکل کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

”کئے! آج تیری زندگی کا آخری دن ہے۔“

مجھے اس دور دراز برقیے علاقے کی ایک دور افتادہ سرائے میں بالکل غیر متوقع اپنے سامنے پارک کی آنکھیں مارے دہشت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہونٹ پڑ پڑا رہے تھے مگر یقینی موت کے نزلے تلے اس کے منہ سے الفاظ نہیں برآمد ہو پارہے تھے۔

میں نے اسے بستر پر دھکا دیا اور اپنی ایک ٹانگ چارپائی پر ٹکا کر اس پر جھک گیا۔

”اب بولو نظر حیات!..... کیا کہتے ہو؟..... صرف ایک گولی..... مگر نہیں، مجھے گولی نہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ میں اپنے باپ کے قاتل اور اپنی کوساری عمر جرم بے گناہی بھو گئے والے دشمن کا آسانی گلا دبوچ سکوں۔“

میرے لہجے سے میری دیرینہ آتش منظم کی تپش کو محسوس کرتے ہی نظر حیات پر یقینی موت کے فز سے لرزہ طاری ہو گیا۔ اس کی بری طرح صلی بندھ چکی تھی۔ وہ ابھی تک ہکا بکا سی کیفیات کا شکار مارے دہشت کے پھٹی پھٹی آنکھوں میں ابھی تک غیر یقینی کے تاثرات بھی مترشح ہو رہے تھے۔

”نظر حیات! میں چاہتا تو کسی بھی وقت تمہارے کھوکھلے محل کی کاغذی دیواروں کو پھلانگ کر کم تک پہنچ سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا اب تک جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔“ میں نے دانت چیں کر اور اس پھیلی ہوئی آنکھوں میں زہر کی طرح سراسیمہ کرتی نظروں سے گھور کر دوبارہ کہا۔ ”اس لئے کہ تمہارا دماغ سے یہ خوش فہمی نکل سکے کہ تم میرے انتقام سے دنیا کے کسی گوشے میں بھی محفوظ نہیں رہ سکتے۔“

چاہے وہ ہاتھ کی گہرائیاں ہی کیوں نہ ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنے میگارد کی نال اس کی پیشانی سے ہٹا دی اور اسے بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی تو وہ کھٹی کھٹی لرزتی آواز میں بولا۔

”م..... مجھے معاف کر دو..... نن..... نار!“

”معافی.....!“ میں نے بھویں اچکا کر سفاک لہجے میں کہا۔ ”معافی کس چیز کا نام ہے؟ اب بھی تمہارے سلسلے میں معافی؟..... نہیں، نہیں..... نظر حیات! نہیں..... اب تمہیں میرے ہاتھوں یقینی موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ میں کسی سانپ کی طرح پھنکارا۔

وہ دونوں ہاتھ جو کر لرزیدہ آواز میں میری منت سماجت کرتے ہوئے بولا۔ ”نن..... نار!.....“

م..... میں اعصابی مریض ہوں۔ یقین کرو..... جب سے میں نے شاہ میر کی حالت زار دیکھی ہے تب سے اب تک ایک لمحے کو بھی سکون کی نیند سے نہیں سوسکا ہوں۔ تم ماں بیٹے کی دہشت اس سے ہی میرے اعصاب پر سوار ہو چکی ہے۔ م..... میں.....“

”بند کرو اپنی کواں..... کئے!“ میں نے ابلیسی آنکھوں کے ساتھ غرا کر کہا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے؟ میں تجھے اتنی آسان موت مار دوں گا؟..... ہرگز نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے ڈرامائی اعزاز میں اس کی گردن ایک جھٹکے سے چھوڑ دی۔ اس کے بعد اپنے میگارد کے چیمبر سے ساری گولیاں نکال دیں۔ پھر

زندگی کا دیا پھر روشن ہوا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ پیشانی تو کیا اس بار اس کا وجود ہی پسینے سے شرابور ہونے لگا تھا۔

”اوہ..... میرے دشمن کی قسمت تو اچھی ہے..... خیر، اب تیسری اور آخری بار ٹرائیگر دبانے ہے۔“ میں نے سنگدلانہ لہجے میں سرسراتی مسکراہٹ سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔  
اس کی موت کے خوف سے بری طرح کھانسی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے اور میری ماں کو دھونس دینے والا دھاڑتا، چنگھاڑتا نظر حیات اس وقت بھیگی ملی بنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے تحمل پڑتے حواس غیر ہوتی حالت سے مزید محظوظ ہونے کی غرض سے آخری ”سیشن“ کو ذرا طول دیا۔

”کیوں نظر حیات!..... آج معلوم ہو رہا ہے نا، موت کا خوف کیا ہوتا ہے؟ اور زندگی کی رکتی ہے۔ مگر تو نے اور شاہ میر نے تو بڑی گھناؤنی سازش کے ساتھ میرے باپ کو زبردستی مار ڈالا اور میری ماں کو تم نے کھلونا بنانے کی کوشش کی تھی اور..... اور پھر تو نے میری ماں پر دہرا ظلم بھی ڈالا کہ اس بے چاری کو بھری جوانی میں بیوہ کرنے کے بعد اسے اسی کے شوہر کے قتل کے جھوٹے میں عمر قید بھگتانے کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی دھکیل دیا۔“ میرا لہجہ آتش انتقام سے بھڑکا جا رہا تھا۔

”کاش..... کاش!..... اس بار گولی چل جائے اور تیرا ناپاک دھڑکتا ہوا وجود موت کی اتھاہ تاریکیوں میں ہو جائے..... کاش!..... میں دبا رہا ہوں ٹرائیگر..... آخری بار!“

”نن..... نن..... مارے خوف کے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔“ ”مم..... مم..... میرا کچھ لے لو نادر!..... مم..... میں ساری عمر تم ماں بیٹے کے پاؤں چاٹتا رہوں گا۔ مم..... دیکھو..... دیکھو، اب کی بار ٹرائیگر مت دباننا..... کیا خبر..... کیا خبر.....“ وہ بری لڑنے لگا۔

”میں دبا رہا ہوں ٹرائیگر.....!“ میں نے سلگتی آنکھوں سے اسے گھور کر کہا۔ وہ ترپنے لگا۔ مجھے بھی اپنے پورے وجود کی طاقت کے ساتھ اسے دبوچے ہوئے تھا۔ اور پھر تیسری بار بھی میں نے اسے ”نا..... نا..... نا.....“ کے دوران ٹرائیگر دبا دیا۔ کمرے کے دم بہ خود ماحول میں تیسری بار ”ٹریج“ کی آواز ابھری اور نظر حیات کی آنکھوں کی پتلیاں چڑھنے لگیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے موت کے خوف سے زرد پڑتے ہوئے چہرے پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پاگلوں کی طرح خوش ہو کر بولا۔

”مم..... مم..... میں فح گیا..... فح گیا..... نن..... نن..... نادر! مگ..... اس بار بھی نہیں چلی۔“

”ہاں..... تو فح گیا کتے! مگر میں دوبارہ تیرے پاس آؤں گا۔ اور اگلی بار تیرے ساتھ اس بھی زیادہ گھناؤنا موت کا کھیل کھیلوں گا۔“ میں نے لبو رنگ لہجے میں اس سے کہا۔ اس کے بعد کچھ پستول اس کے سینے سے ہٹا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ یعنی موت کے خوف سے اس کا بستر غلط ہو چکا تب میں نے اس کے جسم کو کشتی جھکنے لگتے ہوئے دیکھا۔ اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور ہال سے گزر کر سرائے کے بیرونی دروازے طرف بڑھنے لگا تو میں نے اس بوڑھے کو آتش دان کے قریب رکھی چار پانی پر خرائے لیتے دیکھا۔ خاموشی کے ساتھ سرائے سے باہر آ گیا۔

پہلے سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اپنی جیب کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے اپنا میگارد نکال لیا۔ پھر اس کے چیمبر کو دیکھا، وہ بالکل خالی تھا۔ میرے ہونٹوں پر خود بخود زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ کیونکہ میں نے چیمبر میں ایک گولی بھی نہیں ڈالی تھی۔ محض نظر حیات کو ایک گولی کی جھلک دکھائی تھی اور جس بات میں چیمبر بند کرنے لگا تھا تو اس دوران میں نے اس کی خوف زدہ نظروں سے بجا کر وہ گولی اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ اس پر خوف طاری تھا جس کی وجہ سے وہ میری یہ ”چوڑ“ حرکت نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں نے چیمبر میں ساری گولیاں بھریں اور پھر بھرے ہوئے میگارد کو اپنی جیب میں دوبارہ رکھتے ہوئے جیب آگے بڑھا دی..... اب میرا رخ ”کھلیاں“ کی طرف تھا۔

اپنی سرائے میں آ کر میں نے چند گھنٹے نیند لی۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کر واپس رخت سحر پہنا۔ مجموعی طور پر میری یہ مہم کامیاب رہی تھی۔ میں نظر حیات کو ذہنی و دماغی طور پر ایک زبردست نشان سے دوچار کر چکا تھا۔ میں نے اپنے اس انوکھے انتقام کی ابتداء کر ڈالی تھی اور نظر حیات جیسے گھناؤنے دشمن کو میں موت سے پہلے موت کے خوف میں جکڑ چکا تھا۔ یہی میری دیرینہ آرزو تھی کہ میں اسے قہر قہر موت کا زہر پلاتا رہوں۔

چوہدری ذیشان والا چکر میرے ذہن سے منحوس ہوا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے دشمن کون تھے اور اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتے تھے؟ اس نے بھی مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یا پھر حالات ایسے تھے کہ میں ذرا بھی اس معاملے سے جلد از جلد دور ہو جانا چاہ رہا تھا۔

میں نے ایک مقام پر گاڑی ری فیول کروائی اور آگے بڑھ گیا۔ سرائے کے باپے اور بٹ راس کے گھنے جنگلات سے گزرنے کے بعد جب میں شاہراہ ریشم پر پہنچا تو شام گھٹنے لگی تھی۔ وہاں سے ایبٹ آباد پہنچنے پہنچنے مجھے رات نے آن لیا۔

اب یہاں سے مری یا تھتیا گلی تقریباً پچاس ساٹھ کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ میرا نان اسٹاپ سفر جاری تھا کہ اچانک مجھے اپنی جیب میں رکھے موبائل پر واہبر بینک کال محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً موبائل نکال کر پہلے میں دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ ماں نے مجھ سے رابطہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ کال غزالہ کی تھی۔ میں نے اقبال کے پیش نظر موبائل کو کال ٹون سے واہبر بینک الرٹ پر رکھا ہوا تھا۔ بہر طور غزالہ کی اس اچانک کال پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

”ہیلو..... غزالہ! میں نادر بول رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟“ ”نن..... نادر! تہ..... تم اس وقت کہاں ہو؟“ دوسری جانب سے اس کی ہراساں آواز ابھری تو میں نے قدرے چونک کر کہا۔

”کیوں، خیریت ہے؟..... میں اس وقت ایبٹ آباد سے واپس اپنی رہائش گاہ جا رہا ہوں۔“ ”مگ..... کیا تم بٹ راس اور کھلیاں سے آرہے ہو؟“ اس نے یکدم پوچھا تو مجھے ایک اندازت جھکا لگا۔ میں نے فوراً جیب کی رفتار ذرا دھمی کر دی اور جب اسے اثبات میں جواب دیا تو وہ سب اعتبار متحوش لہجے میں بولی۔

”اوہ مائی گاڈ!..... تہ..... تو یہ تم ہی تھے؟“ ”غزالہ! آخر بات کیا ہے؟ کیا ہوا ہے؟“ میں نے ابھن آمیز پریشانی سے کہا تو وہ بتانے لگی۔ ”کیا تمہارا بھانجیل اور کھلیاں میں کچھ لوگوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا تھا اور تم نے کچھ مسلح لوگوں کے خونی ہاتھ سے قومی اسبلی کے ممبر چوہدری ذیشان کی جان بچائی تھی؟“

نہیں..... غ..... خدا کے لئے نہیں.....“  
 میں دھک سے رہ گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے گولی چلنے کے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً  
 جیب کے ٹائر زور سے چرچرائے اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ موبائل میرے کان سے  
 ہوا تھا اور میری سانسیں جیسے سینے میں اٹک کر رہ گئی تھیں۔ دل تیزی سے جیسے سانس سانس کرتی  
 بیڑوں پر بھڑک رہا تھا۔  
 میرے اندر زبردست پکڑ دھکڑ ہونے لگی۔ صاف لگتا تھا کہ غزالہ کو کسی نے بروقت ٹارگٹ بنا لیا تھا  
 اسے گولی بار دی تھی۔ پتہ نہیں اب وہ زندہ بھی تھی یا نہیں۔ یقیناً یہ کام اشفاق شاہین کا تھا۔ دوسری  
 ف سے موبائل کے گرنے کی آواز بھی آئی تھی۔ پھر کسی نے موبائل اٹھا لیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ غزالہ  
 ہم تمام کرنے والے قاتل کے ہی ہاتھ میں اس کا موبائل تھا اور اب وہ اسے آف کر دے گا۔ مگر  
 رہے ہی لمحے مجھے دوسری طرف سے ایک غراتی ہوئی شناسا آواز سنائی دی۔

”ہمارا!..... تم نے ہم سے ٹکر لے کر اچھا نہیں کیا۔“  
 اس کے ساتھ ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میرے دماغ میں سانس سانس ہونے  
 کیلئے یہ آواز غور سے کی تھی۔



”ہاں.....“  
 ”ہمارا! تم سے نادانگی میں ایک بہت بھیا تک غلطی ہو گئی ہے۔“ میرے مختصر اثباتی جواب پر  
 نے ہولناک لہجے میں کہا تو میں بھی تھلا کر بولا۔  
 ”آخر بات کیا ہے؟ تم پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو؟ کھل کر کیوں نہیں بتاتیں، معاملہ کیا ہے؟“  
 ”ہمارا! وہ اشفاق شاہین کے آدمی تھے جو چوہدری ذیشان کو قتل کرنا چاہتے تھے۔“ غزالہ نے  
 ایک دھماکا کیا اور مجھے حیرت اور پریشانی کا ایک زبردست جھٹکا لگا۔  
 ”مم..... مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ چلا؟“ میں نے اپنے حواس پر ذرا قابو پاتے ہوئے پوچھا۔  
 ”مجھے طارق نے بتایا ہے۔“  
 ”طارق.....؟“ میں سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔  
 ”کیا تم بھول گئے غفورے کے قریبی ساتھی کلکیل کو؟ وہی جو مجھ سے سچی محبت کا دم بھرتا ہے اور  
 اچھا دوست بھی ہے۔“ اس نے مجھے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا کہ غزالہ نے مجھے ایک ایسے نوجوان کے بارے  
 میں بتایا تھا جو اشفاق شاہین کے گینگ میں شامل تھا اور غفورے کا دم بھلا بھی تھا۔ وہ غزالہ سے بڑا  
 دعویٰ دار تھا اور اسی کی طرح وہ ان لوگوں سے بددل ہو چکا تھا۔  
 ”ہاں..... یاد آیا..... بتاؤ، اسے کیسے یہ سب پتہ چلا؟“ میں نے بالآخر کچھ کچھ یاد کر  
 ہوئے کہا تو غزالہ بولی۔

”جب تمہارا ”بھیا گل“ میں اشفاق شاہین کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا تو ایک اعجاز عرف جابر  
 شخص نے تمہیں فوراً پہچان لیا تھا۔ مگر وہ تمہارے ہاتھوں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح  
 نے گرتے پڑتے کسی قریبی آبادی پہنچ کر اشفاق شاہین کو تمہارے بارے میں مطلع بھی کر دیا کہ ان  
 بنایا کھیل کس نے بگاڑا تھا؟“

”مگر..... اس نے مجھے کیسے اور کب پہچانا؟“ میں نے الجھ کر پوچھا تو وہ جواباً بولی۔  
 ”جس وقت تمہاری میرے سلسلے میں پہلی میٹنگ اشفاق شاہین اور غفورے کے درمیان اس جگہ  
 والی کوٹھی لاہور میں ہوئی تھی، جا جو نے تمہیں وہاں دیکھا تھا اور پھر جب تم سے اشفاق شاہین نے وہ  
 ملاقات کی تھی اور تم نے بڑی چالاکی سے اسے ہموار کر کے اپنا دوست بنا لیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ  
 کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھری تھی تو اشفاق شاہین نے یہ بات غفورے کو بھی بتائی تھی۔ غفورے  
 تمہارے ماضی سے اچھی طرح واقف ہے اور تمہیں بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ ایک انتہائی شاعر  
 ہوشیار شخص ہے۔ اس کے حلق سے یہ بات نہ اتر سکی۔ اسے تم پر شبہ ہو گیا تھا کہ تم اس کے اور  
 شاہین کے خلاف کسی خفیہ ٹاسک میں مصروف ہو۔ ان لوگوں کی جنگ چوہدری ذیشان سے بھی چلی  
 تھی۔ وہ ان کے کالے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور ان کے خلاف بڑی موثر کارروائی  
 ہے۔ اب یہ اسے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ چوہدری ذیشان، بر فانی اور  
 کے شکار پر روانہ ہو رہا ہے تو ان لوگوں نے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا اور..... اونوں  
 اچانک دوسری طرف سے غزالہ بولتے ہوئے رک گئی۔ شاید اس کے ساتھ اچانک کچھ ہوا تھا۔  
 میں ٹھٹھک سا گیا۔

”ہیلو غزالہ!..... کیا ہوا؟..... تم چپ کیوں.....“ ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ  
 مجھے دوسری طرف سے غزالہ کی اضطرابی چیخ نما آواز سنائی دی۔

کرنے کے لئے از خود اشفاق شاہین سے مل لینا چاہئے تھا۔  
 کوٹھی کے قریب پہنچ کر میں نے جیب روک دی اور نیچے اتر آیا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ یہ وہ چوکیدار تھا جسے کچھ روز قبل میں اور غزالہ رات کی تاریکی میں تختہ مشق بنا چکے تھے۔  
 ”اشفاق شاہین صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔  
 ”وہ تو اس وقت یہاں نہیں ہیں۔“ چوکیدار نے بغور میرا جائزہ لینے کے دوران کہا۔  
 ”کہاں جا سکتے ہیں وہ؟“ میں نے پوچھا۔  
 ”وہ ہمیں بتا کر نہیں جاتے۔“

”کیا میں اندر بیٹھ کر ان کا انتظار کر سکتا ہوں؟..... کب تک آ جائیں گے؟“ میں نے کسی خیال تحت کہا۔ چوکیدار ذرا تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔ ”میں ان کا دوست ہوں، پنڈی سے آیا ہوں۔ ملے بغیر تو میں نہیں جا سکتا۔“  
 ”تو پھر آپ کے پاس ان کا موبائل نمبر تو ہوگا۔ آپ ان سے.....“

میں نے دانستہ اس کی بات کاٹی۔ ”مگر یہ کام میں اندر بیٹھ کر ہی کروں گا۔ تاکہ انہیں بتا سکوں کہ میں اس وقت انہی کی رہائش گاہ میں ان کا منتظر ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر بولا۔ ”ظہور، میرا خیال ہے یہ کام مجھے ابھی کر لینا چاہئے۔“ یہ کہہ کر میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے خیال کے تحت اپنی جیب سے موبائل نکالا اور اشفاق شاہین سے رابطہ کیا۔ دوسری جانب ٹون جا رہی تھی۔ میرا دل یکبارگی کپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

”ہیلو..... کون؟“ معا دوسری جانب سے اشفاق شاہین کی کھردری آواز ابھری۔ میں نے اپنی بات ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جناب! میں..... نادر علی خان، اس وقت پھاگل سے سپدھا یہاں پہنچا ہوں اور آپ کی گلبرگ اب کبھی کے گیٹ پر کھڑا ہوں۔ آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔“

دوسری جانب ایکابی پُر سوچ خاموشی چھا گئی۔ میں نے شاید اسے تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر بتائوں گی پُر سوچ خاموشی کے بعد اشفاق شاہین نے سر دلچھے میں کہا۔

”تم اندر بیٹھو..... میں پہنچ رہا ہوں۔“

اس کے جواب پر میرا دل خوشی سے بلبوں اچھلنے لگا۔ اس نے مجھ سے خلاف توقع کوئی چھپتی ہوئی بات نہیں کی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ میں خود اس کے ہاں آن پہنچا تھا جو میری مکارانہ منصوبہ بندی کا پہلا نتیجہ تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے شاہین صاحب!..... لیکن آپ کا چوکیدار.....“ میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا بھرا تو اس نے مجھے موبائل چوکیدار کو دینے کا کہا۔ میں نے جھٹ سے اپنا موبائل چوکیدار کو پکڑا دیا۔

”تمی سر!..... بہت بہتر۔“ چوکیدار نے موبائل اپنے کان سے لگانے کے بعد یکدم مودبانہ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد مجھے موبائل پکڑاتے ہوئے بولا۔ ”آئیے جناب! تشریف لائیں۔“ اب وہ مودبانہ لہجہ تھا۔ میں بغلی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وہ مجھے اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں تین

لوہو موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ یوں اچھل پڑے جیسے انہیں بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر دوسرے ہی لمحے تینوں نے بڑی پھرتی کے ساتھ پستول نکال کر مجھ پر تان لئے۔ چوکیدار ہکا بکا

راہو گیا۔ مگر میں بے پرواانہ انداز میں چلتا ہوا صوفے پر براجمان ہو گیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کا

غفورے کی آواز اور اس کی دھمکی نے میرے پورے وجود کو عجیب کیفیت سے دوچار کر دیا۔ غیر متوقع طور پر اس کی آواز سن کر جہاں مجھے حیرت ہوئی تھی، وہیں اس کی دھمکی نے گویا میرے غیض و غضب کی بجلیاں دوڑا دی تھیں۔

موبائل پر گولی چلنے اور غزالہ کی ابھرنے والی آخری چیخ، پھر غفورے کی دھمکی سننے کے بعد میرے افسوس ناک حقیقت کا اندازہ لگا لینا چاہئے تھا کہ غزالہ غفورے کی بربریت کا نشانہ بن چکی تھی اور شیطان صفت اشفاق شاہین کے خلاف میرے عزائم پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔

غزالہ نے مجھے موبائل پر بتا دیا تھا کہ میری اصلیت اب اشفاق شاہین کے سامنے آشکارا ہو چکی ہے۔ ”پھاگل“ کے برف زار ویرانوں میں موت کے ہرکاروں کے ہاتھوں میں نے چوہدری ذیشان کی بجائی تھی، نہ صرف یہ بلکہ میں نے ان ساتوں کو ناکوں پنے بھی چبوائے تھے۔ وہ درحقیقت اشفاق شاہین کے ہی ”کار پرداز“ تھے۔ دونوں کی پرانی دشمنی کا سبب وہی تھا جو میرے اور اشفاق شاہین کے مابین یعنی اس کے شیطانی گروہ کا قلع قمع کرنا۔

میرا ذہن اب تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اب مجھے اشفاق شاہین سے جنگ لڑنی پڑے گی یا کسی مکاری کی گنجائش ابھی باقی تھی..... تب پھر اچانک جیسے میرے سامنے ایک جھماکا ہوا۔

اشفاق شاہین کو دوبارہ بے وقوف بنایا جا سکتا تھا۔ میں نے جب باریک بینی سے پیش آمدہ حالات جائزہ لیا تو بے اختیار میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

یہ حقیقت تھی کہ موجودہ حالات میں بیک وقت دو دشمنوں سے نبرد آزما ہونا فی الوقت میرے آسان نہ تھا۔ نظر حیات وغیرہ سے میری کھلی جنگ تھی تو اشفاق شاہین جیسے کینکسر کو میں اس کی جگہ میں بیٹھ کر مارنا چاہتا تھا اور وقت کا تقاضا تھا کہ میں بھیڑیوں کی صف میں کھس کر دوسری بار مکانات کام لوں۔

میں نے غیر ارادی طور پر رست و اوج میں وقت دیکھا اور جیب اشارت کی اور ایک جھٹکے سے بڑھا دی..... اب میرا رخ گرین لاج کی بجائے لاہور کی طرف تھا۔

\*\*\*

وہاں سے لاہور کم و بیش دو ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں تین سائے تین گھنٹوں کی تان اسٹاپ ڈرائیوگ کے بعد لاہور پہنچا اور سپدھا اشفاق شاہین گلبرگ والی کوٹھی کا رخ کیا۔

آئندہ کے غیر یقینی اور خطرناک انداز میں بدلنے والے حالات کو اپنے حق میں کرنے کے ضروری تھا کہ اس سے پہلے اشفاق شاہین کے خونی ہرکارے مجھ تک پہنچتے، مجھے اپنی بات کی چال



”وہ درحقیقت آپ ہی کے آدمی تھے۔“ میں نے جواباً کہنا شروع کیا۔ ”پھر اس دوران مجھے غزالہ ہوں۔ وہ موبائل پر گولی چلتے اور اس کی چیخ کی آواز سنائی دی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے یقیناً چھوٹ کر گر گیا۔ مگر پھر چند ثانیوں بعد ہی غفور کی آواز ابھری اور اس نے مجھے دھمکی دے کر موبائل آف کر دیا۔ میں نے سخت پریشان ہوا۔ غفور تو نہ جانے اپنی کون سی دشمنی مجھ سے نکال رہا ہے۔ مجھے اپنی صفائی بخشنا چاہیے۔ میں نے اس کا موقع نہ دیا۔ تب میں نے یہی بہتر سمجھا کہ مجھے خود ہی آپ سے ملاقات کر لینی چاہئے اور اس میں ادھر حاضر ہو گیا۔“

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور بھانپتی ہوئی نظروں سے اشفاق شاہین کے چہرے پر اپنی ”ادھورے چ“ کی اثر پذیری محسوس کرنے لگا۔

میری وضاحت سن کر اشفاق شاہین کے چہرے پر پُر سوچ تاثرات پھیل گئے تھے۔ پھر اس نے ہلے سے کھٹکار میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔  
”گویا غزالہ کے ساتھ تمہارا خفیہ رابطہ رہا ہے؟..... اس کی وجہ بتاؤ گے؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ ہماری دشمن بن چکی ہے۔“

میں نے دانستہ کھسیانی لہنی کے ساتھ کہا۔ ”سرجی! کیا کہوں..... شوقین مزاج ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ غفور نے کو مفت میں شکر مل گئی تھی۔“

”مگر وہ تو اس مزاج کی نہیں ہے۔“ اشفاق شاہین نے بہ غور مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔  
”میں اب کیا کہہ سکتا ہوں سر!“ میں نے گول مول سا جواب دیا تو اس نے اگلا سوال کیا۔  
”غزالہ کو یہ ساری باتیں کس نے بتائی تھیں کہ تمہارا نادانستگی میں ہی سہی، میرے آدمیوں سے ٹکراؤ ہو چکا ہے؟“

مجھے اس سے اس سوال کی توقع تھی لہذا بلا تامل بولا۔ ”اس نے اپنے ”سورسز“ کے بارے میں مجھے نہیں بتایا تھا۔ یا پھر شاید ممکن ہے، اسے غفور نے موقع ہی نہ دیا تھا اور اسے شوٹ کر ڈالا۔ حالانکہ غفور کو غزالہ سے اس سلسلے میں باز پرس کرنی چاہئے تھی۔“ میں نے آخر میں اسے اس کے مقرب خالص کے خلاف بھی اُکسایا۔

”ہوں..... وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔ بات واضح ہو جائے گی۔“ اشفاق شاہین نے ایک براتی ہوئی ہرکاری لیتے ہوئے کہا تو میں نے دانستہ ذرا شکوہ کرنے کے انداز میں اس سے کہا۔

”کیا میری وضاحت کافی نہیں ہے؟..... اگر غفور کو میرے سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے تو غرضاً خیال ہے، میری یہ تمہید کافی ہوئی چاہئے اور میں نے غفور سے ملاقات کرنے کی بجائے اس امید پر پہلے آپ سے ملاقات کر ڈالی کہ آپ اس سے زیادہ بہتر طور پر میری بات سمجھ پائیں گے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں، جب سے غفور کا بھائی غزالہ کے ہاتھوں قتل ہوا ہے، وہ اس کا ذمہ دار مجھے ہی سمجھتا ہے۔ اور اب مجھے مارگٹ بنانے پر ہر وقت تلا بیٹھا رہتا ہے۔“

”ہاں..... ٹھیک ہے۔ آئیے دوا سے۔“ اشفاق نے کہا۔ میں نے دیکھا وہ خاصا اُلجھ گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا غزالہ اب اس دنیا میں نہیں رہی.....؟“  
”پتہ نہیں۔“ اشفاق شاہین نے گول مول سا جواب دیا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ غالباً ابھی اس کے علم کی پوری بات نہ ہو اور غفور کی غزالہ کے فلیٹ پر شب خون مارنے کے بعد ابھی یہاں واپسی نہ ہوئی

منہ نکلنے لگے۔

”بیٹھ جاؤ آرام سے۔ میں نے اشفاق صاحب سے ابھی تھوڑی دیر پہلے بات کی ہے، وہ آئے والے ہیں۔“ میں نے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے ساٹ لہجے میں کہا۔

”تم ہمارے دشمن ہو..... کھڑے ہو جاؤ۔ ہمیں تمہاری اصلیت کا پتہ چل گیا ہے۔“ ایک نے بالآخر درشت لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں نے سرسراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پُر اعتماد لہجے میں ٹھکرنا گوارا سے کہا۔

”اعجاز عرف جاجو اور غفور کو میرے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے باس سے بات کر لی ہے۔ یقیناً نہیں آتا تو اس سے پوچھ لو۔“ میں نے آخر میں قریب کھڑے حیران پریشان چوکیدار کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ان تینوں سے کہا۔

”صاحب نے مجھ سے بھی بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے اسے یہاں بٹھانے کی اجازت دی ہے۔“ وہ تینوں چند ثانیے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک نے چوکیدار سے کہا۔ ”تم جاؤ۔“

چوکیدار اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔  
تینوں نے اپنے پستول جیب میں رکھ لئے اور میرے مقابل صوفے پر چونکنا انداز میں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اشفاق شاہین اپنے چند کارندوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ شعلہ بارہ رہا تھا۔ میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چند ثانیے کھڑا میری طرف شعلہ بار نظروں سے گھورتا رہا، اس کے ہاں سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا رکھا تھا۔

”بیٹھو.....“ اس نے گنیمت لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔  
”کیا معاملہ تھا؟..... مختصر آؤ۔“ مگر صرف ج۔ ورنہ اسی وقت تمہیں گولی مار کر تمہاری لاش گم دی جائے گی۔“ اس نے سرد اور سفاک لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر تھوڑے پریشان کن تاثرات لانا ضروری سمجھا اور بولا۔ ”سر! میں اپنے ذہن نظر حیات کے تعاقب میں پھاگل کے برف زاروں میں گیا تھا۔ غفور نے یقیناً آپ سے ذکر کیا کہ میری اس کے ساتھ پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے ہمراہ ایم این اے چوہدری ذیشان بھی تھا۔ دونوں برفانی لومڑیوں کے شکار پر گئے تھے۔ مجھے تو چوہدری ذیشان سے

سرکار نہ تھا مگر جب میں اپنے شکار پر حملہ کرنے وہاں پہنچا تو وہاں اچانک ہی گمنام مسلح افراد بھی پڑے جس کے باعث میں بھی چوہدری ذیشان اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں آ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ میرا شکار وہاں موجود نہ تھا لیکن چونکہ میں چوہدری ذیشان وغیرہ کی نظروں میں آ چکا تھا۔

لئے مجبوراً مجھے خود کو ایک عام شکاری کی حیثیت سے متعارف کرانا پڑا اور اس کی مدد کے لئے اس دشمنوں کے خلاف مجبوراً مجھے بھی میدان میں اترنا پڑا۔ لیکن سر!..... میں یہ نہیں جانتا کہ وہ آپ کے آدمی ہیں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا تو اور بات بھی مگر.....“

”تمہیں بعد میں کیسے پتہ چلا کہ وہ میرے ہی آدمی تھے؟“ اچانک اشفاق شاہین نے اپنی ہوتی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز رکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”غزالہ نے مجھ سے پہلے فون کر کے مطلع کیا تھا کہ میں جن لوگوں سے نادانستگی میں

دوئم  
تھا تھا کہ میں نے اور غزالہ نے ہی گٹھ جوڑ کر کے اس کے بھائی شوکی کو ہلاک کیا تھا۔ اس کا ناپاک وجود اب میری اور اشفاق شاہین کی ”دوستی“ میں دراڑ ڈال سکتا تھا۔  
اس دوران ماں نے مجھ سے موبائل پر رابطہ کر کے ”صورت حال“ کے بارے میں آگاہی چاہی تھی۔ میں نے انہیں سردست یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ میں ”گرین لاج“ پہنچ کر انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا۔

اب میں اس تذبذب میں مبتلا تھا کہ آیا مجھے اشفاق شاہین کے خطرناک گروہ کی بیخ کنی کے سلسلے میں چوہدری ذیشان سے روابط بڑھانے چاہئیں۔ اسی طرح میں اپنے طور پر اشفاق شاہین کے خلاف اپنی فحش کارروائی جاری رکھوں۔ اس کے علاوہ چوہدری ذیشان اور اشفاق شاہین کے گروہوں کے درمیان پھاگل کے برف زاروں میں ہونے والی معرکہ آرائی کے بعد یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ چوہدری اپنی بھرپور طاقت سے اشفاق شاہین پر جوابی وار کرتا اور اس کا کام تمام ہو جاتا۔ چوہدری ذیشان اشفاق کا کھلا دشمن تھا۔ جبکہ میں اس کی بنیادوں میں بیٹھ کر اسے کھوکھلا کرنا چاہتا تھا۔

میری پنڈی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ لاہور کی شہری حدود سے نکل کر میں جب موٹر وے پر آیا تو ایک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے موبائل نکالا۔ حسب عادت ڈسپلے پر کال کرنے والے کا نام دیکھا۔ مگر ڈسپلے پر نام اس کا آتا ہے جس کا نمبر پہلے سے محفوظ کیا جا چکا ہو۔ ابھی کال کا صرف نمبر ابھرتا ہے۔ بہر طور میں نے موبائل اپنے کان سے لگا دیا اور بلیو کیا۔  
”مستر نادر علی!..... تمہاری جان کو شدید خطرہ ہے۔“ موبائل کے اسپیکر کے ذریعے ایک مضطربانہ مردانہ آواز میرے کانوں میں آئی۔ ”تم کسی خوش فہمی کا شکار ہرگز نہ ہونا۔ غمخوار اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تمہارے تعاقب میں نکل چکا ہے۔“

”تم کون ہو.....؟“ میں نے سرسراہٹ آواز میں اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ میری رگوں میں خون کی بجائے گویا پھنکار تے ہوئے سانپ رینگنے لگے تھے۔  
”فضول سوال ہے۔“ دوسری جانب سے جواب آیا۔

”مگر اشفاق شاہین پر تو میں نے اپنی بے گناہی ثابت کر دی تھی۔“ میں نے بات آگے بڑھائی۔  
”ہاں..... اور تم سے زیادہ بعد میں غمخوار نے اشفاق شاہین کے سامنے تمہیں گناہ گار ثابت کر دیا۔“ استہزائیہ انداز میں جواب ملا۔ ”اشفاق شاہین اب تمہارے سلسلے میں ذرا بھی شبہ برداشت نہیں کر سکتا۔ تم خوش نصیب تھے کہ اشفاق شاہین کے تذبذب کا فائدہ اٹھا کر وہاں سے نکل آئے۔ اب اپنی فکر کرو۔ غمخوار موت کے فرشتے کی صورت تمہارے تعاقب میں نکل پڑا ہے۔“

”تم طارق ٹکلیل تو نہیں ہو؟“ بالآخر میں نے اپنے تئیں گمانا ہمدرد کے بارے میں ایک مختاط اندازہ لگاتے ہوئے کہا تو دوسری جانب سے اچانک گہری خاموشی چھا گئی۔ جو ظاہر کرتی تھی کہ میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ اس نمبر پر کال بیک کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے سردست طارق ٹکلیل کے نام پر یہ نمبر محفوظ کرتے ہوئے موبائل جیب میں رکھ لیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ وہی طارق ٹکلیل ہی ہو سکتا تھا جو بد نصیب غزالہ کا ہمدرد اور شاید سچا عاشق ہونے کا دعوے دار تھا۔ تاہم میں اب ایسا کی خطرناک حد تک بدلنے والی صورت حال کے بارے میں غور کرنے لگا۔ بالآخر اس مردود غمخوار نے میری چال ناکام بنا کر ہی چھوڑی تھی۔ میرے جانے کے

دوئم  
ہو۔ مگر میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر مردود غمخوار نے غزالہ کے قلیٹ پر کس وجہ سے شب خون مارا تھا؟..... پھر لاحالہ ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ غزالہ کے اس گروہ سے باغی ہونے کے بعد ممکن ہے، یہ لوگ اسے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں اور اب یہ غزالہ کی ایک انتقامی بدقسمتی تھی کہ غمخوار عین وقت پر.....!

اچانک دروازہ کھلا اور غمخوار اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ دندنا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کی حائل مارے طیش کے غضب ناک ہو رہی تھی۔ پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے دانت پیستے ہوئے مجھ سے چھانگ لگا دی۔ میں نے بھی اشفاق شاہین کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر اپنے فوری دفاع کے تحت ہرجائی کے ساتھ جگہ چھوڑی تو وہ کسی غیظ آلود ریچھ کی طرح میرے صوفے سے ٹکرا گیا۔ چنانچہ میں نے اس کے دماغ سے ہوا نکالنے کی غرض سے اس کی پشت پر ایک زوردار لات جمادی تو وہ صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے دونوں ساتھی دانت کچکپکاتے ہوئے میری طرف بڑھے تو اشفاق شاہین کی گویا دار کھمانہ آواز ابھری۔

”اسٹاپ.....!“

میری طرف بڑھتے ہوئے غمخوار کے دونوں ساتھی چابی ختم ہونے والے کھلونے کی طرح یکدم رک گئے۔ جبکہ غمخوارے کا مارے طیش کے ابھی تک برا حال ہو رہا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو چکا تھا اور شل بار نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ وہ کسی جنگلی ریچھ کی طرح بھجرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مگر اپنے باس کی ”تکھمانہ“ مداخلت پر اسے پھر دوبارہ مجھ پر جارحانہ پیش قدمی کی ہمت نہ ہو سکی۔

”بیٹھ جاؤ دونوں آرام سے۔“ اشفاق شاہین نے پاٹ دار آواز میں ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا۔  
میں اپنی جگہ پر براجمان ہو گیا۔ غمخوار ابھی تک مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتا اور پھنکارتا ہوا قہقہے صوفے پر جا دھنسا مگر بیٹھے ہی اس نے اشفاق شاہین سے کہا۔

”باس! میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ یہ سنپولیا ہے اور حرام زادی غزالہ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف.....“

”غزالہ کا کیا بننا؟“ معا اشفاق شاہین نے اس کی بات کاٹ دی۔

غمخوار نے اپنی بات نظر انداز ہوتے دیکھ کر منہ بسورا۔ پھر بڑی بے رحمی سے بولا۔ ”اس کتیا کوئی نے گولی مار دی۔ لاش گہرے کھڈ میں پھینک دی۔ مگر یہ..... حرام.....“

”خاموش!“ اشفاق شاہین کے لہجے میں ڈپٹ تھی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”نادر علی! تم؟ سکتے ہو۔“

اس کی بات پر میرا دل خوشی سے لمبوں اچھلنے لگا۔ اور پھر دیر سے سے اشفاق شاہین کو ”شکریہ“ کہنے ہوئے میں کمرے سے نکل گیا۔

گیٹ سے باہر آ کر میں اپنی جیب میں بیٹھا تو میرا دل اپنی اس چال پر بے حد مسرور ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر اشفاق شاہین جیسے بڑے ٹیکسٹر کو ذرا دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اگرچہ غمخوار بدستور میرا طرف سے بدکا ہوا تھا۔ ایسا غزالہ کے حوالے سے ہوا تھا۔ اس پر مستزاد عین آخری لمحات میں اس نے غزالہ کو مجھ سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اسے اس بے رحم نے گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ گویا کبیر کی بہن کے بعد اس کے ہاتھوں یہ دوسرا بے گناہ خون تھا۔ اور اب مجھ پر یہ لازم ہو گیا کہ غمخوارے کو میں ہلاک کر ڈالوں۔ یوں بھی وہ بد بخت میرا جانی دشمن بن گیا تھا اور اب تو اسے یقین



نہ گنبد سے وعدہ کر لیا تھا۔

دوسری جانب سے گنبد کی پڑمردہ آواز ایک دم خوشی کے بے پایاں احساس سے معمور ہو گئی۔

”نن! نادر! تہہ تہہ تم نے تم..... میرے پیار..... کو معاف کر دیا؟“

”گنبد! میں نے تو اس روز ہی انہیں معاف کر دیا تھا جس روز تم نے مجھ سے پہلی بار کہا تھا۔ لیکن

میں نے اسے پہلے کبھی میں نے تمہیں امید نہیں دلائی تھی۔ مگر اس بار میں تم سے اب یہ وعدہ کرتا

ہوں کہ میں ماں کو بھی سمجھا دوں گا۔“

گنبد کو خوش ہوتا محسوس کر کے میرے دل کو بھی قرار ملا تھا۔

”گنبد! تم بس خیریت کے ساتھ واپس لوٹ آؤ۔“ میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔

”میرے دل سے تم نے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا نادر!“ گنبد نے ایک تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

”گنبد! بس تم جلدی سے لوٹ آؤ۔ تمہارے بنا میں خود کو بالکل تنہا اور بے کار سا محسوس کرنے لگا

ہوں۔“ بے چین و مضطرب دل کی آواز میرے لبوں پر آ گئی تو گنبد کے لہجے میں تھوڑی مسرت آمیز شوخی

آئی۔

”تم اپنی ماں کو سمجھانے کا مجھ سے پہلے ہی وعدہ کر لیتے تو یہ جدائی تمہیں برداشت نہ کرنا پڑتی۔“

”پہلے حالات اور تھے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”تم کیا سمجھتے ہو نادر! میں بھی یہاں تم سے ہزاروں میل دور جدائی کو خوشی سے برداشت کر رہی

ہوں؟“

”مجھے اندازہ ہے۔“

”نادر! اب تمہارے وعدے کے بعد میں اپنے دل میں بوجھ لے کر نہیں بلکہ خوشی کے ایک بے

پایاں احساس کے ساتھ آؤں گی اور ضرور آؤں گی۔“

”یقیناً ایسا ہی ہو گا۔ مجھے تم پر اور تمہارے الفاظ دونوں پر یقین ہے۔ بس تم جلد از جلد واپس آنے کی

تاری کرو۔“ میں نے کہا اور چند رنگی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

ریسوررکھ کر میں پلانا تو چونک پڑا۔ گنبد سے باتیں کرنے کے دوران مجھے ماں کی عقب میں موجودگی

کا بالکل ہی احساس نہ رہا تھا۔ ماں خاموش مگر میری جانب مرکوز اپنی نگاہوں میں ہزاروں طوفان لئے

کھڑی تھیں۔

”گنبد! تم کس قسم کا وعدہ کر رہے تھے مجھے سمجھانے کا؟“ ماں نے سرسراتے لہجے میں مجھ سے

پوچھا تو میں بڑے رसान کے ساتھ چند قدم چلتا ہوا ماں کے قریب آیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے ماں کو

نہایت مکمل اور رसान سے بولا۔

”ماں!..... گنبد کو معاف کر دے۔“

”میری گنبد سے کب دشمنی ہے؟“ ماں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”گنبد کے باپ سے تو ہے۔“

”ماں!..... اور وہ کبھی ختم نہیں ہو گی۔“ ماں کا لہجہ اٹل تھا۔

”لیکن ماں! شاہ میرا ب زندہ لاش کی مثل بن چکا ہے۔“ میں نے کہا تو ماں نے چونک کر پوچھا۔

”کیا مطلب؟..... کیا وہ مردود ابھی زندہ ہے؟“

”ہاں ماں! لیکن گنبد نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب عمر بھر کے لئے معذور ہو چکا ہے۔ وہ صرف ہاتھ

نختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ انہیں اکیلا نہ چھوڑا جائے۔ کسی نہ کسی عزیز کی موجودگی ضروری ہے۔ سناؤ، آنٹی کیسی ہیں؟“

مجھے اصولاً اس کے باپ کی بھی خیریت کے بارے میں استفسار کر لینا چاہئے تھا۔ جھوٹے

سہمی۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن گنبد نے میری ماں کی خیریت پوچھ کر مجھے شرمندہ سا کر دیا تھا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر کیا تمہیں ریٹ کرنے کا وقت نہیں ملتا؟“ میں نے فکر مند لہجے میں پوچھ

”ریٹ ہی تو کرنی ہوں یہاں سارا دن۔“ اس نے اسی تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

”مگر گنبد!..... مجھے تو تم خود بھی بیماری محسوس ہو رہی ہو۔ پلیز گنبد! میری خاطر ہی سہی، اپنا فون

رکھا کرو۔“ میری آواز خود بہ خود بھاری ہونے لگی تھی۔ ”تمہارے پیار کی طبیعت کیسی ہے؟..... اب

کہتے ہیں ڈاکٹر؟“

”نور دوسر جنز نے دوبار ان کا آپریشن کیا تھا۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بتانے لگی۔ ”وہ اب کوئی

حالت سے نکل آئے ہیں..... مگر ڈاکٹر اس کا کہنا ہے کہ وہ..... وہ..... وہ.....“

اتہنائے دکھ سے اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔ فرط غم نے اسے جملہ مکمل نہ کرنے دیا اور وہ سر

پڑی۔ اس کی حالت کا تصور کر کے میرا دل کٹنے لگا۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اس کی کیفیت کیا تھی اور

یہ بھی سمجھتا تھا کہ یہ سارا کیا دھرا میرا اپنا ہے۔ میں نے ہی اس کے باپ کو اس حالت تک پہنچایا تھا۔

شاید اس کا مجرم تھا۔ مگر آفرین بھی اس پر کہ اس نے مجھ سے ایسا کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

میں نے غم سے بوجھل دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”نن!..... گنبد! پلیز، خود کو سنبھالو۔ تہہ

تم پھر کب لوٹ رہی ہو؟“

اس نے چند ثانیے خود کو سنبھالنے کے بعد دوبارہ بتانا شروع کیا۔ ”پیار کی حالت سنبھل تو گئی ہے۔

وہ ہوش میں بھی آچکے ہیں۔ م..... مگر وہ اب ساری عمر نہ کسی سے بات کر پائیں گے اور نہ ہی بچے

پھرنے کے قابل ہوں گے۔“

مجھے ایک جھکا سا لگا۔ عجیب سی چپ لگ گئی تھی مجھے۔

”تمہیں پیار کی زندگی بچ جانے کی خوشی تو نہیں ہو گی نادر!..... لیکن میں سمجھتی ہوں، تمہارے

تمہاری ماں کے جذبہ انتقام کو تسکین تو ہوئی ہو گی۔“ مجھے اچانک خاموش پا کر گنبد نے ہولے سے کہا۔

مجھے اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ سی محسوس ہوئی تھی۔ میرا اندر جھلکنے ہونے لگا۔ تاہم میں نے پوچھا۔

”کب تک لوٹ رہی ہو؟“

”ایک ہفتے بعد پیار کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ اس کے دو تین روز بعد میں لوٹ آؤں گی۔“ اس نے

دھیرے سے بتایا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ اچانک بولی۔

”نادر! ایک بات پوچھوں؟..... برا تو نہیں سناؤ گے؟“

”پوچھو۔“

”کیا تمہاری ماں اب ایک ایسے انسان کو معاف نہیں کر سکتیں جو پہلے ہی زندہ لاش بن چکا ہو؟“

گنبد کی بات پر میں سن ہو کر رہ گیا۔ مگر پھر جانے کیا ہوا کہ میں نے دوسرے ہی لمحے منجم لہجے

کہا۔ ”ہاں، ضرور..... میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ تم ان کی اب بالکل فکر نہ کرو۔ ہاں

ماں کو اب تمہارے پیار کی دشمنی بھلانا ہو گی۔ میں..... میں اس کا تم سے وعدہ کرتا ہوں۔“

ایک ایک جانے کہاں سے میرے اندر اتنی ہمت آ گئی اور میں نے ماں سے بات کئے یا وعدہ لئے

پاؤں ہلانے سے ہی نہیں، زبان ہلانے تک سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو چکا ہے۔“ میں نے بتایا۔  
غور ماں کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔  
ماں چند ثانیوں کے لئے چپ سی کھڑی رہیں۔

”ماں! اپنے بیٹے کی خاطر سہی، شاہ میر کو اب معاف کر دو۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں، اسے اب میرے بھی بدتر سزا مل چکی ہے۔“ میں نے آخر میں ماں سے امید بھرے لہجے میں کہا۔  
میری بات سن کر ماں نے ایک عجیب سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی۔ اس کے بعد آہستگی سے میرے دونوں ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹائے اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں اس جانب پلٹا، ماں کو صوفے پر بیٹھنے کی گہری سوچ میں مستغرق پا کر دوبارہ خوش امید سے ان کی جانب بڑھا۔ پھر قالین پر ان کے قدموں سے جا لگا اور بے اختیار اپنا سر ان کے زانوں پر رکھ دیا۔ تیرا جانے مجھے کیا ہوا کہ میں ابدیدہ ہو گیا۔ میں شاید اس لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا۔ مگر نہ کہاں سے مجھ میں وہ طاقت آگئی کہ میں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ چند لمحے یوں گئے۔ پھر میں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

”ماں! اب نگینہ کے سلسلے میں اپنی دشمنی کا یہ خونیں باب ہمیشہ کے لئے بند کر دے۔“ نہ جانے ہوئے بھی میری آواز رندھی ہوئی تھی۔ ”شاہ میر کو اب اپنے کئے کی سزا مل چکی ہے۔ وہ زندہ لاش ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے سر اٹھا کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا، مجھے ان کے چہرے پر یہ دستور نظر آئی۔

”ماں! تُو خود بتا۔۔۔۔۔ لگ۔ کیا اب ایک زندہ لاش سے انتقام لینا بہادری ہوگی؟  
دیکھ، میری بات مان لے۔۔۔۔۔ اپنے بیٹے۔۔۔۔۔ اپنے نادر کا مان رکھ لے۔ م۔۔۔۔۔ میں نے نگینہ سے اس کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔“

ماں نے ایک خاموش مگر گہری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی پھر آہستگی کے ساتھ صوفے سے اٹھ کر ہوئی اور اس کے بعد مجھ سے کچھ کہے بغیر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی خاموشی کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میں یک تک ماں کو جاتے دیکھنے لگا۔ میں چند عابثیہ گم صم سارہا، مگر میرے دل کو پھر بھی قرار نہ ملا اور میرے قدم از خود ماں کے کمرے کی طرف اٹھتے چلے گئے۔

ماں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں آہستگی سے آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ کر اچانک ٹھک کر رک گیا۔ میری نگاہ ماں کی پشت پر جمی ہوئی تھی۔ ان کا رخ دوسری طرف تھا اور چہرہ ان کے سامنے دیوار پر آویزاں میرے باپ قادر خان کی تصویر پر اٹھا ہوا تھا۔ تب میری سماعتوں نے انتہائی کرب و رقت میں ڈوبی ہوئی مرتعش آواز سنی۔ ماں، میرے باپ کی تصویر سے مخاطب تھیں۔

”قادر خان!۔۔۔۔۔ میرا بیٹا میرے لئے سخت آزمائش بنا ہوا ہے۔ لیکن وہ تیرا بھی خون ہے۔ میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بیٹے نادر نے تیرے دونوں خونی قاتلوں کی نیندیں حرام کرنے میں نہیں اٹھا رکھی ہے اور آج شاہ میر موت سے بدتر زندہ لاش کی صورت میں اور نظر حیات اعصابی بن چکا ہے۔ مگر قادر خان!۔۔۔۔۔ آج ہمارا بیٹا نادر ہم سے کچھ مانگ رہا ہے۔۔۔۔۔ اسے دشمن سے پیار ہو چکا ہے۔ مگر دیکھ، میں اس کی گواہ ہوں کہ ہمارے نادر نے پھر بھی اپنے دشمن شاہ میر کو نہیں کیا۔ میں سمجھتی ہوں، اس نے شاہ میر کی حد تک انتقام لے لیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نگینہ سے نفرت ہو جاتی۔ لیکن قادر خان! میں سمجھتی ہوں کہ نگینہ کو بھی ہمارے نادر علی سے سچی محبت ہے۔

ماں نے میری خاطر، یا پھر اپنی اور میرے باپ کی محبت کی خاطر بالآخر میری بات مان لی تھی۔ میں صوفے سے بھولے ایسے سارہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر نگینہ کے پاس امریکہ جا پہنچوں۔ اسے یہ انوکھی خوش خبری سنا دوں۔ میرا دل بالکل بچوں کی طرح خوش ہو کر جھل جھل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ نگینہ سے دوبارہ فون پر رابطہ کر کے اسے یہ خوش خبری سنا ڈالوں، لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے ارادہ سے ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔



بدل لیا کہ اب نگین کو یہ خوش خبری اس کی امریکہ سے واپسی پر تجھے کی صورت میں دوں گا۔  
اب میری طرف توجہ نظر حیات اور اشفاق شاہین پر مرکوز تھی۔

نظر حیات کے ساتھ میں اب دوسری بار وہی موت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا جو میں پھاگل اور کمرے میں اس کے ساتھ کھیل چکا تھا۔ اس بار میں نے اس کی رہائش گاہ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا۔ دوسری طرف اشفاق شاہین بھی کھل کر میرے خلاف میدان میں اتر آیا تھا۔ اس نے غور سے سفاف درندے کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ تاہم میرے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال ابھر رہا تھا کہ یہ ذیشان نے اس کے خلاف اب تک کیا کارروائی کی ہے؟ اگرچہ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اشفاق شاہین کے آدمیوں کی ہے۔ میں یہ جاننے کے لئے بے چین تھا۔

اگلے روز ٹال پر روزمرہ کے امور نمٹانے کے بعد میں نے چوہدری ذیشان سے موبائل پر رابطہ کیا۔ ”ہیلو.....“ دوسری جانب سے چوہدری ذیشان کی لمبیہ آواز ابھری۔

”ارے نادر میاں! ابھی کیسے ہو تم؟..... کہاں ہو؟“ دوسری جانب سے ان کی شفیق آواز آئی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور اس وقت اپنے مری والے ٹال میں ہوں..... آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہی ہوں..... ڈاکٹروں نے پورے دو ماہ کے مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔ اب بھگت رہا ہوں۔“

”چوہدری صاحب! آپ نے ان نامعلوم حملہ آوروں کے خلاف اب تک کوئی کارروائی کی؟“ نے دانستہ ابھی اسے اشفاق شاہین کے متعلق نہیں بتایا تھا۔

”پولیس کارروائی کر رہی ہے۔ رپورٹ تو درج ہو چکی ہے۔“ انہوں نے گول مول سا جواب میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”آپ کو تو معلوم ہو گا کہ آپ پر یہ قاتلانہ حملہ کروانے والا کون ہو سکتا ہے؟“

”ارے نادر میاں! جہاں ہم لوگوں کے دوست بے شمار ہوتے ہیں، وہیں دشمن بھی ہوتے۔ کسی دل جلے نے اپنی بھڑاس نکال لی ہوگی۔“ ان کے جواب دینے کے انداز سے صاف ہوتا تھا کہ وہ سب جانتے ہیں مگر بتانے سے کتر اگئے تھے۔

”میاں! تم تو بالکل ہی غائب ہو گئے۔“ ان کی گفتگو جاری تھی۔ ”تم نے میری جان بچا کر احسان کیا ہے..... اور میں بھی کیسا بد نصیب اور مجبور ہوں کہ تمہارے احسان کا شکریہ ادا کر سکوں۔“

”لیکن میرے بچے! تم سے ملنے کو، تمہارا شکریہ ادا کرنے کو بہت بے تاب ہوں۔ تم اپنے گھر بتا دو۔ ہم تم سے اور تمہارے والدین سے ملنے کو بے چین ہیں جنہوں نے تم جیسے بہادر اور دلیر جہنم دیا۔“

”چوہدری صاحب.....“ میں نے کچھ کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولے۔

”ارے یار! یہ چوہدری کے تکلفات چھوڑو..... کیا تم مجھے بالکل نہیں کہہ سکتے؟“

”سوری..... میرا مطلب ہے بالکل! کہ آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔ اور میں نے آپ بالکل نہیں کیا۔ یہ تو میرا انسانیت کے ناتے فرض تھا۔“

”اچھا تو پھر تم خود ہی آ جاؤ..... کہو تو گاڑی بھیج دوں؟“ وہ فوراً بولے۔

”یہیں بالکل! شکریہ..... بالکل ضرورت نہیں۔ میں کسی وقت آ جاؤں گا۔ لیکن آپ کو اپنے دشمن سے الحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے آخر میں کہا۔ ”بالکل! ایک بات ہو؟“

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟“

”ارے مجھے پوچھو!..... بھلا تم سے کیسی ناراضگی؟“ وہ فراخ دلی سے بولے۔

”بالکل! تجھڑی سی جھارت کروں گا۔ مجھے لگتا ہے آپ اپنے نامعلوم دشمن کو اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”میں جانتا نہیں چاہتے۔“

”دوسری جانب انہیں لمبے بھر کی پُرسوج چپ لگ گئی۔ پھر ہلکا سا قہقہہ مار کر بولے۔

”میاں! تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن بھی ہو..... دراصل یار! بات یہ ہے کہ میں ابھی رافتی یہ جان نہیں پایا ہوں کہ آخر یہ میرے کس دشمن کی حرکت ہے۔ جو مجرم گرفتار ہوئے ہیں وہ بھی بے کچھ نہیں اگلتے۔“

”بالکل!..... اگر میں آپ کے دشمن کا نام بتا دوں تو؟“ میں نے اچانک کہا تو دوسری طرف سناٹا مچا۔ پھر ان کی قدرے اٹکتی ہوئی آواز ابھری۔ ”تک..... کیا..... مطلب؟“

”آپ اشفاق شاہین کو جانتے ہیں؟“ میں نے جیسے دھماکا کیا تو دوسری جانب سے فوراً ہی ان کی جوش آواز ابھری۔

”نہیں..... تم کیسے جانتے ہو اسے؟“

”ہاں اتفاق سمجھ لیں۔“ میں نے گول مول سا جواب دیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے مستحکم لہجے میں بولا۔

”تم..... تم کیسے جانتے ہو اس خبیث شیطان کو؟..... آخر تم بتاتے کیوں نہیں؟“

”بالکل! کبھی آپ سے ملاقات ہوئی تو تفصیل بتا دوں گا۔ لیکن میں آپ کو پہلے ہی محتاط کر رہا ہوں۔

بایک با اختیار انسان ہیں اور ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے اگر آپ کسی کے خلاف کوئی موثر کارروائی کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو دیر نہیں کرنی چاہئے۔“

”دوسری جانب سے ان کے گہرا سانس لینے کی آواز ابھری۔ پھر وہ پُرسکون لہجے میں بولے۔

”مجھے یہ بات پہلے ہی سے معلوم ہے..... مگر..... مجھے یہ بھی اعتراف کرنا پڑ رہا ہے، میرا یہ طاقتور بھی ہے اور با اثر بھی۔ اور میں اسے اپنی گرفت میں لینے کے لئے بہت عرصے سے لگا ہوا۔“

”مگر تمہیں ثبوت حاصل کرنے سے ہنوز قاصر ہی ہوں۔ لیکن اب تم نے مجھے یہ بتا کر میرے شبے کو یقینیت دے دی ہے۔ میں ان گرفتار مجرموں کے منہ سے اگلوں کی اب پوری کوشش کروں گا۔“

”میں یہی چاہتا تھا بالکل! کہ آپ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی توجہ دشمن پر مرکوز رکھیں۔“ میں نے کہا۔

”یار! تم بھی تو میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟“ انہوں نے آخر میں کہا۔

”میں یہی کچھ کر سکتا تھا جو میں نے آپ کو بتایا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں.....“ انہوں نے پُرسوج انداز میں ہنکارا بھرا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولے۔ ”تم اس لگا لے دھندے سے واقف بھی ہو گے؟“

”یقیناً.....“ میں نے مختصر جواب دیا۔ پھر کسی خیال کے تحت بولا۔ ”ویسے مجھے حیرت ہے کہ وہ کس قدر طاقتور تھا۔“

”لیکن آج تک کسی کے کانوں میں اس کی بھنک بھی نہیں پڑ سکی اور

میں ملبوس، مسلح ڈھانے پوش افراد صاف نظر آ گئے۔ مزدور خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر چاچھے۔  
میں خون آتش فشاں سے بچتے لاوے کی طرح گردش کرنے لگا۔ ہائی روف پک اپ کو اندر  
بھیج دیا۔ میں نے اپنی جیب سے نہایت بھرتی کے ساتھ اپنا میگا رنکال لیا۔

ہائی روف پک اپ کا رخ سیدھا میرے آفس روم کی طرف تھا۔ گیٹ پر متعین میرے گارڈز پر  
میں کی بوچھاڑ کرنے کے بعد یقیناً ان کا نشانہ میں ہی تھا۔ چنانچہ میں نے بھرتی کے ساتھ اپنی جگہ  
پر حرکت کی اور ہائی روف پک اپ کو اپنے آفس کے عین سامنے رکتے دیکھا۔ میں نے جیسے ہی صوفوں  
کا بلب جست لگائی تھی، میرے عقب میں گولیوں کا بھیاںک برست فضا میں ٹکھڑا چلا گیا۔ تو اتر کے  
اچھڑتی ہوئی گولیوں نے میرے آفس کے گلاس ڈور کو کچی کچی کر کے ٹکھیر دیا۔ اور پھر زٹ

زٹ زٹ کی سنسناتی آوازوں سے گولیاں دیواروں پر میری خالی ریوالونگ جیپز پر اور ٹیبل پر بکھری  
آئیں، گولیوں کے ساتھ کھد بڑی، ادھیڑنی چلی گئیں۔ البتہ آفس کی جنوبی دیوار جدر میں ایک بڑے  
پارٹنگ صوفے کی آڑ لے ہوئے تھا وہ اب تک محفوظ رہا تھا۔ لیکن یہ جگہ بھی زیادہ دیر تک محفوظ نہیں  
رہی تھی۔ اس وقت میرے پورے وجود میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی اور سنسنی گولیوں سے لہو مثل پارا کی

ات گردش کر رہا تھا۔ اپنے دفاع میں جو بھی کرنا تھا، فوری طور پر کرنے کا متقاضی تھا۔ موت کے  
ارے مجھے ایک بل کا بھی موقع دئے بغیر موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے بری طرح بے چین تھے۔  
اچانک دھواں دھار فائرنگ بند ہو گئی۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں نے ذرا سراسر ابھارا  
ب سے پہلے دو عدد مسلح ڈھانا پوشوں کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے بھرتی سے اپنے میگا رنک  
ان کی طرف کیا اور اوپر تلے دو فائر بھونک مارے۔ دونوں کراہت انگیز چیخ مار کر گر پڑے۔

”وہ حرامی اندر ہے۔“ باہر سے ایک چلائی آواز ابھری جسے سن کر میری کنپٹیاں سنسنے لگیں۔ یہ  
ارغورے کی تھی۔ میں نے بھرتی کے ساتھ ایک ڈھانا پوش کی لاش کے قریب پڑی، سب مشین گن  
ہاں۔ میں بھرتی کے ساتھ پلٹا تو گولیوں کی بوچھاڑ آن پڑی۔ ایک ہی جگہ محسوس رہنا موت کو از خود  
تدینے کے مترادف تھا۔ حملہ آوروں کے فاسٹ ایکشن سے عیاں تھا کہ انہوں نے مجھے موت کے  
ات اتارنے کا بہت کم سے کم وقت متعین کر رکھا تھا۔ چنانچہ میں نے بہ سرعت اپنا میگا رنک جیب میں  
لا اور سب مشین گن سنبھال لی۔

میری جوابی فائرنگ پر حملہ آوروں کو دوبارہ اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میں نے جنوبی دیوار کی  
کھڑکی سے ذرا سر ابھار کر دیکھا تو چار پانچ مسلح ڈھانا پوش گیٹ سنبھالتے ہوئے دائیں بائیں ہو کر  
میرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جبکہ باقی دو ہائی روف پک اپ کے دائیں بائیں گرد و پوش پر نظر  
ثبوتے تھے۔ میں نے ان پانچوں کی طرف جیسے ہی اپنی گن کا رخ کیا وہ فوراً زمین پر گر پڑے۔

سنے بھی اس وقت لمبی دبا دی۔ گولیوں کی بھیاںک ترترتاہٹ کے درمیان دو حملہ آوروں کی کربہہ انگیز  
ب اٹھریں۔ باقی قیدیوں نے زمین پر گرتے ہوئے مجھ پر اپنی گنوں کے دھانے کھول دیئے۔ مگر میں  
کی آتشیں پیاس بجھانے کے فوراً بعد نیچے جھک گیا تھا۔ اچانک میری نگاہ سامنے بائیں جانب کی  
ن پڑی اور اگر میں بل کے پل نیچے نہ جھک جاتا تو ایک مسلح ڈھانے پوش کے چلائے ہوئے  
ٹ سے میری کھوپڑی پھلتی ہو جاتی۔ گولیوں کی وحشتانہ باڑ نہ کھڑکی کے شیشوں کو جھٹکا چور کر دیا تھا۔

اس سے ہی لمحے اس ڈھانا پوش نے غیر معمولی بھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی کے ساتھ کھڑکی سے ذرا  
ب آ کر ایک بار پھر مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ میں صوفے کے عقب میں رینگ گیا لیکن جانتا

نہ ہی اس کے خلاف کوئی موثر انداز میں قانونی کارروائی ہو سکی ہے۔“

”ہاں..... اس لئے کہ اشفاق شاہین کوئی معمولی مجرم نہیں۔ وہ زیر زمین دنیا کا بہت بڑا  
ہے۔ اور با اثر بھی۔ اس نے درحقیقت انڈورلٹ فلم مانی کے بطن سے جنم لیا ہے اور پھر تیزی سے  
اور چند مقتدر سیاسی حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بناتا چلا گیا۔ یہی سبب ہے کہ میں اب تک اس کے  
کوئی فاسٹ ایکشن نہیں لے سکا ہوں۔ مگر مجھے تو اب تمہاری فکر ستانے لگی ہے..... کیا اشفاق  
کو معلوم ہے کہ تم اس کی اصلیت سے واقف ہو؟“

”جی ہاں۔“ میں نے مختصر اثبات میں جواب دیا۔

”اوہ..... مانی گاڈا! دوسری جانب سے چوہدری ذیشان کی آواز اچانک ہی پرتشوش ہو گئی۔  
”تو..... تو پھر تم بھی کوئی معمولی شخصیت نہیں ہو سکتے۔ تم ایسا کرو، مجھ سے فوراً کسی وقت آکر  
بیٹا! تم میرے محسن ہو..... اور مجھے اب تم اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو چکے ہو۔ مجھے تمہاری حفاظت  
سلسلے میں بھی کچھ کرنا پڑے گا۔“

”میری حفاظت کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔“ میں نے مضبوط اور پُر اعتماد لہجے میں کہا۔  
شاہین جیسے شیطان میرا بال تک بیک نہیں کر سکتے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے اسے مکمل ڈالنی آتی  
”اچھا.....“ انہوں نے گہری سانس لی۔ پھر بے تابی سے بولے۔ ”پھر کب آرہے ہو؟“  
”نی الحال تو کچھ نہیں کہہ سکتا..... مگر جلد آنے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے کہا۔ پھر انہو  
مجھ سے وعدہ لیا۔ اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

چوہدری ذیشان جیسے باختیار سیاسی شخصیت کو کبھی میں نے اشفاق شاہین سے خائف سا ہوا  
تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اشفاق شاہین کی پشت پناہی کوئی بڑی شخصیت ہی کر رہی تھی۔ جس کے  
چوہدری ذیشان بھی دم مارنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔

غفور نے میری راہ پر لگ کر گویا اپنی موت کو دعوت دے ڈالی تھی۔ مگر بزدل دشمن سے  
خطرہ تو رہتا ہی ہے۔ کیونکہ ایسے دشمن پیٹھ پیچھے وار کرتے ہیں۔ میں اب دوسرے خطوط پر غور کر  
تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ان دونوں با اثر اور طاقت ور دشمنوں نظر حیات اور شاہ میر کے  
کیا تھا۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ گئے تھے مگر میں نے ان دونوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اور  
اشفاق شاہین جیسے شیطان ناسور بن کر ملک و قوم کی نئی نسل کو تیزی کے ساتھ ذہنی اور جسمانی  
مفلوج کر رہے تھے۔ اور انفسوس ناک بات یہ تھی کہ باختیار افراد اس کے خلاف کارروائی کر  
عاجز تھے۔ قانون بھی اشفاق شاہین جیسے ناسور کا علاج نہ کر پایا تھا۔ مگر ایسے مجرموں کا علاج  
میرے پاس تھا۔ اور زہر کو زہر سے مارنا تھا۔ چونکہ میں اشفاق شاہین کے گھناؤنے کاروبار سے  
چکا تھا اس لئے اب اسے میں گمنامی کی موت مارنا چاہتا تھا جس طرح وہ اب تک دوسرے بے گناہ  
بے دردی کے ساتھ قتل کرتا آیا تھا جس میں اداکارہ پننا، اس کی بہن غزالہ بھی شامل تھی۔

مجھے غزالہ کی موت پر بھی دکھ ہوا تھا..... اس کی موت سے متعلق اخبار میں مختصری خبر  
تھی اور بس۔

ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیاںک ترترتاہٹ ابھری۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ پھر ابھی  
کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک ہائی روف پک اپ نال کے گیٹ سے تیزی کے ساتھ  
ہوئی۔ اس کے سلائیڈنگ ڈور کھلے ہوئے تھے۔ مجھے اس کے اندر موجود سات آٹھ افراد

میں نے بیک دیو مر میں دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لی۔ یہ پولیس موبائل تھی جو ہوائی رفتار سے میرے تعاقب میں ہولناک سائرن بجاتی ہوئی آرہی تھی اور ساتھ ہی اپنی ہیڈ لائٹس کو چلا کر مجھے رکسنے کا اشارہ بھی کر رہی تھی۔ ناچار میں نے جیب کی رفتار بتدریج کم کر دی اور بالآخر سڑک کے کنارے روک دی۔ پولیس موبائل تیزی کے ساتھ سائرن بجاتی ہوئی میرے قریب آن رکی۔ میں نے سوچ آف کرنے کے بعد نیچے اتر آیا۔ میں نے موبائل گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن سے اسٹیکر شس کو دیکھا اور ساتھ ہی موبائل کے پچھلے حصے سے چند مسلح پولیس والے بھی چھلانگیں لگاتے اتر پڑے۔ اسٹیکر شس کو دیکھ کر مجھے تھوڑی سی پریشانی ہوئی۔ وہ میری طرف معاندانہ نظروں سے گھورتا ہوا آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر درشت لہجے میں بولا۔

”یہ کیا خون خرابہ پھیلا کر آئے ہو تم اپنے ٹال پر؟“

مجھے اس کا لہجہ ناگوار گزرا اور میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ”یہ خون خرابہ میں نے نہیں بلکہ میرے دشمنوں نے کیا تھا۔“

”تم ہاں بیٹوں کا تو پورا شہر ہی دشمن بنا ہوا ہے۔ ہے نا.....؟“ اس نے دانت پیس کر استہزاء سے لہجے میں کہا۔

میں اس کے طعنیہ اور کاٹ دار لہجے میں چھپی کینہ پروری کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ کیونکہ یہ شاہ برادر نظر حیات کی زرخیز کالی بھینٹ تھی۔

”چلو..... موبائل میں بیٹھو۔ تمہیں تھانے چلنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے..... میں اپنی جیب میں چلوں گا۔“ میں نے بھی رکھائی سے کہا تو وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر اس نے اپنے دو پولیس والوں کو میرے ساتھ میری جیب میں سوار ہونے کا کہا۔

میں جیب میں بیٹھا تو ایک پولیس والا میرے برابر کی نشست پر اور دوسرا عقبی نشست کی طرف چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جیب اشارت کی، یوٹرن لیا اور واپس ہو لیا۔ پولیس موبائل میرے عقب لگی۔

جیب چلانے کے دوران میں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور چوہدری ذیشان سے رابطہ کیا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ نیز دو پولیس والوں کی موجودگی کے باعث میں نے اشتقاقی نشان اور بالخصوص غفور کے کا نام لینے سے گریز کیا تھا۔ تاہم میں نے چوہدری ذیشان کو اشاروں کنایوں میں ساری باتیں سمجھا دیں۔

”یہ بہت برا ہو۔ مگر تم بالکل فکر مت کرو۔ میں ابھی متعلقہ ایس پی سے بات کر لیتا ہوں۔“ انہوں نے تسلی کی دی۔ ”ویسے تم ٹھیک تو ہونا بیٹا؟“ ان کے لہجے میں شفقت تھی۔

”جی اٹھل! اللہ کا شکر ہے۔ میں اس قاتلانہ حملے سے بال بال بچا ہوں۔“

”اوکے..... میں ابھی آئی جی سے بھی بات کرتا ہوں اور اسپیشل پولیس ٹیم بھجواتا ہوں۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ اور ہاں، تمہارے ساتھ جو پولیس والا بیٹھا ہے اپنا موبائل ذرا آگے سے دینا۔“

”جی اچھا۔“ میں نے یہ کہہ کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے پولیس والے کی طرف دیکھا اور اپنا موبائل اس طرف بڑھاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

”لو..... بات کرو۔ ایم این اے چوہدری ذیشان صاحب بات کریں گے۔“

چوہدری صاحب کا نام سن کر پولیس والا ایک دم مرعوب سا نظر آنے لگا۔ پھر میرے ہاتھ سے موبائل

تھا کہ یہ صوفہ بل بھر میں گولیوں سے چھلنی ہو کر جالی بن جائے گا اور پھر میں بھی نہ بچ سکوں گا۔ تیزی کے ساتھ اپنی پوزیشن بدلی۔ کھڑکی کی طرف گن کا رخ کرتے ہی لہجی دبا دی۔ میری آنکھیں قہقہہ آگیا۔ جرأت مندانہ انداز دکھانے والا وہ حملہ آور آواز تک نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ میری جوانی فائرنگ نے اب باقی مسلح حملہ آوروں کی پیش قدمی جام کر کے رکھوا دی۔ تاہم اپنے ٹال کے احاطے سے بے دخل اور جوانی کا رروائی کو بدستور برقرار رکھنا تھا۔

”واپس چلو..... جلدی!“

دفعۃً ہی چلائی ہوئی غفورے کی آواز ابھری۔ میں نے پھرتی سے مگر نہایت احتیاط کے ساتھ سمٹ کی کھڑکی سے ذرا جھانکا تو مجھے باقی ماندہ حملہ آور، ہائی روف پک اپ میں تیزی کے ساتھ ہوتے نظر آئے۔ چونکہ ان سب نے چہروں پر ڈھانپے باندھے ہوئے تھے اس لئے میں غفورے کو پایا تھا۔ ہائی روف پک اپ اشارت ہو کر تیزی کے ساتھ ریورس ہوتی ہوئی گیٹ سے باہر نکلی جاتی تھی۔ میں بھی پھرتی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر گولی کی طرح اپنے قریب کھڑکی کی طرف بڑھا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ پھر چشم زدن میں اسے اشارت کر کے تیزی سے بیک کرتا ہوا گیٹ سے کھلی سڑک پر آگیا۔ اور پھر ہائی روف پک اپ تیزی سے دوڑتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے بے سرعت گیر بلا اور ایکسپلیٹر دبا دیا۔ جیب غرائی ہوئی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ جاتی ہوئی ہائی روٹ پک اپ کے تعاقب میں دوڑنے لگی۔ فائرنگ کے باعث راہ گیر اور دیگر گاڑیوں کے لوگ سہم کر محفوظ جگہوں میں جا دبکے تھے..... ہر سے مصروف نظر آنے والی سڑک بل بل ویران ہو گئی تھی۔

میں پوری رفتار کے ساتھ جیب دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یوں ان غورو آوروں کے تعاقب میں نکل پڑنا دانش مندانہ قدم تھا یا نہیں۔ مگر یہ بھی درست تھا کہ اس وقت میرا وجود کسی آتش فشاں کی طرح دھک رہا تھا۔ میرے دماغ میں انگارے سلگ رہے تھے اور دشمنوں کو گھٹا اتارنے کا جنون سر پر سوار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ ایک تو غفورے کی آواز پہچان کر مجھے معلوم ہو چکا تھا، مجھ پر یوں اچانک قاتلانہ حملہ کرنے والوں کا تعلق اشتقاقی شاہین کے آدمیوں سے دوسرے یہ کہ ان میں مردود غفورا بھی شامل تھا اور میں اسے کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں جیب کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا جا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ ہائی روف پک اپ سوار حملہ آور میرے تعاقب کا علم ہو گیا ہو..... مگر انہوں نے گاڑی روکی نہیں تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اپنے ہی کو تعاقب میں آتا دیکھ کر چاہتے بھی یہی ہوں کہ کسی دوسرے ویران مقام تک پہنچنے کے بعد مجھ کو ڈالنے کی کوشش کریں۔ تاہم میں بھی اتنا تر توال نہ تھا۔ تعاقب جاری تھا۔ لالہ زار سے بائیں مڑنے والی بل کھائی سڑک صوبہ کے گھنے لائے پیڑوں کے درمیان جاتی ہوئی نظر آئی تو میں نے کی ہائی روف پک اپ کو اسی سمت کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔ پھر جب میں مذکورہ چوراہے پر بائیں جانب مڑنے والی سڑک کی بجائے تیزی کے ساتھ آگے نکلتا چلا گیا۔ ایسا میں نے دانت درحقیقت میں جانتا تھا کہ لالہ زار سے بائیں طرف مڑنے والی سڑک آگے جا کر تقریباً تین فاصلہ طے کرنے کے بعد سیدھی موڑ وے سے جا کر ملتی تھی۔ یہ وہی سڑک تھی جس پر میں نے آگے کے آدمیوں کنگل خان وغیرہ کا تعاقب کیا تھا۔ مگر اس بار میں دوسری سمت پر تھا۔ لیکن ابھی میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ عقب سے مجھے پولیس سائرن کی چیٹی چانی



لے کر کان سے لگا لیا اور مودبانہ بولا۔

”جی سر!..... محکم کریں۔“

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سنتا رہا، اس کے بعد شاید دوسری طرف سے چوہدری ذیشان نے انپکٹر اجازت بخش جس کا موبائل نمبر پوچھا تھا کیونکہ وہ پولیس والا انہیں یہ کہہ کر موبائل نمبر بتانے لگا۔

”جی سر!..... انپکٹر صاحب کا موبائل نمبر مجھے معلوم ہے۔ نوٹ کریں۔“

نمبر نوٹ کروانے کے بعد پولیس والے نے موبائل مجھے لوٹا دیا۔

میں نے کان سے لگایا تو دوسری جانب چوہدری صاحب لائن پر موجود تھے۔

”ہاں بیٹا!..... میں ابھی انپکٹر اجازت بخش سے بھی بات کر لیتا ہوں..... ٹھیک ہے۔“

اوکے خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر موبائل اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اب میں مطمئن تھا۔

\*\*\*

چوہدری ذیشان کے سچ میں پڑنے سے میری حد تک معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ورنہ انپکٹر اجازت بخش تو پہلے ہی ”اندر“ پہنچانے کے بارے میں پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ میرا تعلقات اتنے وسیع بھی ہو سکتے ہیں۔

بہر طور..... اسے مجھے جھوٹا ہی پڑا۔ معمولی سی ضابطے کی کارروائی اس نے ضرور نمٹائی تھی۔ اب جی صاحب کے حکم پر ایس پی ظہیر قریشی صاحب اسپیشل پولیس ٹیم کے ہمراہ خود قوسے کا جائزہ لینے آئے پہنچے تھے۔

میرے ہاتھوں دو حملہ آور مارے جا چکے تھے جبکہ تیسرا زخمی حالت میں مزدوروں نے پکڑ لیا تھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ مگر مجھے رہ رہ کر یہ خیال بھی فکر مند کرتا تھا کہ اسپیشل ٹیم کی کارروائی سے اشتقاق شاہین اور بالخصوص غفورا پولیس کی گرفت میں آ گیا تو معاملہ الٹا میرے گلے بھی پڑ سکتا تھا۔

کیونکہ یہ بات میرے دشمن شاہ میر اور نظر حیات (مگر اب صرف نظر حیات) بھی جانتے تھے کہ صدف مرڈر کیس میں غفورے کی گرفتاری کس قدر اہم تھی اور نظر حیات انپکٹر اجازت بخش کو غفورے کی تلاش کے سلسلے میں پیسوں کے زور پر الٹ رکھے تھا۔ کیونکہ نظر حیات کی بیٹی صدف مرڈر کیس میں، غفورے کو اب میری ماں کو بھائی پر چڑھانے کا باعث بن سکتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ غفورے نے مجھے بھی ملک

خان کا قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں غفورے کا پولیس کی گرفت میں آنا ہم دونوں ماں بیٹیوں کے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ ادھر غفورے کی بھی میرے خلاف چیرہ دستیایں بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ اشتقاق شاہین کے دیگر آدمی بھی پولیس کی گرفت میں آ چکے تھے اور ان سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کوئی، اشتقاق شاہین یا غفورے کے سلسلے میں زبان کھول سکتا تھا۔ چنانچہ کم از کم غفورے کو اب میرے لئے جلد سے جلد ٹھکانے لگانا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یوں بھی وہ کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل بن چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے غفورے کو جلد از جلد اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانے کا

کر لیا تھا۔ مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے سے ماں اور انکل اعظم خان خاصے پریشان ہو گئے تھے۔ مگر میں انہیں نہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن کون تھے۔ پھر چوہدری ذیشان جیسی بھاری بھر کم شخصیت نے مجھے

پولیس کی انجمنوں سے بچایا تھا اس پر دونوں کو خاصی حیرت ہوئی تھی کہ میرے بھلا چوہدری صاحب کی طرح تعلقات پیدا ہو گئے تھے؟ تاہم میں نے دشمنوں کے سلسلے میں بدستور یہی ظاہر کیا کہ وہ ہامعوم تھے۔ مگر ماں اور انکل اعظم خان کا خیال تھا کہ یہ حرکت پچاگل والی مہم کا رد عمل ہو سکتی ہے۔ مجھے یقیناً نظر حیات وغیرہ کا ہاتھ تھا۔ ”جھوٹ“ سے مجھے یہ پریشانی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ماں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ میں نظر حیات کا کاٹنا اب نکال ہی دوں۔ یوں میں نے جو نظر حیات کے خلاف ”اعصابی جنگ“ شروع کر رکھی تھی وہ متاثر ہونے لگی تھی۔ تاہم مجھے ماں سے یہ جھوٹ بات کہ یہ حرکت غفورے کے آدمیوں کی تھی جو ہمارے لئے خطرہ بننا جا رہا تھا۔

اس ضمن میں ماں سے میں نے یہی کہا تھا کہ تھوڑے دنوں پہلے ہی غفورے نے مجھ سے ایک خفیہ بات کی تھی اور مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہا تھا کہ اگر میں نے اسے ماہانہ پچاس ہزار کی رقم باقاعدگی سے دینی کہ تو وہ پولیس کو صدف مرڈر کیس اور ملک سردار خان کے قتل کے سلسلے میں وعدہ معاف گواہ بن کر ہمارے گاہ اور اس سلسلے میں نظر حیات نے اس کی بھرپور مدد کرنے کا بھی وعدہ کر رکھا ہے وغیرہ۔

غفورے کے ذکر پر ماں بھی پریشان سی ہو گئی تھی۔ مجھ پر قاتلانہ حملے کی خبر اخبارات میں بھی شہ زلزلے سے نائج ہوئی تھیں۔ کاشانہ بھی مجھ سے ملنے آئی۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ حرکت رب نواز کی ہو سکتی ہے۔ تاہم اس نے یہ بھی کہا تھا کہ گزشتہ دنوں ٹرکوں کی چوری والے کیس کے بعد سے اس کے میرے خلاف متوقع رد عمل کے باعث اس نے رب نواز پر کڑی نگاہ رکھنی شروع کر رکھی ہے۔ میں نے کاشانہ کو تسلی دی تھی کہ سر دست اس کے غبارے سے ہوا نکل چکی ہے اور اب وہ رہے خلاف کسی ”مہم جوتی“ کی جرات نہیں کر سکتا۔ اعظم خان نے البتہ ہم ماں بیٹے کی سکیورٹی پر زور دیا تھا کہ شروع کر دیا تھا اور مجھے کچھ عرصے کے لئے ٹال پر جانے سے منع کیا تھا۔ مگر میں نہیں مانتا تھا۔ میں اب بھی باقاعدگی سے ٹال پر جاتا تھا۔

یہ ظاہر حالات معمول پر آ گئے تھے۔ مگر مجھے اشتقاق شاہین اور غفورے کی طرف سے بدستور دھڑکا لگا تھا۔ اس وقت یہ مسئلہ ”برٹنگ پوائنٹ“ پر تھا۔ باقی دشمنوں کو میں نے سر دست نکیل ڈال رکھی تھی۔

سکیورٹی کے سلسلے میں البتہ میں نے ماں کی حفاظت کے پیش نظر گرین لاج میں مسلح گارڈز کی تعداد بڑھا دی تھی۔ میں نے اب اشتقاق شاہین اور بالخصوص غفورے والے معاملے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا اور سر دست غفورے کو میں نے ٹارگٹ بنالیا تھا۔ جو ملزمان گرفتار ہوئے تھے ان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ کسی وقت بھی دھماکا خیز انکشافات کی توقع تھی۔

چوہدری ذیشان بھی اپنا پورا زور لگا رہے تھے۔

ایک روز میں گرین لاج سے ٹال پر جانے کے لئے جیب میں سوار ہونے لگا تو اچانک مجھے چوہدری ذیشان کی کال موصول ہوئی۔

”اندر بیٹا!..... ایک زبردست خوش خبری ہے تمہارے لئے۔“ ان کا لہجہ پُر مسرت تھا۔ مگر میرا دل ”خوش خبری“ پر ایک متوقع اور پُر تشویش خیال سے دھڑکنے لگا۔

”کی..... کیا خوش خبری ہے؟“ میں نے بہ مشکل اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”دونوں طرف کے ملزمان نے زبان کھول دی۔ اب یہ مردود اشتقاق شاہین نہیں بچ سکتا۔“ چوہدری ذیشان نے دھماکا کیا۔ مجھے غفورے کی طرف سے زیادہ پریشانی ستانے لگی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر

انہیں پھرتے ہوئے پوچھا۔

”اچھا..... یہ تو بڑی زبردست خوش خبری سنائی ہے آپ نے..... تو پھر اس کے خلاف پولیس کارروائی ہوئی؟“

”ایسٹبل پولیس ٹیم نے اشفاق شاہین کی لاہور میں گھبرگ والی کوشی پر چھاپہ مارا ہے۔“

”اور میرا دل جیسے کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔“

”مگر اس بد بخت کو شاید پہلے ہی سے علم ہو گیا تھا۔ وہ اپنے چند قریبی ساتھیوں سمیت روپوش ہے۔“ وہ پرجوش لہجے میں بتانے لگے۔ ”مگر وہ اب بچ کر نہیں جاسکتے..... ان کے خلاف بہت مضبوط نیٹ ورک بنایا ہے۔ اس کے گرفتار شدہ ساتھیوں سے مزید پوچھ گچھ جاری ہے۔“

”انکل!..... کیا ایسٹبل پولیس ٹیم کو چھاپے کے دوران کوئی ثبوت ملے ہیں؟“ میں نے ہر دل کے ساتھ پوچھا۔

”گھبرگ والی کوشی سے تو کچھ نہیں ملا۔ البتہ دو دیگر اڈوں پر چھاپے کے دوران کچھ آہدہ باختہ عورتوں اور مردوں کو گرفتار کیا ہے۔ وہاں سے بڑے سسٹنی خیز ثبوت ملے ہیں۔“ باقی تفصیل آج کے لیے کر پڑھ لو۔“ انہوں نے آخر میں کہا۔

”تھینک یو انکل!.....“ آپ نے مجھے ایک بہت بڑی خوش خبری سنائی۔“ میں خوش ہو کر انہوں نے آخر میں توصیفی انداز میں کہا۔

”نادر بیٹے! یہ سب تمہاری بہادری اور ذہانت کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ شاید ہم کبھی اشفاق جیسے بڑے گینگسٹر کو نہیں چھاپ سکتے تھے۔“

”نہیں، اس میں آپ کی بھی ذاتی دلچسپی اور نیک جذباتوں کا دخل ہے۔“ میں نے کسر نفسی کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے لیے یہ ایک بڑی خوش خبری تھی کہ بالآخر اشفاق شاہین کے خلاف موثر انداز میں کارروایاں شروع ہو چکی تھیں۔ یقیناً کئی اہم ثبوت بھی ہاتھ لگے ہوں گے۔ اگرچہ وہ روپوش ہو گیا تھا، تاہم اس اتنا فائدہ تو ضرور ہوا تھا کہ کالا دھندہ بند ہو چکا تھا۔

میں ٹال پر پہنچا تو فیبر مشتاق کو اپنے آفس روم میں اخبار کھولے اور اپنے گال پیٹتے ہوئے پایا۔

”توبہ..... توبہ..... کیسے کہیں لوگ ہمارے سماج میں پیدا ہونے لگے ہیں۔“

وہ اخبار پڑھ رہا تھا اور ایک ہاتھ کانوں کو لگائے، بڑبڑائے جا رہا تھا۔ میں نے جلدی کر کے ہاتھ سے اخبار جھپٹا اور اپنی چیز پر بیٹھ کر اشفاق شاہین کے متعلق خبر پڑھنے لگا۔

شہر سرنیوں میں خبریں پھیلی تھیں۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ انڈر ورلڈ فلم مافیا کے چیف اشفاق شاہین کے خلاف ایسٹبل پولیس نے کارروائی کے دوران اس کی گھبرگ والی کوشی اور دو دیگر خفیہ اڈوں پر چھاپہ مارا تھا۔ کوشی سے تو کچھ برآمد نہیں ہوا تھا البتہ اس کے دو اڈوں سے آہدہ باختہ عورتیں اور مرد لے کر لائے گئے تھے اور وہاں سے ویڈیو کیمرہ اور فلم میکنگ کے دیگر لوازمات کے علاوہ قابل اعتراض سی ڈیز پولیس کے ہاتھ لگی تھیں جس سے یہ گھناؤنی حقیقت سامنے آئی کہ اشفاق شاہین کا گروہ قریباً

اعترافِ فلیس بنانے کا گھناؤنا کاروبار کرتا تھا۔ مزید سسٹنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

خبر کے علاوہ ایک جموٹے سے جو کچھ میں اشفاق شاہین کے دست راست غفور سے کو بھی ہائی ہینڈ کیا گیا تھا۔ بالخصوص اس خبر نے مجھے بری طرح چونکا کر رکھ دیا تھا۔ میں اس خبر کو بھی بغور پڑھنے غفور سے کے سلسلے میں یہ انکشافات تھے کہ وہ اداکارہ سہنا کے قتل میں بھی ملوث تھا۔ بلکہ غفور

میں کی جوں سال بیٹی صدف کا بھی قاتل تھا۔ علاوہ ازیں ملک سردار خان کے قتل کا چشم دید گواہ بھی تھا۔ گرفتار شدہ ملزمان سے بھی مزید پوچھ گچھ جاری ہے۔ ایک دوسرے جو کچھ میں لکھا تھا کہ اشفاق شاہین کو متوقع قانونی حراست سے بچانے اور اس کی نکل از گرفتاری ضمانت کے لئے بعض بااثر شخصیت

خانہ حرکت میں آچکی ہیں۔ غفور سے متعلقہ خبر نے مجھے ایک بار پھر متشکر کر دیا۔ میرے چہرے پر طاری غیر متوقع پریشانی کے جذبات دیکھ کر میرے سامنے بیٹھا فیبر مشتاق جانے کیا سمجھ کر بولا۔

”سری! آپ کو مردود اشفاق شاہین کے گروہ کی گرفتاری پر کوئی خوشی نہیں ہوئی، جی کڑا کے، سر!“

میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سا گیا۔ ”کیا مطلب؟“

”مم..... مم..... مطلب..... کلک..... کچھ نہیں..... سر!..... جی کڑا کے۔“ وہ

تھرا کر بولا۔

اچانک میں نے اپنے آفس کے گلاس ڈور سے ایک پولیس جپ تیزی سے اندر داخل ہوتے دیکھی۔

میں چونک سا گیا۔ پھر جپ سے جب میں نے دو پولیس والوں کے ساتھ انسپکٹر اعجاز شمس کو بھی نیچے اترتے دیکھا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ تاہم میں یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ گزشتہ دنوں مجھ پر

فاتانہ حملے کے واقعے کے سلسلے میں کچھ ضروری پوچھناچھ کی ”باقیات“ نمٹانے آیا ہے۔

وہ سیدھا میرے آفس روم کی طرف بڑھا۔ میں نے فیبر مشتاق کو وہاں سے جانے کو کہا۔ انسپکٹر شمس اندر داخل ہوا۔ اس کے عقب میں وہ دونوں پولیس والے بھی اندر داخل ہو گئے۔ میں نے بہ غور انسپکٹر

شمس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ مجھے اس کے چہرے پر گہرے معاندانہ جوش کے تاثرات محسوس ہوئے۔

میں نے طوعاً و کرہاً کھڑے ہو کر جبراً مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور مصافحہ کرنے کے بعد اسے بیٹھے کا کہا۔ باقی دو پولیس والے بھی دائیں بائیں کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

”جی!.....“ میں نے استفسار طلب لہجے میں اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا

”نادر صاحب! میرے سوال کا جواب آپ ذرا سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح یاد کر کے دیجئے گا۔ کیونکہ آپ کا جھوٹ یا بھول پن ہمارے شعبے کو ثقوبت دینے کا باعث بن سکتا ہے۔“

میں اس کے اس عجیب و غریب پوچھنے کے انداز پر ذرا پریشان سا ہوا تاہم دوسرے ہی لمحے پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ”جی!..... پوچھئے۔ کیا پوچھنا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“

وہ ہولے سے کھٹکھٹا کر اور میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ کر بولا۔ ”آپ پر کئے گئے قاتلانہ حملے

سے چند روز پہلے اشفاق شاہین آپ سے ملنے یہاں آیا تھا؟“

اس کی بات پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ مجھے اس کا فوری طور پر سوچ کر جواب دینا تھا جو میری

علاقہ مندی کا امتحان بھی تھا۔

”کیا مطلب؟“

”میں نے بالکل سلیس اردو میں آپ سے پوچھا ہے نادر صاحب! کہ اشفاق شاہین گزشتہ دنوں

یہاں آپ کے ٹال پر آپ سے ملاقات کرنے آیا تھا؟“

میں نے ایک ایک لفظ چبا کر اور پورے مستحکم لہجے میں اپنا سوال دہرایا تو میرے تیزی سے کام

رستے ہوئے ذہن نے فوری طور پر اس کے لہجے کی مضبوطی اور چہرے پر طاری متوقع فاتحانہ جوش کی

سرخی کو بجانب کر یہ یقینی اندازہ قائم کر لیا تھا کہ چند دنوں پہلے اشفاق شاہین کی یہاں آمد سے متعلق کے ہاتھ کوئی ٹھوس ثبوت لگ چکا تھا اس لئے میرا جھوٹ بولنا مجھے کمزور اور اسے مضبوط بنا سکتا تھا۔ میں نے یہ ظاہر بے پردہ انداز میں اسے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے یہاں وہ کسی کاروباری سلسلے میں آیا ہو۔ اوپن اسپاٹ ہے..... لکڑیوں کے کارخانے وغیرہ دینے کے لئے یہاں لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔“

”ہوں..... ٹھیک کہا آپ نے۔“ میری بات پر اس نے اسرار بھرے لہجے میں ایک گہری ہنسی خارج کرتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ نے اشفاق شاہین کو اس سے قبل دیکھا تھا؟..... یا آپ اسے پہچانتے تھے؟“

نے اگلا سوال داغا۔ اس کے طرزِ مخاطب سے اعتماد کی جھلک صاف محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ایسا لگا جیسے میرے خلاف ایک گہری سازش کے تحت ہی مجھ پر جال ڈالنے کی غرض سے آیا تھا اور اس کے یقیناً کوئی ٹھوس وجہ تھی۔ نیز وہ اس کی پہلے سے بھرپور تیاری بھی کر کے آیا تھا۔ البتہ میں اس کے سوال پر کچھ الجھ سا گیا تھا کہ میں اسے نوری طور پر کیا جواب دیتا؟ مجھ سے جواب نہ بن پڑا تو میں اٹا اس سے چھپتے ہوئے لہجے میں سوال کر ڈالا۔

”انسپکٹر!..... آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟..... ذرا کھل کر بات کریں۔“

اس کی بھانپت ہوئی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”میں نے بات واضح کر دی ہے۔ پھر وضاحت کرنا ہوں۔ آپ کے اشفاق شاہین سے خفیہ گفتگو رہے ہیں؟“ بالآخر اس نے کہا۔

”یہ جھوٹ ہے..... میں تو اسے جانتا تک نہیں ہوں۔ اور نہ ہی کبھی ملا ہوں اس سے۔“ مجھے غصہ آگیا۔ انسپکٹر اعجاز شمس میرے تیز لہجے سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ اس کے بجائے اس کے ہونٹوں زہریلی مسکراہٹ اور آنکھوں سے بلا کے اعتماد کی جھلک نمایاں تھی۔ کم بخت کا یہی پُر اعتماد لہجہ مجھ سے پریشان کئے دے رہا تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنی شرٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

”اسے کھول کر دیکھئے..... کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟“ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ اس بار اس نے شمس کی آنکھوں میں تندی عود کر آئی تھی۔

میں نے لفافے کی طرف دیکھا۔ پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اسے اٹایا اور اس کے اندر سے چارہ پوسٹ کارڈ سازش کی تصویریں برآمد ہوئیں۔ میں نے ان پر نظر ڈالی اور میرے نفس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ پورا وجود بری طرح سائیں سائیں کرنے لگا۔ حواس مختل سے ہونے لگے اور ہاتھوں سے جان نکلتی ہوئی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے انسپکٹر شمس کی طرف دیکھا۔

اس کے ہونٹوں پر بڑی اسرار بھری مسکراہٹ تھی جیسے وہ میری کیفیات سے اندر ہی اندر حفاظ ہو۔ پھر سرسراتے لہجے میں بولا۔

”کیوں نادر صاحب!..... یہ ثبوت کافی ہے؟“

میں نے بے اختیار اپنے خشک پڑتے لبوں پر زبان پھیری اور ایک بار پھر تصویروں پر نگاہ ڈالی۔ چاروں تصویروں میں مختلف زاویوں سے میری اور اشفاق شاہین کی ملاقاتوں کا منظر دکھایا گیا تھا۔ تصویریں تو وہ تھیں جن میں پہلی ملاقات میری، اشفاق شاہین کی لاہور میں گلبرگ والی کوٹھی میں ہوئی تھی۔

دہری تصویر میری جیب کی تھی جو اس کی کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ جبکہ آخری اور چوتھی تصویر وہی جب گزشتہ دنوں اشفاق شاہین بہ نفس نفیس خود اپنی کار میں مجھ سے ملنے ٹال پر آیا تھا۔

یہ تصویریں کب اور کس نے اتاری تھیں، یہ سوچنا بعد کا کام تھا۔ مگر یہ وقت سامنے خطرناک ارادوں اور تہیوں کے ساتھ بیٹھے انسپکٹر اعجاز شمس کو اس کا جواب دینے کا تھا۔ چنانچہ میں پل کے پل اپنی بدلتی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے فوراً اپنے ذہن کو بروئے کار لایا اور بے پرواہی سے مسکرا کر بولا۔

”میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ ممکن ہے میری اس شخص سے کاروباری ڈیلنگ ہوتی رہی ہو۔ اب جبکہ آپ نے یہ تصویریں دکھائیں تو مجھے یاد آگیا ہے کہ اس شخص نے اپنی لاہور گلبرگ والی کوٹھی میں لکڑی کا کچھ کام کروانا تھا۔ اس کے لئے لکڑی درکار تھی۔ پھر جب میں نے آج کا اخبار پڑھا تو اس کی تصویر دیکھ کر میں بھی یقیناً چونکا تھا۔“

میں نے دیکھا میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ تھوڑی دیر قبل اس کے چہرے سے جو بلا کے اعتماد اور فتح مندی کے آثار مترشح تھے وہ اب ماند ہونے لگے تھے جس سے مجھے خود اندازہ ہوا تھا کہ میرا جواب برعکس ہی نہیں بلکہ بہت مناسب اور چچا تلا تھا جس کے باعث اب میرا اعتماد بھی بحال ہونے لگا تھا۔

”ہوں۔“ اس نے میری طرف گھورتی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک طویل ہنکاری لی۔ وہ بے بس ناظر آنے لگا۔ مگر بدستور اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہوئے بولا۔

”میں یہ چاروں تصویریں انسپکٹر پولیس ٹیم کے آفسر اور ایس بی ظہیر قریشی کو بھیجوں گا۔ اس کے ساتھ تمہارے خلاف اپنے ریمارکس بھی۔ اور دوبارہ میں تمہاری گرفتاری کے وارنٹ کے ساتھ آؤں گا۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ اگر تم مجھ سے تعاون کرنے پر تیار ہو تو میں بالائی بالا تمہارے تعاون سے ان دونوں مفروضات مان اشفاق شاہین اور غفور کے کی تلاش میں انسپکٹر پولیس پارٹی کی مدد کروں گا۔ اس طرح میرا یہ فائدہ ہو گا کہ میری رکی ہوئی پروموشن بھی جلد ہو جائے گی۔“

اس نے اپنے پروموشن والے جس ”فائدے“ کا ذکر کیا تھا وہ فائدہ نہیں بلکہ ایک دیرینہ سازش تھی اور میرے دشمن نظر حیات کے ساتھ اس کے خفیہ گٹھ جوڑ کی سازش کا طوق تھا جو وہ میرے گلے میں فٹ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ بڑے شوق سے یہ تصاویر جن کے حوالے کرنا چاہیں کر دیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ رہی بات آپ سے تعاون کر کے آپ کا پروموشن بڑھانے کی تو اس کا خیر کے لئے مجھ سے جو ہو گا میں کرنے کے لئے تیار ہوں..... اور ہاں.....“ میں نے آخر میں اس کے چہرے سے شکا ہوئی بے اعتمادی پر ایک اور کاری ضرب لگاتے ہوئے مزید کہا۔

”اشفاق شاہین کے گروہ کے خلاف جو کارروائی ہوئی ہے وہ میری ہی نشاندہی پر کی گئی ہے۔ اور یہ یہ کہ یہ بات بھی آف دی ریکارڈ ہے۔“

میری اس بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کی آنکھوں سے الجھن آمیز تاثرات نمایاں ہوئے۔ میں نے آخر میں پوچھا۔ ”بائی داوے، میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ تصاویر آپ کو کس ذات شریف نے بنائی تھیں؟ ممکن ہے وہی اشفاق شاہین کا ساتھی بھی ہو اور مجھے اس دشمنی کی بنا پر پھنسانا چاہتا ہو۔“

اس نے اس سے اس لئے کی تاک کہ وہ سمجھ سکے کہ میرے پاس بھی اپنے دفاع اور صفائی میں کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

”یہ کاغذ بے نفع ہے۔“ اس نے مختصر کہا۔ میرے ہونٹوں پر استہزاء کی مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”ویسے ایک بات تو ڈن ہے۔“ وہ آخر میں بولا۔ ”کہ اشفاق شاہن نہیں تو کم از کم غفور ہے۔“  
 گرفتاری تم اور تمہاری مظلوم ماں کبھی نہیں چاہیں گے، اس لئے کہ یہ بات صرف میں ہی جانتا ہوں۔  
 صدف اور ملک سردار خان مرڈر کیس میں غفور ایک اہم گواہ ہے اور تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتا دوں  
 کہ میری اس وقت ساری توجہ غفور کے گرفتار کرنے پر مرکوز ہو چکی ہے۔ اوکے.....“  
 یہ کہہ کر اس نے میز پر رکھی تصاویر اٹھا کر لفافے میں ڈالیں اور اپنے دونوں سپاہیوں کے ساتھ واپس  
 لوٹ گیا۔

وہ خبیث جاتے جاتے غفور کے سلسلے میں مجھے ایک گھبر پریشانی میں مبتلا کر گیا تھا۔ غفور کے  
 اہمیت کا اسے بھی خوب اندازہ تھا اور نظر حیات نے اپنی بیٹی صدف کے قتل میں جو الزام میری ماں اور مجھ  
 پر تھوپ رکھا تھا، انپیکٹر شخص انہی خطوط پر اپنی ”مہم“ جاری رکھے ہوئے تھا۔ گویا اندر ہی اندر نظر حیات  
 میرے اور میری ماں کے خلاف گہری سازش تیار کرنے میں مصروف تھا۔  
 وہ شاید اب اپنے حلیف شاہ میر کے زندہ لاش میں تبدیل ہو جانے کے بعد ہمارے خلاف ”مارا  
 ماری“ کا میدان ترک کر کے انپیکٹر شخص کے ساتھ ساز باز میں لگا ہوا تھا۔ یوں دونوں کی توجہ اب غفور  
 کی جلد یا بدیر گرفتاری پر مرکوز تھی۔ یہ ہمارے لئے ایک تشویش ناک امر تھا۔  
 رہی بات ان چار پوسٹ کارڈ تصاویر کی، جن میں میری اور اشفاق شاہن کی ملاقاتوں کو دکھایا گیا  
 تھا۔ یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی؟..... اس بارے میں مجھے خاصا غور و فکر کرنا تھا۔ اگرچہ اس بارے  
 میں انپیکٹر اعجاز شخص کو میں نے مدلل جواب سے نواز دیا تھا مگر پھر بھی میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم چوہدری  
 ذیشان کو اس سلسلے میں پہلے سے آگاہ کر دوں تاکہ کبھی انپیکٹر شخص ان تصاویر کو میرے خلاف ہتھیار بنا کر  
 استعمال نہ کر سکے۔

اس وقت چوہدری ذیشان ہی وہ واحد شخصیت تھی جو مجھے مکمل طور پر قانونی اور دیگر مسائل میں میرا تحفظ  
 کر رہی تھی۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے چوہدری ذیشان سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک میرا  
 موبائل گنگنایا۔ میں نے موبائل نکایا۔ کال انکل اعظم خان کی تھی۔ میں نے فوراً کان سے لگا کر بیلو کیا۔  
 ”جی انکل!..... میں نادر بول رہا ہوں۔ خیریت تو ہے؟“  
 دوسری جانب سے انکل اعظم خان کی تشویش ناک آواز ابھری۔ ”تم نے کچھ سنا؟“ ان کی آواز میں  
 کچھ ایسی بات تھی کہ میرے بدن میں چوہنیاں سی ریگنے لگیں۔  
 ”نن..... نہیں..... کیا ہوا انکل؟..... خیریت تو ہے نا؟“ مجھ پر یکایک ہی بے چینی کی  
 طاری ہونے لگی تھی۔

”ایم این اے..... چوہدری ذیشان کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔“  
 دوسری طرف سے انکل اعظم خان نے بتایا۔ اور میں جیسے سن ہو کر رہ گیا.....!

چوہدری ذیشان کی اس طرح ہلاکت کی خبر میرے لئے سراسر غیر متوقع تھی۔ اس اچانک اطلاع  
 نے میری سوچنے سمجھنے کی، کچھ بولنے تک کی صلاحیتیں گویا سلب کر لی تھیں۔ ریسپور میرے کان سے لگا  
 ہوا اس میں سے اعظم خان کی آواز ابھر رہی تھی مگر میری سماعت تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ یہ خبر ہی ایسی تھی  
 کہ مضبوط سے مضبوط اعصاب رکھنے والا شخص بھی اس کے صدمے سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ چوہدری  
 ذیشان میرے دشمن کے خلاف میرا بہت بڑا پشت پناہ تھا۔ اس کا اس طرح مارا جانا میرے لئے مشکلات  
 برصا ب پیدا کر سکتا تھا۔ میں نہ جانے کتنی دیر اس صدمے کی کیفیت میں رہا۔ پھر انکل اعظم کی ہیلو بیلو  
 نے مجھے گویا جھجھوڑ کر اس حالت سے باہر نکالا۔  
 ”ہیلو نادر!.....“ وہ دوسری طرف سے پوچھ رہے تھے۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟..... تم میری آواز سن  
 رہے ہو؟“

”جی..... جی.....“ میں نے ایک گہرا سانس لے کر انہیں جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“  
 ”تمہاری اس طویل اور پراسرار خاموشی نے مجھے تشویش میں ڈال دیا ہے..... کیا بات ہے؟ تم  
 کو کچھ تو نہیں رہے؟“ ان کے لہجے میں تشویش کے ساتھ ساتھ تادیب کا عنصر بھی موجود تھا۔  
 ”آپ نے خبر ہی ایسی سنائی ہے کہ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ چلے تھے۔“ میں نے چھینپی جھینپی سی  
 آواز میں جواب دیا۔ ”چوہدری ذیشان سے میرے نہایت قریبی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔“  
 ”میں سمجھتا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”مگر میں تمہیں اس قدر کمزور اعصاب کا مالک نہیں سمجھتا تھا۔ اس  
 نے مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ اصل معاملہ کیا ہے؟“  
 ”اس کے لئے ضروری ہے کہ میں آپ سے تفصیلی ملاقات کروں۔“ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر  
 بان بھیری مگر اس سے وہ ترنہ ہو سکے۔ کیونکہ میری زبان بھی خشک ہو رہی تھی۔  
 ”تو اس کے لئے انتظار کس بات کا ہے؟“ انہوں نے فوراً کہا۔ ”تم ابھی آ جاؤ۔ بلکہ ایسا کرو ابھی  
 کرے نہ نکلو۔ میں گاڑ بھیج رہا ہوں۔ اس کی ہمراہی میں میری طرف آ جاؤ۔“

”نہیں انکل! گاڑ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے کچھ سنے بغیر  
 رابطہ منقطع کر دیا۔ میں درحقیقت انکل اعظم کو نہ صرف انپیکٹر اعجاز شخص کے عزائم کے بارے میں آگاہ کرنا  
 چاہتا تھا۔ بلکہ میرا خیال تھا کہ اب مجھے ان سے اشفاق شاہن اور غفور کے مابین تعلق کی تفصیلی بات  
 فہم کرنی چاہئے تھی۔ غفور نے کی گرفتاری عین ممکن تھی۔ نیز مجھے اس بات کا بھی علم تھا کہ چوہدری  
 ذیشان کے اس اندوہناک قتل میں اشفاق شاہن اور غفور کے کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا اور اب شاید چوہدری  
 ذیشان کے بعد میں ان دونوں سفاک درندوں کی ہٹ اسٹ پر سب سے پہلے نمبر پر تھا۔ انہی سوچوں کے  
 نتیجے میں اٹھا اور اپنی جیب میں سوار ہو کر انکل اعظم خان کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔  
 ان کی رہائش گاہ میرے ٹال سے زیادہ دور نہ تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے میں، میں انکل اعظم خان کی  
 رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ہم دونوں نشست گاہ میں جا بیٹھے۔ میں نے اشفاق



شاہین سے لے کر ”پھاگل“ والے واقعے اور پھر انسپٹر اعجاز شمس سے متعلق سارے واقعات تفصیل سے ان کو سنا دیے۔

انگل اعظم خان نے بڑے غور سے میری باتیں سنی تھیں۔

”اس میں شک نہیں ہے کہ انسپٹر اعجاز شمس درپردہ نظر حیات کے ٹاسک پر کام کر رہا ہے۔ پہلے ہی سے ہمارے خلاف ہائر کر لیا گیا ہے۔“ انگل اعظم خان نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ انسپٹر شمس جیسی بھیڑیوں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس لئے تم اپنی طرف سے اس غیبت موع نہ دینا۔ البتہ اشفاق شاہین اور غفورے کا معاملہ خصا تشویش ناک ہے۔ اس پر ذرا غور کرنا پڑے گا۔ دونوں قانون کی نظر میں تو آچکے ہیں اور اگر واقعی چوہدری ذیشان جیسی بھاری بھر کم شخصیت میں اشفاق شاہین کا ہی ہاتھ ہے تو.....“

”آف کورس انگل! دونوں کے علاوہ اتنی بڑی جرأت اور کون کر سکتا ہے؟“ میں نے فوراً نہ زار میں کہا۔

”ہاں۔ میں سمجھ رہا ہوں۔“ انگل اعظم خان نے اپنے سر کو تھمبی جنبش دیتے ہوئے پُر خیال میں کہا۔

”لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ان دونوں خطر ناک درندوں کو آخر کہاں تلاش کیا جائے؟“

میں نے جو کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ مجھے جانے کیوں گرین لاج جانے کی بے چینی ہو رہی تھی۔ اور غور کرنے کے لئے حالات بھی موافق تھے، وقت بھی۔ چنانچہ میں نے فوراً اجازت چاہی۔ انگل خان کو میری جلد واپسی پر حیرت ہوئی۔ ان کا خیال ہو گا کہ میں دیر تک وہاں بیٹھ کر پیش آمدہ ویش معاملات پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ تاہم انہوں نے مجھے نہیں روکا۔

چوہدری ذیشان کے اندوہناک قتل کے بعد میری چھٹی حس بہ دستور خطرے کا الارم بجا رہی تھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ چوہدری ذیشان نے اشفاق شاہین کے خلاف بڑی موثر کارروائی کی تھی اور اگر گھناؤنے کاروبار میں لوٹ ہونے کے وہ تمام ثبوت حاصل کر لئے تھے جو اس کو قرار واقعی سزاوار کے لئے کلیدی کردار ادا کر سکتے تھے۔ اس کام کے لئے وہ بقول خود بخانے کتنے عرصے سے تک واد مصروف کار تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اشفاق جیسے گاڈ فادر ٹیکسٹر سے کلری تھی اور اس میں ان پر پھاگل کے ویران برف زاروں میں قاتلانہ حملہ بھی ہوا تھا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ میں

پر یہ سازش مجھ پر ”سرائے سیاں“ میں اچانک ہی آشکار ہو گئی تھی اور یوں میری مداخلت کے باعث بال بال بچے اور اشفاق شاہین کے جو کارندے میرے ہاتھوں زخمی ہو کر حوالہ پولیس ہوئے تھے۔ انگل میں چوہدری ذیشان ہی کے حکم پر اسپیشل پولیس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ بعد میں ان سے ضروری کر دی تاجھ کے فوراً بعد ہی اشفاق شاہین کے خلاف موثر اور کامیاب کارروائی کی گئی تھی لیکن ابھی چوہدری کا مشن ادھورا ہی تھا کہ اشفاق شاہین اور غفورہ صرف راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر وار کرنے میں تاخیر نہیں کی تھی اور وار بھی ایسا جس کے باعث چوہدری ذیشان جان سے ہاتھ دھوئے پڑے تھے۔

یہ جاننے والے میرے علاوہ صرف دو ہی افراد تھے جنہیں اس حقیقت کا اور۔ تھا کہ اشفاق جیسے بڑے ٹیکسٹر کے خلاف چوہدری ذیشان کی کامیاب مہم میں میرا ہی ہاتھ تھا۔ ایک چوہدری ذیشان

اور اب..... میں بھی ان ہی دونوں کی ہٹ لسٹ پر تھا۔ ممکن ہے مقتول چوہدری ذیشان کی طرح میرے خلاف بھی کوئی جان لیوا منصوبہ تیار کر چکے ہوتے۔ نظر حیات جیسے دمن کے معاملے میں تو غار کا کھیل کھیلنا جا سکتا تھا مگر اشفاق شاہین اور غفورے کے سلسلے میں ایسا کرنا صریحاً اپنی موت کو دعوت کے مترادف ہوتا۔ وہ دونوں اس وقت میرے لئے زخمی درندے بنے ہوئے تھے اور کسی بھی وقت ذیل چوہدری ذیشان کی طرح مجھے بھی پھاڑ کھانے کے لئے بے چین تھے۔

اب حالات تخت یا تختہ جیسی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ہم دونوں میں سے جس کا داؤ چل جاتا وہ دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے میں لمحہ بھر کی دیر نہ کرتا۔ میں بظاہر خاموشی سے ڈرائیونگ میں مصروف تھا مگر اندر میرے زبردست لچل چلی ہوئی تھی۔

اچانک موبائل کی تیل گنگنائی۔ میں نے حسب عادت موبائل کی اسکرین پر دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ

میں کی کال تھی۔

”ہیلو..... ماں! کیا بات ہے؟“

”تم کہا ہو؟..... خیریت تو ہے نا؟“ دوسری جانب سے ماں کی فکر مند آواز ابھری۔

”ہاں ماں!..... میں بالکل ٹھیک ہوں اور گھر ہی آ رہا ہوں..... مگر.....“

”اللہ تمہیں خیریت سے پہنچائے۔“ ماں نے بے اختیار دعائیہ لہجے میں کہا۔ میرے دل میں کھٹکی

پیدا ہوئی اور فوراً ہی مضطربانہ بے چینی سے بولا۔

”کیا بات ہے ماں!..... تو پریشان ہے؟“

”میں نے گرین لاج کے باہر کچھ مشتبہ لوگوں کو دیکھا ہے۔“ ماں نے گویا بادل نا خواستہ مجھے آگاہ کیا

اور ایسا ایسا میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔

”کتنی دور ہیں وہ؟..... اور تعداد میں کتنے ہیں؟“ میں نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے

دریافت کیا۔

”میں اس وقت بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہوں۔ فی الحال تو مجھے تین ہی نظر

آئے ہیں۔“ ماں بتانے لگیں۔

”ارے..... ایک قریب آ رہا ہے۔“ ماں نے آخر میں اچانک چونک کر کہا۔ میرا دل کنپٹیوں میں

دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد ماں نے بھی رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے فوراً موبائل جیب میں رکھا اور جیب کی

انڈر بڑھاتا چلا گیا۔

منصور اور چیز کے گھنے درختوں کے درمیان بل کھاتی سڑک پر میری جیب آندھی طوفان کی طرح

ڈولنے لگی۔ میرے پورے وجود میں سائیں سائیں ہو رہی تھیں۔ میری نظروں کے سامنے بار بار ان

دونوں زخمی درندوں اشفاق شاہین اور غفورے کے بھیانک اور مکروہ چہرے گردش کر رہے تھے۔ دل و

دماغ دھوسوں کی زد میں تھے۔ بل کھاتی سڑک پر اس قدر تیز رفتار ڈرائیونگ میرے لئے خطرناک بھی

ثبت ہو سکتی تھی۔ مگر میں نے پوری مہارت کے ساتھ اس تیز رفتاری کو سنبھال رکھا تھا۔ ایک قدرے تنگ سے

موز پر تو شکر تھا کہ میں نے بروقت بے قابو ہوتی جیب کو سنبھال لیا تھا ورنہ جیب دائیں جانب بنی اندھی

کھائی میں لڑھک چکی ہوتی۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر گرین لاج جا پہنچوں۔ اگرچہ اب گرین لاج کا فاصلہ کم ہی رہ

گیا تھا لیکن میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالا اور موبائل نکال کر ماں سے رابطہ کرنا چاہا مگر ایک خیال ذہن میں ابھرتے ہی میں نے ارادہ بدل دیا۔ ممکن تھا کہ ماں کسی گوشے میں چھپی ہوئی ہو۔ میری کال پر اس کا گنگنا موبائل خطرے کا الارم نہ بن جائے۔ چنانچہ موبائل دوبارہ جیب میں رکھ کر اب اپنی ساری توجہ جیب دوڑانے پر مرکوز کر دی تھی۔ میرے اعصاب تن کر رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی بڑی قیامت آنے والی ہو۔

بالآخر ذرا دور سے مجھے کاہو اور چیز کے درختوں کے جھنڈ سے گرین لاج کی سبز چوٹی عمارت نظر آنے لگی اور پھر ذرا ہی دیر بعد جب میں گرین لاج کے قدرے قریب پہنچا تو اچانک میری سماعتوں پر گولیاں چلنے کے بیک وقت تین دھماکے گونجے۔ میرے اندر مچی ہوئی ہلچل میں یکدم ہی اضافہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے گرین لاج کے قریب پہنچ کر جیب کو گیت کے سامنے بریک لگائے۔ جیب کے ٹائر پختہ ڈرائیو سے پر زور سے چرچا رہا تھا وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میں نے اپنی جیب سے میگارد نکالا اور بہ سرعت دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ جتنا مگر تیز نظروں کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔ ہر سو خاموشی اور سیاہی کا راج تھا۔ سر پہ چلی تھی اور دور کہیں مغربی پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے سورج کی گیند لڑھک رہی تھی۔ آسمان پر غروب ہوتے سورج کی سرخ تمازت خوب صورت شام کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کین متعین کردہ دونوں سبز گارڈز بھی غائب تھے۔

ابھی میں گرین لاج میں داخل ہونے کا ارادہ کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میری واپس چلتی نظر نے بائیں جانب ذرا ڈھلوانی سمت پر دو گن بردار آدمیوں کو ابھرتے دیکھا۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ مگر دوسرے لمحے ان دونوں کو پہچان کر میں نے بے اختیار گہری سانس لی اور فوراً ان کی طرف دوڑا۔ وہ دونوں کین لاج پر متعین مسلح گارڈز تھے۔ ان کے قریب پہنچ کر میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا ہوا؟.....“ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے گولیاں چلنے کی آواز سنی تھی۔ ایک نے جواباً کہا۔ ”ہیکم صاحبہ کے حکم پر ہم ان تین مشتبہ افراد کے پیچھے لپکے تھے۔ گولیاں انہوں نے ہی چلائی تھیں مگر پھر ہماری جوابی فائرنگ پر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔“ ”کس طرف گئے ہیں وہ؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

دوسرے نے جنوبی سمت کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہیں چیز کے جنگل میں ہم نے ان تینوں کو ہتھ پکڑ دیکھا ہے۔“

”ماں تو ٹھیک ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔ ”جی ہاں..... وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“ پہلے والے نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ تیزی کے ساتھ گرین لاج کے بڑے سے محراب نما داخلی دروازے کی جانب پلٹا ہی تھا کہ مجھے ماں دکھائی دیں۔ میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچا۔

”ماں! تو ٹھیک ہے نا؟“ میں نے اسے دونوں شانوں سے تمام کر پوچھا۔ ”ہاں بیٹا!..... میں ٹھیک ہوں۔ مگر.....“

”میں ابھی آتا ہوں ماں!“ یہ کہہ کر میں تیزی کے ساتھ اپنی جیب کی طرف پلٹا اور اشارت کرتے ہوئے تھوڑا سا رپورس کیا اور تیزی سے گیزر بدل کر دوسری سمت موڑ کاٹا اور ایک سیلیٹر دبا دیا۔ میری طاقت و تھیل پونٹو ہار کمان سے نکلے تیر کی طرح نکلی اور مختصر سے ڈرائیو سے پرفرائے بھرتی ہوئی سڑک پر

نہیں میں سڑک کی جانب رخ کرنے کی بجائے اس سمت گیا جہاں گارڈز نے ان تینوں مشتبہ افراد کو راہ اختیار کرتے ہوئے اوجھل ہوتے دیکھا تھا۔ میں صوبہ اور کاہو کے درختوں کے درمیان خلا سے اپنی جیب کو زنگ زنگ انداز میں دوڑائے چلا جا رہا تھا۔ شام ابھی پوری طرح سے گہری نہیں ہوئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی کندنی کرنیں چھتار پیڑوں سے بہ کر پھبھوں کی طرح خود رو جھاڑیوں میں پیوست ہو رہی تھیں۔ ان تینوں مشتبہ افراد کی تلاش میں یہی طور پر یوں نکلنا بے شک ایک اندھا جوا بھٹکنے کے مترادف تھی لیکن میں ایک یہ بھی محتاط اندازہ رکھتا تھا کہ ان تینوں مشتبہ افراد کی راہ گزر یہی ہو سکتی تھی بشرطیکہ ذرا آگے جا کر وہ اپنی کہیں قریب کھڑی گاڑی میں سوار نہ ہو جاتے۔ کیونکہ وہ یقیناً گاڑی میں ہی یہاں تک آئے ہوں گے اور اسے کہیں قریب کھڑا کرنے کے بعد پیدل ہی آگے بڑھے ہوں گے۔ مجھے اپنے اندازے کی درستی کا پورا یقین تھا۔

یہی سب تھا کہ میں نے ابھی جنگل سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک مجھے اس بل کھاتے تھے پر خاصی دور اونچے پیڑوں کے درمیان جیب نما گاڑی حرکت کرتی نظر آ گئی۔ جسے دیکھتے ہی راسخہ جوش سے تن گیا اور پھر میں یلکھت ہی بائیں جانب موڑ کاٹ کر پوری رفتار کے ساتھ جیب ڈالنے لگا۔

اس ویران اور آبادی سے دور، سنسان جنگل میں بروقت کسی گاڑی کا نظر آنا اس امر کی دلیل تھی کہ ابھی ذرا دیر پہلے ہی گرین لاج کے گرد منڈلاتے ہوئے تینوں مشتبہ افراد اس گاڑی میں ناکام و نامراد راہ گزار اختیار کئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے ٹکرائے گاڑی کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ میں اب ایک شارٹ کٹ راستہ اپنا کر ان کا راستہ کھٹا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے بڑے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا۔ میں نے ان سے دڑانہ وار بھڑنے کا ارادہ دل کر ان کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ اب میں ان کا بڑی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ پیچھا کرنے لگوں کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ ان کی گاڑی مجھے نظر آ رہی تھی۔

جنگل سے نکل کر گاڑی ایبٹ آباد جانے والی سڑک پر آ گئی۔ میں نے بھی اپنی جیب اس سمت موڑ ڈالنے لگا۔ جاکر اس سڑک سے تین اور سڑکیں بھی نکلتی تھیں۔ ایک تو سری واپس جاتی تھی جبکہ باقی دو ہری پر ہزارہ اور کھربار کی طرف جاتی تھیں۔ اس وقت ہم ہزارہ ڈویژن میں داخل ہو چکے تھے۔

اچانک ان کی گاڑی ہری پور جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ یہ ممکن تھا کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس تھا تو غدر ضرور ہو سکتا تھا اس لئے میں نے چند دوسری آنے جانے والی گاڑیوں کے عقب میں ہی جیب کو رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ان کی نظروں میں نہ آسکوں۔ یوں بھی ان کے سامان گمان میں بھی نہ آ گا کہ میں اس طرح ان کے پیچھے آ سکتا ہوں۔

اس وقت بھی میں نے اپنی جیب کو ایک تیز رفتار ہائی ایس ویگن اور گکڑی مسافر کوچ کے عقب میں لگا دیا تھا۔ مشتبہ افراد کی گاڑی لینڈ کرور ٹائپ کی لمبی سی، پرانے ماڈل کی جیب ہی تھی جو اب درمیانی راستے سے دوڑے جا رہی تھی۔ ہری پور جانے والی سڑک کے دونوں جانب سرسبز ڈھلوانوں پر کچے کے ٹکڑوں کی بے ترتیب قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ اچانک ایک مقام پر میں نے دیکھا کہ گاڑی کی رفتار کم آنے لگی اور بالآخر وہ سڑک کے کنارے رک گئی۔ میں نے بھی فوراً ہی اپنی جیب سڑک کے بائیں جانب درختوں کے جھنڈ میں روک لی اور پھر لمبی کی سی سرعت سے دروازہ کھول کر نیچے اترا اور تیزی کے ساتھ دوڑ کر جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔

میں ان کے قریب پہنچ کر ان کی صورتیں پہچانتا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں چھپتا چھپاتا ان کی گاڑی کے بالآخر قریب پہنچ گیا تاکہ یہ آسانی ان کے چہرے دیکھ سکوں۔ ان کی تعداد تین ہی تھی۔ لہذا اس بات تصدیق تو ہو ہی گئی تھی کہ میں نے درست آدمیوں کا تعاقب کیا تھا۔ میں یہ غور نہیں پہنچانے کی کوشش کرنے لگا تو دو افراد کو میں نے انجی ہی پایا تھا۔ ان میں سے ایک گاڑی کا بونٹ کھولے اس پر چڑھا تھا۔ شاید ان کی گاڑی میں کوئی خرابی واقع ہو گئی تھی۔ البتہ تیسرا شخص دوسری جانب منہ کئے کھڑا تھا۔ نہ دیکھنے کے باوجود میں نے اس کے ڈیل ڈول سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی، وہی میرا اصل غور تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد جیب سے موبائل سیٹ نکالا اور میری جانب مڑ کر کسی سے رابطہ کرنے لگا تو یلکھت میرے پورے میں سنسنی پھیل گئی۔ وہ غور ای تھا۔ میں ٹھوڑا اور قریب ہو گیا تاکہ اس کی موبائل پر گفتگو سن سکوں۔

”جیف! کیا آپ کا موبائل آف تھا؟..... میں آپ سے کافی دیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ رابطہ ہوتے ہی وہ مودبانہ بولا۔

”جیف! میں آپ کو بتانا چاہ رہا تھا کہ ہمیں کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم نادر علی کی ماں کو اغواء کرنے میں ناکام رہے ہیں عین وقت پر نہ جانے کس طرح ہم نظروں میں آ گئے اور ان کے گارڈز نے ہم پر حملہ دیا۔ شاید نادر علی بھی گرین لاج کے اندر ہی موجود تھا۔ اس نے بھی بالائی منزل سے ہم پر فائر کر ڈالا تھا۔ ہماری ہم خفیہ نہ رہ سکی۔ اور آپ کو تو حالات کا علم ہی ہے۔ وہ وقت جم کر مقابلہ کرنے کا یا نہ نہ کرنے کا نہ تھا اس لئے.....“

دوسری جانب سے بات کالی گئی تھی۔ شاید اس کا جیف جو بھینٹا اشفاق شاہین ہی ہو سکتا تھا، گالیاں دے رہا تھا۔ کیونکہ غورے کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔

”جج..... جی جیف! ہم واپس ہی لوٹ رہے ہیں۔ بس ہم ابھی تھوڑی دیر میں پہنچنے والے ہیں۔“

اوکے جیف! ہم آ رہے ہیں۔ نہیں، نہیں..... آپ بے فکر رہیں، ہمارا کسی نے تعاقب نہیں کیا ہے۔ جیف! اگر آپ حکم کریں تو میں جیدے اور بشیرے کو آپ کی طرف روانہ کر کے خود اکیلا ہی دوں گا۔

گرین لاج جا کر صرف نادر کو ہی گولی مار دوں، جس طرح چوہدری ذیشان کو میں نے اپنی گولی کاٹ کر بنایا تھا؟..... ٹھیک ہے جیف! جیسے آپ کی مرضی..... میں بھی واپس پہنچ رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے موبائل آف کر کے جیب میں رکھا اور بونٹ پر جھکے ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

”جیدے! کیا بڑی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو اب تک ٹھیک نہیں ہوئی؟“ وہ اپنے ساتھی سے بولا۔

تھا۔ اور میرا داغ اس کی اشفاق شاہین سے ہونے والی گفتگو پر اس بری طرح سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنا لہو جلتی سلسلی کنپٹیوں پر اچھال مارتا محسوس ہونے لگا۔ گویا یہ بات میرے سامنے آشکارا ہو گئی تھی کہ چوہدری ذیشان کو خفیہ غورے نے ہی قتل کیا تھا اور اب یہ لوگ اشفاق شاہین کے خفیہ ٹھکانے جا رہے تھے۔ گویا اب میرا اشفاق شاہین اور غورے سے فیصلہ کر لینے کا وقت بہت قریب آ گیا تھا۔

\*\*\*

ذرا دیر بعد گاڑی کی خرابی دور کر لی گئی۔ میں تیزی کے ساتھ واپس پلٹا اور اپنی جیب سے پہنچا۔ غورے کی گاڑی آگے روانہ ہو گئی۔ میں بھی تیزی سے اپنی جیب میں سوار ہوا اور آگے بڑھ گیا۔

صورت حال اب کافی حد تک واضح ہو چکی تھی۔ اگر غورے کے ساتھ صرف ملک سردار خان والا ہوتا تو بھتہ میاں، اگر وقت پیش پولیس فورس کو افغانم کر دیتا۔ مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ اس

میں سے جلدی جلدی کچھ کہتے سنا اور پھر یکدم واپس چلا۔ باقی اس کے دونوں ساتھی باہر نکل کر نہایت محتاط انداز میں گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے دائیں بائیں کی جھاڑیوں کی سمت تیزی کے ساتھ بڑھے تھے۔

مجھے غورے کے اچانک پلٹنے پر اچنبھا ہوا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا ممکن تھا سرائے کے عقبی حصے کی طرف بھی کوئی دروازہ ہو اور غفورا اسی جانب سے باہر نکل کر مجھے غب سے گھبرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ میں بھی بہ سرعت سرائے کی عقبی دیوار کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے عقب میں سرکا۔ مگر دوسری سمت پہنچ کر میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ سرائے کی عقبی دیوار بائیں تھی۔ یعنی وہاں کوئی دروازہ نہ تھا۔ تب پھر اچانک غیر اختیاری طور پر میری نظریں بالائی منزل پر پڑیں۔ میرے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اگر میں بروقت اور بہ سرعت اپنی جگہ تبدیل نہ کرتا تو پہلی منزل کی بالترتیب بالکونی پر کھڑے اپنی پستول سے میرا نشانہ باندھے غفورے کی چلائی ہوئی گولی کی زد میں ضرور آ جاتا۔ چنانچہ جو جگہ میں نے اپنی جگہ چھوڑی، اسی لمحے غفورے نے بھی مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ عین وقت پر جگہ تبدیل کرتے ہی میں نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے میگارد نکال کر اس پر فائر کر دیا۔ میرے نیٹگوں میگارد کی طاقت درگولی غفورے کی بجائے بالکونی کی کھڑکی میں پیوست ہو گئی۔ غفورے نے اوپر تلے مجھ پر گولیاں برسائی شروع کر دیں۔ میرے لئے بھی جوابی فائرنگ ضروری تھی۔ مگر میں نے دانستہ ایسا نہیں کیا اور تیزی سے قد آدم جھاڑیوں میں رینگ کر قدرے دور چلا گیا۔

شام کے سائے دراز ہو کر اندھیرے میں بدلنے لگے تھے۔ تاریکی کا فائدہ اٹھانا میں خوب جانتا تھا۔ اچانک مجھے اپنی داہنی جانب جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں میگارد کی نال کا رخ مذکورہ سمت کر کے سانس روکے دبک گیا۔ اچانک روشنی ہوئی۔ میں لمحے بھر کو ٹھنکا۔ یہ مارچ کی روشنی تھی جو دو مختلف سمتوں سے آ رہی تھی۔ ایک سامنے کی جھاڑیوں سے، دوسری بائیں جانب سے۔ یہ دونوں غفورے کے ساتھی ہی ہو سکتے تھے۔

میں غفورے کی نظروں میں آ چکا تھا۔ میں نے بالکونی کی طرف بھی دیکھا تھا، وہ اب وہاں موجود نہ تھا گویا وہ یہ جاننے کے لئے ہی بلندی پر آیا تھا کہ دیکھ سکے، حملہ آور کون تھے اور کتنے تھے؟ اب صرف ٹھٹھکیلو کو دیکھ کر وہ نئے عزم کے ساتھ دوبارہ نیچے آ کر مجھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔

ٹھٹھکی اسی وقت میں نے سامنے کی جھاڑیوں سے ایک ہیولے کو ابھرتے دیکھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اس کے مارچ والی ہاتھ پر گولی چلائی۔ ایک کریمہ نیچے آ بھری اور مارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جھاڑیوں میں جا گری۔ دوسری سمت سے ابھرنے والی روشنی نے حرکت کی اور میں نے اسی وقت تیزی کے ساتھ اپنی جگہ تبدیل کر ڈالی۔ میں نے اس سمت پر گولی چلا دی۔ میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتے ہوئے ایک بار پھر متروک سرائے کی عمارت کی جانب پیش قدمی کرنے لگا اور ٹھٹھکی اس لمحے میں بری طرح ٹھنکا۔ میں نے اشفاق شاہن اور غفورے کو تیزی کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا۔ میری رگوں میں شگفتہ خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میرے لئے یہ ان کی غیر متوقع حرکت تھی۔ وہ دونوں فرار ہو رہے تھے۔

مگر کیوں؟..... میں نے جیب میں سوار ہوتے وقت اشفاق شاہن کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی دیکھا تھا۔ میرے دماغ میں الجھا ہوا سوال ابھرا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب غفورے نے مجھے یہاں تنہا دیکھ بھی لیا تھا تو اسے اشفاق شاہن کے ساتھ اس قدر جلدی یہاں سے فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ انہیں تو میرے مقابلے پر اتر آنا چاہئے تھا۔

چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔ اندر مدھم کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر جھانکا۔ یہ ہال نما کمرہ تھا۔ چار پانچ ٹوٹی پھوٹی جھلکا سی چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کا کچھ جگہ سے اکھڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایک جانب آتش دان بنا ہوا تھا جو سرد تھا۔ دو تین کرسیاں اور ایک میز بھی دھری دھری روشنی بائیں جانب کے کسی کھلے کمرے سے آتی محسوس ہو رہی تھی، جس پر اب میری نظر نہیں پڑی تھی۔

غفورے اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اندر داخل ہوتے ہی شاید کمرے کا رخ کیا تھا۔ کیونکہ وہ تینوں نظر نہیں آ رہے تھے۔ تاہم ذرا غور کرنے پر مجھے اس سمت سے باتوں کی گونج سنائی دی۔ مگر سمجھ نہیں آ سکے تھے۔ یہ تسلی ہوتے ہی کہ اب ہال میں کوئی نہ تھا، میں داخلی دروازے سے آ کر اندر اندر داخل ہوا اور مذکورہ سمت کی طرف سر ابھار کر دیکھا تو اسی وقت میری گردن سے ایک سرد ہال اور ساتھ ہی ایک درشت آواز عقب سے ابھری۔

”خبردار!..... کوئی غلط حرکت مت کرنا..... ورنہ گولی چلا دوں گا۔“

\*\*\*

میرے پورے وجود میں کاٹ دار سنسنات دوڑ گئی۔ عین لب بام پر مجھے اپنی ساری محنت جاتی محسوس ہوئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کے جنگجو اور ایتھلیٹ انسان نے چلا کر کہا۔ ”نادر! یہی تو وقت ہے دشمن پر شب خون مارنے کا۔“

دوسرے ہی لمحے میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ جھکاؤ دی اور گن پوائنٹ سے ”آؤٹ“ ہی میں نے اپنے دائیں بازو کی کہنی بھر پور قوت کے ساتھ اپنے مقابل کے پیٹ پر رسید کر دی۔ کے حلق سے بے اختیار اورغ کی ٹھٹھکی آواز خارج ہوئی مگر ساتھ ہی اس بد بخت نے دانستہ یا غیر طور پر پستول بھی چلا دیا۔

پر ہول سنائے میں گولی چلنے کے دھماکے کی آواز جنگل میں بہت دور تک گونجی تھی۔ میں چونک کر پھرتی سے کام لے کر گن پوائنٹ سے دور ہو چکا تھا اس لئے گولی کی بھیاک قریب سے محفوظ رہا۔ اب تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ گولی چلنے کے دھماکے نے اندر موجود افراد کو یقیناً چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اب جو بھی کرنا تھا نہایت پھرتی اور چابک دستی کے ساتھ کرنا تھا۔

میری کہنی کی بھرپور ضرب مقابل کے پیٹ پر پڑنے کی وجہ سے وہ بے اختیار اپنا پیٹ بکڑے کے بل جھک گیا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا ذرا بھی موقع دیے بغیر گھٹنے کی ضرب اس کی ناک پر دی اور ساتھ ہی اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر بھی کرائے والے انداز میں ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ دہری تہری تکلیف کے باعث ڈھے سا گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلنے ہی میرے لپکا پر وہ جھاڑیوں میں جا گرا۔ آخری بھرپور ضرب میں نے اپنی لات کی اس کے پیٹ اور ناف کے نازک ترین مقام پر جڑ کر اسے ڈھیر کر دیا۔ میری یہ کارروائی انھوں میں مکمل ہو گئی تھی اس لئے جیسے ہی سرائے کے ہال میں دوڑتے قدموں کی گونجی آواز سنائی دی، میں پھرتی کے ساتھ قد آدم جھاڑیوں اندر رینگ کر اس سال خوردہ عمارت کی جنوبی دیوار کی آڑ میں آ گیا اور اپنی نظریں دروازے پر گاڑ دیں۔ مجھے غفورے سمیت اس کے وہی دونوں ساتھی نظر آئے جن کے تعاقب میں تھوڑی دیر پہلے یہاں تک پہنچا تھا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول نظر آ رہے تھے۔

پھر شاید غفورے کی نگاہ اپنے زمین بوس ساتھی پر پڑی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے



کیا انہیں کہیں پہنچنے کی جلدی تھی؟..... مگر کہاں؟

ٹھیک اسی وقت جیب اشارت ہوئی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھی۔ ایک انکی میرے پورے وجود پر بجلی سی دوڑ گئی۔ میں بھی پلٹا اور اس سمت پر بے درنگ دوڑنا شروع کر دیا چہرہ میری جیب ٹھڑکی تھی۔ میں جب تک اپنی جیب کے نزدیک پہنچا، ان کی گاڑی آگے نکل چکی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اپنی جیب کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی جیب آگے بڑھا دی۔

راستہ بل کھاتا ہوا اور ناہموار تھا۔ دونوں گاڑیاں زبردست ہچکولے کھاتی ہوئی آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ تاریکی کے باعث میں نے اپنی جیب کی ہیڈ لائٹس روشن کر رکھی تھیں۔ یقیناً اشفاق شاہین غفورے کو بھی اپنے تعاقب کا احساس تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب وہ دونوں بھی اپنی توجہ راہ فرار اختیار کرنے پر مرکوز کئے ہوئے تھے۔ اس طرح مجھ سے مقابلہ کئے بغیر راہ فرار اختیار کرنے پر مجھے سخت حیرت تھی۔ ان کے لئے تو یہ سنہری موقع تھا کہ وہ مجھے تباہ دیکھ کر اپنے ارمان پورے کر سکتے تھے۔ میں اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

کہیں یہ دونوں مردود ملک سے ہی تو کوچ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے؟..... اور اس وقت انہیں شاید ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی ہو؟

مگر پھر میں نے اُٹھے ہوئے ذہن سے سوچا کہ بھلا اس طرح مجھے اپنے پیچھے لگا کر یہ یوں فرار ہونے کا ارادہ کیسے کر سکتے تھے؟..... میں پولیس کو بھی ان کے بارے میں مطلع کر سکتا تھا۔ باجھر میں تھا کہ غفورے کی طرح اشفاق شاہین بھی جانتا تھا کہ میں کم از کم پولیس کو افکار کرنے کی ”مظلمی“ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اشفاق شاہین کے سلسلے میں تو یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن غفور اس کے ساتھ تھا لہذا یہ ممکن تھا۔ کیونکہ الاحوالہ وہ بھی پولیس کی گرفت میں آ جاتا اور یوں غفورے کی گرفتاری سے ”صدف ایڈ ملک سردار خان مرڈر کیس“ ایک بار پھر ری اوپن ہو جاتا۔

ان کے اچانک نکل بھاگنے کی ایک وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی تھی کہ میں ان کے خفیہ ٹھکانے سے واقف ہو چکا تھا اور ممکن تھا کہ میں اپنے ساتھیوں وغیرہ کو مطلع کر کے مدد کے لئے بلا لیتا۔ مگر اس کا مجھے یقین نہ تھا۔ لے دے کر پہلی ہی صورت قرین قیاس تھی۔

بہر طور، کچھ بھی تھا، میں اب ان دونوں کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جبکہ غفورے کو تو زندہ ہی نہیں چھوڑنا تھا۔ وہ کئی بے گناہ لوگوں کا قاتل تھا۔ اگرچہ اس نے یہ سب اشفاق شاہین کے کہنے پر ہی کیا تھا مگر اشفاق شاہین کو میں نے قانون کی گرفت میں دینے کا عزم کر رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں اندھا دھند ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی ہوئی پختہ سڑک پر آ گئیں۔ پختہ سڑک پر آتے ہی ان کی گاڑی کی رفتار مزید تیز ہو گئی۔ ادھر میں نے بھی اپنی پٹھوہار کی اسپید بکنگ بڑھا دی تھی۔ سڑک کے دو رویہ جیز اور صوبہ کے درختوں پر دھیرے دھیرے رات کی سیاہی گھٹنے لگی تھی۔ ایسے وقت میں ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ سڑک ہری پور جاتی تھی۔

میرے ذہن میں دو ہی شہر تھے جہاں کا یہ دونوں رخ کر سکتے تھے۔ ایک اسلام آباد، دوسرا لاہور۔ مگر جب تک یہ میری روڈ پر نہیں آ جاتے، ابھی کچھ کہنا محال تھا۔ اچانک ان کی گاڑی نے بائیں جانب موڑا تو میں بری طرح ٹھک گیا۔ کیونکہ یہ راستہ نہ اسلام آباد کی طرف جاتا تھا اور نہ ہی لاہور کی طرف سے کوئی شارٹ کٹ آتا۔

طرح الجھ کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کہاں کا رخ کئے ہوئے ہے؟ تب پھر اچانک ذہن میں ایک ہولناک خدشا اُبھرا۔

کہیں دونوں مردود اس ویران علاقے میں مجھے گھبرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تھے؟ یہ خیال اچانک میرے ذہن میں اُبھرا اور مجھے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

ٹھیک اسی وقت آگے ایک ٹھک موڑ آیا۔ ان کی گاڑی کی رفتار دھیمی پڑی۔ مگر میں نے اپنی جیب کی پٹھوہار کی رفتار دھیمی کر دی اور پھر جیسے ہی موڑ کاٹا، میرے ہولناک اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔

موڑ کاٹنے ہی ان کی گاڑی سڑک کا راستہ روکے عین پتوں سچ کھڑی ہو گئی۔ میں نے فوراً بریک لگا دی۔ میری جیب کے ٹائر زور سے چرچرائے مگر پھر رکتے رکتے وہ سڑک کے درمیان میں ترجھی کھڑی ہوئی۔ مگر ابھی۔

جیب ایک جھٹکے سے رکی تھی کہ دفعۃً دائیں جانب سے گولیوں کی بھیاںک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ تیزی کے ساتھ نیچے کو جھٹک گیا۔ اندھا دھند برساتی ہوئی گولیاں گونجیلی آوازوں کے ساتھ میری جیب باڈی میں پیوست ہونے لگیں۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی زبردست چھناکوں کے ساتھ چکنا چور ہو گئے۔

اسکریں بھی ایک چھناکے دار دھماکے سے ٹوٹ کر ٹکڑی ہو گئیں۔ میں سیٹ پر نیم دراز سا ہو کر اپنا چہرہ بائیں طرف ہٹا دیا۔ پل کے پل میں فائرنگ کے ”آہنگ“ سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پستولوں کی فائرنگ تھی۔ ورنہ اگر برسٹ چھوڑنے والی خود کار رائفلیں ہوتیں تو پختہ محال ہی تھا۔

میرا پورا وجود بری طرح سنٹا رہا تھا۔ میں اسی طرح جھٹکے جھٹکے اگلی دونوں سیٹوں پر بڑا رہا۔ مگر اس دھماکے نے میگا روڈ نکال کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ مگر اب میں پشت کے بل ہو گیا تھا تاکہ اس فائرنگ کی اور وٹا اسکرین کے باہر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے نہ رہے۔

فائرنگ رک گئی۔ ہر سو پر اسرار اور ہولناک خاموشی طاری ہو گئی۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تب میرے دل میں ایک خطرناک خیال اُبھرا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے میگا روڈ کو پکڑ لیا اور اپنے پیروں کی طرف والے دروازے پر نال کا رخ کر کے ایک لات سیڑ

دروازہ انداز میں دروازے پر دے ماری۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور سامنے ہی مجھے اشفاق شاہین ملے ہاتھ میں لئے محتاط انداز میں بڑھتا ہوا نظر آیا۔ وہ بری طرح ٹھکا۔ مگر میں ٹرائیگر دبا چکا تھا۔

میں نے میگا روڈ کی مہیب نال سے شعلہ نکالا مگر ادھر اشفاق شاہین نے بھی بروقت غیر محسوس پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حرکت کی اور میری چلائی ہوئی گولی اس کے پستول پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ تیزی کے ساتھ ایک طرف دوڑا۔ میں نے بھی جیب سے کودنے میں کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ اس نے دائیں جانب سے غفورا ہاتھ میں پستول لئے نمودار ہوا۔ میں نے حواس بحال رکھتے ہوئے اس کے

ہاتھ والے ہاتھ پر لات جمادی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اپنے میگا روڈ کا فائرنگ کی طرف کرتا، اس کے چہرے پر ایک لمحے کو زردی کھنڈ گئی۔ مگر اسی لمحے اچانک کسی نے عقب سے میری پشت پر زوردار لات رسید کر دی۔ میں غفورے سے ٹکرایا۔ غفورا مریغ پاتے ہی میرے پستول پر

پستول اس کے قبضے میں تو نہ آ سکا البتہ دور سڑک کے کنارے آگئی ہوئی خود رو جھاروں میں جا گیا۔ میں نے میری ٹھوڑی پر مٹکا رسید کرنا چاہا مگر میں نے ایک ہاتھ کی کلانی سے اس کے گھونے کو روک دیا۔ اس کے پیٹ پر دوسرے ہاتھ سے گھونسا رسید کر دیا اور پلٹا۔ عقب سے اشفاق شاہین جو ٹھوڑی دیر

ہر ادھیان ذرا ہٹا تو غفور نے دوبارہ مجھ پر جھپٹنا چاہا مگر میں اب اس کے قابو میں آنے والا تھا۔ ایک زوردار مٹکا میں نے اس کے جڑے پر رسید کر دیا۔ ایک لمحے کو وہ جھنجھٹا سا گیا۔ میں نے اس کی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور جیب میں سوار ہوتے ہوئے اشفاق شاہین کی طرف دوڑا۔ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے جیب اسٹارٹ کر دی۔ مگر ابھی گیسر ڈالنے ہی والا تھا کہ اس نے کھڑکی سے ہی ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن تاپ لی۔

ادھر غفور نے بھی غافل نہ تھا، جو تیزی کے ساتھ دوڑتا ہوا میری جانب آ رہا تھا۔ ہر اشفاق شاہین نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ وہ بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گردن پر ہری گرفت کی پرواہ کئے بغیر گیسر بدلا اور ایک سیلیئر دبا دیا۔ گاڑی کے پچھلے دونوں ٹائر تیز چرچاہٹ کی آواز کے ساتھ گردش کرنے لگے اور گاڑی ایک طغیانی جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھی۔ میں اس خبیث بیان کو کسی قیمت پر بھی فرار ہونے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اس کی گردن کے گرد سہاوا اپنے بازو کا ٹکڑیہ نہیں چھوڑا اور چلتی ہوئی گاڑی کے دروازے پر بھول گیا۔ اس کی گردن میرے ہاتھ کی طرف جھک گئی۔ وہ اسٹیرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت قائم نہ کر سکا۔ نتیجتاً طوفانی آواز میں بدترجہ اسپید بکڑتی ہوئی گاڑی سڑک سے کنارے میں اتر گئی اور زوردار دھماکے سے درخت سے ٹکرائی۔ میں اچھل کر دوڑ جھاڑیوں میں جا پڑا۔ مگر گرتے ہی پھرتی کے ساتھ اٹھا۔ میں نے اشفاق شاہین کا سرا اسٹیرنگ پر پڑا پایا۔ پتہ نہیں وہ زندہ تھا یا نہیں؟..... البتہ میں اس وقت بری طرح چونکا۔

مجبور غفور دوسری جانب کے دروازے کی کھڑکی سے ایک بریف کیس نکال رہا تھا۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ وہ بریف کیس اپنے قبضے میں کئے میری جیب کی طرف دوڑ رہا تھا اور میں اس کے پیچھے دیوانہ وار لگا رہا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا، وہ اچانک رک گیا اور پھر بڑے ڈرامائی انداز میں میری طرف بھاگتا ہوا میری سڑک پر قدموں سے ٹھک کر رک گیا۔

میں دونوں حریفوں کی وحشیانہ نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ تب غفور نے اپنی ہونٹوں کی آواز میں مجھ سے کہا۔

”نادر علی! اشفاق شاہین ختم ہو چکا ہے..... مجھے اب جانے دو۔ اسی میں تمہاری اور تمہاری ماں کی آواز ہے۔ ورنہ اگر میں پکڑا گیا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو یاد رکھو، تمہارے دشمن مجھے وعدہ معاف کرانے میں دیر نہیں کریں گے۔“

میں اس خبیث کی بکواس پر بھٹا اٹھا اور دانت پیس کر خوف ناک لہجے میں بولا۔

”میں تجھے زندہ چھوڑوں گا تو تو وعدہ معاف گواہ بنے گا نا..... خبیث! تو نے معصوم غزالہ اور شہناز چوہدری ذیشان کا قتل کیا اس سے پہلے تو نے غزالہ کی بہن سہنا کا بھی خون کیا تھا۔ تیرا ناپاک ہاتھ میرے لئے ہی نہیں، اس دھرتی پر بھی بوجھ بن چکا ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ وہ اپنے ایک ہاتھ میں بریف کیس پکڑے پیچھے ہٹے ہوئے دوبارہ بولا۔

”بھٹ! میں آؤ نادر علی!..... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے جانے دو۔ میں ہمیشہ کے لئے یہ ملک چھوڑنے والا ہوں۔“

”اب تو صرف تیری روح ہی تیرا جسم چھوڑے گی ذلیل کتے!“ میں نے دانت پیس کر کہا اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بریف کیس کو فضا میں لہرا کر میرے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ گئی۔

پہلے ہی میری پشت پر اپنی لات رسید کر چکا تھا اور اب دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کو پر تول رہا تھا۔ میں نے یکدم جھک کر اس کے پیٹ پر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی اور اسے دھکیلا ہوا خاصی دور تک لے گیا۔ میں نے توازن قائم نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ اسی لمحے غفور نے خود کو فوراً ہی سنبھالتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے رگیدتا ہوا سڑک پر آ رہا۔ میں پارے کی طرح چھلا اور رچھ جیسے بھاری بھر کم غفور سے کواپنے سے دھکیل دیا۔ اس وقت قریب ہی پشت کے بل گرے ہوئے اشفاق شاہین نے لات چلا دی جو میرے چہرے پر پڑی۔ ایک لمحے کو مجھے اپنا دماغ جھنجھٹا محسوس ہوا۔ میں ابھی سنبھلنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ بدبخت غفور وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر دوبارہ جھپٹا۔

اس کے بھاری ڈیل ڈول میں جانے کیسی پھرتی سانی ہوئی تھی کہ اس نے مجھ پر جھپٹنے ہی اپنے ہاتھ کا ٹکڑیہ میری گردن کے گرد کس دیا اور ساتھ ہی مجھے دھوبی پاٹ لگا کر گرا دیا۔ اب اس کی گرفت میری گردن کے گرد اور بھی مضبوط ہو گئی تھی۔ میرا دماغ گھٹنے لگا۔

”مار ڈالو اسے غفور!..... مار ڈالو۔ ہماری فلائٹ نکلنے والی ہے۔“

اشفاق شاہین نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا جس میں میرے لئے شدید نفرت بھری ہوئی تھی۔ غفور کو مکمل طور پر گرفت جمانے کی پوزیشن حاصل تھی اور میں بے بس تھا۔ اس کا یہ داؤد خالصتاً دیکھی طرح کا تھا جس میں مد مقابل کے پاس بے بسی کے ساتھ اپنی موت کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مگر مجھے دفاع کے لئے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر گردن پر غفور نے اتنی باؤں کا شکنجہ میرے جسم کی طاقت ہی گویا مفلوج کر کے رکھ دی تھی۔ تب پھر اچانک ہی میرے اندر ہوش جنوں خیز کی شدید لہر ابھری اور میں نے دائیں ہاتھ کی کہنی اس کے پہلو پر رسید کر دی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ شاید میری کہنی کا وار بھر پور نہ تھا۔ ادھر وہ خبیث اپنے دوسرے ہاتھ سے بھی میری گردن کے گرد ہونے شکنجے کو جکڑ کر میری گردن کی ہڈی توڑنے میں اب دونوں بازوؤں کی قوت صرف کرنے لگا۔ پھر بچتے ہوئے وجود میں ایک بار پھر جوش جنوں خیز لہر ابھری اور پھر میں نے اپنے دونوں بازو غفور کے گرد اور پیٹ کے گرد کس لئے۔

غفور ابے شک رچھ جیسا گھٹا ہوا ڈیل ڈول رکھتا تھا مگر میں بھی لمبے چوڑے جتنے کا مالک تھا۔ میں نے ایک آخری کوشش کے تحت اپنے وجود کی پوری طاقت اپنے دونوں بازوؤں پر مجتمع کرتے ہوئے غفور کو پورا زور لگا کر زمین سے تقریباً ایک دو فٹ اوپر اٹھالیا اور پھر عقب میں اس کے سینہ پر بھی سڑک پر گرا دیا۔ سڑک پر گرنے سے ہم دونوں کو کوئی خاص چوٹ تو نہیں لگی تھی البتہ اتنا ضرور ہوا کہ گردن سے غفور کے بازو کی گرفت میری گردن کے گرد ذرا ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نیز مجھے بھی اس کے پہلو پر زوردار کہنی کا وار کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ ضرب کھاتے ہی اس کے حلق سے بھانے ڈکراہٹ ابھری اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بھرپور طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے ڈھیلے بازو کے شکنجے کو مزید وا کر دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چپتے کی سی پھرتی کے ساتھ اس کے خطرناک سے اپنی گردن چھڑا چکا تھا۔

اشفاق شاہین جو ایک جانب خاموش تماشا بنی کھڑا تھا، مجھے غفور کے شکنجے سے نکلتا دیکھ کر تیزی کے ساتھ اپنی گاڑی کی جانب لپکا۔ اسے شاید ایئر پورٹ پہنچنے کی جلدی تھی کیونکہ ابھی ذرا ہی ہی اس نے غفور کو میرا معاملہ ”نمائنے“ کی تلقین کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ ان کی فلائٹ کا وقت جارہا ہے۔

قدم عقب میں لڑکھڑاتا ہوا میری جیب کے بونٹ سے جا لکڑایا۔ اس نے بریف کیس سڑک پر پھینکا۔ کسی وحشی سانڈ کی طرح میری طرف لڑکا۔

ایک بار پھر ہم گھم گھما ہو گئے تھے اور ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی اپنی سی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ہم لڑتے لڑتے بے حال سے ہونے لگے۔ ایک موقع پر ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو کر چند قدموں کے فاصلے پر آئے سانسے کھڑے ہو گئے اور بری طرح ہانپنے لگے۔

”اب بھی وقت ہے..... میری بات مان لو نارا! مجھے یہاں سے جانے دو۔ تم میرا کونہ پر ہکاڑ سکتے۔“ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔

”ہرگز نہیں..... کتے! میرے بازوؤں میں اب بھی اتنا دم ہے کہ میں تیرا خاتمہ کر سکوں۔“ میں نے جنوں خیز لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا اور اچانک ہی میں نے اس کے چہرے کے تارن بدلتے دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت اُبھری اور وہ میرے عقب میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ناقابل یقین منظر دیکھ رہا ہو۔ اچانک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور یکدم میں نے عقب میں سڑک دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اچھل کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اسی لمحے میرے عقب میں سڑک پر لیٹے ہوئے اشفاق شاہین نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھا پستول کا ٹرائیگر پکڑ دیا تھا۔ گولی چلتے کا دھماکا ہوا اور غصہ اور ایک بھیاںک چیخ مار کر اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھے لہراتا ہوا گرا۔ ادھر میرے بجائے اپنے ہی ساتھی کو گولی لگتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اشفاق شاہین کو سانس سو گھٹ گیا۔ میں نے اس کی اس کرب ناک حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے پستول کی نال کا رخ میری جانب موڑنا چاہا مگر میں اس سے پہلے ہی پل کے پل اس کے اوپر گرا۔ میری ایک لات اس کے سر پر پڑی تھی۔ اس کا سر زور سے سڑک پر لگا۔ اس کے حلق سے بھیاںک کراہ خارج ہوئی۔ پستول ہاتھ سے پھوٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

میں ایک لمحے سڑک پر کھڑا ہانپتا رہا، پھر سڑک پر اوندھے منہ پڑے اشفاق شاہین کے بے سدھ دھڑکا جائزہ لیا۔ میں نے چاند کی مدھم روشنی میں سڑک پر خون کے بڑے بڑے دھبوں کی بے ترتیب لکیر دیکھی جو درخت سے ٹکرا کر کھڑی ان کی گاڑی سے ہو کر یہاں آتی محسوس ہو رہی تھی۔

مجھے یہ جاننے میں چنداں دیر نہ لگی کہ اشفاق شاہین گاڑی کے درخت کے موٹے تنے سے ٹکرانے کے بعد ذرا دیر کے لئے زخمی ہو کر نیم بے ہوش سا ہو گیا تھا۔ مگر پھر نہ جانے کس طرح اپنی سخت جانی بچا کر جوش انتقام کے جذبے تلے وہ کسی طرح جیب سے آڑا۔ پھر کسی طرح اپنا ہی گرا ہوا پستول اس کے ہاتھ لگا اور شدید زخمی ہونے کے باعث شاید اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو پایا تو سڑک پر ہی اپنے لہو بہان زخمی وجود کو گھسیٹتا ہوا میرے ذرا عقب میں پہنچ کر اس نے مجھے گولی سے نشانہ بنانا چاہا تھا۔ یہ تو اچانک ہی غصہ کی میرے عقب میں نگاہ پڑی تھی تو میں نے اس کے ایک اکیلی بدلے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر پل کے پل کسی ہولناک خطرے کو بھانپتے ہی نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ عین اس وقت چھوڑی تھی جب اشفاق شاہین نے مجھ پر گولی چلائی، جو بالآخر اس کے مقرب خاص غصہ کے پیٹ میں جا لگی۔

میں نے پستول کو ٹھوکر مار کر پرے سرک دیا اور سب سے پہلے غصہ کی جانب بڑھا۔ وہ بھی گولی کا کر سڑک پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی اور ساکت تھیں۔ میں نے نبض چیک کی، وہ مر چکا تھا۔ پھر میں اشفاق شاہین کی طرف بڑھا۔ وہ بھی آخری سانسوں پر تھا۔

میں نے سنا تھا کہ قسمت کی دیوی ایک بار دروازہ ضرور کھٹکتی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جب انسان یہ محسوس کرنے لگے کہ ایسی تقدیر و خالصتہ تدبیر پر فتح ہو کر ہر محاذ پر انسان کو فتح و کامرانی سے دوچار کرے تو پھر انسان کو کسی محاذ پر بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ بلاتناخیر دشمنوں کے خلاف ڈٹ کر میدان کارزار میں اتر آتا چاہئے۔

میری سب سے پہلی کامیابی نگینہ کو غضبیت کی لاشی عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانا اور اپنے شاہک ترین دشمن کالا ناگ کو گلے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کے بعد شاہ میر میرے اور ماں کے ہاتھوں اپنے بھیاںک انجام کو پہنچ کر زندہ لاش کی مثل قرار پایا۔ اس کے بعد رب نواز کے خلاف مہم کامیابی سے ہیکٹار ہوئی اور اب اشفاق شاہین اور غصہ بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔

میں سمجھتا تھا کہ اب نظر حیات ہی میرا ایک اہم دشمن باقی بچا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کیر کا کیلاشی عامل سے ٹکڑ جوڑ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہ تھا۔

یہ ٹکڑ جوڑ ممکن ہے پہلے پہل اس نے اپنی خلاصی کے لئے کیا ہو۔ مگر اب جبکہ نگینہ بھی کیلاشی مہم کے غصہ اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی اس لئے کیر کے ہاتھ میں میرے خلاف، میری اور نگینہ کی راہ ٹھنک کرنے کے لئے عامل عاروب کی صورت ایک موثر ہتھیار آ گیا تھا۔

اخبارات میں غصہ اور اشفاق شاہین کی موت کی خبر آچکی تھی۔ اسپیشل فورس نے دونوں کی ہاسرار ”موت کا یہی سبب نکالا تھا کہ دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی اور پھر سخت مقابلے کے بعد

ہڈی کے درخت سے ٹکرانے کے باعث اس کی پسلیاں بری طرح مجروح ہو چکی تھیں۔ سر پھٹا ہوا تھا۔

نادر سے خون بہہ رہا تھا۔

اچانک اشفاق شاہین کے بے سدھ وجود نے ایک تشنجی جھٹکے کے ساتھ ہچکی لی اور اس کی روح قفسِ فانی سے پرواز کر گئی۔

خس کم جہاں پاک..... شرم ناک اور گھٹاؤنا دھندا کرنے والے یہ دونوں ابلیس صفت جہنم واصل ہو چکے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور بریف کیس اٹھالیا اور اپنی جیب کے بونٹ پر رکھ کر اٹھ کھڑا۔

اس کے اندر دونوں کے پاسپورٹ وغیرہ موجود تھے۔ دو عدد ہوائی ٹکٹ بھی تھے۔ کچھ کریڈٹ کارڈز کے علاوہ سوئس بینک کی چیک بکس اور کتا بچے بھی نظر آئے۔ خاصی تعداد میں امریکی ڈالرز بھی تھے۔ گویا دونوں امریکہ فرار ہونے والے تھے۔

میں نے بریف کیس وہیں پھینک دیا اور اپنی جیب کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

اس اعصاب شکن اہم ترین مہم کو کامیابی کے ساتھ سر کرنے کے بعد میں گرین لاج پہنچا اور ماں کو یہ فحش خبری سنا دی کہ اب غصہ کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن چکا ہے۔ اگلے اعظم کو بھی میں نے اشاروں کنایوں میں آگاہ کر دیا تھا۔

غصہ کے سلسلے میں نظر حیات کی ہم ماں بیٹے کو قانونی جال میں پھنسانے کی جو دیرینہ آرزو تھی وہ اب ختم ہو چکی تھی۔ ”سرائے سیاں“ میں نظر حیات کو فحشی طور پر نارج کرنے کے بعد میں اب اس کے دوسرے مرحلے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اگلے دن میرا سارا وقت نال میں گزرا اور شام ہوتے ہی میں نے ہڈی کا رخ کیا۔

میں نے سنا تھا کہ قسمت کی دیوی ایک بار دروازہ ضرور کھٹکتی ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ جب انسان یہ محسوس کرنے لگے کہ ایسی تقدیر و خالصتہ تدبیر پر فتح ہو کر ہر محاذ پر انسان کو فتح و کامرانی سے دوچار کرے تو پھر انسان کو کسی محاذ پر بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے۔ بلاتناخیر دشمنوں کے خلاف ڈٹ کر میدان کارزار میں اتر آتا چاہئے۔

میری سب سے پہلی کامیابی نگینہ کو غضبیت کی لاشی عامل عاروب کے شیطانی چنگل سے چھڑانا اور اپنے شاہک ترین دشمن کالا ناگ کو گلے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کے بعد شاہ میر میرے اور ماں کے ہاتھوں اپنے بھیاںک انجام کو پہنچ کر زندہ لاش کی مثل قرار پایا۔ اس کے بعد رب نواز کے خلاف مہم کامیابی سے ہیکٹار ہوئی اور اب اشفاق شاہین اور غصہ بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچے۔

میں سمجھتا تھا کہ اب نظر حیات ہی میرا ایک اہم دشمن باقی بچا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹے کیر کا کیلاشی عامل سے ٹکڑ جوڑ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہ تھا۔

یہ ٹکڑ جوڑ ممکن ہے پہلے پہل اس نے اپنی خلاصی کے لئے کیا ہو۔ مگر اب جبکہ نگینہ بھی کیلاشی مہم کے غصہ اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی اس لئے کیر کے ہاتھ میں میرے خلاف، میری اور نگینہ کی راہ ٹھنک کرنے کے لئے عامل عاروب کی صورت ایک موثر ہتھیار آ گیا تھا۔

بانی ہے ادھر ادھر دھکیل کر لے جایا جاسکے۔

ایک ہی میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا۔ اگر نظریات کی رہائش گاہ پر نقب لگانے کے لئے اس چوٹی گھوڑی کو بروئے کار لاتا تو میرا کام بن سکتا مگر مسئلہ یہ تھا کہ اتنے سارے لڑکوں کی موجودگی میں یہ کام مجھے مشکل تو کتنا ممکن ہی نظر آتا تھا۔ اس سزا میں نے نظریات کے ایک مسلح گارڈ کو بھی وہیں کھڑے پایا جو ان پر نظر رکھے ہوئے مگر خاموش رہا تھا۔

میں ابھی پودوں کی آڑ میں دبکا اپنے ہونٹ باہم پیوست کئے کوئی ترکیب لڑانے کی سوچ ہی رہا تھا تاہم ایک لڑکے کے موبائل کی بیل گنگنائی۔ اس نے موبائل نکال کر کان سے لگایا اور کہا۔ ”ہیلو!“ میری نظریں اس لڑکے کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے چہرے پر غصے کی لہر اُبھرتے دیکھے۔ اس کے بعد اس نے غصیلی آواز میں گالی دیتے ہوئے کہا۔

”ان حرام زادوں کی تو..... اکرم! تم فکر مت کرو، ہم ابھی پہنچتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جلدی موبائل آف کیا اور اپنے ساتھیوں سے با آواز بلند بولا۔ ”منج بھانا پر بیتر لگاتے ہوئے مخالف تنظیم ہاروں سے ہمارا جھگڑا ہو گیا ہے۔ چلو..... جلدی کرو۔“

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ سب لڑکے جھنڈے اور بیڑ وہیں پھینک کر ایک طرف دوڑ پڑے۔ اہل یکبارگی مسرت کی لہر تلے زور سے دھڑکا۔ شاید ان لڑکوں کے دوسرے ساتھیوں کا کسی مخالف تنظیم ہاروں سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ سب بل کے بل دوڑ پڑے تھے۔ میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ فوری میری نظریں قریب کھڑے مسلح گارڈ پر بھی جبی ہوئی تھیں۔ وہ بھی چند ثانیے وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا اس کے بعد اپنا سر جھٹکتے ہوئے وہاں سے پلٹ گیا۔

میں نے اطراف میں ایک نگاہ ڈالی اور چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے ابھرا اور چوٹی گھوڑی کی طرف بڑھا۔ پھر چوٹی گھوڑی کو آہستہ آہستہ دھکیلے ہوئے باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ کسی بھی لڑکے گارڈ دوبارہ یہاں آ سکتا تھا۔ اس اندیشے کی خاطر میں نے ایک قلیل وقت مقرر کیا اور پھر تیزی سے ساتھ چوٹی گھوڑی پر چڑھتا ہوا باؤنڈری وال تک جا پہنچا۔

اس کے بعد نہایت احتیاط کے ساتھ میں نے منڈیر پر ایک قدم جمایا اور اس خم دار آہنی بریکٹ پر لگی ہمارے نو لادری باز میں اٹھنے بغیر میں نے دوسری جانب ایک ایک کر کے اپنے دونوں پاؤں جمائے اور پھر پختہ سے نیم تاریک خلا میں کود گیا۔

میں نے کریپ سول کے جوتے پہن رکھے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے کودنے سے کچھ زیادہ دھک نہیں اُبھری تھی۔ تاہم پھر بھی میں چند ثانیے وہیں دبکا اطراف میں ”مشتبہ“ سن گن لیتا رہا۔ مگر ہر سو کوئی خطرہ نہ تھا۔ گویا سب ٹھیک تھا۔

میں ایک قسم رہ گیا تھا۔ باہر چوٹی گھوڑی کا دیوار کے ساتھ لگ رہنا گشتی گارڈ کو شک میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہی گارڈ وہاں آ کر چوٹی گاڑی کی پدلی ہوئی جگہ کو دیکھتا۔ بصورت دیگر دوسرے گارڈ کو علم نہ کہ یہ ”گھوڑی“ کچھ دیر پہلے کہاں ”کھڑی“ تھی۔

میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے چہرے پر رومال کی نقاب چڑھا لی۔ بہر طور اب میں اندر داخل ہو چکا تھا۔ میں نے آگے پیش قدمی کی۔ سامنے وسیع و عریض لان تھا جہاں چھوٹے سائز کے پائپوں کی لکڑی روشن تھیں۔ مجھے کتوں کا بھی خدشہ تھا اس لئے میں نہایت احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا۔ میں

دونوں ہی ایک دوسرے کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کیونکہ اشتقاق شاہین کے پستول کی چلائی ہوئی گولی سے ہی غور ہلاک ہوا تھا۔ جبکہ اشتقاق شاہین کی موت ایک سیڈنٹ قرار دی گئی تھی۔

شام کی ملگجھاٹ رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی جب میں پنڈی پہنچا۔ نظریات جس علاقے میں رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے قریب ہی ایک کیراج میں اپنی جیب روکی اور ٹیونک کرانے کے بہانے اسے وہیں چھوڑ کر پیدل ہی آگے چل پڑا۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ کیراج والے نے مجھے بارہ سے پہلے آ کر اپنی جیب لے جانے کا کہا تھا۔ ابھی میرے پاس تین گھنٹے تھے۔

غور سے کے جہنم واصل ہونے کے بعد میں اب اور بھی دلیر ہو گیا تھا۔ انسپکٹر اعجاز شمس کی طرف سے اب مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ تاہم مجھے باوجود اس کے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ سرائے سیالپور میں نظریات کو نفسیاتی طور پر مار چر کرنے کے دوران میں نے اسے یہ دھمکی بھی دے رکھی تھی کہ اگر دوبارہ اس کے پاس وہی زندگی اور موت کا کھیل کھیلنے ضرور آؤں گا، اور اس وقت تک کھیلنا رہوں گا جب تک کہ اسے ہلاک نہ کر دوں۔ یقیناً اسے بھی میری دھمکی اچھی طرح یاد ہوگی۔ اور اس کا ہرگز نہایت اپنے سامنے سے بھی ٹھٹکنے پر مجبور کر رہا ہوگا۔

میں سبب تھا کہ جب میں نظریات کی عظیم الشان رہائش گاہ کے ذرا نزدیک پہنچا تو وہاں مجھے غیر معمولی سیوری کا احساس ہوا۔ چار مسلح گارڈز ٹیگٹ پر مستعد کھڑے تھے بلکہ ان میں سے دو تو باقاعدہ رہائش گاہ کے گرد گشت بھی کر رہے تھے۔ باقی ہر سو گہری خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ میری تصویر ان چاروں مسلح گارڈز کو ضرور دکھائی گئی ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے اس طرح مزگشت کرتے دیکھ کر شبے میں مبتلا ہو سکتے تھے۔

میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ عقبی سمت کا رخ کیا۔ رہائش گاہ کے چار اطراف گردش کرنے والے باقی دو گارڈز ایک ایک کر کے رہائش گاہ کا نصف طواف کر کے واپس لوٹ جاتے۔ باقی نصف دوسرا گارڈ طے کرتا۔

عمارت ایک ہی منزلہ تھی۔ عقب میں آ کر میں نے باؤنڈری وال کا جائزہ لیا جو کافی بلند تھی اور منڈیروں پر خم دار آہنی بریکٹ نصب تھے۔ جبکہ ان میں تین رویہ خاردار باز بھی چھتی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ ”الترامات“ دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رکھنا ہو گئی تھی۔ گویا نظریات میری طرف سے بری طرح خوف میں مبتلا تھا۔

بہر طور اب میرے لئے مسئلہ اندر کود کر کسی آرام دہ بیڈ روم میں جو خواب نظریات کی شررگ تک پہنچنا تھا۔ اس نے اپنی حفاظت اور سیوری کا جس قدر سخت بندوبست کر رکھا تھا، اسی قدر میرا اس تک پہنچنا اسے پہلے سے بھی زیادہ ذہنی ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی مار چر کرنا تھا۔

میں اطراف میں بنی کوشیوں اور بنگلوں کی بیرونی دیواروں تک پھیلی ہوئی کیاریوں اور پودوں کی آڑ لیتا ہوا گشتی مسلح گارڈز کی نظروں میں آئے بغیر رہائش گاہ کی تین اطراف پھیلی ہوئی کمپاؤنڈ وال کا بیڑہ جائزہ لیتا رہا تو مجھے شمال مغربی سمت کی دیوار کی طرف اچانک چند نوجوان لڑکے کھڑے نظر آئے۔ ان کی تعداد سات آٹھ کے قریب تھی اور انہوں نے ایک سیاسی تنظیم کے بیڑ، جھنڈے پکڑ رکھے تھے۔ ایک جانب لکڑی کی اونچی ”گھوڑی“ بھی کھڑی نظر آئی۔ وہ کافی بلند تھی۔ اس پر دو رویہ بیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جس پر چڑھ کر بلندی پر بیڑ وغیرہ ایک پول سے دوسرے پول یا دیواروں کی ابھری ہوئی آہنی ”گل میٹوں“ پر پلٹ کر باہر جاتے تھے۔ لکڑی کی گھوڑی کے نیچے چار چوٹی پہنے بھی نصب تھے تاکہ

جہاں موجود تھا، یہ باؤٹری وال اور کوشی کی دیوار کا درمیانی خلا تھا جس نے ایک طویل راہداری صورت میں کوشی کی اصل چار دیواری کو تین اطراف سے گھیرا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر رومال سے نقاب کو ذرا درست کیا اور آخری سرے پر ذرا سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے خوب صورت ڈرائیو سے تقریباً گیسٹ بند تھا۔ اندر کی طرف کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اوپر بالکونی تھی۔ یہ اوپر بنے ہال کمرے کی ہی غالباً بالکونی تھی اور اندر داخل ہونے کا اس مذکورہ بالکونی سے بہت شارت کٹ راستہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کام میں کار پورچ کے نیچے کھڑی گاڑیوں کی جھبٹ پر توجہ کر انجام دے سکتا تھا۔ لیکن اس طرح باہر موجود چونکا کھڑے مسلح گارڈ کی نظر مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔ اس لئے یہ خیال میں نے سر دست رد کر ڈالا۔

گیٹ کے دائیں جانب سینٹ کا بکتر نما کیمین اس طرح بنا ہوا تھا کہ اس کا نصف حصہ باہر اور نصف اندر تھا۔ یوں بڑے گیٹ کے علاوہ ”گارڈ کیمین“ کے اندر اور باہر کھلنے والے دروازوں سے بھی کوشی میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

میں پلٹا، راہداری کا ایک طویل تین چوتھائی چکر کاٹ کر دوسری جانب سے اُبھرا۔ یہاں راہداری کا سرادوسرے لان سے جالمتا تھا۔ یہاں سے گیٹ دور تھا مگر کوشی کا خوبصورت اور ساگوان کی پیش رفت لکڑی والا حراچی چو کھنا صاف نظر آتا تھا اور قریب ہی پڑتل کا مرکزی دروازہ تھا۔ میں نے رومال کی نقاب کے افق سے گیٹ کی طرف دیکھا، مجھے ابھی وہاں کھڑے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک میں نے بائیں کی گاڑی کے ہارن کی آواز سنی۔ میں ذرا ٹھٹکا۔ ٹھیک اسی وقت گارڈ کیمین میں انٹر کام سسٹم کی تیلی جلی گونگی۔ ذرا دیر بعد گیٹ کھول دیا گیا۔

ایک کار اندر داخل ہوئی اور دوسرے ہی لمحے کوشی کے داخلی دروازے سے میں نے کبیر کو نکلتے باہر نکلتے دیکھا۔ کار حراچی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔ میں دیوار کی آڑ کے عقب سے نظریں بٹھائے ہوئے تھا۔ تب میں نے کار سے تین کیم کیم اور سرخ و سفید افراد کو اترتے دیکھا۔ کبیر ان سے بڑے پرتاک انداز میں ملا۔ میں ان تینوں افراد کے رنگ و روپ سے فوراً ہی یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ ان کا تعلق شمالی علاقے سے لگتا تھا۔ ان کے نقوش چینی اور کوریائی نمونے کے لگتے تھے۔ تاک چینی آنکھیں چند ہی ہوئیں۔ یہ مجھے کیلاشی باشندے لگتے تھے۔ میرا خیال فوراً کیلاشی عامل عاروب کی طرف چلا گیا اور بے اختیار میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عامل عاروب کے تین کارندے نئے محاذ کے ساتھ یہاں آن پہنچے تھے اور ان کی میزبانی کا شرف کبیر کو حاصل تھا۔

وہ ان تینوں کو لئے اندر داخل ہو گیا۔ اب مجھے دو مسلح گارڈز کیمین کے اندر بھی چوس کھڑے نظر آنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت گارڈز کیمین کے دروازے سے میں نے ایک تیسرے گارڈ کو قدرے پوٹھلا ہونے انداز میں نمودار ہوتے دیکھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ یہ وہی گارڈ تھا جسے میں نے باہر کوشی کے شمال مغربی سمت کی دیوار کے قریب کھڑے دیکھا تھا۔

وہ اندر کھڑے اپنے دونوں ساتھی گارڈز سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے ”گارڈز کو تیزی سے حرکت کرتے دیکھا۔ ایک نے سامنے کا رخ کیا تھا جدھر پورچ کی طرف سے راہداری کا سرا اُبھرتا تھا۔ جبکہ دوسرا راہداری کے اس سمت تیز تیز قدموں سے بڑھنے لگا جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔ ان دونوں کی بیک وقت چونکا انداز کی حرکات و سکنات نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ صاف لگتا تھا کہ اس گارڈ نے باہر شمالی دیوار سے لگی کھڑی ”چوٹی گھوڑی“ کو دیکھ لیا تھا اور ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی

یہاں تھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی اندر داخل ہوا ہے۔ ممکن ہے، ایسا اس نے اپنا غدشہ ختم کرنے کی غرض سے بھی کیا ہو۔ مگر مجھے کیا کرنا تھا؟.....

یہی طور پر سوچنے والی بات یہ تھی۔ وہ گارڈ نہایت تیزی کے ساتھ اس سمت آ رہا تھا جبکہ دوسرا گارڈ ہری جانب سے راہداری میں اب تک داخل ہو چکا ہوگا۔ گویا میرے لئے دونوں جانب ”نہ پائے رقتن“ بنائے ماندن“ والا معاملہ پیدا ہو گیا تھا۔

فوری طور پر مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا، میں نے سراٹھا کر کھڑکی کے چھجکے کی طرف دیکھا اور پھر تیزی کے ساتھ کھڑکی کی آہنی گرلوں پر پاؤں اٹکاتا پھساتا ہوا اونچے چھجکے پر جا چڑھا۔ یہ خاصا بلند تھا۔ میں نے ”سلیب“ پر بالکل سپاٹ ہو کر سینے کے بل لیٹ گیا تاکہ نیچے راہداری پر بھی نظر رکھ سکوں۔ مگر ہلکی سلیب پر میرا لمبا چوڑا وجود پوری طرح نہ چھپ سکا۔ چنانچہ قریب کی سمت سے اندر راہداری میں داخل ہونے والے اس گارڈ کی نظروں میں تو میں نہیں آ سکا البتہ عقب سے پورا چکر کاٹ کر آنے والے دوسرے دور سے اُبھرنے والے دوسرے گارڈ نے چھجکے پر مجھے کسی شے کی صورت میں دیکھ لیا۔ مجھے اس کا

بہت چلا جب وہ مذکورہ گارڈ اپنے ساتھی سے ذرا بلند آواز میں بولا۔

”بھیرے!..... تیرے سر کے اوپر والے چھجکے میں مجھے کچھ نظر آ رہا ہے۔ ذرا اُچھل کر تو دیکھنا۔

میں وہی چور تو نہیں ہے جو گھوڑی دیوار سے لگا کر اندر داخل ہوا ہے؟“

اب تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ گویا ساری محنت اکارت چلی گئی۔ اب جو بھی کرنا تھا، بل کے بل کرنا تھا۔ جس گارڈ کی مجھ پر نگاہ پڑ چکی تھی، وہ مجھے گولی کا بھی نشانہ بنا سکتا تھا چنانچہ میں نے چھجکے پر ہلکی کے ساتھ لوٹ لگائی اور گارڈ پر آن گرا۔

اس نے سنبھلنے کی کوشش میں مجھ پر آہنی گن کا کندا رسید کرنا چاہا تو میں نے اس کی کینٹی پر اپنے ٹوٹنے کی زوردار اور پتلی تلی ضرب رسید کر ڈالی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

سامنے سے آنے والا گارڈ یکدم رک کر مجھ پر اپنی گن تانے کھڑا ہو گیا۔ مگر میں نے عقل مندی یہ کہ کر اس کے بے ہوش ساتھی کے بے سدھ وجود کو ایک ہاتھ سے تھام کر اپنی ڈھال بناتے ہوئے

ہرے گارڈ پر اس کی گن تان لی اور غراہٹ سے مشابہہ آواز میں بولا۔

”اپنی گن پھینک دو..... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

وہ تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ کیونکہ میں نے اس کے ہاتھوں ساتھی کے بے سدھ وجود کو اپنے ایک بازو کے حلقے میں خود سے ڈھال بنائے چمٹا رکھا تھا۔

”میں آخری بار کہہ رہا ہوں، گن پھینک دو۔ ورنہ.....“

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میرے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ٹوٹی اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبا چلا گیا.....!

\*\*\*

بوش آیا تو میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت پر مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے اور دونوں بیروں کی بالکون کی مضبوط رستی بندھی ہوئی تھی۔

ایک کشادہ کمرہ تھا۔ میں فرش پر بچھے دبیز قالین پر بے بسی سے گٹھری بنا پیلو کے بل پڑا ہوا تھا۔

منہ منہ پر نظر حیات، سلپنگ گاؤں پہنے بیٹھا میری جانب نفرت انگیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس

ساتھ ہی اس کا بیٹا کبیر بھی براجمان تھا۔ اس کا چہرہ بھی جوش غیظ سے پھنک رہا تھا۔ جبکہ دوسرے

قریب کے صوفے پر تینوں کیلاشی باشندے بھی فروکش تھے اور سنسناتی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔  
نظر حیات بری طرح تلملاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوک میرے چہرے  
رسید کر ڈالی۔ میرا اوپری ہونٹ پھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔ اذیت کی لہر میرے وجود میں نفرت  
چنگاریاں بن کر بھڑکی تھی۔

”تم خود کو بڑا تیس مار خان سمجھتے تھے..... ہے نا؟“ وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر قہر ناک  
میں بولا۔ ”لیکن اب دیکھ لو کہ کس طرح ہم تمہیں حقیر ٹیکڑے کی موت مارتے ہیں۔“  
”چپا! آپ کیوں غصے میں خود کو ہلکان کر رہے ہیں؟“ کبیر نے میری جانب نفرت بھری نظروں سے  
دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔ ”آپ یہاں آرام سے بیٹھ جائیں، اس کے کریا کرم کا بندوبست  
نے کر لیا ہے۔“

نظر حیات قہر و غضب کے عالم میں لرزتا کانپتا ہوا دوبارہ اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔  
”تم لوگوں کا شکار حاضر ہے۔“ باپ کے صوفے پر دھنسنے کے بعد کبیر نے ان تینوں کیلاشی باشندوں  
سے کہا تو نظر حیات چونک کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”کیا مطلب؟..... یہ تو ہمارا شکار ہے بیٹا! ہم اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“  
”چپا! زندہ تو یہ لوگ بھی اسے نہیں چھوڑیں گے۔ آپ بے فکر رہیں۔“ کبیر نے اپنے باپ کو  
دیتے ہوئے کہا۔ ”میرا ان سے معاہدہ ہوا تھا کہ میں نادر علی کو ان کے حوالے کر کے چھوڑ دوں گا۔“  
”مگر بیٹا! یہ لوگ اس کا کیا کریں گے؟..... یہ بہت شاطر اور چالاک انسان ہے۔ اس کے ہم  
میں جن کی روح ہے۔ یہ انہیں بھی چمکے دے کر یہ آسانی نکل بھاگے گا۔ میری مانو تو اسے گولی مار کر  
کی لاش راول ڈیم میں پھینک دو۔“ نظر حیات نے دانت پیس کر کہا۔ وہ میری طرف سے بری طرز  
دہشت میں جٹلا تھا۔

”چپا! آپ بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ کبیر نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ان لوگوں کو آپ  
معمولی نہ سمجھیں۔ آپ بھول گئے، میں انہی لوگوں کی قید میں تو تھا اتنے عرصے۔ پھر ان کے روحانی  
عاروب سے میں نے اپنی جان بخشی کے سلسلے میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ میں ان کے مجرم نادر علی خان کو ان  
کے حوالے کرنے میں ان کی بھرپور مدد کروں گا۔ کیلاشی وادی میں ان کی پوری قوم آباد ہے۔ یہ اپنے  
دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اور ہم ان لوگوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔ آپ بے فکر رہیں۔  
معاہدہ میرے سپرد کر دیں۔ میں نے پہلے سے جال پھیلا رکھا تھا۔“

کبیر نے اتنا کہا اور پھر ان تینوں کیلاشی باشندوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”میں نے اپنا وعدہ پورا  
دیا ہے..... تمہارا شکار حاضر ہے۔“

اس کی بات پر ان تینوں نے ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھا اور اپنی زبان میں کھسک  
کی۔ پھر ایک نے کبیر نے گونجیلی آواز میں ٹوٹی پھوٹی آواز میں کہا۔  
”مگر ہمارا دوسرا شکار ابھی باقی ہے..... وہ کب ملے گا؟“

جواباً کبیر نے کہا۔ ”وہ پرسوں صبح کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ  
اپنے باپ کے علاج کی غرض سے امریکہ گئی ہوئی ہے۔ اس کی رہائش گاہ بھی تمہیں میں نے دکھا کر  
کرادی تھی..... مگر یہ شکار میں سمجھتا ہوں تم لوگوں کے لئے زیادہ اہم ہے۔ پہلے اسے اپنے  
لے جاؤ۔ دوسرا شکار ہاتھ لگنا بہت آسان ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ بہت خطرناک ہے۔ ابھی تم لوگ

”ہاں..... یہ تو ہمارا مجرم ہے۔ اس بد بخت نے ہمارے روحانی پیشوا کو قتل کرنے کی کوشش کی  
فی..... دوسرے نے میری طرف دیکھ کر خوف ناک لہجے میں دانت پیس کر کہا۔  
ان کی گفتگوں کو میری کنپٹیاں بری طرح سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی کبیر کے بھیا نک  
دائم بھی کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ ان کا آپس میں ”دوسرے شکار“ کے متعلق سوال جواب کرنا مجھے سخت  
توہین میں جٹلا کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے بخوبی اور اک تھا کہ ان کی دوسرے شکار سے مراد لامحالہ نگینہ ہی ہو  
سکتی تھی۔ اور مردود کبیر کا یہ کہنا کہ دوسرے شکار کا ہاتھ لگنا آسان تھا، مجھے سخت تشویش میں جٹلا کر رہا تھا  
اور یہ بات حقیقت بھی تھی کہ نگینہ ان کے بھیا نک عزائم سے ناواقف تھی اور یہ آسانی ان خبیثوں کے ہاتھ  
لگ سکتی تھی۔ میرے وجود میں کبیر کے خلاف نفرت کی ایک طوفانی لہر ابھری اور میں نے رن بستہ ہونے  
کے باوجود قتل کے بل دھاڑ کر کبیر سے کہا۔  
”سنتے!..... اگر نگینہ کا بال بھی بیکا ہوا تو میں تجھے بھیا نک موت سے دوچار کروں گا۔ سن لے کان  
کھل کر اچھی طرح ٹو۔“

میری دھمکی پر نظر حیات کے چہرے پر ہلکی تشویش کی لہری ابھری تھی۔ مگر کبیر بڑی طمانیت سے مسکرا  
کر بولا۔ ”ممکن ہے تمہاری بدروح مجھ سے انتقام لینے کی کوشش کرے۔ مگر نادر! میں تمہیں جس کے  
نالے کر رہا ہوں، تم اسے اچھی طرح جانتے ہو..... وہ انسان کی روح کو نہیں چھوڑتا۔“  
”آگے کیا ہوگا، اس کا تجھے کیا پتہ؟“ میں نے نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”کس کی جان جاتی ہے اور  
کس کی بچتی ہے، اس کا فیصلہ تو کیسے کر سکتا ہے؟“  
”اسے لے جاؤ۔ ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔“ اس بار نظر حیات نے بھر کر ان تینوں کیلاشی  
باندھوں سے کہا۔ اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔  
”ہم ابھی اسے ادھر اپنے خفیہ ٹھکانے پر رکھیں گے۔ جب دوسرا شکار بھی ہمارے ہاتھ آجائے گا تب  
اپنی وادی کا رخ کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے دیکھا، کیلاشی کی بات سن  
کر باپ بیٹھا کچھ بے چین سے نظر آنے لگے۔ تب پھر کبیر نے کھڑے ہو کر ان سے کہا۔  
”تم نہیں جانتے، یہ کس قدر خطرناک انسان ہے۔ بہتر یہی ہو گا اسے یہاں کہیں اپنے کسی خفیہ  
ٹھکانے میں ریغمال بنانے کی بجائے فوراً اپنی وادی میں لے جاؤ۔ اگر یہ تمہاری قید سے نکل گیا تو ہم سب  
اگر شکر کر دے گا۔ کیا تم اپنے پہلے دو ساتھیوں کا انجام بھول گئے؟“  
نئے کبیر کے لہجے میں چھپی تشویش اور بے نام خوف کی جھلک صاف محسوس ہوئی تھی۔  
”یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم چھوڑو ان باتوں کو۔ چلتے ہیں اب ہم۔“ ایک کیلاشی نے روکھے لہجے میں کہا  
میں نے دیکھا، کبیر اور نظر حیات بے بسی سے دانت پیس کر رہ گئے۔ صاف نظر آتا تھا کہ ان دونوں  
بہت بلب بیٹوں کو ان تینوں کیلاشیوں کی فرمائش ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔  
ہر طور انہوں نے چپ سادھ لی۔  
ایک کیلاشی نے مجھے پوری کی طرح اٹھا کر کاندھوں پر لا دیا اور پھر یہ سب لوگ باہر آ گئے۔ ایک  
انجیب باہر موجود تھی۔ مجھے غبی دروازہ کھول کر سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا۔ ایک کیلاشی وہیں  
انجیب باہر آجماں ہو گیا جبکہ بانی دونوں اگلی سیٹوں پر سوار ہو گئے۔ جب کے اشارت ہونے کی  
پر اٹھ ابھری اور پھر وہ ایک جھٹکے سے ریورس ہوئی ہوئی گیٹ سے باہر نکلے۔ اس کے بعد ذرا رک

اور جب اچانک ہی دوسری سمت سے قدموں کی چاپ ابھری اور اگلے ہی لمحے دروازہ زوردار جھٹکے۔ میں نے غیر ارادی طور پر پلٹنا چاہا مگر اسی وقت کسی نے میری پشت پر لات رسید کر دی اور میں بلی ڈرا دور فرش پر جا پڑا۔ میرے حلق سے بے اختیار کراہ آمیز آوازیں برآمد ہو گئیں۔

بلے کے بل ڈرا ہٹ کر میں نے دیکھا تو ان تینوں کیلاشیوں میں سے ایک کو ہاتھ میں پستول لئے اپنی طرف خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے پایا۔ مجھے سانپ سونگھ گیا۔ میرا خیال غلط ثابت ہوا۔

چم میں میرے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

مجھے پپ..... پیاس لگی تھی۔ میں نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ بند دروازے پر زور آزمائی کا کوئی جواز پیش کرنا لازمی تھا۔

پری بات پر وہ غراہٹ سے مشابہہ آواز میں بولا۔ ”یہاں کسی قسم کے کھانے پینے کی توقع نہ رکھو۔“

لیکن مجھے..... چند گھنٹ پانی تو ملا دو۔“ میں نے کہا۔

”اس بند کرو اپنی۔“ وہ عصبی آواز میں گھور کر بولا۔ ”اور ہاں..... اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت، ورنہ مار مار کر بھر کس نکال دوں گا تمہارا۔“ یہ کہہ کر اس نے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ دروازہ کی آواز سے بند ہوا تو اچانک میری ساتوں سے ایک چھکتی، ٹھنکتی آواز نکلائی۔ بالکل ناچیسے کوئی تکن پختہ فرش پر گرنے کی آواز ابھری ہے۔

میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو مجھے ایک گول رنگ (Ring) پڑا نظر آیا۔ میں بہ غور اسے نکلے۔ بولادی رنگ یقیناً دروازے پر لٹو سے اکھڑ کر گرا تھا۔ اور ایسا دروازہ زور سے بند کرنے کے ہوا ہوگا۔ شاید یہ ڈھیلا تھا۔ لیکن میں اس کا کیا کرتا؟..... تب پھر اچانک میری نگاہ دروازے پر پڑی۔ لٹو کے عقب میں رخسہ نظر آیا جو غالباً رنگ کے اکھڑ کر گرنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

میں کچھ خاص فرق محسوس ہوا۔

میں یہ مشکل دروازے تک آیا اور ذرا جھک کر لٹو کے عقب میں بنے اس آہنی رخنے کو دیکھنے لگا۔ یہ رنگ گرا تھا۔ کمرے کے اکلوتے بلب کی روشنی میں مجھے رخنے والی جگہ پر ایک کند فولا دی ابھری ہوئی دکھائی دی۔ میرے ذہن میں یکبارگی ایک خطرناک خیال ابھرا۔ اگر میں اپنی ناک میں بندھی رستی کو کسی طرح اس تیز دھار پر رگڑتا تو یہ ممکن تھا کہ میری پیٹھ پر رستی کٹ جائے۔

”خطرناکی“ کا عنصر یہ تھا کہ رستی کو زور سے رگڑنا تھا اور ایسی صورت میں دروازے پر زور لگا کر رستنے سے آواز ابھرتی اور باہر کہیں قریب موجود دشمن باخبر ہو سکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اس بار دروازے سے زور آزمائی کرتے دیکھ لیتا تو میرے دونوں پیروں میں رستی باندھ دی جاتی اور میں شام بے بس ہو کر رہ جاتا۔

اس خطرے کو اگر میں خاطر میں لاتا تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہی بیٹھا رہتا۔ چنانچہ میں نے فی الحال کوشش کو ترک کرنا ہی مناسب سمجھا۔ رات کے کسی نصف پہر میں یہ عمل کرنا زیادہ مناسب تھا کہ ہو سکتا ہے، اس کے دو ساتھی کہیں چلے گئے ہوں اور یہاں ایک ہی پہرے دار موجود ہو۔

میں نے صبر کا دامن ہاتھ میں تھامے رکھا اور دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر دیوار سے پشت نکائے۔ ابھری نظریں کھڑکی کے بار مقدور پھر آسمان پر جمی ہوئی تھیں جہاں شام کی ملجاہٹ رات کی تیرگی

کر آگے نامعلوم منزل کی طرف بڑھ گئی۔ میں اپنے گھڑی بنے وجود کے ساتھ جیب کے عقبی حصے پر فرش پر پڑا بری طرح چل رہا تھا۔ مجھے اس بات کی تسلی تو تھی کہ سردست یہ مجھے فوری طور پر اپنے ساتوں کیلاش وادی لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ان کے آئندہ منصوبے کے مطابق یہ لوگ گنیز پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے اور اس کے بعد یہ ہم دونوں کو لئے کیلاش وادی روانہ ہونے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں ان کا خطرناک مجرم تھا اور ان کی نظروں میں میرا ناقابلِ طعنی جرم یہ تھا کہ میں نے ان کے بدخصلت روحانی پیشوا عامل عاروب کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ میرے ہاتھوں مرتے مرتے تھا۔ جبکہ گنیز کا معاملہ اپنی جگہ سنگین تھا۔ وہ مردود کیلاش عامل عاروب گنیز کو اپنے ”داہولا مزی“ نامی خود ساختہ دیوتا کے آگے قربانی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ گویا ہم دونوں ہی کی زندگیاں شدید خطرے سے دوچار تھیں۔ لیکن مجھے خود سے زیادہ گنیز کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

وہ پہلے سے ہی جاں گسل حالات سے گزر رہی تھی اور اپنے باپ شاہ میر کی زندہ لاش واپس لا رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں اس کے خلاف کس قدر بھیاں ک سازش تیار کی گئی تھی۔ اگرچہ کیلاشی مہم کے دوران ہم جن کڑے حالات سے گزر کر یہاں پہنچے تھے اس کے ہنگامہ خیز روزِ دُشرب اس کے ذہن میں بھی ابھی تازہ ہوں گے۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اس کی قیمت ہم دونوں سے چکانی جانے والی تھی۔

میں بے شک رسیوں سے بندھا ہوا تھا لیکن میں نے باوجود اس کے یہ پختہ عزم کر رکھا تھا کہ میں عامل عاروب کے ان تینوں کارندوں کو اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ اور شاید ان سے اس ”خطرے“ کا لہن دونوں سانپ اور سنپولے باپ بیٹوں کو بہ خوبی ادراک تھا۔

اب برقیلے پہاڑوں کا علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد جیب ایک ویرانے میں ایک کانٹے باہر کی۔ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ انہوں نے مجھے جیب سے نکالا اور مکان کے اندر ایک کمرے میں بند کر دیا اور دروازہ بند کر کے کمرے سے نکل گئے۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر وہاں پڑا رہا تھا۔

راہ فرار کی ابھی تک کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں کو بھی نہ لگا کر کھولنے اور توڑنے کی سعی کی تھی مگر کامیاب نہ ہو پایا تھا۔

عالم تشویش کی ان گھڑیوں میں مزید وقت سرکا اور شام ہو گئی۔

مجھے حیرت تھی کہ ابھی تک کوئی بھی اندر میرے کمرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔

’آخر یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟‘ میں الجھ کر سوچنے لگا۔ ’کہیں یہ لوگ مجھے یہاں دور برف والے ویرانوں میں بھوکا پیاسا چھوڑ کر واپس کیر کی میربانی کا شرف حاصل کرنے اور گنیز کی صورت میں دوسرے شکار پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نظر حیات کی رہائش گاہ پر ڈیرا تو نہیں ڈالے بیٹھے تھے؟‘

ممکن تھا کہ میرا یہ خیال درست ہی ہو۔ اس خیال نے جہاں مجھے انجان سی تشویش میں مبتلا کر رکھا وہاں پہلی بار ایک موہوم سی امید بھی پیدا ہو چلی تھی کہ اب میں اس منحوس کامیج میں تنہا تھا۔ گویا میں پورے اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کر سکتا تھا۔

لہذا یہ سوچتے ہی میرا ذہن پہلے سے بھی تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔ میں دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے دونوں ہاتھ کلائی کی طرف سے بائیں بائیں گئے تھے مگر میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آزاد تھیں۔ میں سب سے پہلے پشت کے بل دروازے کے لٹو کو گھما کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین جھٹکے دیئے۔ دروازہ مضبوطی کے

میں بدل رہی تھی۔

مزید دو تین گھنٹے اس صبر و خاموشی کے ساتھ بیت گئے تو میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے لگا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکا۔ چند ثانیے باہر کی طرف دیکھ کر رہا۔ سناٹا پا کر میں پشت کی طرف گھوما..... میری انتہائی کوشش یہی تھی کہ دروازے پر کھڑا ہونے سے پہلے اپنے دل کو تھکا دے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنی سی ”کوشش“ شروع کر دی۔ ذرا رکوع کے بل جبکہ کمر میں نے لٹو کے عقبی کندھار پر رگڑنا شروع کر دیا۔ احتیاط کے پیش نظر پورا زور نہیں لگا رہا تھا۔ رتی بالکل انداز میں رگڑ کھانے لگی جس کا مطلب تھا کہ رتی پر اب تک ذرا سا بھی جھکا نہیں لگا تھا۔ بہ صورت رتی کا اگر ایک ”ریشہ“ بھی اڑھڑ جاتا تو وہ ”رف“ انداز میں رگڑ کھاتی اور مجھے بھی اپنی امیدیں بھرنے آنے کا تھوڑا بہت احساس ہوتا۔

چنانچہ میں نے زور بڑھا دیا اور دروازے پر تھوڑی کھڑ بڑا ہٹ اُبھری۔ میں نے یکدم اپنی ترک کر ڈالی۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ میں چند ثانیے باہر کی طرف گن لینے کی کوشش کرتا ہوا دوسری جانب اٹھا خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے دوبارہ کوشش شروع کر دی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اس رگڑ سے رتی کھر در رہی ہوگی تھی۔ میرے اندر ایک ایسی امید بھری مسرت کی لہر اٹھی۔ میں نے اگلیوں کی مدد سے رتی کو چھوا۔ اس کچھ ریشے اڑھڑے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

لگا تار کوئی نصف پون گھنٹے کی محنت نے مجھے تھکا ڈالا۔ میں ذرا سستانے کے لئے واپس اپنی جا کر بیٹھ گیا۔ وقت گزر رہا تھا۔ صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے رہ گئے تھے۔ اور نگینہ..... نگینہ کی کئی ہی کی واپسی کی فلائٹ تھی۔ نہ جانے ان بد بختوں نے اسے کہاں اور کس جگہ سے کڈنیپ کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا؟..... مگر میں تو اس سے پہلے ہی ان مردودوں کو ان کے گھتاؤ نے منصوبے سمیت ڈھیر کر چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر ہانپنے اور سستانے کے بعد میں پھر دیوار کا سہارا لئے ابھی کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ سامنے وہی کیلاشی کھڑا تھا جس نے کچھ دیر قبل میری پر لٹات رسید کی تھی۔

اسے دوبارہ دروازے پر دیکھ کر یکبارگی میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ بڑی تیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں یہ بد بخت میرے ہاتھ میں بندھی رتی کاٹ لینے کی کوشش نہ کرے۔ ورنہ اسے اڑھڑے ہوئے ریشے نظر آ جاتے اور وہ ٹمک میں جپٹا ہو سکتا تھا۔ شاید وہ اپنے اطمینان کی خاطر آیا تھا۔ میں نے لہجہ میں بے چارگی سموتے ہوئے ایک بار بار سے کہا۔ ”مجھے پیاس لگی ہے، پانی تو پلا دو۔“

مگر اس نے بڑی نفرت کے ساتھ مجھے دیکھ کر ”ہنہ“ کہا اور دوبارہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ میں نے بے اختیار طمانیت کی سانس خارج کی۔ میرے ذہن نے اس کی اچانک مگر ”خاموش“ پر یہی محمول کیا تھا کہ وہ شاید آخری بار اطمینان کرنے کے بعد اب اپنی جگہ پر جا کر سونے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے بھی مزید نصف گھنٹے کے لئے اپنی ”کوشش“ مؤخر کر ڈالی۔ پھر خاصی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالآخر کافی دیر بعد میری پیچم کوشش رنگ لائی اور رتی

دوئوں ہاتھ اب آزاد تھے۔ میں نے اپنی کلائیوں کو سہلایا۔

میرے سینے میں اب مسرت کے علاوہ جوش کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ میں دشمنوں کی گردن کاٹنے کے لئے اب بری طرح بے چین تھا۔ قید و بند سے مفکر کی طرف میری کوششوں کا یہ پہلا مرحلہ اب ختم ہو چکا تھا۔

اب اس کمرے سے نکلنا باقی تھا۔ ظاہر ہے، میں دروازے پر دستک دے کر تو نکلنے سے رہا۔ تاہم اس کا دوسرا حل سوچنے لگا۔

اس کے لئے میں دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر سابقہ پوزیشن میں اپنے دوئوں ہاتھ پشت کی سمت کر کے اسی طرح بیٹھ گیا گویا میرے دوئوں ہاتھ ہنوز جکڑے ہوئے تھے۔ اگر کوئی اچانک میرے کمرے میں دروازے پر آئے پتہ بھی نہ چلے۔

رات شاید اپنے آخری پہر پر تھی۔ ایک تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور اب دوسری تدبیر کرنا تھی۔ کمرے سے نکلنے کی اب دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں دوبارہ دروازے پر کھڑ پڑ کروں یا پھر زور زور سے نکلنے کے لئے چلاؤں اور سامنے آنے پر اس کیلاشی کو چھاپ لوں۔

دوسری صورت یہ ذہن میں آتی تھی کہ میں اطمینان سے کسی کے اندر داخل ہونے کا انتظار کرتا اور پھر اس کے سے ان پر قابو پانے کی کوشش کرتا۔

مگر انتظار مجھ سے نہیں ہو رہا تھا۔ میرے پاس اب بہت کم وقت بچا تھا۔ صرف چند گھنٹے یا شاید اس سے بھی کم۔ ایسے میں ذرا سی بھی جلد بازی سارے کئے کرانے پر پانی پیچھ سکتی تھی۔ میں ایک بار پھر غور کرنے لگا۔ بالآخر یہی سمجھ میں آیا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ لہذا یہ سوچ کر میں اٹھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے کے لٹو کو پکڑا اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔ دروازے پر اگر میں دوئوں ہاتھوں سے ”دھکم“ مارتا تو یقیناً پتہ چل سکتا تھا کہ میرے دوئوں ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ یوں وہ چوکتا ہو جاتے۔

مگر اب اس کم از کم وہ اس زعم میں تو ہوتے کہ میرے دوئوں ہاتھ ابھی تک جکڑے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک میں اسی طرح دروازے کو کھڑکھڑاتا رہا۔ مگر مجھے خاصی حیرت ہوئی کہ خاصی دیر تک کسی نے مجھے ادھر توجہ نہ دی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ گہری نیند سو رہے ہوں۔ تب میں نے یہی مناسب سمجھا کہ مزید کرنے کی بجائے زور زور سے چلا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرنا ہی زیادہ بہتر تھا۔ چنانچہ ابھی میں نے ہاتھ کھولا ہی تھا کہ اچانک میری ساعتوں میں کسی گاڑی کے انجن کی گھر گھر اہٹ اُبھری۔ میں یکدم اپنے میں آ گیا اور ساتھ ہی ایک سنسناتا ہوا خیال اُبھرا۔

”کیوں یہ لوگ اپنے دوسرے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے روانہ تو نہیں ہو رہے؟“ میں نے زور زور سے چلا نا شروع کر دیا۔ ”پانی..... مجھے پانی چاہئے..... سخت پیاس لگی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے ناچار دوئوں ہاتھوں سے دروازے کو دھڑکھڑاتا شروع کر دیا۔ اس کے بعد دیر کو کس گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ گاڑی کی آواز دور دور جاتی ہوئی سنائی دی۔

”کیا یہ لوگ چلے گئے تھے؟..... نگینہ اب ان کے ہاتھوں اغواء ہونے والی تھی؟“ میرے دل و دماغ میں اذیت ناک خیال اُبھرا۔

لیکھت میرا دل کنپٹیوں میں ٹپک اسی وقت دروازے کے باہر قدموں کی آہٹ اُبھری جسے سن کر لکھت میرا دل کنپٹیوں میں ٹپک لگا۔ میں ایک طرف ہو گیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ گویا ان کا ایک ساتھی ادھر ہی رہ گیا تھا۔



انہوں نے غور و خوض کے بعد میں نے یہی سوچا کہ جس راستے سے یہ لوگ آئے تھے اور پھر دوبارہ  
میں نے بھی اس راستے پر آگے بڑھنا چاہیے۔ کیونکہ پھر دوبارہ (نگینہ سمیت) ان کی واپسی بھی اسی  
رستے ہو سکتی تھی۔

میں گہری اور الجھن آمیز تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا پڑے گا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ صبح کی سپیدی اب روشنی میں بدل رہی تھی۔ میں نے وقت

بہر طور یہ تجویز مجھے زیادہ بھائی تھی۔ لہذا میں نے رائفل سنبالی۔ گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی اور نام لے کر اس اکلوتے راستے پر آگے بڑھ گیا۔

\*\*\*

اس بار میرے ستارے گردش میں نظر آ رہے تھے۔

گلیئہ کے واپس ملک پہنچنے کے بعد میری خوشی ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے کھاتے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں بھر بھری مٹی والے راستے پر مٹی کے تودے درمیان برف کے کندن رہنے بھی چک رہے تھے۔ میں خاصی دیر تک بغیر رُکے چلتا رہا۔ تجربے مفور کی تلاش کی طرف سے بھی اچانک حملے کا دھڑکا لگا ہوا تھا کیونکہ اس کے دوسرے ساتھیوں کے کے بعد بازی ہلک کر کسی حد تک میرے حق میں ہو گئی تھی اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ مگر اس کے ساتھی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے بھی میری طرح اس راستے کا انتخاب کیا ہوتا کہ راستے میں ہی دونوں لوٹنے ہوئے ساتھیوں سے مل کر وہ انہیں موجودہ صورت حال سے آگاہ کر دے۔

مجھے اب اپنی اس موجودہ پیش قدمی کا خیال بروقت اور درست ہی معلوم ہوا تھا۔ میرے انداز کے مطابق اب دس بج چکے تھے۔ گویا اب تک عامل عاروب کے ان دونوں کارندوں نے گلیئہ کو لیا ہو گا یا اغواء کرنے والے تھے۔ اگر وہ دونوں غبیث اپنے مذموم مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے تب بھی انہیں واپس یہاں تک پہنچنے میں دو سے تین گھنٹے درکار تھے۔

اچانک میں چلتے چلتے ٹھک کر رک گیا۔ ایک آواز میرے کانوں سے نکرائی تھی۔ بڑی بڑی آواز تھی۔ مجھے چونکہ تیسرے مفور دشمن کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا تھا اس لئے میں اپنے سامنے چوکنہ ہو کر ہل رہا تھا۔

میں نے رک کر آواز پر ذرا غور کیا تو یہ آواز مجھے اپنے دائیں جانب ایک قدرے اونچے نیلے محسوس ہوئی۔ تاہم آواز میں کرب کا تاثر موجود تھا۔

میں نے فوراً مذکورہ نیلے کی طرف رخ کیا۔ نیلا زیادہ وسیع نہ تھا۔ اس کی ڈھلان پر بھی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ ذرا قریب پہنچنے پر میں بری طرح ٹھکا۔ دو افراد مجھے زخمی حالت میں پڑے ہوئے ملے۔ میں جلدی سے ان کی طرف لپکا۔ یہ غوران کی طرف دیکھا۔ یہ دو جوان سالہ تھے۔ نو عمر ہی تھے۔ لڑکی کے مقابلے میں لڑکا زیادہ زخمی اور ہولناک نظر آ رہا تھا اور اس کا جسم ساکت تھا۔ جبکہ لڑکی زخمی حالت میں کراہ رہی تھی۔

دونوں نے قیمتی مگر مقامی پوشائیں پہن رکھی تھیں۔ میں سب سے پہلے لڑکی کی طرف بڑھا۔ خوب صورت تھی۔ بال ہلکے براؤن تھے۔ اس نے فر کا قیمتی لباس پہن رکھا تھا اور پیردوں میں لالٹ تھے۔ ذرا دیر کے بعد اس کا سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

میں نے جلدی سے اس کی نبض چیک کی اور سینے کی دھڑکنیں سنیں۔ وہ ابھی زندہ تھی مگر بے ہوش گئی تھی۔ میں نے فوراً لڑکے کی طرف رخ کیا۔ وہ بھی ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ مجھے دونوں لڑکیوں کی صورتوں میں بہن بھائی کی مماثلت محسوس ہوئی۔ میں نے لڑکے کی نبض چیک کی اور دھڑکنیں افسوس ناک انکشاف ہوا کہ وہ جان کی بازی ہار چکا تھا۔

ناچار مجھے بے ہوش پڑی لڑکی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس برف زار ویرانے میں مجھے کیا کرنا تھا؟..... یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مگر میں لڑکی کو زخمی حالت میں چھوڑ کر بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔

مگر وہاں نہیں کر رہا تھا کہ میں ایک انسان کو یوں موت و زیست کی کشش میں چھوڑ کر اپنی راہ لیتا۔ ان دونوں بے چاروں پر کسی نے قیامت ڈھالی تھی؟

میں نے عمر میں سال کے قریب لگتی تھی جبکہ لڑکی بہ مشکل سترہ اٹھارہ کے بیٹے میں نظر آتی تھی۔ میں نے زخموں کا جائزہ لیا۔ اس کے صرف سر پر چوٹ تھی اور چہرے پر بھی خراشوں کے نشان نظر آتے۔ گردن پر بھی سرفی مائل لکیریں تھیں۔ جبکہ لڑکے کا سر بالکل پھٹ چکا تھا اور پیشانی بھی ترخی غرائی تھی۔ اور یہی زخم اس کے لئے مہلک ثابت ہوا تھا جس نے بالآخر اس کی جان لے لی تھی۔ زانی سے کچھ یوں لگتا تھا کہ انہوں نے ایک یا ایک سے زائد حملہ آوروں کے ساتھ نبرد آزما کی اور زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکے تھے۔ یوں بھی یہ نو عمر ہی تھے۔ لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی کہ یہ دونوں یہاں اکیلے اس ویرانے میں کیا کرنے آئے تھے؟

کیا ان کا گھر قریب ہی تھا؟..... یہی ایک بات میرے ذہن میں آئی تھی۔

ایک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ میں نے زمین کا یہ غور جائزہ لیا تو مجھے چوڑے تاروں کے واضح نشان دکھائی دے گئے۔ یہ ان کی کسی پرانی قبائلی دشمنی کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔

بہر طور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کم از کم لڑکی کو اٹھا کر واپس کاٹیج کا رخ کرنا چاہئے یا پھر یہاں زخمی آبادی کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں اٹھا اور نیلے کی بلندی پر چڑھ کر چہار اطراف میں ڈھالی۔ تب ایک جانب بہت دور مجھے سبزے اور برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ڈھلان پر چھدری سی لڑکی کے آثار نظر آئے۔

یہاں سے دیکھنے پر وہ قریب ہی محسوس ہوتی تھی۔ ممکن تھا جب میں وہاں کا قصد کرتا تو فاصلہ بول بول پڑتا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک بل کھاتا راستہ بھی اس سمت کی طرف جاتا ہوا ہی رہا تھا۔

میں نے زخمی لڑکی کو فوراً اپنے کانڈھے پر اٹھایا اور اس سمت کا رخ کیا۔ لڑکی کا وجود نازک اور پھول لڑکھا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ابھی میں نے یہ مشکل تھوڑی ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ مجھے سامنے آبادی کی طرف جاتے ہوئے راستے پر گرد و غبار کے بادل اڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں ٹھک کر رک گیا اور یہ غور اپنی آنکھیں کھلیں۔ سامنے کتنے لگا۔ یہ تین چار کے قریب بھاری ہتھیار تھیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ ذہن میں یہی خیال ابھرا کہ شاید ان دونوں بد نصیب بھائی کے وارثوں سے ان کا تعلق ہو۔ یہ بھی اچھا تھا۔ میرا کافی وقت بچ گیا تھا۔ تاہم دل و دماغ کو ایک بے پریشانی بھی لاحق ہونے لگی تھی۔

غور ہی دیر میں تینوں گاڑیاں آدھی طوفان کی طرح اڑتی ہوئی میرے قریب پہنچ کر ایک جھکے ہوئے گئے۔ گرد و غبار کا ایک طوفان سا اٹھا اور پھر میں نے تقریباً دس یا دس نیم مقامی افراد کو دیکھا۔ ان کی پشت سے رائفلوں کی تالوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے انہیں دیکھ کر کانڈھے سے بے ہوش لڑکی کو اٹھا کر آہستگی سے زمین پر لٹا دیا تو وہ لوگ تیزی سے میری جانب بھاگنے لگے۔

ایک لڑکی کی طرف بڑھے اور تب ایک نے جلا کر مقامی زبان میں کہا۔

یہ تو شہزادی صاحبہ ہیں۔

یہ زبان آتی تھی۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ لڑکے کا سن کر ان کے چہرے تاریک ہو

گئے۔ پھر کچھ لوگ میری نشاندہی پر اس طرف دوڑے جہاں بدنصیب لڑکے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی لاش اٹھائے وہاں آگئے اور بیشتر دھانسیں مار مار کر رونے لگے۔

”لالہ مجھے یہ بھی انہی کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ اسے گولیوں سے بھون دینا چاہئے۔“ ایک پڑٹیش لہجے میں نسبتاً دراز قامت اور بازعب شخصیت والے آدمی سے کہا۔ اس کی انگارے برساتی ہونے نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں پریشان ہو گیا۔ بارعب شخص نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا تو میں نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”اگر میں آپ کے دشمنوں کے ساتھ ہوتا تو بھلا میں فرار ہونے کی بجائے لڑکی کو آبادی کی طرف کیوں اٹھا کر لے جاتا؟ میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کی جان بچ جائے۔“

میری دلیل معقول تھی۔ اب ان کے چہروں پر چھائے درشتی کے آثار مذہب اور الجھن آمیز خاموشی میں بدل گئے تھے۔ تاہم باوجود اس کے وہ مجھ سے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

اس بارعب شخص نے مجھ سے گونج دار آواز میں کہا۔ ”جب تک شہزادی بیٹی کو ہوش نہیں آ جاتا اور وہ ہمیں اصل حقیقت نہیں بتاتی، تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔“

اس کی بات سن کر میں بری طرح پریشان ہو گیا۔ مجھے یہ نیکی گلے پڑتی نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے میری بات سننے بغیر مجھے جیب میں سوار ہونے کا حکم دیا اور ناچار مجھے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔

بستی زیادہ گنجان اور بڑی نہ تھی مگر بہر حال زندگی اپنی پوری ہماہمی کے ساتھ متحرک تھی۔ بستی میں کہرام مچ گیا تھا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ یہ دونوں بدنصیب نو عمر لڑکا لڑکی آپس میں واقعی کئے بہن بھائی تھے اور یہاں کے سردار زور آور خان کی اولاد تھے۔ جبکہ وہ بارعب شخصیت سردار زور آور خان کا چھوٹا بھائی وزیر خان تھا۔



سردار زور آور خان کی عمر ساٹھ کے پینے میں تھی۔ مگر اپنی قابل رشک صحت سے ساٹھاپاٹھائی نظر آتا تھا۔ سر اور ہنڈوں کے بال سفید دودھیا تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔

ارباب فریب ڈھلوانی کھیریل کی چھتوں والے جھونپڑ اور مکانات نظر آتے تھے۔ جبکہ سردار کا مکان وسیع بن قطع اراضی پر محیط ایک حویلی نما تھا جس کے گرد نوٹ اونچی دیواروں کا ایک قلعہ نما ”کوٹ“ بنا ہوا اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا طویلہ بھی تھا۔ سردار زور آور خان کے بدنصیب بیٹے کا نام شہ زور خان تھا۔ بیٹی کا نام شہزادی تھا۔

اول میں بڑے غم و غصے کی لہر پائی جاتی تھی۔ مجھ پر بھی پڑٹیش نظروں کی برچھیاں پڑ رہی تھیں۔ خلاف بھی فتوے جاری کئے جا رہے تھے جس کا لب لباب روایتی ہی تھا۔ یعنی میں حملہ آوروں کا افتاد کم و بیش سردار زور آور خان کا بھی یہی خیال تھا۔ جبکہ اس کا لمبا ترنگ بھائی وزیر خان سمجھ دار آدمی نے میری دلیل دہراتے ہوئے اپنے بھائی اور دیگر مشتعل لوگوں کو قدرے ٹھنڈا کیا مگر میرے سلسلے رنگی دبا دبا اشتعال پایا جاتا تھا۔

ردار کی حالت غم ناک ہو رہی تھا۔ مگر وہ مرد تھا۔ اپنے کرب پر ضبط کئے ہوئے تھا جبکہ اس کی بیوی بچوں مرگی پر بارے غم کے ٹھہر چکی تھی۔ اس پر غمی کے دورے پڑ رہے تھے۔

شہزادی کو ہوش آ گیا تھا۔ اس سے فوراً اس اندوہناک واقعے کے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے اسے پہلے اپنے بھائی شہ زور کے بارے میں دریافت کیا۔

اس کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے یہی جھوٹ بولا گیا کہ وہ زندہ ہے۔ تب اس کی حالت کچھ سنبھلی اور لائے جو کچھ بتایا وہ دیگر لوگوں کے لئے تو اتنا چونکا دینے والا ثابت نہ ہوتا مگر میں بری طرح تشویش بٹان کن بے چینی کا شکار ہو گیا۔

شہزادی نے بتایا کہ وہ اور اس کا بھائی اپنی گاڑی میں سیر کی غرض سے نکلے تھے۔ دونوں بہن بھائی ملے تھے اور شہر میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہیں ہوٹل میں رہتے تھے۔ آج کل اپنے گاؤں آئے تھے۔

اسے میں ایک تحیم خیم شخص نے ہاتھ کے اشارے سے ان کی جیب کو روکا۔ اس کے بعد اچانک اس نے لڑکے دیا۔ وہ ان کی جیب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شہ زور جوش میں آ گیا اور اس سے بھڑ گیا۔ شہزادی نے اس کی آواز کو اس اجنبی حملہ آور نے اسے بھی پتھر اور ڈنڈے مار کر زخمی کر دیا اور بعد میں جیب کی فولادی شہ زور کا سر بے دردی سے مار مار کر بری طرح زخمی کر ڈالا اور ان کی جیب لے کر فرار ہو گیا۔

شہ زور آور کی بیٹی شہزادی نے اس اجنبی حملہ آور کا جو حلیہ بتایا تھا اسے سن کر میں بری طرح چونک گیا۔ عامل عاروب کا مفروضہ کارندہ معلوم ہوتا تھا اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بد بخت ان کی جیب کیوں حاصل کرتا تھا۔ اس کے بعد شہزادی سے میرے بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے میرے سلسلے میں قطعاً

الطی کا اظہار کیا تھا۔

مگر اس کے باوجود میری گلو خلاصی نہ ہوئی اور قبیلے کے معتبر لوگوں کے سامنے مجھے پیش کیا گیا۔ میرے سلسلے میں چھوٹا موٹا جرم ہو گیا جس میں سردار زور آور خان اور اس کا بھائی وزیر خان بھی شامل تھے۔ مجھ سے میرے بارے میں تفصیلات پوچھی گئیں کہ میں اکیلا وہاں کیا کر رہا تھا؟ اب مجھے لازماً جج بتانا پڑا تھا کہ میرے ساتھ بھی کیسی ٹریبیڈی ہوئی تھی۔ نیز یہ کہ میں اس اجنبی حملہ آور قاتل کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا تھا کہ اب تک اس سارے ”کھٹ راگ“ میں میرا جتنا وقت ضائع ہوا تھا، اس کی تلافی ہو سکے۔

یہی سبب تھا کہ میں نے انہیں اپنے بارے میں تفصیلات آگاہ کر دیا تاکہ وہ میرے سلسلے میں تصدیق اور توثیق کر سکیں..... لیکن میری کہانی پر انہیں شاید پوری طرح یقین نہ آیا۔ تاہم سردست جرم کے اراکین اور سردار وغیرہ میری کہانی غور سے سنتے رہے۔ اس کے بعد آپس میں وہ دھمے دھمکے میں کھسپھسرتے رہے۔ مجھے سردار زور آور خان کے بھائی وزیر خان سے امید تھی کہ وہ میری گلو خلاصی کی کوشش کرے گا۔ کافی دیر تک آپس میں کھسپھسرتے رہنے کے بعد بالآخر سردار زور آور خان نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بلکہ ملا کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارے بیٹے شہ زور کا وہ قاتل بے شک تمہارا دشمن سہی لیکن وہ تمہاری وجہ سے ہی یہاں آیا تھا اور تم سے جھگڑے کے دوران وہ کاٹھج سے فرار ہوا۔ یوں راہ فرار اختیار کرتے ہوئے اس مردود کا سامنا ہمارے دونوں بچوں سے ہوا۔ اس طرح سے تم بھی قصور وار ثابت ہوئے ہو۔ لیکن ابھی ہم تمہاری سزا کے سلسلے میں حتمی فیصلہ محفوظ رکھتے ہیں۔ مگر تم ذہنی طور پر خود کو کڑی سے کڑی سزا کے لئے تیار کرو۔“

وزیر خان کی بے تکلیف منہ سے مجھے بری طرح جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ میری بے گناہی سمجھنے کے باوجود اپنے سردار بھائی زور آور خان کے فیصلے پر مجبور ہو۔ لیکن میں بری طرح اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر نگینہ کا خیال پریشان کر رہا تھا اور اس کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں وسوسوں کے ساپ کلبانے لگے تھے۔

جیب نے واپسی کے سفر پر یوٹرن لیا اور پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔ میرا ذہن تیزی سے موجودہ ممکن حالات اور اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ پہلا تو یہ کہ میں خاموشی سے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا۔ سردار زور آور خان کے فیصلے کا انتظار کرتا۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ میں اس وقت ان سے بھڑ جاتا اور مارا ماری کر کے ان کے چنگل سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ میں نے لمحوں میں دونوں راستوں پر باریک بینی سے غور کیا۔ مجھے پہلا راستہ زیادہ سودمند لگا۔ کیونکہ موجودہ حالات کا تقاضا تھا کہ میں زیادہ خطرات مول لئے بغیر صبر و استقامت کے ساتھ بہتر وقت کا انتظار کروں۔ اگر میں دوسرا راستہ اپنانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے سردار زور آور خان کے پورے قبیلے کی نظروں میں مجرم بنانے کا باعث بنتا اور موجودہ حالات اس نئی دشمنی کے آغاز کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن مجھے اس بات کی بھی پریشانی ستا رہی تھی کہ نگینہ اگر ان تینوں کیلاشیوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی تو وہ اسے بلا تاخیر کیلاش لے جا کر عامل عاروب کے حوالے کر سکتے تھے جہاں اس شیطان نے نگینہ کو اپنے نام نہاد مقصد دیوتا ”داہولا میزنی“ کی بھیئت چڑھانے کا ناپاک اور خطرناک عزم کر رکھا تھا۔ ایسا نہ ہوتا کہ میں دوسری بار تباہی خیزی کے وجہ سے خدا نخواستہ ہمیشہ کے لئے نگینہ کو کھو بیٹھتا۔

جیب کا سفر جاری تھا اور میں نگینہ کے حوالے سے ایک بار پھر شدید شیش و خشک کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھ سے

فیصلہ ہونے پر ہاتھ تھا۔ میں نے دوبارہ اور آخری بار غور کیا کہ اگر میں جیب چاپ ان کے ساتھ ہو لیتا تو باخوری تھا کہ ہٹ دھرم سردار زور آور خان مجھے یوں آسانی سے چھوڑ دیتا؟ اس طرح بہتر وقت کے غار میں تو نگینہ کی جان کو لاحق خطرے کی نگینیں کھڑیاں مختصر ہوتی چلی جاتیں۔ بالآخر میں نے پہلے راستے چلنے کا ارادہ ترک کر ڈالا اور دوسرے مگر خطرناک راستے کو اپنانے کا آخری اور پُر عزم فیصلہ کر لیا۔ اس نظرے میں بہر حال نگینہ کی زندگی کو فائدہ تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر میں نے پیشاب وغیرہ کی حاجت کے لئے وزیر خان سے درخواست کی۔ اس نے بڑی ناگوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر بالآخر اس نے باخوری سے جیب روکنے کو کہا۔

ڈرائیور نے جیب سڑک کے کنارے پر روک لی۔ دو گن بردار افراد میرے ساتھ ہی جیب سے اترے۔ میں نے سڑک کے کنارے قدرے نشیب میں جھاڑیوں کی سمت پیش قدمی کی تو ایک گن بردار نے مجھے پیچھے چلا آیا۔ تب پھر موقع پاتے ہی میں نے یکدم پلٹ کر اس پر حملہ کر دیا۔ سب سے پہلے میں نے اس کی گن پر چھٹا مارا اور اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے ”اوغ“ کی بھیا نک کراہ خارج ہو گئی اور گن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی میں نے برق ناری سے وہ اس سے جھپٹ لی۔ گن میرے قبضے میں آتے ہی اس کا ٹھوس آہنی بٹ میں نے دشمن کے لئے ہوئے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے بھیا نک کراہ خارج کر کے زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ اس کا دھڑکنے والا سر ابھی نہیں، سڑک کے کنارے ٹھہری جیب میں موجود وزیر خان سمیت اس کے دیگر ساتھیوں کو بھی بازوؤں کی اوٹ میں ہونے والی گزربوکا احساس ہو گیا تھا۔ پھر جب تک وہ سب قریب آتے، میں تیزی سے ساتھ ایک جانب جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا رینگ گیا۔ دفعۃً ہی پھر عقب میں مجھے وزیر خان کی ٹپش محسوس ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی زبان میں اپنے ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن ادھر میں نے اپنی ”پور“ پیش قدمی ترک کی۔ میرا ارادہ ان کی جیب پر قابض ہونے کا تھا اس لئے میں سردست ان پر گولیاں مارنے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ لیتا، سڑک کے کنارے آگے بڑھتا رہا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسری طرف اٹھتا تو میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسرت و کامرانی کی مسکراہٹ ابھری۔ میں دشمنوں کو بھگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیونکہ ان کی جیب ذرا فاصلے پر کھڑی نظر آگئی تھی۔ مگر اولک سب غائب تھے۔ ان نگین اور پُر خطر لحاظ میں ایک بل بھی ضائع کرنا حماقت ہوتی۔ چنانچہ میں باہت بھرتی مگر محتاط روی کے ساتھ جیب کی سمت بڑھا۔ جیب کے قریب پہنچتے پہنچتے میں نے ایک نگاہ لگائی۔ میں ڈالی اور ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ہو گیا۔ حسب توقع چابی انیشن سوچ میں موجود تھی۔ میں نے جیسے ہی چابی گھمائی، اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ مجھے اپنے چہرے کے قریب سے گزرتی گولی کی مہیب ”ہٹک“ صاف محسوس ہوئی تھی جس نے دوسری طرف کی کھڑکی کا شیشہ ایک دھماکے سے چٹکنا چور کر دیا۔ ہمارا زور سا گیا۔ تاہم اوسان بحال رکھتے ہوئے میں نے جیب کے اشارت ہوتے ہی اسے ایک طوفانی طعنے سے آگے بڑھا دیا۔ پھر تو عقب میں جیسے طوفان اُٹھ پڑا۔ گولیوں کی بھیا نک تڑتڑاہٹ نے خاموشی کے سانے کو بری طرح مجروح کر ڈالا تھا۔ کئی گولیاں جیب کی پاڈی میں بیوست ہوئی تھیں مگر شکر تھا کہ ان گولیوں نے کوئی نہ کوئی نہ جیب کے ٹائروں تک رسائی نہیں حاصل کی تھی۔

میں بتدریج جیب کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ”فائرنگ رینج“ سے خاصی دور نکل گیا۔ مخدوش تر حالات میں اپنی اس کامیاب اور دراندہ وار پیش قدمی نے میرے حوصلے دو چند کر ڈالے۔ اب میری ساری

توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی

میں

ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری تشویش آمیز پریشانی اور بے چینی اب وحشت میں بدلنے لگی تھی۔ میری فلائٹ براہِ پشاور تھی جو اسلام آباد سے 172 کلومیٹر مغرب میں واقع تھا اور یہ مشکل آدھے گھنٹے کا فضائی سفر تھا۔ ہاں سے پچاس منٹ کی پرواز مجھے چترال پہنچا دیتی۔ اس کے بعد کسی فلائنگ کوچ یا وٹکن کے ذریعے مقامی تین گھنٹوں میں کیلاش پہنچا جاسکتا تھا۔

فاصلہ تیزی سے سنسنے کی امید پر دل و دماغ کو کچھ قرار ملا تھا۔ کیونکہ میں نے مجموعی طور پر یہ اندازہ لگایا تھا کہ میں اگلے چند گھنٹوں کے اندر اندر کیلاش وادی میں قدم رکھ چکا ہوں گا جبکہ وہ تینوں کیلاشی نگینہ کو اگر فراہم بھی کر چکے تھے تو یہ واردات آج صبح دس یا گیارہ کے درمیان کی گئی ہوگی اور اب یہ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کب اور کون سے راستے سے اپنے تیسرے ”مفروز“ ساتھی سے ملنے کے بعد واپس کیلاش کا محزون ہوں گے۔

بہر طور میں تیز رفتاری اور نان اسپاٹ ڈرائیونگ کے بعد ڈیڑھ گھنٹے کے اندر اسلام آباد پہنچا اور سب سے پہلے ایئر پورٹ کے قریب ہی جیپ سے چھٹکارا پانے کے بعد میں نے ایک قریبی پٹی سی او سے انکل اعظم خان سے رابطہ کیا تو انہوں نے میرے خدشے کی تصدیق کر ڈالی کہ آج صبح ایئر پورٹ سے واپسی پر ایک ہنگ گیارہ بجے نگینہ کو دو نامعلوم افراد نے ان کی ٹیکسی روک کر اغواء کر لیا تھا۔ شاہ میر کو وہ ٹیکسی ڈرائیور کے پاس ہی چھوڑ گئے تھے اور ٹیکسی ڈرائیور تھانے میں تھا۔ نیز انکل اعظم خان سے میں نے شاہ میر کو اپنے ہاتھ لے جانے کی گزارش کی اور پھر رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں سیدھا پیدل ہی ایئر پورٹ کی طرف بھاگ گیا۔

ٹھیک ساڑھے چار بجے جہاز نے پشاور کے لئے ٹیک آف کیا۔ نصف گھنٹے کی پرواز کے بعد میں پشاور ایئر پورٹ پر اتر اور ساڑھے پانچ بجے دوبارہ وہی فلائٹ چترال روانہ ہوگئی۔ چترال ایئر پورٹ پر پہنچنے میں طیارے نے پچاس منٹوں کی بجائے پورا ایک گھنٹہ لگایا تھا۔ یوں تقریباً سوا ایک منٹ چترال ایئر پورٹ سے نکلا۔ اب مجھے کیلاش وادی جانے کے لئے کسی جیپ یا وٹکن کا سفر کرنا تھا۔ اڑے پر پہنچا تو مسافر وٹکن نہ ملی مگر ایک جیپ والے سے کرایہ ملے کیا۔ اس نے پورے ہزار روپے لے کر کیلاش وادی کے علاقے ”بہمر پت“ پہنچانے کا وعدہ کیا۔

نگینہ کے سامنے بھلا اس معمولی رقم کی کیا حیثیت تھی! میں اس میں سوار ہو کر تقریباً دو ڈھائی گھنٹوں بعد رات نو بجے ”بہمر پت“ پہنچا۔ یہاں ایک ہوٹل میں، میں نے رہائش اختیار کی۔ یہ وہی ہوٹل تھا جہاں کیلاش وادی کی اپنی پہلی بہم کے دوران آچکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے دوسری بار یہاں کا رخ کرنے میں کوئی معمولی سی بھی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

یہ علاقہ پاکستان کے انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے بہت سرد تھا اور میں جن حالات اور تیزی کے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا، مجھے گرم کپڑوں کا خاص اہتمام کرنے کا موقع یا وقت تک نہ مل سکا تھا۔ تاہم حسبِ معمول میں نے پیٹ شرت اور لیڈر جیکٹ پہن رکھی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ ”کالا ش آگرم“ میں رہتا تھا اور وہیں نواح میں آبادی سے متعلق علاقے میں اپنے بگڑا نما عبادت خانے میں ہی رہتا تھا۔

میں پوچھا کہ بعد میں بیش آمدہ حالات پر غور کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ اغواء کنندگان کیلاشیوں نے مجھے اپنے لئے ہوائی جہاز ہرگز استعمال نہیں کیا ہوگا۔ یہی صورتِ ٹرین یا پبلک ٹرانسپورٹ وغیرہ کی ذمہ داری تھی جیپ میں ہی کیلاش کے لئے روانہ ہوئے ہوں گے۔

ذرا دور تک تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں نے شارٹ کٹ اپنا یا۔ اب میرا رخ تھیا گلی کی بجائے مری کی طرف تھا۔ میں سب سے پہلے انکل اعظم خان سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے میں اپنے ہاں پہنچنا۔ مزدور اپنے کام میں مگن تھے۔ میں نے جیپ روکی اور اپنے آفس میں آکر انکل اعظم خان کے موبائل پر ان سے رابطہ کیا۔ اس دوران میں نے کئی بار نگینہ کے موبائل پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

”تم اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے نادو؟ تمہاری ماں بہت پریشان.....“

میں نے ان کی بات کالی اور دھڑکنے والے ساتھ جلدی سے بولا۔ ”انکل! پہلے میری بات سن لیں۔ اور پھر میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔“

”اوہ مائی گاڈ!..... تو آج صبح اسلام آباد ایئر پورٹ پر اغواء ہونے والی واردات نگینہ کے متعلق نہیں تھی؟“ میری مختصر اسراحت پر وہ اچانک چونک کر بولے۔ میں سر تا پا لرز گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میرا دل کپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا اور رگوں میں سنسنائی ہوئی لہو کی گردش خود بخود ہی بڑھنے لگی تھی۔ ”انکل! اب میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ میں نے آپ کو ساری باتیں بتا دی ہیں۔ آپ پلیز ماں کو میری خبریت اور موجودہ حالات کے بارے میں بتا دیجئے گا۔ میں اس وقت نکل رہا ہوں۔“ پھر اچانک ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت میں نے دوبارہ ہانپتی سی آواز میں کہا۔ ”انکل! آپ پلیز میرا ایک اور کام کر دیجئے گا۔“

”ہاں، ہاں نادو!..... پولو، کیا بات ہے؟“ وہ پُر شفقت لہجے میں بولے۔ البتہ ان کے لہجے سے پریشانی اور تشویش مترشح ہو رہی تھی۔

”انکل! میں آپ سے رابطے میں رہنے کی کوشش کروں گا۔ آپ تب تک یہ بات واقعی سکرم کر لیں کہ کیا واقعی نگینہ کو امریکہ سے لوٹتے وقت اغواء کیا گیا ہے؟“

”ٹھیک ہے بیٹا! یہ کون سی بات ہے۔ میں ابھی اسلام آباد کی انتظامیہ سے سکرم کر لیتا ہوں۔ لیکن تم بھی نگینہ کے موبائل پر رابطہ تو کر کے دیکھو۔“ وہ بولے۔

”وہ میں کر کے دیکھ چکا ہوں۔ کوئی جواب نہیں ملا تھا مجھے۔ اچھا انکل! ایک اور اہم بات۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”ہاں، میں سن رہا ہوں۔“

”سردار زور آور والے معاملے سے متعلق میں نے آپ کو ساری بات بتا دی۔ ممکن ہے وہ گرین لاج کا رخ کریں۔ کیونکہ میں نے انہیں.....“

”نادو! میں سب سمجھ چکا ہوں۔ اور سنبھال بھی لوں گا ساری جوبویشن۔ تم اللہ کا نام لے کر بس نکلنے کی کرو۔“ وہ میری بات کاٹ کر مہربان اور متشکر آواز میں بولے۔ میرا دل ان کی مہربانی پر بھرا آیا۔

”اچھا انکل! میری کامیابی کی دعا کیجئے گا، خدا حافظ۔“ آخر میں میری آواز رندھ گئی۔

میں نے ٹریولنگ ایجنسی کو نوٹ کیا اور چترال کے لئے کسی فلائٹ میں جگہ طلب کی۔ خوش قسمتی سے مجھے ساڑھے چار کی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ چنانچہ میں نے منبر مشتاق سے نقد رقم لی اور آندھی طوفان کی طرح راویلینڈ ایئر پورٹ روانہ ہو گیا۔

میرے اندر زبردست لچل چلی ہوئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ٹیک بھیکتے میں اسلام آباد کیا سیدھا وادی کیلاش جا پہنچوں۔ میری جلتی ہوئی چشم تصور نگینہ کو لمحہ بہ لمحہ جیسے قفل گاہ کی جانب بڑھنے

بک لگائے، دونوں جیروں میں ہاتھ ڈالے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

داور خان کی ”مرہمی“ تک پہنچنے میں مجھے بہ مشکل پندرہ بیس منٹ لگے تھے۔ مرہمی کے آس پاس ویرانی کا راج تھا۔ ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مرہمی کے دروازے پر ٹاٹ جمول رہا تھا۔ دائیں جانب چھپر نما مانتان تلے دو خچر تو بڑوں میں منہ دیئے کھڑے تھے۔ ایک خچر چھوٹی عمر کا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کا ٹاٹ ہٹایا۔ سنگل پٹ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دستک دی، کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوسری بار اور ذرا تیز دستک دی تو اندر سے ہلکی کھڑ پڑی آواز ابھری۔ میں دل میں یہی دعائیں مانگنے لگا کر آنے والا داور ہی ہو۔ کیونکہ پہچاننے کے بعد اس وقت وہی میری مدد کو تیار ہو سکتا تھا۔ دفعۃً اندر سے کھانسنے کی آواز کے ساتھ ہی ہلنی آواز ابھری۔ یہ آواز قدرے ضعیف اور عمر رسیدہ شخص کی محسوس ہوتی تھی۔ اجنبی زبان میں ہی شاید اندر سے کچھ پچھا گیا تھا۔ داور خان کو اردو بھی ٹوٹی پھوٹی آتی تھی۔ یقیناً اس کے ماموں کو بھی ٹوٹی پھوٹی اردو آتی ہوگی۔ کیونکہ آخر کو بقول داور خان کے ”راہبر“ کا کام اس کے ماموں نے ہی اسے سکھایا تھا۔ اور ان لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، مختلف زبانیں بھی آتی ہوں گی۔ بہر طور میں نے ذرا کھٹکار کر بلند آواز سے کہا۔

”میں مسافر ہوں..... رات گزارنا چاہتا ہوں۔ مناسب کرایہ دے دوں گا۔“ میں نے دانستہ یہ کہا تھا۔ کیونکہ داور خان کی زبانی مجھے معلوم تھا کہ یہ لوگ اکیلے اکیلے مسافر کورات گزارنے دیا کرتے تھے۔ دروازہ فوراً ہی کھلا۔ لائین تھا سے ایک عمر رسیدہ شخص نمودار ہوا۔ اس نے موٹی سرمئی اور بوسیدہ چادر کی ہل ماری ہوئی تھی۔ اس نے لائین والا ہاتھ ذرا اونچا کیا اور میرے چہرے کو آنکھیں کھینچ کر دیکھنے لگا۔ مجھے یہ داور خان کا ماموں ہی لگا تھا۔ وہ بہ غور میرا جائزہ لینے کے بعد بولا۔

”اور کون ہے تمہارے ساتھ؟..... تمہارا سامان؟“

وہ خاصا محتاط معلوم ہوتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں سے مجھ اکیلے اور خالی ہاتھ مسافر کو دیکھ کر ٹلک کی رنق ابھری تھی۔

”میں اکیلا ہی ہوں۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ مگر اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اسے تذبذب میں پا کر میں مزید بولا۔ ”تم شاید داور خان کے ماموں ہو۔ اس سے پہلے بھی میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آچکا ہوں۔ داور نے ہمیں یہاں کی سیر کروائی تھی۔ دراصل ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے فوراً تنہا اور خالی ہاتھ لٹکا پڑا۔ کیونکہ اس بار میں سیر کرنے نہیں اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں آیا ہوں۔“

اس بار مختصر وضاحت اور اپنے بھانجے کا ذکر سن کر اس نے مجھے اندر آنے کا کہا۔ میں اس کے عقب میں اندر نکل و تارک کوٹھڑی میں آ گیا۔ اندر دو جھلنگ سی چار پائیاں رکھی تھیں۔ ایک پر کوئی موٹا سا بوسیدہ لٹل اوڑھے سو رہا تھا۔ بابا نے لائین دیوار پر ابھری ہوئی ٹیل پر لٹکا دی۔ مجھے چار پائی پر بیٹھنے کو کہا۔ داور خان کے مقابلے میں اس کی اردو صاف تھی۔ میں خاموشی سے چار پائی پر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔ وہ بھی ہنسے قریب بیٹھے ہوئے بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا.....؟“

”نام۔“ میں نے جواب دیا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ گھاگ اور تجربہ کار لگتا تھا۔

”لاہور سے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

”تمہارے کون سے ساتھی کھو گئے ہیں؟“

میں ان کے بانی روڈ سفر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسلام آباد سے پشاور بانی روڈ 172 کلومیٹر یعنی تقریباً تین سے چار گھنٹے، پھر پشاور سے چترال سات سے آٹھ گھنٹے، اس کے بعد وادی کیلاش چترال شہر سے کوئی 40 کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ یعنی لگ بھگ انہیں اسلام آباد سے بارہ تیرہ گھنٹے کا سفر درکار تھا۔ جس میں دو تین گھنٹوں کا اضافہ بھی ہو سکتا تھا۔

اب اگر وہ غنیمت اور اپنے تیسرے ساتھی کے ساتھ ایک بچے اسلام آباد سے روانہ ہوئے تھے تو اب تک وہ نو دس گھنٹوں کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ جبکہ یہاں پہنچنے تک انہیں مزید پانچ سے چھ گھنٹے درکار تھے۔ کہا رات تین بجے کے بعد ان کی بھریت آمد متوقع تھی۔

مجھے چونکہ ان پر اب چھ گھنٹے پہلے کی برتری حاصل ہو گئی تھی اس لئے میری کوشش تھی کہ میں انہیں اپنے قبیلے یا عامل عاروب تک پہنچنے سے قبل ہی چھاپ لوں۔ لیکن اب مسئلہ یہ تھا کہ چترال سے کیلاش وادی میں داخلے کے تین راستے تھے۔ یعنی ”ریمبور“، ”بہریت“ اور ”بریر“ خدا جانے وہ کون سے راستے کا انتخاب کرتے؟ تاہم کافی غور و فکر کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ جدھر عامل عاروب کا پورا قبیلہ آباد تھا، اس کا ایک ہی راستہ تھا۔ یعنی ”کیلاش آگرم“۔ یہ ان کے علاقے سے آٹھ، نو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

تاہم یہاں معاملہ اب صرف غنیمت کو ان کے چنگل سے چھڑانے کا ہی نہ تھا بلکہ اس مردود عاروب کا قبیلہ بھی ہمیشہ کے لئے نشانہ تھا۔ وہ ان خبیثوں کا خطرہ ہر وقت میرے اور غنیمت کے سر پر سوار رہتا۔ ان معاملات پر غور کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ کیلاش قبیلے کا ایک سردار ”آگرموشی“ عامل عاروب کے قبیلے کا دشمن تھا۔ اگر میں اس سے ملاقات کرتا تو ممکن ہے ہمارا مفاد ”مشتزک“ ہونے کی وجہ سے میرا کام بھی آسان ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں ان تینوں کا راستہ روک کر غنیمت کو عامل عاروب کے چنگل میں جانے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کروں۔

میری یہ تنہا کوشش ناکامی سے بھی دوچار ہو سکتی تھی۔ کیونکہ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہ تھی اور میں کم از کم اس آخری اور نازک وقت میں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟..... کیا اس وقت کیلاش قبیلے کے سردار آگرموشی سے ملنا چاہئے تھا؟..... میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال ابھرا۔

میرے پاس ابھی پانچ چھ گھنٹے تھے۔ سردار آگرموشی کا قبیلہ بھی اس علاقے میں تھا۔ لیکن اس وقت رات کے نو دس بجے اور اس کاٹ دار سردی میں جبکہ ہر سمت گہری دھند اور پدھول ٹھہرتے ہوئے سناٹے کا راج تھا، کسی ”خچر سواری“ کے ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اچانک مجھے اس نوعمر چترالی گائیڈ داور خان کا خیال آیا، جو قریب ہی ایک جھونپڑی میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتا تھا۔ داور خان وہی چترالی لڑکا تھا جس نے میری پہلی کیلاشی مہم میں خاصی مدد کی تھی اور ایک ہوشیار اور سمجھ دار لڑکا تھا اور غریب بھی۔ اپنے ماموں کے ساتھ وہ تنہا رہتا تھا۔ وہ سیاحوں کے لئے گائیڈ کا کام کرتا تھا۔ پہلی کیلاشی مہم میں بھی اس نے ہی میری رہنمائی کی۔ اس کے پاس ایک موٹا تازہ خچر بھی تھا۔ چنانچہ داور خان کا خیال آتے ہی میں اسی وقت ہوٹل سے نکلا اور پیدل ہی سنسان، ٹھہرتے ہوئے راستوں پر اس کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ داور خان اپنی اس جھونپڑی کو مرہمی کہتا تھا جو ہوٹل سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھی۔ یہ حصہ آبادی کے کچے کچے مکاناتوں سے ذرا ہٹ کر شمال مغرب میں تھا۔

دیہاتی علاقہ ہونے کے باعث ہر طرف اندھیرا اور سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ آوارہ کتے تک سردی کے بارے میں کوئی کھردر میں دیک گئے تھے۔ ہر سو بؤ کا عالم تھا۔ میں اللہ کا نام لئے اپنی جیکٹ کی زپ کھینکھیں کھنکھناتے ہوئے دوڑ دوڑ کر دیک گئے تھے۔

”میرا دوست اور اس کی بیوی۔ وہ دونوں دراصل ایک اخبار کے لئے کام کرتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہی اخبار میں کام کرتا ہوں۔ ان کی تلاش میں آیا ہوں۔“

”ہاں..... یہاں سیاحوں کے علاوہ اخبار والے بھی آتے ہیں۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔ میں نے شکر کیا کہ وہ میری باتوں سے مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں نے یونی فونم دیا۔

”بابا! تمہارا کیا خیال ہے، میری اس معاملے میں کون مدد کر سکتا ہے؟“

”پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی تم نے؟“ اس نے غالباً کسی خیال کے تحت مجھ سے پوچھا۔

”ہاں۔ چترال کے ایک تھانے میں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ ”لیکن وہ بھی ناکام ہو گئے ہیں۔ یا پھر انہوں نے کوئی خاص کوشش نہیں کی ہوگی۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔ یہاں برف پوش وادوں میں کسی کو تلاش کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔“

”ہاں بابا! اس لئے میں خود بھی آیا ہوں۔ میرا خیال ہے میری اس معاملے میں کوئی مقامی بارشخصیت ہی مدد کر سکتی ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟“ میں نے گیند اس کی کورٹ میں پھینکی تو وہ کچھ سوچنے لگا۔ میں بھی اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سردار آگر موٹی سے ملنے کا ہی مشورہ دے گا مگر اس کے برعکس وہ چند ٹائیے کی پُرسوج خاموشی کے بعد بولا۔

”تمہیں خود ہی کوشش کرنا پڑے گی۔ یہاں کے سردار کسی ایسے معاملے میں نہیں پڑتے۔ میرا خیال ہے میرا بھانجا داور خان تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اگر تم کچھ دینے دلانے کی بات کرو تو۔“

اس نے گویا میرے دل کی بات کر ڈالی۔ وہ مجھے لالچی لگا تھا۔ ممکن ہے اس نے کسی سردار کے اس معاملے میں نہ پڑنے والی بات بھی اسی لئے کی ہو۔ بہر طور میں نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارے بھانجے داور خان کی قابلیت پر پورا بھروسہ ہے۔ کیا تمہارا بھانجا داور خان سو رہا ہے؟“ میں نے آخر میں سامنے والی ایک دوسری چارپائی پر سونے شخص کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تو اس نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“

میں نے اب اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔ ”بابا! درحقیقت بات یہ ہے کہ میں اس معاملے کو خود بھی خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں..... کوئی خاص بات؟“ اس نے قدرے چونک کر پوچھا تو میں نے دانستہ عامل عاروب کے قبیلے کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا۔ ”میرے دونوں گمشدہ ساتھی درحقیقت یہاں کے کسی مخصوص قبیلے پر تفصیل فیچر لکھنا چاہتے تھے جو کسی دابولا میزری نام کے دیوتا کے بچاری ہیں۔ سنا ہے کہ ان کا ایک روحانی پیشوا جس کا نام غالباً عاروب ہے، وہ بہت بڑا عامل ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ میرے دونوں ساتھیوں کی گمشدگی میں اسی قبیلے کا ہاتھ ہے۔“ یہ کہہ کر میں اس کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری اس بات پر وہ بری طرح چونک کر میرا چہرہ نکلنے لگا۔ میں نے دیکھا، اس کے ضعیف اور جھریوں بھرے چہرے، کچھ عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ وہ یہ غور اور مسلسل میرا چہرہ نکلنے لگا کہ بالآخر میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا بابا! کیا میری بات پر یقین نہیں آیا تم کو؟“

”نہیں..... ایسی بات تو نہیں۔“ وہ جلدی سے میرے چہرے سے اپنی نظریں ہٹا کر بولا۔

”میں درحقیقت یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تمہارے ساتھی واقعی عامل عاروب کے قبیلے والوں کے ہوتے تو ان کے ہاتھ میں تو ان کا زندہ بچتا بہت مشکل ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو بابا تم؟“ میں نے دانستہ اپنے چہرے پر پریشانی سموتے ہوئے اس سے کہا۔

”مجھے انفس ہے کہ میں اس مہم میں اپنے بھانجے داور خان کی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ ہاں، ہزرات یہاں گزار سکتے ہو مگر صرف آج کی رات۔“ اس کے متوقع جواب پر میں نے اصل بات کی آواز دے دی۔

”اچھا بابا!..... مگر میں اکیلا ہی اس مہم کو سر کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن دراصل پہلے یہ بات کرنا چاہتا ہوں کہ آیا میرے دونوں ساتھی انہی لوگوں کے قبیلے میں ہیں بھی یا نہیں؟ اگر وہ دونوں ان کی قید زدہ ہیں تو میں فوراً واپس چترال جا کر پولیس کو خبر دوں گا اور پھر ساری آگے کی کارروائی وہ لوگ کریں اور اس مہم کے لئے بہترین وقت یہی ہے۔ اگر تم اپنے بھانجے کو میرے ساتھ نہیں بھیجتا چاہتے تو مجھے اپنا بے درد۔ میں واپس لوٹ کر خیر تمہارے حوالے کر دوں گا۔ تم بے شک اس کا جتنا چاہے معاوضہ مجھ سے

برائیاں مل سکتی ہیں۔“ میں نے اس بات پر کچھ لیت و لعل سے کام لے گا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت ہوئی۔

”اچھا..... سردی میں نکلنے کے..... میں تمہارے لئے قبوہ بنا کر لاتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو۔“

میں نے اس کے باوجود وہ قبوہ بنانے کے لئے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔

اس کے یوں اچانک مان جانے اور پھر قبوہ کی دعوت دینے پر نہ جانے کیوں میرے دل و دماغ کو ایسی بے چینی نے جکڑ لیا۔ مگر پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی پیالی میں میرے لئے قبوہ بنا کر باور مجھے تمہارے دیا۔

”لو..... قبوہ چو۔“

میں نے قبوے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ قبوہ خوش ذائقہ اور خوشبودار لہجے میں میرے قبوے کی پیالی ختم کی، اچانک مجھے اپنے وجود میں بے جانی کی سی کیفیات محسوس ہوئیں۔ میرے ہاتھ سے قبوے کی خالی پیالی بھی جھوٹ کر گر پڑی۔ پھر میں بھی چارپائی پر بے جان ہو پڑا۔ بڑی عجیب کیفیت ہو گئی تھی..... میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

عالم بھی پوری طرح بیدار تھی مگر میرا پورا جسم بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے بے ہوش ہونے کو ہلانے جلانے کی بھی کوشش کی مگر بے سود۔ میں تو اپنی ایک انگلی کو بھی جنبش دینے کا روادار نہ تھا۔

میں نے اس کا مالک ہونے کے باوجود میں سرتاپا لرز اٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میرے ہاتھ کیسے ہو گیا تھا؟..... میں نے اپنی آنکھوں کو گردش دی اور قریب بیٹھے میزبان کی طرف مدد مانگنے سے دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر عجیب سی سرد مہری کھنڈی ہوئی تھی۔ پھر وہ چارپائی سے اٹھا

اس سے باہر نکلتا چلا گیا۔

میں نے حلق کے بل منہ کھول کر چلائے، چیخنے کی کوشش بھی کی مگر آواز تک نہ نکل سکی۔ حتیٰ کہ منہ بھی اپنا

لٹا کر تھا میں۔ بڑی ہی عجیب و غریب اور ہراساں و پیچیدہ مصیبت تھی یہ۔ اور اس کا مقصد؟

میں نے سوچنے کے قابل تھا۔ میزبان بابا کی نیت پر مجھے شبہ ہونے لگا۔ اس کے سرد مہر روپے اور

میں نے اس کے ساتھ کوٹھڑی سے باہر نکل جانے پر مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ اب تو یہ ساری کارستانی اسی

میں نے اس کے لئے کی تھی۔ اس نے مجھے کوئی ایسی دوا قبوے میں کھول کر ملا دی تھی کہ جس نے میرا تمام وجود

نارواں کر دیا تھا۔

”مگر کیوں؟“

یہ سوالیہ نشان شتر کی طرح میرے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ نہیں میری تقدیر میں کیا گیا تھا۔ میں جب بھی نگینہ کو مشکل حالات سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ کسی نہ کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہو جایا کرتا تھا۔ وقت ہر ایک لمحہ مجھے تاہم ہم کی تک تک کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خبیث بڑھا کچھ دیر بعد واپس لوٹے گا۔ مگر کافی دیر گزر گئی، وہ نہ آیا اب تو میری پریشانی فروز تر ہونے لگی۔ ادھر مجھے نگینہ کی بھی تشویش کھائے جا رہی تھی۔ شاید ایک بار میں تاخیر کی زد میں آ رہا تھا۔

میں اپنی گردن بھی ہلانے کا روادار نہ تھا۔ میں نے پھر حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کرنی چاہی۔ قریب کی چار پائی پر لیٹے ہوئے داور خان کو نیند سے بیدار کر دوں۔ جب میں نے خود ہر طرح سے بالکل بے بس پایا تو میں بھی دعائیں مانگنے لگا خدا سے کہ کاش داور خان خود ہی بیدار ہو جائے۔ وہ خبیث نہ جانے مجھے یوں مفلوج بنانے کے بعد کہاں دفغان ہو گیا تھا۔ اچانک پھر جیسے میری دعا قبول گئی۔ میں نے کھانسنے کی آواز سنی۔ میں اپنی گردن تو نہیں مڑ سکتا تھا مگر محسوس کر سکتا تھا کہ یہ آواز داور خان کی چار پائی سے اُبھری تھی۔ میرا دل امید تلے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پھر میں نے چار پائی کے سر سے چڑھانے کی آواز سنی۔ میرا دل پھر یکبارگی دھڑکا۔ میرا چہرہ چھت کی طرف تھا۔ تاہم آنکھوں کے گوشہ گھما کر میں نے قریب کچھ چار پائی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی تو میں نے کسی کو مکمل ہٹا کر چار پائی پر کر بیٹھے ہوئے دیکھا۔

تب پھر دوسرے ہی لمحے میری نظروں کے سامنے داور خان کھڑا تھا جو مجھے یوں بے سدھ چار پائی اپنی چٹنی چٹنی آنکھوں سے سٹکے جا رہا تھا۔ میری آنکھیں بھی اس کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ میری آنکھوں میں التجا آمیز بے بسی کے سائے تھے۔ داور خان لائین کی مدھم روشنی میں شاید میرا چہرہ پہچاننے کی کوشش رہا تھا۔ اسے شاید پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر دیوار سے لائین اُتاری۔ اس کی کوبہ پھر لائین میرے چہرے کے ذرا قریب لاتے ہوئے خود بھی جھک کر بہ غور میرے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ششاسانی کی چمک اُبھرتے دیکھی۔ تب بے اختیار اس کے لبوں سے برآمد ہوا۔

”ارے صیب! تم..... تم تو وہی والے صیب ہو۔“ وہ مجھے پہچان چکا تھا۔

”پھر..... تم بولتے کیوں نہیں ہو؟..... کیا ہوا ہے تمہیں؟“ وہ حیرانی سے بولا مگر میں ہونٹوں کا بوجھ کوشش کے ایک ذرا سی جھنجھٹ بھی نہ دے سکا۔ تب اس نے خود ہی میرے بے سدھ ہلایا جلایا اور میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا تو وہ سیدھے کھڑے ہو کر اپنے ہونٹ جھینچے کچھ سوچنے لگا۔ اس بعد اس نے اپنے ماموں کو چترالی زبان میں آوازیں دیں۔ وہ باہر بھی گیا۔ ذرا ہی دیر بعد لوٹا تو اچانک کی نظر شاید فرش پر گری ٹوٹی ہوئی قبوے کی پیالی پر پڑی۔ میری کھلی نظریں بدستور اس کے چہرے کاہلے لئے جا رہی تھیں کہ شاید اب یہ میرے لئے کچھ کرتا۔

وہ چند ثانیے ہاتھ میں اپنی لائین پکڑے بدستور انداز میں کھڑا رہا۔ اس کے بعد خود کلامی ہوئے بولا۔ ”یہ ضرور ماما کی ہی حرکت ہو سکتی ہے۔ اس نے تمہیں ہڑکی بوٹی گھول کر ملا دی۔ کیوں؟..... کیا وہ تمہیں کوئی چور یا رازن سمجھتا تھا؟“

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اپنا حلق پھاڑ کر اس سے یہ استدعا کروں کہ خدا کے لئے مجھے اس



داور خان کو اگر کچھ وقت مزید مل جاتا تو وہ یقیناً میرے ہاتھ پیروں کی اس مخصوص روغن سے ماش کر درست حالت میں لاسکتا تھا۔ مگر عین وقت پر اس کا غیبت ماموں ان تینوں دشمنوں کے ساتھ آن چکا تھا۔ چھکڑے کا سفر جاری تھا۔ میں پچھلے حصے میں بھڑ بکری کی طرح خج دیا گیا تھا۔ عامل عاروب کا ایک ہاتھ میرے ساتھ موجود تھا۔ دوسرا چھکڑا چلا رہا تھا۔ تیسرا شاید چھت پر تھا۔

راستہ تاہم وار تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ چھکڑے کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ میں چھکڑے کے چوبی تختے پر سداہ پڑا کسی بوری کی طرح ادھر ادھر لڑھک رہا تھا۔

اچانک میں نے پہلی بار اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور پیروں کے تلووں میں سنسنیٹ ابھرتی محسوس کی۔ اب پتہ نہیں یہ روغن کی ماش کے تھوڑے بہت اثرات تھے یا پھر چھکڑے کے چکولوں کی اٹھا خ پانچ کے جس نے میری سن پر پتی رگوں میں خون کی گردش تیز کر ڈالی تھی۔ یوں بھی مجھے یاد آیا کہ داور خان نے میری کیفیات دیکھتے ہی مجھے تسلی دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ میری یہ کیفیت عارضی ہوگی۔ میں نے فوراً اس اٹھا خ پانچ کے دوران اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دینا شروع کر دی، جن میں جان پڑتی محسوس ہوتی تھی۔ چھکڑے میں ڈوبتی ہوئی لائین کی برقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وہ ہرکارہ میری حرکات سکناٹ پر غور کرنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ میں چکلوں سے ملنے جلنے کے دوران اپنے ہاتھوں پیروں کو اس طرح ہلا رہا تھا کہ ایسے شہ نہ ہو کہ میں وارم اپ کر رہا تھا۔ تب پھر جس طرح اچانک میرے ہاتھوں پیروں کی طاقت زائل ہوئی تھی، وہ اب یکدم دوبارہ بحال ہوتی محسوس ہونے لگی۔ چند ہی لمحوں میں میرے وجود کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو گئی۔ اس کے ساتھ جوش میرے رویں روئیں میں بجلی بن کر دوڑنے لگا۔ میں موت بن کر اندر بیٹھے ہرکارے پر جھپٹا۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ رہا ہو گا کہ میں فضا کی طرح اس پر پڑوں گا۔ اس کی گردن میرے بازوؤں کے شکنجے میں آگئی۔ اس وقت میری نس نس میں جنوں کا جوالا اسی ابل رہا تھا۔ یہی سب تھا کہ میں نے اسے ایک لمحے کا بھی موقع دیئے بغیر اس کی گردن کو زوردار جھکا دیا۔ ”کڑاک“ کی آواز سے اس کی گردن کی بڈی ٹوٹ گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس نے سمور کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی تو ایک عجیب وضع کی ”سنان“ برآمد ہوئی جس کی دھار دور دورے اور تیز تھی۔

چھکڑا کمرہ نما تھا۔ عقبی حصہ کھلا ہوا تھا جہاں سے چاندنی میں نہایا ہوا برف زار علاقہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دور برف پوش چوٹیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں ”سنان“ ایک ہاتھ میں لئے مذکورہ کھلے حصے کے ایک پیروں چوبی تختے پر اپنے دونوں پاؤں جمائے کھڑا ہوا اور چھت کی طرف جھانکا۔ مجھے دوسرا گرگا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ بے خبر تھا۔ میں نے سردست ان دونوں سے بھڑنے کا فیصلہ ترک کیا اور چھکڑے کے چوبی تختے سے برف زار راستے پر چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ میں نے مخالف سمت کی بجائے چھکڑے کے رخ پر متوازی لگائی تھی اور ذرا دیر تک دوڑتا رہا۔ ورنہ میں گر سکتا تھا۔ پھر میں رک گیا اور ہانپتا ہوا کھڑا ہو گیا اور چھکڑے کو دور تاریکی میں جاتا دیکھ رہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ چھکڑا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اپنی سانسیں بحال کیں، پھر اپنی ریڈیم ڈائل والی رسٹ وایج پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بجے والا تھا۔ گویا تین چار گھنٹوں بعد عامل عاروب کے وہ تینوں ہرکارے گئیں کو اپنی جیب میں لئے یہاں پہنچے والے تھے۔ لیکن اب بات میرے حوالے سے بھی خاصی تشویش ناک ہو چکی تھی۔

اُترتو یہ چھکڑا سوار ہرکارے عامل عاروب کے ہی ساتھی تھے، جس کا امکان بہر حال بہت زیادہ تھا تو اب پوری وادی میں میری تلاش جاری ہو سکتی تھی۔ یعنی اب میری اس علاقے میں موجودگی راز نہیں تھا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ مجھے واپس پلٹ کر اس بڈھے میزبان کی خبر لینا چاہئے تھی جس نے مجھے دھوکے سے تھوے میں کوئی ہڑنامی جڑی بولی پلا کر ج کر دیا تھا اور بعد میں ان کے حوالے بھی کیا تھا۔ اس سے کم از کم یہ تو دریافت ہو سکتا تھا کہ آیا ان ہارکاروں کا کیا واقعی عامل عاروب سے ہی تعلق تھا؟ اور اگر تھا تو کیا وہ فریبی بڈھا ان کے ساتھ ملا ہوا ان کا بھروسہ و کاربن چکا تھا؟

ابھی میں اسی شش و پنج میں کھڑا تھا کہ اچانک جس طرف سے میرا چھکڑا آیا تھا، اس سمت ایک حرکت آئی۔ میری پوری توجہ اس جانب مرکوز ہو گئی۔ اسی وقت ایک خوف ناک خیال میرے ذہن میں ابھرا اور نامتو سے قریبی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ یہ جھاڑیاں ایک برفیلی ڈھلان میں آگئی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد میں نے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو وہ کوئی خیر سوار تھا۔ اس نے گرم موٹا بوری نمالاس پہن رکھا تھا۔ برف زار قریب آتا تو میں بری طرح چونک اٹھا۔ وہ داور خان تھا۔ میں فوراً جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلا۔ وہ بھی اٹکا مگر پھر مجھے پیچانے کے بعد فوراً خچر کی پیٹھ سے اتر کر میری جانب لپکا۔

”صیب!..... صیب!..... تم..... ٹھیک تو ہوتا؟“ میرا دل اس لڑکے کی محبت اور دوست نوازی پر بھر آیا۔ میں نے بے اختیار اسے گلے لگالیا۔ ”تمہارے روغن نے میرے مفلوج جسم کی طاقت لوٹائی ہے۔“ میں نے تشکر آمیز لہجے میں اس کی پیٹھ پر ہاتھوں سے لکھوئے کہا اور پھر اسے ساری بات بتادی۔

”صیب!..... یہ تینوں، عامل عاروب کے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔“ وہ ہر جوش لہجے میں بتانے اور میں اس کا چہرہ سننے لگا۔ میری استفسار طلب نظریں اپنے چہرے پر مرکوز پاتے ہوئے اس نے مزید کہا۔ ”یہاں ماموں پوٹے، ایک لالچی انسان ہے۔ تم نے یقیناً اپنے بارے میں اسے سب بتا دیا ہو گا۔“

”ہاں..... مگر کچھ زیادہ نہیں..... لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ.....“ ”صیب! آپ کی جان کو یہاں سخت خطرہ ہے۔“ وہ اچانک میری بات کاٹ کر متوحش لہجے میں بولا۔ ”یانی لوگوں کا علاقہ ہے۔ پہلے یہاں سے فوراً نکلتا ہو گا۔ آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے خچر پر سوار ہو گیا اور مجھے اپنے پیچھے سوار ہونے کا کہا۔

”یہ وزن سہارے لگا ہم دونوں کا؟“ ”ہاں صیب! یہ بہت سخت جان ہے۔ آ جاؤ۔“ وہ مسکرا کر بولا اور میں اس کے پیچھے خچر کی پیٹھ پر سوار ہو کر داور خان نے خچر کی لگا میں تھام کر اسے واپس موڑا اور درمیانی رفتار سے دوڑانے لگا۔

”کیا اب تم مجھے واپس مڑھی کی طرف لے جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں آپ کو وادی سے باہر کی محفوظ مقام پر چھوڑ آتا ہوں۔“ ”تم ایسا کرو۔“ میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ”میں نے یہاں سے قریب ہی ایک ہوٹل میں کمرہ رکھا ہے۔ تم اس طرف چلو۔“ ”مگر صیب! آپ کی جان کو خطرہ ہے۔“ ”تم چلو۔ وہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس کے بعد ہم ہوٹل میں آ گئے۔ اس نے ہوٹل کے پچھواڑے اپنا خیر باندھا اور پھر میں اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ ”اب تم مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ماموں پوشے کا کیا معاملہ ہے؟ پھر میرے تمہیں اپنے یہاں آنے کا مقصد بتاؤ گا۔“

میری بات پر اس نے مجھ سے جو سنسنی خیز انکشافات کئے ان کا لب لباب یہ تھا کہ میری سابقہ مہم جرنل اور اس کے نتیجے میں ہونے والی خونریزی اور میری فتح کے بعد پوری وادی میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ اس معرکے میں عامل عاروب کے زخمی ہونے سے اس کا حریف قبیلہ بہت خوش تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ عاروب کی کے مقابلے میں ہلکا پڑا تھا۔ اس سے پہلے خود اگر موٹی سردار کے قبیلے کا دوسرے عاروب اور اس کے بیروکاروں سے مقابلہ ہو چکا تھا اور دونوں مرتبہ بد قسمتی اگر موٹی سردار کے ساتھ رہی۔ یہی سبب تھا کہ جب اگر موٹی عاروب کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تو انہوں نے ایک مرتبہ پھر عاروب کے قبیلے پر حملہ کیا۔ مگر حیرت ناک طور پر اس مرتبہ بھی عامل عاروب کے قبیلے نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں تیسری مرتبہ شکست دے دی تھی۔ تاہم اس فتح کے بدلے میں نہ صرف انہیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ خود عاروب بھی مرتبہ مرتبے بجاتا تھا۔ اس مقابلے کے بعد دونوں طرف سے خاموشی طاری تھی۔ مگر واقفان حال سمجھتے تھے کہ یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ معاملہ ایک طرف تھا، دوسری طرف میرے ہاتھوں عاروب کی ہزیمت ایسا واقعہ نہیں تھا جسے اس کے قبیلے والے خاموشی سے بھلا دیتے۔ ایک طرف عاروب نے گنہگار اور مجھے پکڑوانے کے لئے اپنے مہم جو راؤ لینڈی بھجوائے تھے تو دوسری طرف اس کے ایک خاصہ گرگے بوغانے اپنے جاسوس اس علاقے میں پھیلا دیئے تھے جن کا کام باہر سے آئے لوگوں پر نظر رکھنا تھا اور ان میں سے جب کوئی عامل عاروب کے متعلق بات کرتا تو اس کی اطلاع بوغا کو فراہم کرتے تھے۔ وہ خان کا ماموں بھی اس جاسوس گروپ کا اہم رکن تھا۔

دور خان کی زبانی یہ ساری تفصیل جان کر میں حیران رہ گیا تھا۔ پھر میں نے دور خان کو اپنی تازہ ترین مہم کے بارے میں آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ درحقیقت میں ہوٹل سے اس سے ملنے اس کی مڑھی آیا تھا کہ میرا سامنا اس کے غمخیز لالچی ماموں پوشے سے ہو گیا۔

”صیب! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو میرے ساتھ ابھی چلنا پڑے گا۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ تینوں گنہگار بی بی کو کس راستے سے لے کر اپنے قبیلے کی حدود میں داخل ہوں گے۔“ یہ سنتے ہی میں ساری کلفت بھول گیا اور بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم نے تو میرا مسئلہ حل کر دیا۔ یہ بتاؤ، کب چلنا ہے؟“

”فورا چلو صیب! وہ تینوں حرام زادے گنہگار بی بی کو اگر ایک بار اپنے قبیلے میں لے گئے تو بڑی مشکل پڑ جائے گی۔“ وہ آخر میں خاصے تھکرے سے بولا۔

”چلو پھر.....“ میں نے کہا۔ اس کے بعد ہم ایک بار پھر تاریکی میں خیر پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئے۔

عاروب کے بیروکاروں سے چھینی ہوئی ”سان“ میرے قبضے میں تھی۔

دور خان نے مجھے بتایا کہ وہ تینوں فرستادے گنہگار سمیت جس راستے سے اپنے قبیلے کی حدود میں داخل ہو سکتے تھے، وہ یہاں سے تقریباً پندرہ سولہ کلومیٹر دور ویران برف زاروں میں تھا۔

دور خان نے مجھے اپنے بارے میں بھی بتایا تھا کہ وہ ایک یتیم و بیروزگار کا تھا۔ اس کا آبائی وطن جزیرہ تھا۔ مگر ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کا لالچی اور خود غرض ماموں پوشے اسے یہاں لے آیا تھا۔ پوشے خود بھی گناہ کا کام کرتا تھا مگر دور خان کے آنے کے بعد اس نے سارا بوجھ اسی پر ڈال دیا تھا اور کالوں کی

رج چار پائی پر پڑا رہتا تھا۔ تاہم دور اس کے باوجود خوش تھا۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمیں دائیں جانب کے ڈھلوانی بریلے ٹیلوں سے جنگلوں کی رج بہت سی روشنیاں اُٹتی نظر آئیں۔

”وہ.....!“ دور خان سرسراتے لہجے میں ان روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ میں بھی ٹھنک پڑا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ”صیب! یہ ہمارے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔“ وہ شاید ماموں پوشے سے ملنے آ رہے ہیں۔ تمہارے فرار کا انہیں پتہ چل گیا ہو گا۔“ بڑبڑاتے ہوئے میں نے راستہ تبدیل کر لیا۔ دور خان بہت ہوشیار اور وادی کے چبے چبے سے واقف تھا۔ جلدی وہ متوقع نہیں سے دور ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ جنگلوں کی طرح چمکتی ہوئی روشنیاں بھی غائب ہو گئیں۔

”کتنی دور ہے اب ہمارا مطلوبہ راستہ؟“ ذرا دیر بعد میں نے اس سے دریافت کیا۔

”بس تھوڑی دور ہے صیب!“ وہ بولا۔ لیکن ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہمارے دائیں جانب روشنیوں کا سیلاب اُٹھ آیا۔ میں اور دور خان بری طرح ٹھٹکے۔ پھر یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ تقریباً پندرہ بیس افراد کا مشعل بردار ٹولا تھا جنہوں نے سیاہ لہجے چنے پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں دھابا، سنان اور راکٹیں تھام رکھی تھیں۔

آن کی آن میں ان سب نے ہمیں گھیر لیا..... ان میں ایک نسبتاً دراز قد اور کرخت چہرے والا شخص تھا۔

”صیب! برے بھنسنے..... یہ بوغانے۔ عامل عاروب کا کمانڈر۔“ دور خان نے لرزتی آواز میں دراز قامت اور کرخت چہرے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میرے پورے وجود میں سنسنی اُڑ گئی۔ انہوں نے بھی شاید مجھے پہچان لیا تھا۔ سنان اور راکٹوں کا رخ میری جانب کر دیا گیا۔ اس کے بعد دراز قامت اور کرخت چہرے والا بوغانے مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتا ہوا میری جانب بڑھا۔ اس کی روک دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کنبہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے منگولوں کے انداز میں ایک دل دہلا دینے کی تیجی ماری جو شاید اپنے دشمن کو پہچان لینے کی فتح مندی کا نعرہ ہی ہو سکتا تھا۔ مگر اس بد بخت نے نہ صرف داد دلا دیے والا بلکہ الفاظ دیگر فتح کے نشے سے چورنفرہ بلند کیا تھا بلکہ تھوڑا اور وحشیانہ غراہٹ بھی حلق سے اُڑا کرتے ہوئے میرے چہرے پر نکلا جڑ دیا تھا۔

بوغانے کا ہاتھ انسانی ہاتھ نہیں تھا، کسی ربوٹ کا ہاتھ تھا۔ اس کے ایک ہی زوردار کئے نے مجھے برف اپنے پر مجبور کر دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے چمک رہے تھے۔ میرے زمین پر گرتے ہی نائٹ لے کے چار تو منہ افراد مجھ پر جھپٹے اور مجھے بے بس کر کے میری مشکلیں کر دیں۔

میرا خیال تھا وہ دور کے ساتھ بھی کوئی ”مناسب“ سلوک کریں گے۔ مگر مقام شکر تھا کہ انہوں نے اس شخص درشت لہجے میں کچھ گفتگو کر کے چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں، بوغا اور اس کے گرگوں کی حراست لے کر نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔

\*\*\*

عامل عاروب کے بیروکاروں کا یہ ٹولا گھوڑوں اور گھنے بالوں والے خچروں پر سوار اپنے قبیلے کی طرف جارہا تھا اور میرے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اس بار میں حالات کے ہاتھوں ہار گیا تھا۔ یہ نہیں کیوں اس بار گنہگار کے معاملے میں میرے ستارے گردش میں تھے۔ میں ہر بار کسی نئی بہت کا شکار ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ مجھے یہ احساس بھی کچھ کے لگا رہا تھا کہ گنہگار اس وقت خود بھی

مصاب کا شکرتھی اور تہا ان برے لمحات میں وہ مجھے یاد کر رہی ہوگی۔ مگر میں اس کی مدد کے قابل نہ تھا۔ میں تو خود اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتا تھا کہ میری ماں نے اس کے باپ شاہ میر کو معاف کر دیا تھا۔ میں اسے فون پر ہی یہ خوش خبری اس کے امریکہ میں قیام کے دوران ہی سنا ڈالتا۔ میں نے کیوں یہ سوچا کہ میں خود اس سے مل کر اسے یہ عظیم خوش خبری سناؤں گا جس کی وہ تمنائی تھی۔ میں نے کیوں اسے اپنے سر پر اند دینے کے چکر میں دیر کر دی تھی۔ کاش! کاش!..... مگر اب میرے پاس سوائے پیچھے ہٹنے کے اور کیا تھا؟ ان سارے خیالات اور پریشان کن سوچوں نے مجھے بالکل ادھ مو کر کے رکھ دیا تھا۔

ادھر ان سفاک اور بے رحم کیلاشیوں کا سفر جاری تھا۔ سردرات شاید اپنے آخری پہر میں تھی اور بے دست و پا ان خوئی، بھیڑیوں کے چنگل میں پھنسا اپنی قسمت کی ستم ظریفیوں سے الجھ رہا تھا۔ اندیشوں اور وسوسوں بھرا یہ سفر نصف گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ اپنے قبیلے میں داخل ہونے کے بعد اس کے دیگر مشعل بردار افراد بھی ان سے آن ملے تھے اور عجیب و غریب آوازوں کے ساتھ نعرے بلند کر رہے تھے۔ اپنے روحانی پیشوا پر قاتلانہ حملے کرنے والے کی گرفتاری پر وہ اپنے طور پر بیک وقت خوشی اور غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی تو جیسے دیرینہ مراد پوری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد مجھے نچر سے اتار کر نہایت دردی سے کھینچتے ہوئے اس کی خروٹی چھت والی پگڈانہ عمارت سے اندر لایا گیا جہاں ان کے دیوتا ناہن میز کی بدہیت مورتی اور قربان گاہ تھی۔ اس میں وہ سنگلاخ قید خانہ بھی تھا جہاں میں پہلے بھی قیدی رہا تھا۔

مجھے یہاں تک کئے، ٹھوکریں اور لاتیں مارتے، کھینچتے ہوئے لایا گیا تھا۔ ساتھ ہی بوغا اپنی زبان پر ایک ہاتھ بلند کر کے اونچی آواز میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ اس کے انداز و لہجے سے خوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ ان کی زبان نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اگرچہ عامل عاروب سمیت اس کے چند قریبی ساتھیوں کو کوئی پھوٹی آواز بھی لیکن بوغا شاید اس سے بالکل ہی کورا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ عامل عاروب نے بھلا ایسے آدمی کو کیوں کمانڈر بنا رکھا تھا؟ شاید اس کی وجہ بوغا کا غیر معمولی تنخواہ جش، وحشاندہ انداز و اطوار، جنگجو مہارت رہی ہوگی۔

اس وقت بوغا ہی مجھے نہایت بے دردی کے ساتھ نچر سے اتار کر جیکٹ کے کالر سے پکڑے گھینٹا ہر لے جا رہا تھا۔ اندر ہال کمرے کے وسط میں لاکر مجھے بخ دیا گیا۔ پھر تین اطراف یہ سب لوگ ہاتھوں میں مشعلیں، سان اور راتھلےسے تانے کھڑے ہو کر وحشاندہ انداز میں اپنے حلق سے عجیب و غریب چیخیں مارتے کرتے گئے۔ چوتھی سمت چبوترہ تھا اور چبوترے کے وسط پر ان کے دیوتا دابولا میز کی بدہیت بت رکھا ہوا تھا۔ اس کے بالکل ساتھ ایک اونچی اور چوڑی پشت گاہ والی تخت نما عجیب وضع کی کرسی پر عامل عاروب بٹ چھپنے بڑے طنطنے کے ساتھ براجمان تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ میں تیل کے پیڑو کی ہڈی تھامی ہوئی تھی مگر درحقیقت یہ اس کی سان تھی۔ عامل عاروب کی چند ہی چند ہی آنکھوں سے مقناطیہیت پھوٹ رہی تھی۔ ان میں میرے لئے نفرت کی چنگاریاں بھی مترشح تھیں۔

مجھے یوں لگا جیسے میں افریقہ کے کسی دور دراز جزیرے کے وحشی قبائل کے زرنے میں پھنس گیا ہوں۔ عامل عاروب جیسے ہی کھڑا ہوا، یکدم شور مچ گیا۔ خروٹی چھت والی عبادت گاہ میں ایک ایک جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھر اس نے بائیں ہاتھ کا اشارہ کیا تھا۔ یکدم دو افراد نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے اور مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ عامل عاروب چبوترے کے مختصر قد بچے کے

”ہوں..... تو تم وہی ہو۔“ معاہل میں عامل عاروب کی سنسناتی آواز ابھری۔ پھر دوسرے ہی لمحے شدید غیظ و غضب کے عالم میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہڈی نمسان کی انی سے میرے چہرے پر چکا لگایا۔ مجھے اپنے گال کی کھال چیرنی ہوئی محسوس ہوئی اور اذیت کی شدت سے بے اختیار میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی۔ میرے گال سے خون کی تپلی دھار بہہ نکل گئی۔ اس کے بعد نہ جانے عامل عاروب کے دل میں کیا سمائی کہ وہ فوراً ہی اگلے قدموں واپس ہوا پھر چبوترے کے مختصر قد بچے اگلے ہیروں کی طرح لپک کر اٹھا اور واپس چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی حکم صادر کرتا، اچانک باہر شور مچا دیا۔ سب لوگ چونک پڑے اور میں بھی غیر ارادی طور پر چونک کر ہال کے بڑے سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اپنے زخمی گال پر رکھا ہوا تھا۔ ہال میں تین افراد داخل ہوئے۔ انہوں نے الم نصیب گنیز کو دو بچ رکھا تھا۔

میں ان تینوں کیلاشیوں کو پہچان گیا۔ ان میں تیسرا وہی ہرکارہ تھا جو کش پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے سردار زور آور خان کی بیٹی شہزادی کو زخمی اور بیٹے شہ زور کو بے دردی سے قتل کرنے کے بعد ان کی جیب میں فرار ہو کر اپنے انہی دونوں ساتھیوں سے جا ملا تھا۔

گنیز کو دیکھتے ہی میرے پورے تن بدن میں آتش فشاں ساد پکنے لگا۔ گنیز کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اور پھر جیسے ہی وہ تینوں اسے قریب لائے تو مجھے دیکھ کر وہ بری طرح چونکے۔ جیسے انہیں دہری خوشی کی توقع نہ تھی۔ دونوں شکار ان کے قبضے میں تھے۔ گنیز نے جیسے ہی ٹڈیالنگاہوں کے ساتھ مجھے بھی ان کے قبضے میں دیکھا تو ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے مجھے دیکھ کر اس کے اندر جانے کدھر سے قوت اُٹھ آئی کہ وہ دامن چھڑا کر چیختی ہوئی میری طرف دوڑی۔

”نادر.....!“

لیکن راہ میں ہی مردود بوغانے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ گنیز اس کی آہنی گرفت میں کسی بے بس کمزور چڑیا کی طرح ترے لگی۔

میری سکتی ہوئی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا خون پارے کی مانند ترپ رہا تھا۔ مجھے بھی کچھ ہوش نہ رہا اور میں نے وحشت جنوں خیز انداز میں زخمی شیر جیسی دھاڑ ماری اور دوڑ کر بوغا پر چھینا۔ پھر اس کے چہرے پر زوردار زکا جڑ دیا۔ اس کا نیچا ہونٹ پھٹ گیا۔ ذیل ڈول میں ہم دونوں کا انیس میں کا ہی فرق تھا۔ بوغا کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور پھر ان میں نفرت و غیظ کے الاؤ دہکنے لگے۔ اس وقت دیگر ہرکاروں نے وحشاندہ غراہٹ کے ساتھ میری جانب جارحانہ پیش قدمی کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بوغا نے خوں ناک غراہٹ آمیز آواز کے ساتھ انہیں بڑھنے سے روک دیا۔ پھر بے آواز بلند چیخ کر کچھ کہا اور ساتھ ہی گنیز کو ایک جانب دھکیل کر دو ہاتھ فضا میں بلند کر کے کوئی مخصوص اشارہ کیا۔ اس وقت اس کے دیگر ہرکارے تین اطراف سے اگلے گرد گھیر ڈال کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔

اب درمیان میں صرف میں اور بوغا آئے سانسے کھڑے ایک دوسرے کو غضب ناک نظروں سے گھورنے لگے۔ بوغا نے ایک نظر عامل عاروب پر ڈالی اور مودبانہ آواز میں اس سے کچھ کہا تو عامل عاروب

میرا اپنے تئیں اس نے مجھے اپنی طاقت کے جال میں پھنسا دیا۔ اسے شاید اپنی جسانی طاقت کا کچھ دہی غرور تھا۔

اب ہماری نظریں ایک دوسرے کے چہرے پر کبھی ہوئی تھیں۔ طاقت آزمائی شروع ہو چکی تھی۔ ہم دونوں پوری قوت صرف کر کے ایک دوسرے کے ہاتھ، پنجوں سمیت مروڑنے کی کوشش کر رہے تھے اس زور آزمائی کے دوران کبھی وہ مجھے اپنے زور پر چند قدم پیچھے دھکیل رہا تھا، کبھی میں اسے دھکیلتا ہوا ہی لے جا رہا تھا۔ پھر جب دونوں کی دال نہ گل سکی تو بوجھنے ایک روایتی ساداؤ آزمایا اور بجلی کی سی لکڑی کے ساتھ مجھے لئے چند قدم پسپائی اختیار کرتے ہوئے یکدم رک کر بہ سرعت اچھلا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر جمادیئے۔ پھر نیچے زور سے عقب میں اچھال دیا۔ میں پشت کے بل اس کے ہرکاروں ہڈیوں میں جا گرا۔ وہ خوشی سے شور مچاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ ادھر بوجھنے ذرا بھی سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ پھر جھپٹا اور میری کمر پر سوار ہو گیا اور ریسٹروں کے سے انداز میں دونوں ٹانگیں پشت کی سمت موڑ کر بائیں دینے۔ اس پر اپنے بھاری بھر کم وجود کا دباؤ ڈالنے لگا۔ اس داؤ میں میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کا ڈر تھا۔ تکلیف کے باعث پہلی بار میرے حلق سے تیز چیخ خارج ہو گئی اور دشمن کی تکلیف دہ چیخ سن کر ہال ہو جوداؤں کے بیروکاروں نے خوشی سے نعرے بلند کر کے اپنے کاڈر کی حوصلہ افزائی کی۔

ان چیخوں اور نعروں کے بیچ مجھے گنبد کی دکھ بھری آہ بھی سنائی دی۔ میری جان پر نہیں بلکہ گنبد مصیبت فانی اور میری زندگی خدا کے بعد گنبد کی ہی امانت تھی۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو یقیناً گنبد بھی زندہ نہ رہتی۔ ہال میں نے اپنے مضروب اور ریختہ وجود کی طاقت کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں فرش پر بٹا کر اپنا بالائی جسم بوجھنے کے بھاری بھر کم وجود سمیت اوپر اٹھانے لگا۔ اس جاں لی اور ہر زور قوت سے مجھے دانتوں تلے پسینہ آ گیا اور میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ میں (خود) طریقے سے اپنے بالائی وجود کو ایک حد تک اوپر اٹھا چکا ہوں تو میں نے بازوؤں کے زور پر ہی دار چٹائی مگر بوجھنے میرا داؤ فوراً بھانپ لیا اور پھرتی کے ساتھ میری ٹانگیں پکڑ کر الف کھڑا ہو گیا۔ ہال میں سر کے بل فرش پر جھول رہا تھا۔ بس یہی موقع تھا جب بوجھ دوسرا مہلک داؤ مجھ پر آزمانے کی رت ہی کر سکا۔ کیونکہ میں نے سر کے بل جھولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیروں کی پٹیلیوں پر لئے اور مضبوطی سے پکڑ کر انہیں زوردار جھکا دیا۔ نتیجتاً بوجھنے کے قدم زمین سے اٹھ گئے اور مجھ سمیت ڈال کے بل ”دھپ“ کی زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا۔ ہال میں سب کو سانپ سوگھ گیا۔ اب بازی کسی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اچھل کر اپنی ٹانگوں کے دونوں گھٹنے اس کے پیٹ پر رسید کر دیئے۔ ٹانگے حلق سے اذیت ناک اور کمر پر یہ چیخ خارج ہوئی۔ میں تڑپ کر اس سے علیحدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک وقت مجمع سے کسی نے سان بوجھنے کی طرف اچھال دی۔ بوجھنے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اسی وقت مجھے یاد آ کر اس کے ایک ساتھی سے جھپٹتی ہوئی سان میری جیکٹ کے اندر مضمض کے نیچے بھی محفوظ تھی۔ میں نے انہر گر بیان میں ہاتھ ڈال کر پھرتی سے وہ سان نکال لی۔ گویا اب مقابلہ پھر برابر کا تھا۔

ہم دونوں کے ہاتھوں میں سانیں تھیں۔ سانیں سنبھالے ہم دونوں ایک دوسرے کو خون کی نظروں سے گزرتے ہوئے دائرے کی صورت میں گھوم رہے تھے۔ ہم دونوں ہی مد مقابل کی طرف سے پہل کے پیش منہ تھے یا پھر موقع ملنے ہی سان پیوست کرنے کے تھے۔ جب میری طرف سے کوئی جارحانہ پیش نہ ہوئی تو بالآخر بوجھنے ہی جارحانہ طور پر قدم بڑھایا۔ مگر مجھ پر اپنی سان کا وار کرنے کی بجائے یکدم ہاتھ جھک کر لڑھکنی لگائی اور جب تک میں اس کا یہ مکارانہ داؤ سمجھتا، اس کی ایک ٹانگ فرش پر ”سوپ“

کے پتلے پتلے مکروہ ہونٹوں پر بدھیت مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ اپنی تخت نما کرسی پر براجمان ہو گیا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہال کے بل میں جان چکا تھا کہ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟..... میری قسمت کا فیصلہ منظر طور پر بوجھنے کے سپرد کر دیا گیا تھا اور بوجھنے بھی غالباً میری اس جرأت کا مجھے مزہ چکھانے کی خاطر عال عاروب سے یہ اجازت طلب کی تھی۔

ہال میں اب کسی وقت بھی رن پڑنے والا تھا۔ اس وقت بوجھنے غصہ ناک چنگھاڑ ماری اور کسی وحشی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں پہلے ہی اس کی متوقع جارحانہ پیش قدمی کے لئے تیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی وہ غصہ ناک درندے کی مانند مجھ پر جھپٹا میں نے اپنے گالے زخم کو بھلا کر فوراً ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دی تو اس کا پیٹ میرے دائیں کانڈھے کی زد میں آ گیا اور میں نے اپنے پورے لمبے چوڑے وجود کی طاقت صرف کرتے ہوئے بوجھنے اسی کانڈھے پر اٹھا کر ہال کے پختہ فرش پر دے مارا۔

ہال میں غصہ ناک شور مچا۔ بوجھنے کی کمریقینا درد سے دہری ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھی چیخ چیخ کر اس کی ہمت افزائی کرنے لگے۔ تاہم بوجھنے دوبارہ اٹھ کر کھڑے ہونے میں ایک لمبے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ان کا کمانڈر تھا۔ ابتداء میں ہی میرا گھونسا کھانے اور دوسری بار میرے ہاتھوں پٹنے جانے پر اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے مسخ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام اور غیظ کی وحشتانہ چمک ابھری۔ پھر دوبارہ وہ غراہٹ آمیز چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا۔ اس بار میں نے اسے ڈانچ دینے کی غرض سے بظاہر دوبارہ وہی داؤ کھیلایا۔ بوجھنے یکدم رک کر مجھے چھانپنے کے لئے جھکا تو میں نے ایک زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کر دی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ بوجھنے جیسے حریف کو صرف بچھاڑنے کے لئے نہیں بلکہ اسے نابود کرنے کے لئے میری ہر ضرب زوردار اور کاری ہو۔ کیونکہ میں اس ایک ایکی ہونے والے اپنے اور بوجھنے کے درمیان مقابلے کا مقصد جان چکا تھا۔

یہ بالکل ایسا ہی مقابلہ تھا جسے ”پٹ فائٹنگ“ (PIT FIGHTING) کہا جاتا تھا جو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا اور نیو میکسیکو کی کے انڈر ورلڈ کے درمیان خفیہ تہ خانوں میں دو حریفوں کے درمیان لڑی جاتی تھی اور اس کا فیصلہ دوسرے حریف کی صرف موت پر ہی ہوتا تھا۔ یہ غیر قانونی مقابلہ ہوتا تھا۔ یہاں بھی مجھے کچھ ایسا ہی لگتا تھا۔

بوجھنے عال عاروب سے شاید ایسا بات کی اجازت طلب کی تھی کہ وہ ایک طرف اپنی بے عزتی کا بدلہ اتارنا چاہتا تھا تو دوسری جانب دشمن کو بھی موت کی نیند سلانا چاہتا تھا۔

اور نادر علی خان بھلا ایسے مقابلوں سے کہاں پیچھے ہٹنے والا تھا۔ یہ تو میری سرشت میں تھا کہ اپنے حریف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پیچھے آزمائی کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

تیسری بار میرے ہاتھوں پٹنے کے بعد بوجھنے کی ساری مہارت دھری کی دھری رہ گئی اور وہ اس قدر مشتعل ہو گیا کہ ہوش و حواس کا دامن چھوڑ بیٹھا اور یہی میں چاہتا تھا۔ وہ غراتا، دھاڑتا ہوا میری جانب لپکا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے پنجے میری جانب بڑھا دیئے۔ یہ ایک چیخ تھا پیچھے آزمائی کا۔ یعنی میں ادھر ادھر ہوئے بغیر اس کے پنجوں میں اپنے ہاتھوں کے پنجے پھنسا دوں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو بزدل تصور کیا جاتا اور میں نے اس کی یہ دعوت قبول کر لی میں نے پنجے سے پیچھا لایا۔

بوجھنے کے ہونٹوں پر بیٹھتی فاسقانہ مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں کی خونخوار اور وحشیانہ چمک میں بھی اضافہ ہو

دروازے کے باہر کو کھلے ایک دیوہیکل چوٹی پٹ کے عقب میں جا چھا تھا۔ وہ سارے وحشیانہ یلغار اور چیخوں کے ساتھ میری تلاش میں کافی دور وادی کی طرف لشکر کی صورت میں دوڑ گئے۔ اچانک مجھے عبادت گاہ کے اس چور دروازے کا خیال آیا جو درحقیقت بالائی منزل کے زینے میں کھلتا تھا۔ مگر اس کا ایک اور چھوٹا دروازہ اندر ہال کے چوڑے کی طرف بھی کھلتا تھا۔ کیونکہ پہلے والی مہم کے دوران میں نے اس راستے سے ہال عاروب پر شب خون مارا تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر مجھے یہ سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ کیونکہ اس نے تقریباً سارے ہر کارے میری تلاش میں وہاں سے جا چکے تھے۔ مگر وہ جلدی واپس لوٹ سکتے تھے۔ بہت کم تھا اور مجھے فوراً منصوبے کے آخری مرحلے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ چنانچہ میں نے بہ احتیاط عبادت گاہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ تیزی کے ساتھ کھسکتا شروع کر دیا۔ پھر میدان صاف پاتے ہی میں مذکورہ دروازے کے قریب آ گیا۔ دروازے کو میں نے کھولنا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا۔ میں دروازے کی متوازی جری سے اندر جھانکنے کے لئے ابھی جھکا ہی تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ میں جیسے ہی پلٹا تو دو ہرکاروں کو وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ خود پر جھپٹنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ میں یکدم ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ دونوں دروازے سے ٹکرائے۔ میرا بیاں بازو اور دائیں ہاتھ کی پھیلی پہلے ہی بری طرح زخمی تھی مگر میں نے ان سے بھڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں دروازے سے ٹکرا کر میری طرف پلٹے تو اچانک دم خود راکھی اور کھٹکی فضا میں گولی چلنے کے دو دھماکے ہوئے اور میں نے ان دونوں ہرکاروں کو کریمہ چیخوں کے ساتھ زمین بوس ہوتے دیکھا۔

میں نے بری طرح چونک کر فائر کی آواز کی سمت دیکھا تو مجھے چند قدموں کے فاصلے پر کوئی کھڑا نظر آیا۔ وہ دوڑ کر جیسے ہی میرے قریب آیا تو میں بری طرح چونک گیا۔ وہ میرا دوست، داور خان تھا۔ ”صیب!..... تم ٹھیک تو ہونا؟“ وہ ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے بولا۔ میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک عبادت گاہ کی دوسری دیوار کی سمت عقل بردار ہرکاروں کا جلوس سا آتا دکھائی دیا۔ ”صیب!..... جلدی نکل چلو..... آؤ“ داور خان مجھ سے بولا اور اب میرے پاس یہاں سے نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

میں اور داور خان تھوڑی دور دوڑتے ہوئے اس کے خچر کے قریب پہنچے، اس کے بعد اس نے اپنے خچر کو پلٹ لگائی۔ عقل مند کی کاہلی تقاضا تھا کہ سرعت وہاں سے میں نکل جاتا۔ مگر میں گیند کو عامل عاروب کے ہنگام سے چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ داور خان مجھے برقی ٹیلوں کی بھول بھلیوں میں لئے اپنے خچر پر سوار کئے بہت دور لے آیا۔ ”صیب!..... تم بہت زخمی ہو“ وہ بولا۔ ”مگر تم لگتے کرو۔“ میں نہیں سیدھا سراسر دار آکر موتی کے پاس لے جا رہا ہوں۔“

”لیکن دوست! میری ایک ساتھی ان لوگوں کے قبضے میں ہے۔“ میں نے جوابا کہا۔ ”سردار آکر موتی تمہاری ضرورت مدد کرے گا۔ جب اسے یہ پتہ چلے گا کہ تم نے ایک بار پھر عامل عاروب سے جنگ کی ہے تو وہ تمہاری بہت عزت اور قدر کے علاوہ تمہاری مدد بھی کرے گا۔ تم ایک بار کمرے ساتھ اس کے پاس چل کر دیکھو۔“

میرے پاس اس کا مشورہ ماننے کے سوا اور کیا چارہ تھا۔ ناچار میں نے جب سادھ لی۔ خاصی دیر بعد ہم سردار آکر موتی کے قبیلے کی حدود میں داخل ہوئے تو یکدم چند خچر سوار مسلح افراد نے ہمیں روک لیا۔ داور خان نے شاید انہیں پہچان لیا تھا۔ ادھر میرے بازو سے خون بہنے اور جاں گسل حالات کمرے ساتھ اس کے پاس چل کر دیکھو۔“

کے انداز میں لہرائی اور میری ٹانگوں سے ٹکرائی اور میں اچھل کر پشت کے بل فرش پر گرا تو لامحالہ میرے ہاتھ سے سان چھوٹ کر دور جا گری۔ پس یہی وہ موقع تھا جب عیار اور سفاک لڑاکا بوغانے اپنی سان چھوٹا میرے پیٹ میں گھونپتی چاہی مگر میں نے بھی گرتے ہی بروقت لوٹ لگا دی۔ بوغانے خالی جگہ پر گرا اور میں نے زوردار لات اس کے چہرے پر رسید کر دی اور وہ چیخ مار کر الٹ پڑا۔ مگر سان اس کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی تھی۔ میں نے اپنی سان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا مگر وہ غائب تھی یا پھر ”غائب“ کر دی گئی تھی۔ اور بوغانے وحشیانہ چنگھاڑ کے ساتھ دوبارہ مجھ پر جھپٹا۔ میری نظریں چونکہ فرش پر گر کر اپنی سان کی طرف متوجہ تھیں اس لئے میں مار کھا گیا۔ بوغانے اپنی سان سے مجھ پر وار کر دیا۔ میں نے اپنے سینے خود کو دہری سان سے مہیب وار سے بچانے کی کوشش کرنی چاہی مگر وہ میرے دائیں بازو میں بیوست ہو گئی..... اذیت کی دوسری ٹیک اترنے والی ناقابل بیان لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ اسی وقت عاروب کے چیلوں نے نعرہ ہائے تسخیر بلند کیا۔ مگر مجھے گیند کی پُر درد آواز اس شور پر بھاری لگی۔

”نادر.....“ اس نے دکھ بھرے لہجے میں بے اختیار پکارا تھا۔ بوغانے سان میرے بازو سے کھینچی اور اس بار میرے سینے میں اتارنے کی کوشش کی مگر میں اپنے زخمی بازو کی تکلیف بھلا کر یکدم ایک طرف ہٹا اور کوشش یہی کی کہ بوغانے سے زیادہ دور نہ ہو سکوں۔ چنانچہ جیسے بوغانا سان والے ہاتھ کا وار خالی گیا تو میں نے کرانے کے انداز کا ایک زبردست وار اس کی کلائی پر کیا۔ سان اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ بوغانا جان چکا تھا کہ وہ خالی ہاتھ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اس لئے مجھ سے بھڑنے کی بجائے وہ فوراً فرش پر گر کر ہوئی اپنی سان اٹھانے کو پلکا۔ مگر میں نے بھی اس کے ساتھ ہی سان اچکنے کے لئے جست لگائی۔ ہم دونوں ہی کے ہاتھ سان پر پڑے۔ مگر قسمتی سے میری گرفت میں سان کا دو دھاری پھل آیا تھا اور بوغانے کے ہاتھ کی گرفت میں سان کا دستہ۔ اس نے جیسے دستے کو پکڑ کر سان میرے ہاتھ کی گرفت سے کھینچی تو میری پھیلی کٹ گئی۔ بائیں بازو کی تکلیف ابھی تازہ تھی کہ سان کے دو دھاری چر کے نے مجھے غدار کر دیا۔ میرے منہ سے کرب ناک سسکاری خارج ہو گئی۔ سان قابو میں آتے ہی بوغانے پھرتی سے میرے پہلو پر وار کیا مگر میں نے پلٹ کر خود کو نہ صرف اس وار سے بچالیا بلکہ اس کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ بوغانے کی قدم لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب جا پڑا۔ وہاں سے اس کے خونی ہرکاروں کا مجمع چھٹ کر دائیں بائیں ہو گیا۔ میں نے وہیں سے جست لگائی۔ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بوغانا پر چھلاگ لگا دی اور اسے رگیدتا ہوا بیرونی دروازے پر پڑا۔ اس کے حلق سے بھیا نک اور کریمہ چیخ خارج ہوئی۔ گرنے کے باعث نہ جانے کس طرح اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سان اس کے سینے میں سین دل کے مقام پر بیوست ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ مگر جب بوغانے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تو حقیقت اور اک ہوا۔ ٹھیک اسی وقت ہال میں کئی چینی گونج اٹھیں۔ عاروب کے چیلوں کو اپنے کمانڈر کی اذیت ناک شکست اور موت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سب میری جانب لپکے۔ ایک ایک میرے ذہن میں بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔

”سز دست میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔“ چنانچہ میں نے زخمی ہونے کے باوجود اٹھنے میں دیر نہیں لگائی اور چھلاوے کی طرح باہر نکل گیا۔ غائب ہو گیا۔ ہرکارے جیسے دھاڑتے ہوئے میرے تعاقب میں ہو لئے تھے۔ مگر میں نے ایک عقل مند کی بھی کی تھی کہ باہر کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً عبادت گاہ کی دیوار سے چپک گیا تھا اور پھر

نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میرا منہ چکرانے لگا اور مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

\*\*\*

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو آرام دہ مسیروں پر پڑے پایا۔ میرے زخمی بازو اور ہتھیلی مرہم پٹی کی ہوئی تھی۔ تکلیف میں اب کافی حد تک کمی آگئی تھی۔ میں نے حیران پریشان نظروں سے اپنے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا مگر اس کی چھت قدرے بلند اور ڈھلوان تھی۔

”اب کیسی طبیعت ہے عجیب؟“ اچانک داور خان کی آواز پر میں چونکا۔ آواز کی سمت دیکھا جہاں ایک کرسی پر وہ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اٹھا تھا اور اب میرے قریب مسیروں پر آٹھ تھا۔

”اب بہتر ہوں۔“ میں نے کمزوری آواز میں کہا۔ مگر.....

”یہاں آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے صیب!“ وہ یکدم دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”مگر دوست! میری ساتھی گنیز کی جان تو خطرے میں ہے۔“ میں نے تشویش آمیز نظر سے کہا۔

”میں نے سردار آگرموشی سے مل کر انہیں ساری بات بتادی۔ تم بے فکر رہو۔“

”کیا یہ جگہ.....“

”ہاں صیب! ہم سردار آگرموشی کے گھر میں ہی ہیں۔“ وہ بولا۔

”میں اب یہاں سے جانا چاہوں گا۔“ میں فکرمند ہو کر مسیروں سے اٹھنے لگا تو اچانک ایک بھاری بھر کم عمر سیدہ مگر چاق و چوبند شخص زرق برق لباس میں اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ دو اور مسلح افراد بھی تھے۔ وہ ایک طرف مڑا ہوا انداز میں کھڑے ہو گئے جبکہ داور خان بھی احتراماً اپنے ہاتھ باندھے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں اٹھ کر مسیروں پر بیٹھ گیا تھا۔

”کیسے ہو نوجوان!“ آنے والی بارعب شخصیت نے ملائمت بھرے لہجے اور شستہ اردو میں مجھ سے پوچھا۔ میں نے اس کی بارعب شخصیت سے اندازہ لگایا تھا کہ یہی سردار آگرموشی تھا۔

”میں ٹھیک ہوں..... آپ.....؟“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ کرسی پر براجمان ہونے ہوئے بولا۔

”ہم سردار آگرموشی ہیں اور تم جیسے بہادر نوجوانوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمیں اب بھی یقین نہیں آرہا ہے کہ تم ایک بار پھر اس ذلیل عاروب کو شکست دے کر زندہ سلامت لوٹ آئے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا اے بہادر جری نوجوان؟“

”نادر علی خان۔“ میں نے ہولے سے اپنا نام بتایا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”پنڈی میں رہتا ہوں۔ مری کے ایک گاؤں میں۔“

”خوب!..... یہ لڑکا تیار رہا تھا کہ تمہاری کوئی گنیز نام کی ساتھی لڑکی اس مردود عامل عاروب کی قید میں ہے؟“ اس نے قریب خاموش کھڑے داور کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا تو میں نے جلدی سے اپنا سراٹھاتے ہوئے ساری بات بتادی۔ جب اسے عامل عاروب کے کائنات پر بوغا کی خبر

ساتھ دوبدو خون ریز جنگ اور پھر میرے ہاتھوں اس کی عبرت ناک شکست اور ہلاکت کا علم ہوا تو میں نے دیکھا، سردار آگرموشی کے چہرے پر پہلے حیرت اور ناقابل یقین تاثرات ابھرے، پھر اس کے بعد دیکھنے تک خوشی سے بھرپور لہجے میں گویا یقین طلب لہجے میں بولا۔

”خوب!..... یہ لڑکا تیار رہا تھا کہ تمہاری کوئی گنیز نام کی ساتھی لڑکی اس مردود عامل عاروب کی قید میں ہے؟“ اس نے قریب خاموش کھڑے داور کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا تو میں نے جلدی سے اپنا سراٹھاتے ہوئے ساری بات بتادی۔ جب اسے عامل عاروب کے کائنات پر بوغا کی خبر

ساتھ دوبدو خون ریز جنگ اور پھر میرے ہاتھوں اس کی عبرت ناک شکست اور ہلاکت کا علم ہوا تو میں نے دیکھا، سردار آگرموشی کے چہرے پر پہلے حیرت اور ناقابل یقین تاثرات ابھرے، پھر اس کے بعد دیکھنے تک خوشی سے بھرپور لہجے میں گویا یقین طلب لہجے میں بولا۔

”خوب!..... یہ لڑکا تیار رہا تھا کہ تمہاری کوئی گنیز نام کی ساتھی لڑکی اس مردود عامل عاروب کی قید میں ہے؟“ اس نے قریب خاموش کھڑے داور کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا تو میں نے جلدی سے اپنا سراٹھاتے ہوئے ساری بات بتادی۔ جب اسے عامل عاروب کے کائنات پر بوغا کی خبر

ساتھ دوبدو خون ریز جنگ اور پھر میرے ہاتھوں اس کی عبرت ناک شکست اور ہلاکت کا علم ہوا تو میں نے دیکھا، سردار آگرموشی کے چہرے پر پہلے حیرت اور ناقابل یقین تاثرات ابھرے، پھر اس کے بعد دیکھنے تک خوشی سے بھرپور لہجے میں گویا یقین طلب لہجے میں بولا۔

”خوب!..... یہ لڑکا تیار رہا تھا کہ تمہاری کوئی گنیز نام کی ساتھی لڑکی اس مردود عامل عاروب کی قید میں ہے؟“ اس نے قریب خاموش کھڑے داور کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا تو میں نے جلدی سے اپنا سراٹھاتے ہوئے ساری بات بتادی۔ جب اسے عامل عاروب کے کائنات پر بوغا کی خبر

میری بات پر سردار اگر موشی حیرت بھری نظروں سے مجھے تنکے لگا، پھر اسی لہجے میں بولا۔

”تم تنہا..... یہ ہم سر کر سکتے ہو؟..... مگر کیسے؟“

”یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں معزز سردار! کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ نہ صرف میں اپنی ساتھی نگیز کو اس مردود عامل عاروب سے چھڑاؤں گا بلکہ اس خبیث کا پتا بھی ہمیشہ کے لئے صاف کر دوں گا۔ کیونکہ بعد میں بھی وہ پہلے کی طرح ہمارے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار بنارہے گا۔ اس کے خاتمے کے بعد آپ اس کے قبیلے پر لشکر کشی کر سکتے ہیں۔“

میری بات پر سردار اگر موشی نے اپنے سر کو ہولے سے تھپکی جنبش دی۔

”مجھے تھوڑا اسلحہ درکار ہے..... صرف ایک پستول اور فاضل راؤنڈز۔“ میں نے آخر میں اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”وہ تمہیں مل جائے گا۔ ابھی تم آرام کرو۔ صبح ہونے والی ہے۔ میں کچھ کھانے کے لئے بھجواتا ہوں۔“

سردار اگر موشی یہ کہہ کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی چپ سادھ لی۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔ سردار اگر موشی اور اس کے دونوں مصاحب خاص کے جانے کے بعد داور خان مجھ سے بولا۔

”صیب! میں بھی اب چلوں گا۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔“

”سنو!“ میں نے کہا۔

”جی صیب؟“ وہ دھیرے سے بولا۔

”تم اپنے ماموں پوشے کو کیا جواب دو گے؟ وہ تو تمہارا بھی دشمن بن گیا ہوگا۔“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو اس کے چہرے پر بخ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

”ارے صیب! وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... میں اسے چھوڑ کر چترال واپس چلے جانے کی دھمک دوں گا تو وہ تیر کی طرح سیدھا ہو جائے گا۔“

”اچھا، ایک بات تو بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”جی صیب!“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا تم اپنے ماموں پوشے کے ساتھ یہاں خوش ہو؟“

”اور کیا کروں صیب!“ وہ عجیب سے دکھ سے بولا۔ ”میں چاہوں تو مجھے چترال میں اس سے زیادہ اچھی نوکری مل سکتی ہے۔ مگر صیب! دل نہیں مانتا کہ اپنے بوڑھے ماموں کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ کچھ بھی سنا“

وہ میری ماں کا بھائی ہے۔ میں اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا صیب! ماموں پوشے کی صورت میں مجھے اپنی ماں کا چہرہ نظر آتا ہے۔“ ماں کو یاد کرتے ہی اس کی آواز رندھنے لگی تو وہ جلدی سے کرسی سے اٹھتے ہوئے

بولا۔

”اچھا صیب!..... اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میں اب چلتا ہوں۔ آتا رہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ

کمرے سے نکل گیا۔ میں خاموش نظروں سے خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ اس کے بعد خالی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند مجھے نہیں آئی۔

نگیز کی طرف سے میرا دل سخت بے چین اور پریشانی کا شکار تھا۔ میں یونہی بے چین ہو کر اٹھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں نے وقت کا اندازہ کرنے کی خاطر کھڑکی زرا دکر کے باہر دیکھا۔ سرد اور کٹ دار برقی ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ ممکن ہے صبح طلوع ہو چکی ہو لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہونے کے باعث ہنوز اندھیرے کا سا سماں تھا۔ میں نے کھڑکی بند کی، پھر اپنے رزموں کا جائزہ لیا۔ مرہم پٹی ہونے

اب کافی آرام تھا۔

اسپری پر آکر دروازہ ہو گیا۔ یونہی پُرسوج انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔ ابھی ذرا ہی دیر گزری تھی کہ جی سی آہٹ سنائی دی۔ میں بظاہر سوتا ہوا تھا تاہم میرا چہرہ دروازے کی طرف تھا۔ یونہی دل میں جانے کیا خیال آیا کہ میں آنکھیں کھولے بغیر سوتا بنا رہا۔ مگر ایک آنکھ کی جھری سے میں نے کی طرف دیکھتا رہا۔ دروازے کا ایک پٹ دھیرے دھیرے وا ہو رہا تھا۔ اس بات نے مجھے پر مجبور کیا تھا۔

میں نے ایک نومند مگر گینڈے جیسی جسامت کے ٹھنکے قد و قامت والے شخص کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر ڈھانٹا بندھا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ میں تیز دھار والی دلی ہوئی تھی۔ میرا ہاتھ ٹھکا۔ گلوں میں یلکھت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔

میں اب بھی سوتا بنا پڑا رہا اور اس مشکوک اجنبی شخص پر اپنی ادھ کلکی نگاہ جمائے رکھی۔ اس کے ارادے

میں جھلک رہا تھا کہ وہ مجھے قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا یا بھیجا گیا تھا۔ مگر کیوں؟..... میں جب

”کیوں“ کے بارے میں سوچتا، وہ قزول بدست نقاب پوش قاتل میری مسہری کے بالکل نزدیک

آتا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے جیسے ہی اپنا قزول والا ہاتھ فضا میں لند کیا اور ابھی میرے سینے

لڑائی چاہتا تھا کہ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک زوردار لالت

لے پیٹ پر رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا گیا مگر سنبھلنے میں اس نے ذرا بھی دیر نہ لگائی تھی۔ میں نے مسہری سے

بلیا کوشش کرنی چاہی مگر اس نے پھر مجھ پر وار کر ڈالا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی دیوچ لی

بٹ کے پتے کی شکل کی ٹکینے جیسی سرخ انگشتی پر یونہی میری نگاہ پڑ گئی۔ وہ بھی بلا کی طاقت رکھتا تھا۔

میرے زخمی بازو پر زوردار ٹھوک رسید کر ڈالی۔ میرے حلق سے چیخ سی نکل گئی اور میں مسہری پر جا

برائیاں تھا یہ ڈھانٹا پوش قاتل مجھ پر دوبارہ حملہ کرے گا مگر وہ نہایت پھرتی کے ساتھ دروازے سے

نکل گیا اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ باہر سے دروازے کو کٹدی بھی چڑھا دی۔

میں ہونٹ بھیجنے کر اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر ایک ہاتھ سے دروازہ پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد

دھندلے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس بد بخت ڈھانٹا پوش کی ٹھوک سے میرے بازو کا زخم بھی کھل

نہا۔ سفید پٹی خون بہنے سے سرخ ہونے لگی تھی۔

باہر سے دروازے کی کٹدی کھولی گئی اور چار پانچ مسلح افراد اندر داخل ہو گئے۔ میں نے انہیں ساری

تعدادی۔ وہ چاروں اگلے پیروں دوڑ گئے۔ ذرا دیر بعد ایک مسلح شخص ایک عمر رسیدہ آدمی کو لے کر آ

کر۔ کوئی دیکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چوٹی باکس تھا۔ اس نے مجھے لیٹ جانے کو کہا اور پھر میرے بازو

پر گولی کر نئے سرے سے دوبارہ باندھ دی۔ وہ مسلح شخص چلا گیا۔ وید نے مجھے ایک بیالی میں دوائی

دیا۔ تاریخی رنگ کے محلول والی وہ دوائی خوش ذائقہ تھی جسے پیتے ہی مجھے بدن میں توانائی سی دوڑتی

نہ ہوتی۔

ایک بارش شخص تھا۔ اس نے ایک نظر دروازے پر ڈالی، پھر رازدارانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔

”تم نے حملہ آور کی صورت دیکھی تھی؟“

”نہیں..... اس نے چہرے پر ڈھانٹا چڑھا رکھا تھا۔“ میں نے جوابا کہا۔ وہ کچھ سوچتا بن گیا۔

”کون ہو سکتا ہے یہ؟“ میں نے اسے سوچتا پا کر پوچھ لیا۔ وہ بولا۔

”راس کے سوا یہ حرکت کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس نے ہی تمہیں قتل کرنے کے لئے اپنے کسی آدمی کو

بھیجا ہوگا۔

”رامس؟..... یہ کون ہے؟“ میں نے اچھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

”رامس، سردار آگرموشی کا چھوٹا بھائی ہے۔“

”اوہ.....“ حیرت کے باعث میرے ہونٹ سڑک گئے تھے۔ پھر پوچھا۔ ”مگر رامس یہ حرکت کیا

کرنا چاہتا تھا؟ اس کی بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہے؟ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اچانک کمرے میں سردار آگرموشی اپنے دو مسلح ساتھیوں کے

اندر داخل ہوا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر پریشانی اور تشویش کے آثار تھے۔ شاید اسے مجھ پر

والے قاتلانہ حملے کے متعلق آگاہ کر دیا گیا تھا۔ بارلیش وید فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم خیریت سے تو ہوتا؟“ اس نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

”ہاں..... ٹھیک ہوں۔ عین وقت پر میری آنکھ کھل گئی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا

میرا بازو زخمی کر گیا تھا۔ اب دوبارہ مرہم پیٹی کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے اس کی صورت دیکھی تھی؟“

”نہیں..... اس نے چہرے پر ڈھانچا چڑھا رکھا تھا میں نے اس سے مقابلہ بھی کیا تھا مگر وہ مجھ

دے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ باہر سے دروازے کو بھی کنڈی چڑھا دی۔“

”ہوں۔“ سردار آگرموشی نے ایک گھبر اور پرجوش ہمکاری بھری۔ پھر مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”فکر نہ کرو..... میرے آدمی اس نامعلوم حملہ آور کو تلاش کر رہے ہیں۔ اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ میں۔

تمہارے کمرے کے باہر دو پہرے دار بھی تعینات کر دئے ہیں۔“

”کیا پوچھ سکتا ہوں معزز سردار! یہ حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟“ میں نے سردار آگرموشی کے چہرے

نظر میں گڑتے ہوئے پوچھا تو وہ تھوڑا متذبذب سا دکھائی دینے لگا۔ پھر گوگوسا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا..... خیر، جلد پتہ چل جائے گا۔“ اس کے بعد اس نے قریب

خاموش کھڑے بوڑھے وید سے تھکسا نہ انداز میں مخاطب ہو کر اپنی زبان میں کچھ پوچھا شاید میرے زخم

بارے میں پوچھا تھا۔ وید نے میرے زخم کی طرف دیکھ کر اسے مختصراً کوئی جواب دیا تھا۔ اس کے بعد

دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے چلا گیا۔ اس کے بعد جب وید بھی وہاں سے جانے لگا

میں نے آواز دے کر اسے روکا۔ وہ رکا اور میری جانب مڑا۔

”تم مجھے رامس کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے؟“ میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ میرے ذرا قریب

کر انتہائی رازداری سے بولا۔ ”ابھی اس کا نام بھی مت لینا..... بس محتاط رہو اور میرا مشورہ مانو، وید

سے ملے جاؤ۔“

”لیکن مجھے.....“ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ تیز تیز قدموں سے میری بات سنی ان کی کرے

کمرے سے نکل گیا۔ میں عجیب شش و پنج کا شکار ہو گیا۔

مجھے اب دوہری بے چینی نے آن گھیرا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا کیا چکر تھا۔ سردار آگرموشی

کے چھوٹے بھائی رامس کو بھلا مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد میرے لئے ایک آدمی کھانے کی بڑی سی سینی اٹھائے اندر داخل ہوا اور نہایت ادب کے

ساتھ میرے سامنے مسہری پر رکھ دی۔

”ہجرم کا کچھ پتہ چلا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ وہ میرا منہ نکلنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے

پری زبان نہیں آتی تھی۔ ناچار مجھے بھی چپ ہو جانا پڑا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے ٹرے پر سے کپڑا ہٹایا۔ سرخ

کی یعنی ہوئی ران، بڑے بڑے تین چار نان کے علاوہ ایک آب خورے میں نیلے رنگ کا مشروب تھا۔ میں

نے نہ جانے کب سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ میری بھوک چمک اٹھی۔ کھانے کے بعد میں نے نیلے رنگ کا

مشروب پیا تو جسم میں توانائی کی لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔

کھانے کے بعد میری سوچوں کا دفتر ایک بار پھر کھل گیا تھا۔ ان سوچوں میں نگینہ کا خیال سب سے

ایاں اور بھاری تھا۔

ذرا دیر بعد ایک دہلا پتلا اور دراز قامت شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے سرخ رنگ کا مخصوص لباس پہنا ہوا

پشت پر رافٹل جھول رہی تھی۔ پہلو میں نیام کے اندر سنان کا متفش دستہ بھی جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹوٹی

دلی اردو میں مجھ سے کہا۔

”میرے ساتھ آئیں۔“

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ کمرے سے نکلا تو دائیں بائیں دو مسلح پہرے داروں کو چوکس کھڑے پایا۔ وہ

نہل مجھے لئے ایک مختصر سی راہداری کے بعد ایک نسبتاً بڑے کمرے میں لے آیا۔ یہاں کسی دربار کا سا

دل تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں بائیں عجیب وضع کی کرسیاں اور صوفے بچھے ہوئے تھے۔ ان

کمرے پر سامنے دو اونچی اور چوڑی پشت گاہ والی کرسیوں میں سے ایک پر سردار آگرموشی خود براجمان تھا

لبا بائیں جانب ایک سرخ و سپید اور خاصی فریبی بال عورت زرق برق لباس میں بڑے ططراق کے ساتھ

اعتان تھی۔ اس کے بال اخروئی رنگ کے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گال پھولے ہوئے تھے۔ وہ مونے

ش کی ہونے کے باوجود خاصی پُرکشش تھی۔ سردار آگرموشی کے دائیں جانب ایک صوفے نما چوڑی سی

ست پر ایک چالیس سالہ تومند شخص بھی براجمان تھا۔ بائیں جانب یعنی سردار کی بیوی کی قطار والی

نتوں پر یقیناً قبیلے کے دیگر امراء بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کئی مسلح سنان بردار محافظ دائیں بائیں

کا دستہ کھڑے تھے۔

سردار آگرموشی نے مجھے ایک قریبی نشست کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے سردار آگرموشی نے وہاں موجود سب سے اپنی زبان میں میرا

رف کروایا۔ پھر مجھ سے اردو میں ان سب کا تعارف کرواتے ہوئے آخر میں اپنے بائیں جانب بیٹھے اس

بائیں سالہ کرخت رو چہرے والے سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا چھوٹا بھائی رامس ہے۔“

میں اس شخص کے نام پر ذرا چونکا۔ اچانک ہی مجھے وید کی بات یاد آگئی۔ میں بہ غور اس کا چہرہ نکلنے لگا۔

ان کی کب سے میرے چہرے پر اپنی تیز اور چھیتی ہوئی نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا۔ پھر میرے ساتھ آئے

سے شخص کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”یہ ہماری فوج کا سالار موشد ہے۔“

موشد نام کا وہ شخص بھی ایک نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ سب کی نظریں اس وقت میرے چہرے پر جمی ہوئی

تھیں۔ ذرا دیر بعد آگرموشی نے ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔

”تو جوان! ہم سب نے ہی متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ عامل عاروب کے قبیلے پر لشکر کشی کرنے

پہلے تمہیں اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کے چنگل سے چھڑانے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔ حالانکہ یہ

نہالہ سے جنگی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ ہماری اس سے پرانی عداوت چل رہی ہے۔ ہم کسی وقت



نہیں۔ میں نے اس کے چہرے سے البتہ دبا دبا جوش محسوس کیا تھا جس سے اس کے اندر کے خفیہ جارحانہ راز کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے سینے میں زبردست ہلچل جاری تھی۔

”یہاں کب تک رکنا پڑے گا؟..... بارش کے تو رکنے کے آثار نظر نہیں آ رہے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میری کوشش تھی کہ میں اس سے ذرا فاصلہ رکھوں اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف سے غافل نہ رہوں۔ اس نے میری بات سن کر ایک لمحے کو بغور میری جانب دیکھا۔ اس وقت رہنے آسمان پر زور سے بجلی کڑکی اور وہ اپنی جیب سے پستول نکال کر یونہی اس کا ہوائی نشانہ باندھنے لگا۔ میرا دل یکبارگی کپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میرا پستول جیب میں تھا۔ جبکہ راس کا ہاتھ میں۔ اس نے ابھی ہی میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ اپنے پستول کے نشانے پر اپنی ایک آنکھ بھیجے ہوئے وہ مال کا رخ آہستہ آہستہ میرے چہرے کی طرف لا رہا تھا۔ میرے وجود میں ہر تھراہٹ اُبھری۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ میں نے بالآخر حلق ترک کر کے پوچھا۔  
اس نے فوراً پستول نیچے کر دیا۔ بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہو گئی۔  
”تم مجھ سے خوف زدہ ہونا؟“ اس نے اچانک ایک چونکا دینے والا اور بالکل غیر متوقع سوال مجھ سے کیا اور میں اس کے اسرار بھرے لہجے پر چونکے بیٹا نہ رہ سکا۔  
”نہیں..... بھلا میں تم سے کیوں خوف زدہ ہونے لگا؟“ میں نے ہولے سے ہنس کر کہا۔  
”تمہارے انداز و اطوار اور چہرے کی چابک دستی اور ہر لمحے کے چونکنا پن سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ ہلکی سی لہجے میں بولا۔ میں نے بے اختیار ایک گہری ہرکاری خارج کی اور نظریں سیکڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر تم ہی وجہ بھی بتا دو کہ بھلا مجھے تم سے کس بات کا خوف ہو سکتا ہے؟“  
میری بات پر اس نے ایک عجب سا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے میں عجیب سی سنسنی مجھے محسوس ہوئی تھی۔  
”اس بڑھے وید نے ہی تمہیں یقیناً میری طرف سے خائف کیا ہو گا۔“ اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... اس نے تو مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔“ میں نے جھوٹ بولا۔  
”میں نے سن لی تھی اس غصیت بڑھے کی بات کہ تم پر قاتلانہ حملہ میں ہی نہ کروایا تھا۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں چل رہا تھا۔ بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا۔  
روٹی کی کاٹ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ پھر جیسے ہی بارش رکی تو برف باری شروع ہو گئی۔ ایسے بعید ترین علاقوں میں بارش کے بعد برف باری ہونا لازمی تھا۔

”کیا اب میں جھوٹ بولوں گا؟“ اس نے میری طرف سرسراہٹ نظر سے گھور کر کہا اور میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میں اسے کیا جواب دیتا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ مجھ پر بلاتا خیر گولی چلا دیتا تو میں اپنے فاق میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تب میں نے سچ کہا ہی بہتر جانا اور پھینک مسکراہٹ سے بولا۔  
”ہو سکتا ہے اس بڑھے وید کو تمہاری طرف سے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو؟“

اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔ ”تو گویا اس نے تم سے میرے خلاف بات کی تھی؟“  
”ہاں..... مگر وہ زیادہ تفصیل نہیں بتا سکا تھا۔ صرف اتنا ہی کہا کہ یہ حرکت تمہارے ہی کسی آدمی کی کرتی ہے۔“

بھی اس پر جنگ مسلط کرنے کا غیر مشروط حق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم نے عامل عاروب کے کمانڈر بوجھا دو بدولڑائی میں موت کے گھاٹ اتارا ہے اس لئے اب تم بھی ہمارے ساتھ براہ راست اس جنگ میں شامل ہو چکے ہو۔ پھر تم نے عامل عاروب کو کبھی ٹھکانے لگانے کا تہیہ کر رکھا ہے، اس لئے.....“  
وہ ذرا رکا۔ پھر کہنا شروع ہوا۔ ”ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں تنہا اس خطرناک مہم پر بھیجے کی بجائے تمہارے ہمراہ اپنے چھوٹے بھائی راس کو بھی روانہ کریں گے۔“  
میں سردار آگرموشی کی اس آخری بات پر چونکے بیٹا نہ رہ سکا تھا۔ تاہم جب وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو میں نے کہا۔

”معزز سردار! کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ مجھے اس مہم پر تنہا ہی جانے کی اجازت دے دی جاتی۔“  
میری بات پر سردار آگرموشی کی بجائے اس کا چھوٹا بھائی راس مجھ سے مخاطب ہو کر ٹوٹی پھوٹی اور بولتا ہوا۔

”سردار کا یہی حکم ہے اور قبیلے کے دیگر معززین کا بھی۔ تمہیں کیوں اعتراض ہے؟“  
میں نے محسوس کیا اس کا لہجہ جھٹکے دار تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔  
”میں معزز سردار کی حکم عدولی کی بات نہیں کر رہا ہوں..... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ.....“  
”اب کچھ سوچنے یا سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں۔“ راس نے جیسے ہوئے لہجے میں میری بات کاٹ ڈالا۔  
”معزز سردار نے تمہاری بھلائی کے لئے ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ تمہارا تنہا اس مہم میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ تم زخمی بھی ہو اور تمہاری جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔“  
اس کی بات پر مجھے مجبوراً خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ تاہم مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس میں بھی خود اس کی مرضی کا دخل ہو گا۔ وہ میرے ساتھ دانستہ اس مہم میں جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ سردار آگرموشی کے پاس آدمیوں کی کمی نہ تھی۔

ذرا دیر بعد نشست برخاست ہوئی اور ہم دونوں کی مہم پر روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سردار آگرموشی کے پاس ایک سے ایک جدید ہتھیار تھے۔ جیسے ساختہ کلاشنکوف کے علاوہ راکٹ لانچر تک تھے۔ اس گوربا مہم پر روانگی اسی وقت عمل میں لائی جا رہی تھی۔ راس نے مجھے فقط ایک پستول تمھایا تھا۔ فاضل راؤنڈز بھی نہیں دیئے تھے۔ جبکہ خود اس نے بھی ساتھ کچھ خاص اسلحہ نہیں رکھا تھا۔ ماسوائے ایک سنار اور پستول کے۔ اسلحے کی تو مجھے بھی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ لیکن مجھے راس کی طرف سے تشویش محسوس ہو رہی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ اس بوڑھے وید نے مجھے پہلے سے راس کی طرف سے محتاط رہنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ وہ اس اہم مشن میں میرے ساتھ کر دیا گیا تھا اور راس کے ساتھ اپنے اس مشن پر نکلے کا مقصد تھا۔ عاروب عامل کی سرکوبی نہیں بلکہ اپنے ہی گلے کا پھندا محسوس ہو رہا تھا۔

میرے معترض ہونے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے سردار آگرموشی کے جھوٹے بیان راس کے بارے میں شبہ کرنا سردار سے ناراضگی مول لینے کے مترادف ہی ہوتا۔ تاہم میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر راس نے میرے ساتھ راہ میں دھوکا کرنے کی کوشش کرنی چاہی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔ ہم دونوں خچروں پر سوار ہو کر عامل عاروب کے قبیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک ایسی موسمی کے پتہ پالنے لگے۔ آسمان پر کالے کالے بادلوں نے یلغار کر دی اور تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔  
میں اور راس خاموشی کے ساتھ آگے پیچھے اپنے اپنے خچروں پر چلے جا رہے تھے۔ تیز بارش کی وجہ سے ہم ایک چٹانی جھجے کے نیچے آن رکے۔ میری نظریں بدستور اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی

”مگر عامل عاروب نے تو نگینہ کو اپنے دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اگر میں نگینہ کو اپنے ہاتھ لے بھی جاتا ہوں تو بھی خطرہ اس کے سر پر بدستور مسلط رہے گا۔“

”عامل عاروب کو دوسری لڑکی مہیا کر دی جائے گی۔ میں خود اس سے جا کر مذاکرات کروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔

مجھے اس کی بات پر ناقابل حیرت سی ہوئی اور میں اُلجھ سا گیا۔ پھر اسی لہجے میں بولا۔ ”عامل عاروب تمہاری یہ بات بھلا کیونکر مانے گا؟“

”اسے ماننا پڑے گی میری بات۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ چالاک شخص اندر ہی اندر کون سی گہری سازش کے تانے بانے بننے میں مصروف تھا؟ کیا یہ درون خانہ اقتدار کی جنگ تھی؟

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ ”تم نہیں جانتے کہ تم نے اس کے بہادر اور جنگجو سالار یوغا کو ہلاک کر کے اسے کتنا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ ادھر میرا بھائی سردار آگر موشی اس حملے کے لئے پر تول رہا ہے۔ اور مجھے ہی نہیں، عامل عاروب کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا کہ اس بار ہر ت ناک شکست اس کا مقدر ہوگی۔ اچھا ہی ہوا کہ تم میرے قاتلانہ حملے سے بچ گئے اور تمہاری وجہ سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ اگر مجھے ناگامی تم سے معاہدہ کرنے کا بروقت مشورہ نہ دیتی تو حالات مختلف ہوتے۔“

”ناگامی..... یہ کون ہے؟“ میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

”ناگامی..... میرے بھائی کی بیوی۔“

”تو..... تو گویا یہ بات.....“ میں چونکتے ہوئے بڑبڑایا اور اسے مزید کھولنے کی غرض سے بولا۔

”مگر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ عامل عاروب تمہاری بات مان لے گا، ہرگز نہیں۔“

ایسا میں نے اس کا منہ کھلوانے کے لئے کہا تھا جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ وہ اسے خود کلامیہ بڑبڑایا۔

”لگتا ہے تمہیں پوری بات بتانا ہی پڑے گی۔“

”ہاں، تب ہی مجھے تسلی ہو سکتی ہے۔“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

وہ ایک گہری سانس لے کر صراحت بتانے لگا۔

”یہ دو قبیلوں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہے۔ ناگامی درحقیقت میری بیوی بننا چاہتی تھی مگر بعض حالات میں اسے میرے بھائی آگر موشی سے شادی کرنا پڑی۔ میرے بھائی کی یہ دوسری شادی تھی۔ خیر، نیلے کی روایت کے مطابق سردار پیچن سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد از خود قبیلے کی سرداری سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کی سرداری اس کے جوان بیٹے یا خاندان کے کسی دوسرے فرد کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ مگر میرا بھائی بے اولاد ہے۔ اگر وہ صاحب اولاد ہوتا تو یقیناً اپنی دستار اپنے بیٹے کو پہنا دیتا۔ مگر اپنے بچے بھائی کے حق پر وہ ڈاکا مارے ہوئے ہے۔ پہلے اس نے مجھ سے ناگامی کو چھینا اور اب سرداری کے حق سے بھی مجھے محروم کر دیا۔ یہی سبب تھا کہ میرے دل میں اپنے ہی بھائی کے خلاف نفرت جڑ پکڑنے لگی۔ میں نے انتقاماً بغاوت کرنا چاہی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ناگامی سے میرے اب بھی خفیہ تعلقات ہیں۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر سردار آگر موشی نے اپنی سرداری قبیلے میں کس قدر مضبوطی سے جما رکھی ہے۔ اس دوران عاروب سے جنگیں لڑی گئیں۔ مگر دونوں بار ہمیں شکست

”میرا اندازہ درست نکلا۔“

”کیا مطلب؟..... کیا تم جھوٹ بول رہے تھے کہ تم نے اس کی باتیں سن لی تھیں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں..... اس نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ اس نے میرے کہنے پر ہی تم سے دوسرا کہا تھا۔“

اس بار اس نے ایسی بات کہہ ڈالی کہ میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ سانس سینے میں اٹکنے لگی اور حلق خشک ہونے لگا۔ وہ پھر بولا۔

”میں تمہیں اس کے ذریعے خوف زدہ کر کے یہاں سے بھگانا چاہتا تھا۔ مگر وہ..... خیر، اپنی ہمتوں نکالو۔“ اچانک اس نے سنسنائی آواز میں کہا۔ میرا پورا وجود دھڑکنے لگا۔

”نکالو پتولی۔“ اس بار اس کے لہجے میں تھکنا دہشتی تھی۔ میں نے اپنا پتول نکال لیا۔

”اس میں نفلی گولیاں ہیں..... محض پٹانے..... فلوں کی شونگ میں استعمال ہونے والے پٹانے۔“ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا اور پاگلوں کی طرح تھپتھپے لگانے لگا۔ ایسے میں دو بجے کوئی خطرناک پاگل محسوس ہونے لگا۔

یہ بات اب شک و شبہ سے بالاتر ہو چکی تھی کہ وہ میرے سامنے کھل چکا تھا۔ بلکہ اس نے خود میرے سامنے اپنی اصلیت کا اعتراف کیا تھا۔

”ڈرو نہیں..... یہ سچ ہے کہ پہلے میں تمہیں مردانا چاہتا تھا۔ مگر اب میرے ناکام حملے کے بعد صورت حال بدل چکی ہے۔“ وہ پھر یکدم تنہید ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ بد بخت میرے ساتھ چوہے اور بلی کا کھیل کھیل رہا تھا۔

”اب تم مجھے یہاں چالاکی سے دیرانے میں لا کر قتل کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”یہ کام مجھے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا۔ مگر اب نہیں کر سکتا۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تم میرے بڑے بھائی آگر موشی کے دل میں اپنا مقام پیدا کر چکے ہو۔ اور دوسری خرابی یہ ہو گئی کہ مجھے تمہارے ساتھ کر دیا گیا۔ مگر پھر بھی میرے پاس تمہیں قتل کرنے کے سوا بہانے ہیں۔ لیکن میں اپنے بھائی کے دل میں اپنے لئے ذرا سے بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں پیدا کرنا چاہتا۔ تم مجھ سے معاہدہ کرو، اپنی جاں بخشی کے سلسلے میں۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

”کیسا معاہدہ؟..... یہ بھی تم خود ہی بتا دو۔“ میں نے بظاہر بے پروا ہانہ انداز میں پوچھا۔

”عامل عاروب کو قتل کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔“

”میری اس سے پہلے کوئی دشمنی رہی ہے نہ اب ہے۔“ میں نے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے مکاری سے کہا۔ ”وہ تو خود ہی میری ساکھی نگینہ کو اپنے دیوتا داہلا مینزی کی بھینٹ چڑھانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے اس مقصد کے لئے ہی نگینہ کو اغواء کروایا تھا۔“

”اگر نگینہ تمہیں زندہ سلامت مل جائے تو؟“ اس نے پراسرار انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ کس طرح ممکن ہے؟“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں یا نہ میں جواب دو۔“ وہ سپاٹ و سرد آواز میں بولا۔ ”مجھے سے باہر برف روٹی کے گالوں کی طرح

رات ہی کی رات عامل عاروب پر لشکر کشی کر ڈالے گا۔ اور ممکن ہے کہ عامل عاروب تہوار والے دن کا انتظار کئے بغیر ہی تمہاری ساتھی کو موت کے گھاٹ اتار دے۔“

مجھے اس کی بات میں کچھ وزن محسوس ہوا تھا۔ ”کیا میرا تمہارے ساتھ عامل عاروب کے پاس ہا کرات کے لئے جانا ضروری ہوگا؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”ہاں..... تمہاری موجودگی کے بغیر میں اسے قائل نہ کر سکوں گا۔“ وہ بولا۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میرے ذہن میں خدشہ بھی ابھرا تھا کہ کہیں اس طرح یہ مجھے چالاکی سے عامل عاروب کے حوالے تو نہیں کرنا چاہ رہا ہے۔ مگر اس کی بغاوت والی بات نے میرے اس خدشے کو رد کر ڈالا۔ اب بھی وہ اس وقت مجھے گولی مار سکتا تھا۔ میں پوری طرح اس کے رحم و کرم پر تھا۔

بالآخر میں نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”ٹھیک ہے..... لیکن میں تمہارے ساتھ عامل عاروب کے ہاں نہیں جاؤں گا۔ یہ مذاکرات تمہیں خود ہی نمٹانے ہوں گے۔ البتہ میں تمہارا اس جگہ پر انتظار کروں گا۔ عاروب کی خانقاہ یہاں سے زیادہ دور تو نہیں ہے۔“

اگر اس کی نیت میں فوری تھا تو وہ میری یہ بات نہیں مانتا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور پُر جوش لہجے میں بولا۔

”گلتا ہے تم اب بھی مجھ پر شبہ کر رہے ہو۔ خیر، تم تسلی رکھو۔ تم پھر میرا دھر انتظار کرنا۔ میں بہت جلد لوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ پھر رکا اور میری جانب گردن موڑ کر عجیب سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”تمہارے ہاتھ کی گولیاں تھکی نہیں، اصلی ہیں۔ چاہو تو ایک ہوائی فائر کر کے دیکھ سکتے ہو۔ چلتا ہوں۔“ وہ آگے بڑھ گیا اور میں گویا اپنی جگہ پر سن بیٹھا اسے جانا دیکھتا رہا۔

\*\*\*

برف باری اسی رفتار سے جاری تھی۔

راس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے راس کی باتوں پر یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ سرحد عاروب، نگینہ کو راس کے حوالے کر دے گا اور مجھے اس بات کا خیال تھا کہ کیا خبر، عاروب سے مل کر راس میرے خلاف کوئی اور کچھ بھی کر سکتا ہے؟ یہ بھی ممکن تھا کہ لڑکی واپسی نگینہ کی بجائے عاروب کے خونی ہر کاروں سمیت ہو اور یہاں پہنچ کر وہ لوگ آنا فانا مجھے اپنی لبت میں لے لیں۔ غرضیکہ راس کے جانے کے بعد میرے دل و دماغ میں عجیب و غریب دوسوے اور دشمنانے پلنے لگے تھے۔ بہر طور میں اپنی طرف سے محتاط ہو کر بیٹھ گیا۔

میں نے پستول نکالا، اس کا جیمبر چیک کیا۔ پھر ایک گولی نکال کر دیکھی۔ گولی اصلی محسوس ہوئی۔ نانا میں نے اس کی اصلیت جانچنے کی خاطر ایک ہوائی فائر کیا۔ دھماکا ہوا اور گولی ایک برقی چٹان میں لگ گئی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں آرام سے بیٹھ گیا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ برف باری اب رک چکی تھی۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر اپنی کھجور اور اس چٹانی جگہ سے خاصی حد تک دور ہو کر ایک ایسی جگہ پر آ گیا جہاں سے میں با آسانی اپنی جگہ پر بھی نظر رکھ سکوں۔

میرا دل و دماغ اب بھی راس کی جانب سے شکوک و شبہات کا شکار تھا۔ مزید کافی دیر گزری، برف ٹارک چکی تھی اور ماحول اب صاف ہو چکا تھا۔ تاہم سر پہر ہو چلی تھی۔ دھوپ البتہ اب بھی نہیں نکلی تھی۔

اٹھانا پڑی۔ میں سمجھ گیا کہ عامل عاروب ہی وہ شخص ہے جو میرا اقتدار مجھے واپس دلانے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ یوں میں نے اس کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر لیا۔ اب تم خود سوچ لو کہ کون حق پر ہے، کون ناحق۔“

وہ اتنا تباہ کن خاموش ہو گیا۔ ایک لحاظ سے اس کی بات درست محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ یہ سب کیلئے داستان تھی تاہم مجھے ان کی آپس میں دو بھائیوں کے درمیان اقتدار کی سرکشی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ تاہم اگر اس طرح بغیر کسی خون خرابے کے میرا اور نگینہ کا مسئلہ حل ہوا چاہتا تھا تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ اور اب میں راس کی یہ بات بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ عاروب کو اب کس طرح قائل کر سکتا ہے۔

”اب عاروب سے جا کر میں کیا کہوں گا، اس کا تمہیں بہ خوبی اندازہ ہو چکا ہوگا۔ یا پھر کہو تو اس کی میں تفصیل سناؤں؟“ تھوڑے وقف کے بعد وہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

”ہاں..... اب تم اسے جا کر یہی کہو گے کہ وہ تمہارے بھائی کی لشکر کشی سے بچنا چاہتا ہے تو مجھے فارغ کر ڈالے۔ لیکن بات تو پھر وہی ہو جائے گی، یعنی تمہارا بھائی تو پھر اس پر چڑھائی کرنے سے بچے نہیں بنے گا۔“ میں نے آخر میں کہا۔

”وہ زندہ رہے گا تو تب ہی کرے گا۔“ اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں نے آخر میں کہا۔

”تم نے شاید میری پہلی بات پر غور نہیں کیا۔“ وہ بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں ہلاک کرنے کی فاش غلطی کرنے لگا تھا۔ تمہارے زندہ رہنے سے تو ہمیں مہلت ملی ہے مگر صرف ایک دن کی۔ ناگہی نے مجھے خوش خبری سنائی ہے کہ وہ اندر ہی اندر اس کے چند معتبر امراء کو اپنا ہم خیال بنا چکی ہے۔ درحقیقت قبیلے کی اکثریت عامل عاروب سے جنگ کرنا نہیں چاہتی۔ اس خیال کو ہم نے بھی اندر ہی اندر ہوا دے دی کہ سردار اگر موٹی بلاوجہ پورے قبیلے کو دو جنگیں ہارنے کے باوجود جنگ کی آگ میں جھونک رہا ہے۔

اب ہم نے آج کی فیصلہ کن رات میں بیک وقت دو چالیں چلنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی تو یہ کہ عامل عاروب سے جنگ ٹال دی ہے۔ کیونکہ اس بار ہمیں یقین تھا کہ سردار اگر موٹی کو فتح ہوگی اور اس فتح کا مطلب اس کی سرداری کی درازی عمر ہے۔ دوسری چال یہ ہے کہ میں تمہارے بہانے عامل عاروب کو اس خطرے سے آگاہ کر کے اسے اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ نگینہ کو تمہارے حوالے کر دے اور عین اس وقت سردار اگر موٹی کے خلاف جنگ چھیڑ دے جب میرے باقی ساتھی اس کی صفوں میں خانہ جنگی کی صورت حال پیدا کر دیں۔ یوں سردار اگر موٹی کا سورج غروب ہو جائے گا اور ایک معاہدے کے تحت سرداری مجھے سونپ دی جائے گی۔“ وہ اتنا تباہ کر چپ ہو رہا۔

لیکن اس کی باتوں سے میں اب بھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اب بھی کئی سوال میرے دل و دماغ میں ابھر رہے تھے۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھ لیا۔

”مگر کیا ضروری ہے کہ تمہاری بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہو؟..... وہ کبھی بھی تو جاسکتی ہے۔ یہ قول تمہاری منظور نظر ناگہی کے شوہر سردار اگر موٹی نے قبیلے میں اپنی سرداری مضبوطی کے ساتھ جمارکھی ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ عامل عاروب کے ساتھ تمہارے مذاکرات کامیاب ہوں۔ وہ تمہاری بات رد بھی تو کر سکتا ہے؟“

”اندر کے معاملات اور صورت حال کا مجھے علم ہے۔ تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم بھی میرے ساتھ عامل عاروب کے پاس چلو گے۔ اور ہاں، تمہیں اس حقیقت کا بھی اندازہ نہیں ہے کہ اگر تم آج کے دن عامل عاروب کے چنگل سے اپنی ساتھی نگینہ کو نہ چھڑا سکو تو سردار اگر موٹی انتظار نہیں کرے گا

”تو پھر..... اب واپس جا کر وہ مصیبت بھی گلے پڑے گی ہمارے۔“ وہ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔  
 ”تم فکر نہ کرو گنیز! میں وہ سب بھی سنبھال لوں گا۔ ویسے میں نے انکل اعظم خان کو آگاہ کر دیا تھا۔  
 ہر کس میں ان کا اثر و رسوخ بہت کام آتا ہے۔ یوں بھی عاروب کے اس ہرکارے کو نظروں میں رکھا  
 ہے۔ اس نے سردار زور آور خان کی بیٹی شہزادی کو شادی زخمی اور بیٹے شہ زور کو مار ڈالا تھا۔ پھر ان کی  
 لے کر اپنے دونوں ساتھیوں سے جلا تھا۔“

”ہاں..... میں بھی اس کے تیسرے ساتھی کو پہچانتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”وہ ہمیں واپسی میں راستے ہی  
 مل گیا تھا۔ اس نے تمہارے متعلق بتایا تھا۔ میں تب ہی سمجھ گئی تھی تم اسی لئے ایئر پورٹ مجھے ریسو کرنے  
 پائے تھے۔“

”بس گنیز! اب تم فکر نہ کرو۔ ہماری دوریاں ختم ہوا چاہتی ہیں۔ میں اب کسی طرح اس آدمی کو بھی  
 فٹ میں لینا چاہتا ہوں تاکہ اسے سردار زور آور خان کے سامنے پیش کر سکوں۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہے  
 اس کی بیٹی شہزادی اپنے بھائی شہ زور کے قاتل کو پہچان لے گی۔“

”ہاں..... ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“ گنیز نے بھی کہا۔ ”ویسے ناد! مجھے اس آدمی کا نام معلوم ہے جو  
 دونوں سے ملا تھا، جو مجھے ایئر پورٹ سے اغواء کر کے واپس کش پور کی طرف لارہے تھے۔“

”چھا..... کیا نام تھا اس بد بخت کا؟“ میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔  
 ”بڑا عجیب سا نام تھا..... سنکھال۔“

”ہوں..... سنکھال۔“ میں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے گویا یہ نام ذہن نشین کر لیا۔  
 ہمارا خچروں پر سفر جاری تھا۔ جب منزل قریب تھی تو راس نے مجھے ہدایت کی کہ اگر موٹی کو یہی بتایا  
 نے کہ گنیز کو ایک لڑائی کے بعد عاروب سے چھینا گیا ہے۔ مجھے اس کی بات ماننی تھی۔ چنانچہ سرار  
 موٹی کو بھی ہم نے یہی بتایا۔

سردار اگر موٹی نے مجھے اور اپنے بھائی راس کو اس کامیابی کی مبارک باد دی۔ تب پھر اچانک سردار  
 موٹی نے مجھ سے کہا۔

”تمہارے کچھ ساتھی مہمان گاہ میں موجود ہیں، ان سے مل لو۔“

سردار اگر موٹی کی بات پر مجھے حیرت ہوئی۔ بھلا میرے یہاں کون سے مہمان ساتھی مجھ سے ملنے آ  
 ؟ سردار اگر موٹی نے یہ بھی بتایا کہ انہیں یہاں میرا چترائی نو عمر دوست داور خان ہی لایا تھا۔ میں نے فوراً  
 ان گاہ کارخ کیا تو انکل اعظم خان اور وزیر خان سمیت اس کے تینوں ساتھیوں کو دیکھ کر بری طرح چونک  
 گنیز بھی اس وقت میرے ساتھ تھی۔

ان سب افراد کو غیر متوقع طور پر یہاں دیکھ کر مجھے حیرت اور دبی دبی پریشانی کا شدید جھکا لگا۔ راس  
 ہمارے پیچھے پیچھے وہیں چلا آیا تھا۔

”ناد بیٹے!..... کیسے ہو تم؟“ انکل اعظم خان یہ کہہ کر میری طرف لپکے۔ پھر گنیز کو بہ خیریت پا کر  
 کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے اس کی بھی خیر خیریت پوچھی۔ از روئے اخلاق میں وزیر خان سے  
 ملنا۔

انکل اعظم خان نے مجھے بتایا کہ انہیں سردار اگر موٹی نے سارے حالات سے آگاہ کر دیا تھا کہ میں اور  
 ناکس مقصد کے لئے اور کہاں گئے تھے؟ یوں اب خاصی حد تک وزیر خان کی غلط فہمی بھی دور ہو گئی اور  
 ناکس انہوں نے دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ یہی وہ میری ساتھی تھی جس کی تلاش میں مجھے

میں نے سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، بادلوں کی آوارہ ٹولیاں ہنوز گردش کر رہی تھیں۔  
 اچانک میں نے ایک سمت سے ذرا دور دو افراد کو ایک خچر پر آتے دیکھا تو میرا دل یکبارگی زور زور  
 سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی والی سمت تھی جہر راس نے رخ کیا تھا۔

کیا راس اپنے وعدے کے مطابق عامل عاروب سے کامیاب مذاکرات کے بعد گنیز کو لے کر واپس  
 لوٹ رہا تھا.....؟ میرے ذہن میں یکبارگی یہ جاں فزا خیال اُبھر اُٹھا۔

گنیز سے ملنے کی مسرت انگیز و متوقع گھڑیوں نے مجھ پر عجیب سی سرشاری طاری کر دی تھی۔ میں  
 دھڑکتے دل اور پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ دور خچر پر سوار آتے ہوئے ان دونوں افراد کو دیکھ رہا تھا۔ پھر  
 جب خچر چٹائی جھجے والی سابقہ بناہ گاہ کے قریب آن کرکا تو میں..... یہ انوں کی طرح اس کی طرف دوڑ پڑا۔

میں خچر پر سوار راس اور گنیز کو پہچان چکا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری دنیا، میری  
 کائنات، میری محبت، میری گنیز یوں آسانی سے بھٹھل جائے گی۔ مجھے واقعی اب تک اس کی توقع نہ تھی۔  
 میں پاگل دیوانے کی طرح ہانپتا دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچا تو گنیز نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں  
 میں ایک لمحے کو غیر یقینی کے تاثرات اُبھرے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ”ناد“ چلاتی ہوئی یکدم خچر سے اُتری اور  
 میری جانب دوڑ پڑی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے فلمی انداز میں لپٹ گئے۔

”نن..... گنیز! ات..... تم ٹھیک تو ہونا؟“ میں اسے دھیرے سے خود سے الگ کر کے اس کے  
 چہرے کی طرف دیکھ کر بے تابانہ انداز میں بولا۔ راس خچر سے اتر کر خاموش کھڑا ہماری طرف ہی نکلے جا  
 رہا تھا۔

”ہاں..... نن..... ناد! ہم..... میں..... میں بالکل ٹھیک ہوں..... مگر تمہارا بازو؟“

”یہ معمولی زخم ہے..... تم بالکل فکر مت کرو۔ اب مردود عاروب کا خاتمہ قریب ہے۔“ میں نے  
 اسے تسلی دی۔

”مگر ناد! یہ سب کیا چکر ہے؟..... اس نے مجھے اتنی آسانی سے کیوں چھوڑ دیا؟ اور یہ..... یہ  
 کون ہے؟“ اس نے متوش لہجے میں قریب خچر کے پاس کھڑے راس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو میرے  
 کوئی جواب دینے سے قبل راس بولا۔

”اب نکل چلو یہاں سے۔“ وہ یہ کہتا ہوا اپنے خچر کی رتی پکڑے ہمارے قریب آ گیا۔ میرا خچر بھی ایک  
 طرف چٹائی جھجے کے ساتھ بندھا کھڑا تھا۔

”آؤ گنیز! میں تمہیں بعد میں ساری باتیں بتا دوں گا۔“ میں نے گنیز سے کہا اور پھر اسے لے کر اپنے  
 خچر کی طرف بڑھا۔ پھر پہلے گنیز کو سہارا دے کر خچر پر سوار کروایا، اس کے بعد خود بھی اس کے عقب میں خچر  
 کی لگا میں تھامے بیٹھ گیا۔

راس بھی اپنے خچر پر سوار ہو کر آگے بڑھ چکا تھا۔ میرا خچر بھی اس کے عقب میں چلا جا رہا تھا۔ راستے  
 میں، میں گنیز کو اب تک کے سارے حالات سے آگاہ کرتا رہا۔

اسے یہ سن کر بہت خوشی و تسلی ہوئی تھی کہ اس کا باپ شاہ میر خیریت سے تھا اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ  
 ماں نے بالآخر شاہ میر کو معاف کر دیا تھا اور کن حالات میں معاف کیا تھا تو گنیز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ  
 رہا تھا۔

میں نے گنیز کو کش پور کے چھوٹے سے قصبے کے سردار زور آور خان کے متعلق بھی بتایا تھا، وہ تشویش  
 زدہ ہو گئی۔

یہاں پہنچنے کی اس قدر جلدی تھی۔

انگل اعظم خان نے مجھے وزیر خان سے متعلق یہ بھی بتایا تھا کہ جب میں نے انہیں سردار زور آور خان کے بیٹے شہ زور کے قتل کے معاملے پر یہاں آنے سے قبل آگاہ کیا تھا تو انہوں نے فوری طور پر یہ دانش مندانہ قدم اٹھایا تھا کہ اپنے چند ذمہ دار افسر دوستوں کے ساتھ مکش پور کے سردار زور آور خان سے ملاقات کی۔ اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے اور ہماری مدد کی خاطر یہاں کا رخ کیا تھا۔

راس وہاں موجود تھا اور بڑے غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ عاروب اور سنکھال کے متعلق لرزہ خیز واقعے کے بارے میں سن کر وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا تھا اور وہ کیوں پریشان ہو گیا تھا، اس کا بھی مجھے اندراک تھا۔

میں نے ایک نظر راس پر ڈالی۔ درحقیقت مجھے اس کی یہاں آمد ناگوار ہی مگزی تھی۔ بالآخر وزیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”سنکھال کو ہم کسی صورت میں معاف نہیں کر سکتے۔ اور اسے ہم پکڑ کر اپنے سردار کے سامنے پیش کریں گے۔ یقیناً ہماری بیٹی شہزادی اس قاتل سنکھال کو پہچان لے گی۔ اس کی تصدیق کے بعد ہی ہمارا اور تمہارا معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔“

اس کی بات ایک حد تک درست ہی تھی اور میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سنکھال کو زندہ پکڑ کر ان کے سپرد کر دوں۔ اور یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اب وزیر خان بھی انگل اعظم خان کے ساتھ یہاں آ گیا تھا۔ اتفاق تھا کہ ان لوگوں نے اسی ہوٹل میں رہائش اختیار کی ہوئی تھی جہاں میں نے بھی اپنے لئے کمرہ بک کر وار کھا تھا۔ میں نے جواباً وزیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے تمہارے نتیجے کے قاتل سنکھال کو اپنی نظروں میں رکھا ہوا ہے لیکن.....“

اچانک انگل اعظم خان نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے مجھے ٹوکا۔ ”نادر بیٹے! مجھے بات کرنے دو۔“

پھر وہ وزیر خان سے مخاطب ہو کر انتہائی متانت سے بولے۔ ”دیکھو وزیر خان! تمہیں اب تک سچائی کا اندازہ ہو ہی چکا ہوگا۔ تمہارے نتیجے شہ زور کا قاتل سنکھال اس وادی میں موجود ہے۔ مگر اب اسے پکڑنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ کام تمہیں خود نمٹانا ہوگا۔“

جواباً وزیر خان نے انگل اعظم خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سنکھال کو ہم نہیں پہچانتے۔ اسے ہم کیسے اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں؟ اس کی نشاندہی بھی نادر ہی کو کرنا ہوگی۔“

”لیکن یہ ایک غیر مشروط مدد تصور کی جائے گی۔“ انگل اعظم خان نے بارعجب لہجے میں وزیر خان سے کہا تو اس نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔

اچانک راس اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے فوری طور پر انگل اعظم خان اور وزیر خان کو روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ یہاں آج رات کیا ہونے والا تھا، اس کا میرے اور راس کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ اس لئے میں نے یہاں سے نکل کر اپنے ہوٹل میں جانے کو ترجیح دی۔ یہاں کھل کر میں انگل اعظم وغیرہ سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

یوں بھی میں ہوٹل جا کر تنہائی پاتے ہی انگل اعظم خان سے چند مشورے بھی کرنا چاہتا تھا۔ کبھی میرے جی میں آتا کہ اسی وقت جا کر سردار آگر موٹی کو آج کی رات اس کے خلاف ہونے والی بغاوت کے بارے

مگر کڑالوں۔ مگر پھر راس کے ساتھ کئے گئے معاہدے کا خیال آتا تو اپنا ارادہ بدلنا پڑتا۔

میں نے جب سردار آگر موٹی سے جانے کی اجازت طلب کی تو اس نے انکار کر دیا۔ رات کے کھانے اچھا اس نے وہ رات بھی مہمان خانے میں گزارنے پر اصرار کیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ آج رات کیا والا تھا۔ اس لئے میں نے مزید وہاں رکنے سے انکار کر دیا اور انتہائی معذرت کے ساتھ کچھ ضروری اشیاں کر اسے قائل کر بی لیا۔

بلکہ راس جانے کیوں ہمارے وہاں سے جانے پر شدید متذبذب نظر آ رہا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ بلکہ بالخصوص میرے اور نگینہ کے وہاں سے جانے پر قطعی تیار نہ تھا۔ اس بات پر میں اندر سے ذرا گیا تھا۔ تاہم جب ہم گاڑی میں سوار ہونے لگے، گاڑی چرال سے کرائے پر لی گئی تھی تو راس نے ہ پوچھا۔

”میرا خیال ہے اب تو تم لوگ ادھر ہی رہو گے، ہوٹل میں۔“

”ہاں..... کیونکہ سنکھال والا معاملہ بھی تمہارے علم میں آ ہی چکا ہے۔ وہ بھی نمٹانا پڑے گا۔“ میں ہانسنکھال والے معاملے کا ذکر کیا تھا۔

اس وقت سب لوگ جیب میں سوار ہو چکے تھے۔ جیب کا ڈرائیور بھی موجود تھا۔ صرف میں اور راس لڑے باتیں کر رہے تھے۔ سردار آگر موٹی ہمیں رخصت کر کے جا چکا تھا۔

”میں تم سے ملنے آؤں گا ہوٹل۔ پھر اس سلسلے میں مزید بات ہوگی۔ مگر تم مجھ سے ملے بغیر وادی سے لگنا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اس کی اس بات نے ایک بار پھر تشویش میں مبتلا کر دیا۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ بہر طور لی جیب میں سوار ہو گیا۔ ہم اپنے ہوٹل میں آ گئے۔ انگل اعظم نے دو کمرے لے رکھے تھے۔ میں نے نان کوٹنگ تک کے لئے ٹال دیا اور پھر نگینہ کے ساتھ انگل اعظم خان کو بھی لے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کیا۔ پھر میں اور انگل اعظم خان موجودہ صورت حال پر تبادلہ خیال نہ کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں راس کی باتوں سے آگاہ کر دیا۔

”تم نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے نادر بیٹے!“ پوری بات جاننے کے بعد انہوں نے تشویش زدہ لہجہ میں کہا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے کہ راس اور عامل عاروب نہ صرف سردار آگر موٹی کے خلاف بلکہ تمہارے ذمے خلاف بھی ضرور کوئی گہری چال چلنا چاہتے ہیں۔ یہ تو تمہاری اور نگینہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے مل جب راس کے اقتدار حاصل کرنے والے معاملے پر زور پڑتی تھی تو اس نے کسی طرح عامل کو بھی اس معاہدے کے لئے سر دست قائل کر لیا کہ وہ نگینہ کو رہا کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سردار کی بغاوت سے پہلے ہی عامل عاروب پر لشکر کشی کر دیتا۔ نگینہ والے مسئلے کی وجہ سے نہ صرف راس لی عاروب کو بھی اپنے لئے خطرہ محسوس ہوا تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تم نے عامل عاروب کے ہونا کموت کے گھاٹ اتار ڈالا جس کے باعث عامل عاروب کی کمر ہی ٹوٹ گئی۔ لہذا انہیں نگینہ کو اپنا تاکہ ادھر راس مقررہ مدت کے اندر اندر قبیلے کی دستار حاصل کر لے اور ادھر عامل عاروب بے رحمی فیصلہ کن جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔ اور نادر بیٹے! میں تمہیں ایک بات بھی بتا دوں۔“

ناگہ کر انگل اعظم خان نے تھوڑا توقف کیا، پھر بولے۔

اگر راس کی یہ بغاوت کامیابی سے ہمکنار ہوگئی تو ایک بار پھر تم اور نگینہ عامل عاروب کے چنگل میں پڑ گے۔ راس خود تمہیں تحفظ عاروب کے حوالے کرے گا۔“

انگل اعظم خان کی باتوں اور تجویزے نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں دنگ رہ گیا۔ انہوں نے اپنے جوش و خروش کا اظہار کیا تھا، موجودہ حالات کے تناظر میں ایسا ہونا ہرگز ناممکن نہیں تھا۔  
”تو پھر انگل! ہمیں سردار آگر موشی کو اس خطرے سے فوری آگاہ کرنا ہوگا۔“

”ایسا کرنا ہمارے لئے بے حد ضروری ہے۔“ انہوں نے تائیدی اور تاکید دوں انداز میں کہا۔ ”تم پر ویسے بھی یہ اخلاقی ذمے داری بنتی ہے۔ سردار آگر موشی بہر حال تمہارا محسن ہے۔ کم از کم اتنا ہی سہی، جب تم زخمی تھے تو سردار آگر موشی نے ہی تمہاری مرہم پٹی کروائی تھی۔ باقی رہی یہ راس کی قصہ کہانی تو ان کے اندرونی معاملات میں ہمیں دخل اندازی نہیں کرنا چاہئے۔“

”تو پھر اب کیا، کیا جائے؟..... پانی تو سر سے گزر چکا۔“ مجھے پہلی بار تشویش کا احساس ہوا۔  
”تم اسی وقت سردار آگر موشی سے ملنے کی کوشش کرو۔ اور میں نگینہ کو لے کر یہاں سے نکل جاتا ہوں۔“

وہ بولے۔ ”سردار آگر موشی کو عاروب کے قبیلے پر لشکر کشی کرنے دو۔ عاروب کی شکست سے ہمیں یہ فائدہ ہو گا کہ اس موذی سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ جائے گی۔ اس کے ساتھ سنکھال بھی ہماری گرفت میں آجائے گا جسے ہم وزیر خان کے حوالے کر دیں گے۔ میں صبح تک یہاں سے نگینہ کو لے کر روانہ ہو جاؤں گا۔ جاؤ، اب دیر مت کرو۔“

ان کی باتوں سے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ مگر نگینہ فوراً پریشان ہو گئی اور ساری شرم دیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میرا ہاتھ تمام کر تشویش زدہ لہجے میں بولی۔  
”نادر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ تم بھی ہمارے ساتھ واپس چلو۔“

میں نے بڑی ملائمت سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔  
”نگینہ! حوصلہ رکھو..... اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے۔ آگے بھی وہ کرم نوازی فرمائے گا۔ تم میرے لئے دعا کرو۔“

نگینہ کی آنکھوں میں تشویش اور محبت دونوں کا تاثر تھا۔ طوعاً و کرہاً اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے رواں گی کا ارادہ کیا تو انگل اعظم خان نے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”میرا خیال ہے ہم اس صورت حال سے وزیر خان کو بھی آگاہ کر دیں تو بہتر ہوگا۔ ورنہ وہ خواہ مخواہ تمہاری رواں گی کے بعد اہل سیدی باتیں سوچتا رہے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس کی گاڑی تمہارے کام بھی آسکتی ہے۔“

ان کی بات معقول تھی۔ میں ٹھہر گیا اور پوچھا۔ ”کیا اسے ساری باتوں سے آگاہ کرنا ہوگا؟“  
”ہاں..... میرا خیال ہے اس کا دل اب صاف ہو چکا ہے۔ سنکھال کو گرفت میں لینے کا وہ بھی خواہاں ہے۔“

ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ اور جیسے ہی میں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا، اجانک رانفل کی لمبی نال میرے سینے سے آن لگی..... وہ دوا فرماتے تھے۔ میں بری طرح ٹھنک گیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ رانفل کی نال اپنے سینے سے ہٹا کر اس کے پیٹ پر لات جمانی۔ مگر رانفل پر اپنی گرفت مضبوط نہ کر سکا۔ وہ لڑکھڑا کر اپنے ساتھی سے جا ٹکرایا۔ دونوں نے سنکھال کی کوشش میں اپنی رانفلوں کی نالوں کا رخ میری جانب موڑنے کی کوشش کی۔ مگر ایک پر انگل اعظم خان نے حملہ کر دیا اور دوسرے پر میں پل پڑا۔ ہم نے ان کی رانفلیں چھین لیں اور اس سے پہلے کہ سنکھال کران کی رانفلیں

از پر استعمال کرتے، وہ ناقابل یقین پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے راہداری میں دوڑتے چلے گئے۔

”جیپ دوڑاؤ..... ہماری جائیں خطرے میں ہیں۔“

ڈرائیور بولکھلا سا گیا۔ کیونکہ اسے حالات کا اندازہ نہ تھا۔ وزیر خان نے پُر جوش آواز میں کہا۔  
”ہمیں رک کر ان کا مقابلہ کرنا ہوگا۔“

”ہم اتنے سارے مسلح لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے وزیر خان!..... ڈرائیور سے کہو جیپ دوڑائے۔“

نے تیز لہجے میں کہا تو وزیر خان نے وہی ہدایت ڈرائیور کو دی۔ مگر ڈرائیور پریشان ہو گیا۔ اس نے اکی رفتار میں کچھ خاص اضافہ نہیں کیا تھا۔ میں نے غصے سے دانت پیس لئے اور گردن گھما کر دیکھا تو

ماسان خطا ہو گئے۔ متعاقب لشکر گویا سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو کالر سے پکڑ کر چلا تے

”جیب دوڑاؤ غیبت آدمی!..... ہماری جانیں خطرے میں ہیں۔“

جب ہمیں جا کر اس نے جیب کی رفتار یکدم تیز کر دی۔ میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ڈرائیور کو گروں سے پکڑ کر اس کی سیٹ سنبھالنے کی کوشش کرتا۔

اچانک عقب سے گولیوں کی بھیاں تڑتڑاہٹ اُبھری۔ ہم سب غیر ارادی طور پر نیچے جھک گئے۔ عقب سے برسنے والی گولیاں ”ٹھک..... ٹھک“ کی آوازوں سے جیب کی گاڑی میں پیوست ہو گئیں۔ گولیاں عقبی شیشے کو توڑتی ہوئی اندر سے ہی آر پار ہو کر جیب کی وینڈ اسکرین میں پیوست ہوئی تھی۔ دونوں اسکرینیں زوردار چھناکے سے ٹوٹ گئیں۔

تعمین نے غیر ارادی طور پر چیخ ماری۔ ڈرائیور کا ہاتھ اسٹیرنگ پر پکھنے لگا۔ عقب سے بدستور فائرنگ جاری تھی۔ ہم سب نے اپنے سروں کو نیچے جھکا دیا۔ مگر بد قسمتی سے ایک گولی ڈرائیور کے سر میں عقب سے پیوست ہو گئی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈرائیونگ سیٹ پر لڑھک گیا۔ بھیجا پار ہونے کے باعث اس کے خون آلود کھڑوں کے چھیننے میرے اوپر پڑے تو مجھے ڈرائیور کے افسوس ناک انجام کا ادراک ہوا۔ میرا پورا دھڑ سانس سانس کرنے لگا۔

اتفاق سے وزیر خان نے ہمت اور پھرتی سے کام لیا اور ڈرائیور کی لاش کو اپنی طرف کھینچا۔ میں نے بزم بکلی کی سی تیزی کے ساتھ عقبی سیٹ سے اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب بدقسمت ڈرائیور کی لاش بیٹھنے کے انداز میں میری اور وزیر خان کے بیچ میں پھنسی ہوئی تھی۔

اسٹیرنگ سنبھالتے ہی میں نے جیب کی رفتار بڑھا دی۔ جبکہ وزیر خان نے اپنا ہپٹول نکال لیا اور تیز کے ساتھ عقبی حصے کی طرف چلا گیا۔

اب وزیر خان اور اس کے آدمی نے متعاقبین حملہ آوروں پر جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ بعد میں اگلے اعظم خان بھی اپنا ہپٹول نکال کر اس جوابی فائرنگ میں شریک ہو گئے۔ جبکہ میں نے تعمین کو سختی سے دوڑ سیٹوں کے درمیان لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔

میرے برابر میں ڈرائیور کی لاش دوسری خالی سیٹ پر لڑھکی ہوئی تھی۔ میری ساری توجہ اب جیب دوڑانے پر مرکوز تھی۔ میری کنکٹیاں بری طرح سنسنار رہی تھیں اور دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فائرنگ تبادلہ بدستور جاری تھا۔ مجھے ہر دم یہی خدشہ لاحق تھا کہ کہیں دشمن حملہ آوروں کی گولی سے جیب کا تازہ برست ہو جائے۔

اچانک مجھے زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ شاید تازہ برست تھا۔ مگر جلد ہی مجھ پر یہ خوش کن انکشاف ہوا کہ یہ دھماکے کی آواز تعاقب میں آنے والے نامعلوم دشمنوں کی گاڑی کے تازہ برست ہونے کی تھی۔ میرا حوصلہ سوا ہو گیا۔ راستہ بل کھاتا ہوا ہونے کے باعث جیب کو زیک دوڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم جیب زبردست ہچکولے کھا رہی تھی بلکہ ایک نسبتاً تنگ موڑ کا وقت جیب تیس بیٹیتیس ڈگری تک ایک جانب جھکتے ہوئے الٹے الٹے پٹی تھی۔ مگر میری دونوں ہاتھوں گرفت اسٹیرنگ پر مضبوط تھی۔

ہم آبادی سے کافی دور نکل آئے تھے۔ جیب اب ایک دوسرے اور نسبتاً کشادہ راستے پر دوڑی جا رہی تھی۔ اگرچہ یہ راستہ بھی بل کھاتا ہوا اور تاہوار تھا۔ تاہم یہ خدشہ بدستور موجود تھا کہ میں اڈے کے راستے سے بھٹک سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں تو ایک کے بعد ایک دوسرا راستہ پہلے راستے کے بطن سے نکل رہا تھا اور آخرت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ہم بر فیلے اور ٹھہرتے ہوئے ویرانوں میں بھی نکل سکتے تھے۔

اچانک مجھے اپنی جیب کے عقبی حصے سے ایک کرب ناک انسانی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ وزیر خان کے کی تھی۔ میں مزید پریشان ہو گیا۔

اچانک مجھے اٹکل اعظم خان کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”نادر!..... جیب اور تیز دوڑاؤ۔ دشمن آتے جا رہے ہیں۔“

مجھے خود بھی عقب میں آتی ہوئی گاڑیوں اور نچروں وغیرہ کے دوڑنے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی رہے رہی تھیں۔ مگر راستہ بتدریج پُر خطر ہونے کے باعث میں اپنی جیب کی رفتار اس سے زیادہ نہیں سکتا تھا۔

”ہمارے پاس فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے..... فاضل راؤ غر ختم ہونے لگے ہیں۔“ وزیر نے بولکھائی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی تھی۔ مجھے پورا یقین ہو چلا تھا کہ ہم راستے بھٹک چکے اور جیب کی فیول تانے والی سوئی بھی خاتے (E) کی طرف جھک رہی تھی۔

معاذ مجھے سامنے بائیں جانب ایک تنگ موڑ نظر آیا۔ ادھر عقب میں متعاقبین حملہ آوروں کی گاڑیوں اور دلی وغیرہ کے دوڑنے کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر یہ تنگ موڑ کانٹے کے لئے

دلی تھا کہ میں جیب کی رفتار چالیس سے بھی کم کروں اور میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اچھے ہی میں نے رفتار دھیمی کی اور موڑ کے قریب پہنچنے ہی اسٹیرنگ بائیں جانب گھمایا، اچانک ساعت

ن ا دھماکا ہوا۔ ہماری جیب نے ایک زبردست جھکا کھایا۔ بد قسمتی سے موڑ کانٹے کے دوران ہی کوئی گولی زبردست کر چکی تھی۔ نتیجتاً جیب الٹے الٹے پٹی تھی۔ اگر میں فوراً بریک نہ لگا دیتا تو جیب دائیں جانب

اٹک نمودار ہونے والی گہری کھائی میں جا گرتی۔ چشم زدن میں دشمنوں نے ہمیں گھیر لیا۔ وزیر خان اور اعظم ”سر سڑ“ کر چکے تھے۔ میں نے بھی بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے

کر دیئے۔ جیب کا انجن بند ہو چکا تھا۔ اس کے بعد تعمین شمیم مسخ افراد نے ہم سب کو بے دردی کے ساتھ تھپتھپ کر باہر نکالا۔ ان سب کے

ہے پر خونخواری تھی۔ آنکھوں سے پُر غیظ اور فاتحانہ جھک مترشح تھی۔ تعمین ہم کر میرے ساتھ آن لگی تھی۔ انہوں نے ہم سے کوئی بات نہ کی اور ہماری تلاشی لے کر نہتا کرنے کے بعد گاڑیوں میں ڈال دیا گیا۔

اگوں کے تیور اس قدر جارحانہ اور خطرناک نظر آ رہے تھے کہ ہمیں ان سے کچھ پوچھنے میں بھی جان کا

دھمکس ہو رہا تھا تعمین کی حالت زیادہ خراب تھی۔ اس نے جوں ہی امریکہ سے پاکستان، اسلام آباد ایئر پورٹ پر قدم

اٹھا، نامساعد حالات کی ایک کے بعد ایک تزاوڑی کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ مختصر سا قافلہ ہمیں لے کر روانہ ہوا اور جب ہم سردار آگر موشی کے قبیلے میں داخل ہوئے تو وہاں ہر

ن مجھے خانہ جنگی کا نقشہ نظر آیا۔ کئی خون آلود لاشیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ دھوئیں اور گرد و غبار کے

اواروں کی تاگواری پو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہ لگی تھی کہ وہ کچھ ہو چکا تھا جس کی مجھے اور اٹکل اعظم خان کو توقع تھی۔

ایں لگتا تھا کہ گزشتہ شب بغاوت کے دوران سردار آگر موشی کے جاں نثاروں نے اس بغاوت کو کچلنے کی

ی پوری کوشش کی تھی لیکن شاید وہ اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کے باوجود بھی کامیاب نہ ہو سکے تھے۔

لیکن میرے لئے تشویش کی بات یہ تھی کہ اگر راس اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی چکا تھا تو پھر اس

نے اپنے حواری ہمارے تعاقب میں کیوں روانہ کئے تھے؟..... کیا انکل اعظم خان کے بدترین خدشہ درست ثابت ہونے والے تھے؟ مکار اور شاطر رامس نے ہمیں اپنے مقصد کی خاطر استعمال کیا تھا، درحقیقت رامس نے میرے ساتھ نہیں بلکہ عامل عاروب کے ساتھ اصل معاہدہ کیا تھا۔ گویا اب اس طرح دونوں کے مقاصد پورے ہو چکے تھے۔ رامس ہمیں تختے کی صورت میں عامل عاروب کے حوالے کر چاہتا تھا۔

ہمیں سردار آگر موٹی کے درباری حجرے میں پیش کیا گیا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔

رامس کو میں نے سردار آگر موٹی کی تخت نما کرسی پر زرق برق لباس میں ملفوف براجمان پایا۔ اس کے سر پر سرداری کی سرخ دستار بھی نظر آرہی تھی جس میں سنہری تاروں سے ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں جانب کی نشست پر سردار آگر موٹی کی فریاد نام سرخ و سپید بیوی ناگاسی بھی موجود تھی۔ رامس بلکہ سردار رامس کے چہرے پر کدو اور پُر غرور تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

”رامس! یہ کیا حرکت ہے؟..... تم نے میرے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ پھر یہ سب کیا ہے؟“ میں نے رامس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے بلند لہجے میں اسے مخاطب کر کے کہا۔

اس کی آنکھوں میں مکارانہ بھٹک اور ہونٹوں پر بڑی مکروہ مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ حقارت سے اومگوخیلی آواز میں بولا۔

”بددیانتی کی ابتداء تم نے کی تھی نادور! اس رات میرے دونوں آدمیوں نے ہوٹل میں تمہاری گفتگو سنا لی تھی۔“

میں اس کی بات پر چونکا اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ گزشتہ رات ہمارے کمرے کے باہر باندھنے والے وہ دونوں جاسوس اس کے بیچھے ہوئے تھے جنہوں نے مجھ پر داخل بھی مانی تھی۔ مگر بعد میں فراہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مگر میں نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔

”میں جن حالات سے دوچار تھا، مجھے اس بات پر شبہ تھا کہ کہیں تم ہمارے ساتھ بھی دھوکا کر سکتے ہو۔ اگر میرا خدشہ غلط تھا تو پھر تم نے اپنے جاسوس کیوں روانہ کئے تھے ہمارے پیچھے؟“

وہ بڑی ڈھٹائی سے ایک بدست قبہ لگاتے ہوئے بولا۔

”بے وقوف! تمہیں اگر خطرے کا احساس ہو گیا تھا تو پھر تمہیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ بلکہ میں تو تمہارے یہاں سے جاتے ہی پریشان ہو گیا تھا۔ خیر..... اب تمہارا فیصلہ جلد ہو جائے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح حواریوں کو حکم دیا۔ ”انہیں لے جا کر قید خانے میں ڈال دو۔“

\*\*\*

میں نے اس بات پر خدا کا شکر تو ادا کیا تھا کہ گیند کو مجھ سے جدا نہیں کیا گیا تھا مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ خطرہ سر سے ٹل چکا تھا۔ بلکہ ہم چاروں ہی اس مہیب خطرے کی ان دیکھی ہولناک زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

یہ اٹھارہ بائی بارہ کا مستطیل نما کمرہ تھا۔ چھت قدرے بلند اور سیاہ تھی۔ دیواروں کے دائیں بائیں چربی سے جملنے والے لیپ نصب تھے۔ زمین پر گھاس پھوس بکھری ہوئی تھی۔ فرش کھردرا اور کہیں کہیں بادی انظر میں یہ قید خانہ زمین دوزی نظر آتا تھا۔ بے الفاظ دیگر تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جہاں روشن

یہ اٹھارہ بائی بارہ کا مستطیل نما کمرہ تھا۔ چھت قدرے بلند اور سیاہ تھی۔ دیواروں کے دائیں بائیں چربی سے جملنے والے لیپ نصب تھے۔ زمین پر گھاس پھوس بکھری ہوئی تھی۔ فرش کھردرا اور کہیں کہیں بادی انظر میں یہ قید خانہ زمین دوزی نظر آتا تھا۔ بے الفاظ دیگر تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جہاں روشن

یہ اٹھارہ بائی بارہ کا مستطیل نما کمرہ تھا۔ چھت قدرے بلند اور سیاہ تھی۔ دیواروں کے دائیں بائیں چربی سے جملنے والے لیپ نصب تھے۔ زمین پر گھاس پھوس بکھری ہوئی تھی۔ فرش کھردرا اور کہیں کہیں بادی انظر میں یہ قید خانہ زمین دوزی نظر آتا تھا۔ بے الفاظ دیگر تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جہاں روشن

یہ اٹھارہ بائی بارہ کا مستطیل نما کمرہ تھا۔ چھت قدرے بلند اور سیاہ تھی۔ دیواروں کے دائیں بائیں چربی سے جملنے والے لیپ نصب تھے۔ زمین پر گھاس پھوس بکھری ہوئی تھی۔ فرش کھردرا اور کہیں کہیں بادی انظر میں یہ قید خانہ زمین دوزی نظر آتا تھا۔ بے الفاظ دیگر تہہ خانہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ جہاں روشن



عاروب بڑی پر غضب خونخوار نظروں سے ہماری جانب ہی دیکھے جا رہا تھا۔ باغی سردار راس نے بھری نگاہ ہم پر ڈالی اور پھر قریب بیٹھے عامل عاروب سے گونجی آواز میں بولا۔

”میرے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ یہ لو عاروب! ہم تجھے کے طور پر یہ چاروں تمہارے حوالے کرتے ہیں ان کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔“

ادماغ جلنے لگا۔ ہمارے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو چکی تھی۔ میرا اس وقت رواں رواں جوش زہر کے مارے کانپ رہا تھا۔

”دونوں میرے لئے اجنبی ہیں..... کون ہیں یہ؟“ عاروب نے انکل اعظم خان اور وزیر خان کی نشاندہ کر کے سردار راس سے پوچھا۔

اس کا نام اعظم خان ہے۔ یہ نادر کا کوئی رشتہ دار ہے۔ جبکہ یہ دوسرا شخص وزیر خان ہے۔“ راس نے کہا۔ ”وزیر خان تمہارے ایک آدمی سکھال کی تلاش میں آیا ہے۔ اُس نے اس کے پیچھے شہ زور کا قتل وہ اپنے علاقے کے سردار کا بیٹا تھا۔ یہ وزیر خان اس کا بھائی ہے۔“

ل عاروب وزیر خان کے متعلق یہ سب راس کی زبانی جان کر بری طرح چونکا۔ پھر دوسرے ہی لمحے بچے میرا راس سے بولا۔

”میرے صرف یہ دونوں چاہئیں۔ بس۔“ اس کا اشارہ میری اور گنیز کی طرف تھا۔ ”باقی یہ تمہارے حوالے جو چاہے ان کے ساتھ سلوک کرو۔“

ل عاروب یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اور گنیز کو آٹا فانا بیڑیاں پہنائی جانے لگیں۔ میں غصے سے لال لڑا راس کو خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے شیر کی طرح دھاڑا۔

”راس! یہ تو اچھا نہیں کر رہا..... تجھے اس کا حساب دینا پڑے گا۔“

”لے جاؤ اسے..... کہیں میں ادھر ہی ان دونوں کا خاتمہ نہ کر ڈالوں۔“ راس نے شعلہ بار نظروں کی طرف گھور کر عامل عاروب سے کہا۔

ما کے بعد عامل عاروب کے پانچ چھ ہرکاروں نے مجھے اور گنیز کو بازوؤں سے پکڑا اور نہایت لڑائی کے ساتھ گھسیٹنے ہوئے لے گئے۔

ارتن چار جیسیں کھڑی تھیں۔ کچھ مسلح افراد خچروں اور گھوڑوں سمیت کھڑے تھے۔ ان کے مخصوص دل سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب عامل عاروب کے ہرکارے ہی تھے..... ایک بڑی سی بھی لڑائی تھی جس میں چار تو مند خچر جتے ہوئے تھے۔ عامل عاروب کو میں نے اسی بھی میں سوار ہوتے

ل نے یہ غور اطراف میں نگاہ ڈالی تھی۔ ہمیں لینے کے لئے عامل عاروب کا دستہ تقریباً بیس نجیس ل پر مشتمل تھا۔

ل عاروب کے چنگل میں پھنسنے کی وجہ سے گنیز بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ماکہ وہ اس مردود کے خونی عزائم سے واقف تھی جو اسے اپنے دیوتا دیوالا میز کی کی بھینٹ چڑھانے کا ارادہ باندھ رہے تھے۔ میں خود اندر سے بری طرح پریشان اور تشویش زدہ ہو رہا تھا۔ مگر میں نے فاس تحمل ہونے نہیں دیئے۔

”اب کک..... کیا ہوگا..... نن..... نادر!“ معا گنیز نے سہمی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور نی لال خاموش رہنے کا

رہا تھا۔ اگر شب گزشتہ میں بتا بھی دیتا تو بھی یہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ بغاوت کا علم یکدم ہی بلند نہیں ہوتا۔ پہلے اس کی بنیادیں بھری جاتی ہیں، طویل عرصے تک۔ اس کے بعد شب خون مارنے کا وقت آتا ہے۔ اس لئے میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ تھا۔

انکل اعظم خان نے میرے کاندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم خود قیدی تھے اس کی کیا مدد کرتے؟ اس لئے اسے مجبوراً ایسی حالت میں چھوڑ کر واپس اپنی جگہ پر آکر فرش پر بیٹھ گئے۔

قید خانے کا دروازہ سپاٹ تھا۔ اس میں بھری تک نہ تھی۔ اندر کی جانب بھی کنڈی نہیں تھی۔ ہم چاروں سر جوڑے بیٹھ گئے۔

”نہ جانے یہ غیثت راس ہم سے اب کیا سلوک کرتا ہے۔ اس چکر میں بلاوجہ میں بھی پھنس گیا۔“ وزیر خان نے تملک کر کہا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور انکل اعظم خان سے بولا۔

”انکل! یہاں سے نکلنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔“

”کون سا؟“ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ وزیر خان کی مستفسر آنکھیں بھی میرے چہرے پر جچی ہوئی تھیں۔

”دروازے کے ساتھ اکھاڑ پچھاڑ کرنا پڑے گی۔“

”یہ کس طرح ہوگا؟..... باہر یقیناً پہرے دار موجود ہوں گے۔“ انکل اعظم نے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ایسی کوشش کرنے کی بجائے وقت کا انتظار کرنا چاہئے۔ ورنہ نیا سردار امر مشتمل ہو کر ہمارے خلاف اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھا سکتا ہے۔“ وزیر خان پریشانی سے بولا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پانچ فٹ سے زیادہ نہ تھا اور چوکھٹ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ میں نے کان لگا کر دوسری جانب سے سن گن لیے کی کوشش کی مگر گہری اور وحشت انگیز خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

”واپس آ جاؤ..... کوئی فائدہ نہیں۔“ اچانک قیدی سردار آگرموش کی آواز ابھری۔ ”اب ہمیں موت ہی یہاں سے باہر نکال سکتی ہے..... روحوں کی صورت میں..... ہا..... ہا..... ہا۔“

وہ پاگل پن کے مارے تھپتھپے لگانے لگا۔ معزول ہونے اور قید میں ڈالے جانے کے بعد اس کے حوال بری طرح متاثر نظر آرہے تھے۔

مجھے دروازے پر گرفت جمانے کا ایک ذرا سا رخنہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند گھنٹوں بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب غیر ارادی طور پر گردنیں گھما کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا، چار عدد مسلح کچم شیم افراد اندر داخل ہوئے۔ مجھے دروازے کے باہر بھی چند مسلح افراد کھڑے نظر آئے تھے اور ایک اوپر جاتے ننگی اینٹوں کے تنگی زینے کی بھی جھلک نظر آئی تھی۔

ہمیں گن پوائنٹ پر باہر چلنے کا درست حکم دیا گیا۔ ہم چاروں خاموشی سے اٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے۔

زینے چڑھنے کے بعد جب ہمیں سردار راس کے بڑے سے درباری حجرے میں لایا گیا تو مجھے ہچکا لگا۔ گنیز کے حلق کے بھی مارے سراسیمگی کے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی۔

وہاں باغی سردار راس سمیت اس کے دیگر امراء بھی موجود تھے اور انہی میں مجھے وہ مردود و ملعون عامل عاروب بھی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کے چند مسلح ہرکارے بھی اس کے عقب میں چوکس کھڑے تھے۔

کہا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں آہنی زنجیروں سے باندھے ہوئے تھے۔

سفر جاری رہا۔ مجھے عامل عاروب کے قبیلے تک کے فاصلے کا یہاں سے بہ خوبی اندازہ تھا جو کھنڈے محیط تھا۔ راستہ تنگ اور ناہموار ہونے کے باعث گاڑی کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ میں چلتے سلتے ذہن پرزور رہا مگر لگتا تھا شاید اس بار یقینی طور پر مفرک کی تمام راہیں ہی مسدود و منقطع ہو چکی تھیں۔ دل و دماغ میں طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کے ناگ بار بار پھین کاڑھے ڈسنے کو تیار معلوم ہوتے تھے۔ کوئی راہ بھٹائی دے رہی تھی۔ کچھ کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ایک ایک بدلتی ہوئی خطرناک اور سنگین تر صورت سے کس طرح چھٹکارا پایا جاتا۔

جب سوچ و خرد کے تمام راستے منقطع ہو جائیں اور کوئی دوا کام نہ کرے..... جب مایوسوار ناامیدیوں کے مہیب اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن بھی نہ نظر آئے تو انسان ایسے میں اپنے خالق اور معبود ہی کو پکارتا ہے۔ اللہ..... جتنا بڑا نام ہے، اتنا ہی بڑا آسرا۔ میں نے بھی ایک مجبور و بے لکڑ عاجز بندے کی طرح صدیقی دل اور بے زبان دل اللہ کو پکارا۔

”اے اللہ!..... اے میرے معبود!..... تُو نے مجھے جتنی عقل اور طاقت دی، میں اسے اب بروئے کار لاتے ہوئے اپنے دشمنوں پر حاوی ہوتا رہا، ان پر غلبہ پاتا رہا۔ لیکن آخر کب تک؟ آج مجھے جسمانی طاقت ہی نہیں بلکہ ذہنی قوت بھی شاید ایسے کڑے حالات سے نہیں نکال سکتی۔ اب دُعا ہی میری نگینہ کی دست گیری فرما سکتا ہے۔ تیرے فضل کی ایک ہی جھلک مجھے اور نگینہ کو اس ناامیدی کے اندھیرے سے نجات دلا سکتی ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ سچے دل سے نکلی ہوئی دعا اور دیدہ تر سے پہنچنے والی فریاد ضرور پوری ہوتی ہے۔“

دعا مانگنے کے بعد مجھے اپنے اندر عجیب سا روحانی سکون محسوس ہوا۔ میں ایک ایک خود کو ہلکا چھٹکار کرنے لگا۔

میں اور نگینہ جیب کے عقبی حصے میں تھے۔ ہمارے دائیں بائیں دو مسلح ہرکارے براجمان تھے۔ درمیانی سیٹوں پر، ایک ڈرائیور کے برابر والی نشست پر۔

سفر کو تقریباً نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ گویا ”مقتل گاہ“ تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ باقی رہا تھا۔ عامل عاروب سمیت اس کے خونی ہرکاروں کا یہ قافلہ اس وقت برف زار ویرانوں سے گزر رہا تھا۔ پھر اچانک جیسے میری دعا سن لی گئی۔ لیکن جو بھی کچھ ہوا، وہ عقل سے بالاتر بہر حال نہیں تھا اور نہ ہی اسے کوئی تجزہ کہہ سکتے تھے..... تاہم جو کچھ ہوا تھا، وہ بالکل فطری اور منطقی انداز میں ہوا تھا۔



کچھ بھی ہوا تھا، وہ شاید غیر متوقع تھا۔ مگر فطری ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ رات کی تاریکی میں دشوار گزار راستوں پر عامل عاروب کے خونی ہرکاروں کے ٹولے کی جھپٹیں آگے پیچھے دوڑی جا رہی تھیں کہ لولیوں کی بھیاں تک ترنواہٹ اُبھری۔ ہم سب بری طرح چونک گئے۔ پھر ہم سنبھلنے بھی نہ پائے تھے۔ نا اگھوں نے عقبی سیٹ سے سامنے وٹا اسکرین کے پار ہماری جیب کے آگے چلتے والی جیب کو کسی راج بلاٹ ہوتے دیکھا..... شاید اس پر راکٹ لانچر داغا گیا تھا۔ یہی نہیں، ایسے پے درپے مزید یہ بھی سنائی دیتے تھے۔ مزید دو جھپٹوں کا مع سواروں کے خانہ خراب ہو گیا تھا۔ اب صرف ہماری اور جیب سلامت تھی، جس پر عامل عاروب سوار تھا۔

برت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دونوں جھپٹوں کے سواروں نے مذکورہ سمت سے داغی جانے والی اور راکٹوں کی سمت پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیئے اور پلک جھپکتے ہی جھپٹوں سے نیچے اتر گئے۔ پھر سواروں کو اپنی پڑی تھی اس لئے وہ ہمیں بھی خاطر میں لائے بغیر اچانک شب خون مارنے لگا۔ نامعلوم ٹولے سے جنگ کرنے کے لئے نیچے اتر گئے تھے۔ میرے اندر زبردست ہلچل مچ گئی۔ فیر کے نہیں، تقدیر کے وسیلے قسمت نے ہمیں فرار ہونے کا موقع دیا تھا جبکہ نگینہ اس اچانک افتاد پر جا ہراساں ہو گئی تھی۔

ان تھا کہ معزول سردار آگر موشی کے جاں نثار مسلح ٹولے نے عامل عاروب کے اس کارواں کو باغی کس کا حلیف ہونے کی سزا دی ہو۔ اور اس خیال کو بھی بد نگاہ رکھنا ضروری تھا کہ کسی پل وہ ہماری ٹی راکٹ لانچر کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ اسی لئے میں نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا فوری طور پر ارادہ کیا۔ سب سے پہلے نگینہ سمیت سیٹوں کے درمیان میں دبک گیا۔ کیونکہ گولیوں کی بوچھاڑ ہنوز جیب کو رہی تھی۔ جیب کے بائیں کھڑکیوں اور وٹا اسکرین کے شیشے چٹنا چور ہو چکے تھے، تاہم دونوں شیشوں میں تھیں۔ شاید بروقت جوابی کارروائی نے نامعلوم حملہ آور ٹولے کو کسی حد تک دور رکھنے میں کامیابی ملی تھی۔

موت سے کام لو..... گھبراتا نہیں..... ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔“ میں نے جوش سے اواز میں اسے مخاطب کیا۔ شکر تھا کہ ہمارے پاؤں آزاد تھے۔ میں نے ذرا سر اٹھا کر گرد و پیش کا تارک ماحول میں شعلہ فشاں لکیروں کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ میں جھکے جھکے ریک کر جیب کی فوں پر آ گیا اور نگینہ نے بھی ذرا حوصلہ پکڑتے ہوئے میرا ساتھ دیا تھا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں اسے گرد و فلابادی زنجیریں جکڑی ہوئی تھیں، تاہم میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ حملہ بائیں جانب سے آیا جبکہ دائیں جانب کی جگہ خالی تھی۔ ہم دونوں جیب سے باہر تاریکی میں اتر گئے۔ گولیوں کی مع ترنواہٹ جاری تھی۔ بادی انظر میں مجھے نامعلوم حملہ آور ٹولے کا پلڑا بھاری محسوس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے عامل عاروب کے ہرکاروں میں سے چند ایک کی لاشیں بھی پڑی دیکھی تھیں۔ میں اور نگینہ

رات میں برہمی کا عنصر غالب تھا اور مجھے ڈر ہوا تھا کہ کہیں یہ ہمارے دشمن ہی نہ ہوں۔ کم از کم اس کے بارے کے غلط تاثرات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا۔

پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے سخت لہجے میں کچھ کہا اور یہ لوگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ قریب ان کی دو تین لمبی لمبی اور اونچے چوڑے نازوں والی جینیں کھڑی تھیں۔ ایک میں ہمیں سوار کرایا لیا اور پھر یہ لوگ ہمیں لے کر تاریکی میں انجان منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

میرادل وسوسوں کے باعث بری طرح دھڑک رہا تھا اور بار بار ذہن میں یہی تشویش ناک خیال ابھر رہا تھا کہ کہیں ہمارے ساتھ، آسمان سے گرا کھجور میں انکا والا معاملہ تو نہیں ہوا تھا؟..... بہر طور سفر اوشی سے جاری رہا۔

لگ بھگ کوئی نصف، پون گھنٹے بعد جینیں رکیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ مجھے سامنے چند چھوٹی بڑی بولڈاریاں نظر آئیں۔ یہاں پیرو میکس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہمیں ایک نسبتاً بڑی چھوٹاری میں لایا گیا۔ یہاں بھی ایک پیرو میکس روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے یہاں مقدور و بھر ضرورت کا ہر سامان نظر آ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ بارعب شخصیت والا لمبا ترنگا آدمی بھی دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ ہمیں ایک طرف کونے میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہی بحیم شخص ہمیں گھورنے لگا۔

میری تشویش ناک بے چینی فزوں تر ہونے لگی۔ میں کچھ دیر تو اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب وہ کچھ نہ بولا تو میں نے کہا۔

”میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے ہمیں عامل عاروب کے خونی چنگل سے رہائی دلائی۔ کیا میں تمہارا ام پوچھ سکتا ہوں؟“

میرے تشکر آمیز لہجے کے باوجود وہ بدستور مجھے سنسناتی نظروں سے گھورتا رہا۔ اس کے چہرے ہوئے نور بتا رہے تھے کہ وہ کسی وقت بھی مجھے اور نگینہ کو کوئی سے اُڑا دینے کا حکم جاری کرنے والا تھا۔ میں نے ہمت کر کے دوبارہ کہا۔

”مجھے کچھ اندازہ تو ہوتا ہے کہ ہم دوستوں میں ہیں۔ کیا وہ کمینہ عاروب مر گیا؟“ اس بار وہ بڑے نفرت آمیز لہجے میں مجھ سے بولا۔

”بکواس بند کرو اپنی۔ ہم صرف سردار آگرموشی کے جاں نثار ساتھی ہیں اور تم نے اپنے میزبان کے ہاتھ دھوکا کیا۔“ اس کے انداز اور جملے نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ صورت حال تقریباً وہی تھی جو میں نے سوچی تھی تاہم اس کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم مصیبت سے نکلنے کے باوجود مصیبت میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

میں نے امید اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے قدرے حیرت زدہ لہجے میں بولا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو دوست!..... تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ”تم نے راس سے مل کر ہمارے سردار آگرموشی کے خلاف بغاوت کی سازش میں اس کی مدد کی۔“

”یہ غلط ہے۔“ میں نے بھی پُر زور لہجے میں احتجاج کیا۔ ”شاید تمہارے علم میں یہ بات نہیں کہ سردار آگرموشی نے خود مجھے اپنی ساتھی نگینہ کو عامل عاروب کی قید سے چھڑانے کی غرض سے راس کے ساتھ روانہ کیا تھا اور.....“

”ہاں..... مجھے پتہ ہے۔“ وہ دانت پیس کر کونجیلی آواز میں بولا۔ ”اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ راستے

تاریکی کا حصہ بنے سنگلاخ چٹانوں کے خلا میں آ گئے۔ سردست ہمارا ادھر محبوس رہنا بہتر تھا۔ باہر غمراہ رن پڑا ہوا تھا۔ بے تحاشا فائرنگ کی زد میں ہم دونوں بھی آ سکتے تھے۔ بلکہ عاروب کے کسی خونی ہرکارہ اگر ہم پر نظر پڑ جاتی تو مشتعل ہو کر وہ ہمیں بھی گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا۔

عامل عاروب کے خونی ہرکاروں کے ٹولے کے مقابلے میں نامعلوم حملہ آور کا گروہ شاید زیادہ اور خطرناک اسلحہ رکھتا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف گولیوں کی بوچھاڑ جاری رکھے ہوئے تھے بلکہ گاہے گاہے گرینڈ، راکٹ لانچرز کا بھی آزادانہ استعمال کر رہے تھے۔ وہ یقیناً پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ جبکہ عامل عاروب کا خونی ہرکاروں کا ٹولہ ابھی کم نہ تھا۔ تاہم انہیں اس حملے کی ذرا سی بھی توقع تھی۔ یہی وہ پیشگی ایسی کسی بھرپور تیاری میں تھے۔ مگر باوجود اس کے وہ بھی ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔

میں سمجھتا تھا کہ جس قدر سرعت کے ساتھ میرے ذہن نے اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ ہم پر اپنا ہلہ بول دینے والا گروہ کون ہو سکتا تھا؟ شاید عامل عاروب یا اس کے ہرکاروں کو اور اک نہ ہو سکا تھا۔ سبب تھا کہ انہوں نے واپسی پر متوقع جنگی ”احتیاط“ نہیں برتی تھی۔

بہر طور چونکہ مجھے سو فیصد اندازہ ہو چکا تھا اور میں نے کسی حد تک اس کی فائننگ سے بھرپور فائدہ اُٹھا اور ”برننگ پوائنٹ“ سے خود کو اور نگینہ کو بحفاظت نکال کر ”بلیک پوائنٹ“ پر آ گیا تھا۔ فائرنگ کا شور بتدریج ختم ہونے لگا۔ کہیں کہیں سے اکا دکا برست چلنے کی آتشیں گرج ابھرتی اور ہر طرف پراسرار اور بھیاں ناک سناٹا چھانے لگتا۔

میں نے سنگلاخ خلاء سے ذرا ابھر کر مدھم چاندنی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے کی کوشش کی تو مجھے بے ترتیب بڑی لاشوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ فضا میں بارود کی ناگوار بو رچی ہوئی تھی۔ دفعۃً میں نے چند ہیولوں کو متلاشی انداز میں مڑتے دیکھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ بہر عامل عاروب کے ہرکارے نہ تھے۔ اچانک پھر ایک کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میں یکدم اندر ہو گیا۔ لیکن چونکہ دیکھ لیا گیا تھا اور ساتھ ہی کسی کو چلا کر کچھ کہتے سنا تو مجھے خدشہ ہونے لگا کہ کہیں ہمیں بھی دشمن سمجھ کر یہ ہم پر گولیاں نہ داغ دے۔ چنانچہ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ نگینہ کے ساتھ باہر نکل آؤں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ ہم دونوں بندھے ہوئے ہاتھ بلند کئے سنگلاخ خلاء سے باہر آ گئے۔

وہ بھی ادھر ہی کو تیزی کے ساتھ لپکے تھے۔ ہمیں ہاتھ اٹھائے نمودار ہوتے دیکھ کر وہ سب ٹھک کر آ گئے اور ہم پر گنیں تان لیں۔ ایک نے تیز روشنی ہم پر بھیجی تھی۔ کسی نے عجیب سی بولی میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انہوں نے ہمیں کسی حوالے سے یا تو پہچان لیا تھا یا پھر ہمارے ہاتھ ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔

ہر سوچ چکی ہوئی چاندنی میں کئی اور مسلح ساتھی بھی ان سے آن ملے۔ یہ سب چست لباس میں تھے۔ میں ایک نسبتاً خاصا بحیم شخصیت بھی تھا۔ اس کی شخصیت خاصی رعب و دبدبہ والی تھی۔ اس نے بغور ہماری طرف دیکھتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں مجھ سے کہا۔ ”تم دونوں وہی تو نہیں؟“ سردار آگرموشی کے مہمان تھے؟“

”ہاں..... ہم وہی ہیں۔“ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے کہا۔ ”میرا نام نادر ہے..... اور یہ یہ ساتھی نگینہ ہے۔ ہمیں غاصب سردار راس نے عامل عاروب کے حوالے کر دیا تھا۔“

میری بات پر وہ چند قدم چلتا ہوا میرے ذرا قریب پہنچ کر رکا تو میں نے بغور اس کے چہرے پر تاثرات بھانپنے کی کوشش کی اور دوسرے ہی لمحے میرے اندر بھیاں ناک وسوسوں نے سراٹھایا۔ اس

میں رامس نے تمہارے ساتھ کیا ساز باز کی تھی۔“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ مجھے جھٹکا لگا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

میں نے یہ ساری باتیں بیان کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر لی۔ میں نے دیکھا، اس کے چہرے پر اب یلکھت درشتی اور نفرت کی جگہ الجھن آمیز تذبذب نے لے لی۔ میں نے لوہا گرم ہوتے دیکھ کر ایک آخری چوٹ کی۔

”مجھے خود افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ معزز سردار اگر خاموشی میرا میزبان نہیں، میرا محسن بھی ہے۔ میں نے بھی تمہیں کر رکھا تھا کہ اس سلسلے میں مجھ سے جو ہو گا میں اپنی جان کی بازی لگا کر انجام دوں گا۔ مجھے خوشی ہوگی کہ اگر مجھے تم اپنے ساتھ مہم میں شامل کر لو تو۔“

وہ میری بات پر چند ٹاپے کچھ سوچتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر دوستانہ تاثرات نمودار ہونے لگے تھے۔ مانے اپنے ساتھیوں کو کوئی حکم دیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے میرے اور گنبد کے ہاتھوں کی آہنی پیرس توڑ دی گئیں۔ اب ہم عمل طور پر دوستانہ ماحول میں فرش پر پٹھی کھال کی دری پر بیٹھ گئے۔ اس شخص نے مجھے اپنا نام رشی گال بتایا تھا اور وہ سردار اگر خاموشی کے اس خفیہ دستے کو کمانڈ کر رہا تھا۔

اس نے میرے دوبارہ استفسار پر بالآخر بتایا کہ اس کے تازہ حملے میں عامل عاروب بچ نکلا تھا۔

”ہمارے ساتھیوں کی تعداد کتنی ہے؟“ میں نے رشی گال سے پوچھا۔

”پچیس، تیس کے قریب ہوں گے۔“ وہ جوابا بولا۔ ”جبکہ اس سے دگنی تعداد ابھی منتشر ہے۔ مگر ہم جلد انہیں اپنے ساتھ شامل کر لیں گے۔“

”قبیلے میں، سردار اگر خاموشی کے ہم خیال لوگوں کی تعداد کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟“ میں نے کسی خیال بحث پوچھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میرا خیال ہے..... تیس، چالیس فیصد لوگ ہوں گے۔“

”تمہارا آئندہ کا کوئی منصوبہ..... غاصب سردار رامس کے خلاف؟“

”اس کا قتل۔“ رشی گال پر غیظ لہجے میں بولا۔

”ابھی یہ ناممکن تو نہیں، مشکل ضرور ہے۔“ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے سب سے ہمیں معزول سردار اگر خاموشی کو اس کی قید سے آزاد کرانا ہو گا..... میرے ساتھی بھی رامس کی قید میں۔“

”ہم یہ دونوں کام بیک وقت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں..... اور ساتھ ہی ساتھ، عامل عاروب کو بھی اسے لگانا چاہتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”سنو میری بات۔“ میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ”ابھی نہ کا قتل قبل از وقت ہو گا۔ جب تک کہ ہم معزز سردار اگر خاموشی کو اس کی قید سے نہ چھڑا لیں۔ یہ معرکہ اگر ہم کامیابی سے سر کر لیں تو بہت ہو گا۔ بہ صورت دیگر رامس مظلوم قرار پائے گا۔ اقتدار اور سیاست جنگ میں ایسا ہی غلط قدم اٹھانے کے باعث مظلوم، ظالم اور ظالم، مظلوم قرار پاتا ہے۔ پھر کیا ہو گا، لیکن جبکہ دوسرا سردار آجائے گا۔ رامس اپنی کابینہ مضبوط بنا چکا ہے لیکن اگر ہم پہلے معزز سردار اگر خاموشی کی قید سے چھڑا لیں تو قبیلے میں ہمارے تیس فیصد ہم خیال لوگوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے، بلکہ ہمیں ہماری رامس کے خلاف کارروائی بھی موثر ثابت ہوگی۔“

رشی گال کے چہرے پر میری بات کی اثر پذیری کے تاثرات ابھرے۔ میری تجویز اس کی سمجھ میں آئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس سے علاوہ اس کے پاس کوئی راہ نہیں تھی۔ تھوڑی سی بحث کے بعد اسے میری ماننا پڑی۔

”تم نے عامل عاروب کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن راستے میں اس سازشی رامس نے تمہارے ساتھ ایک خفیہ ساز باز کر ڈالی کہ اگر وہ خود عامل عاروب کے ٹھکانے پر جا کر تمہاری ساتھی کو مذاکرات کے ساتھ چھڑا لایا تو تم عامل عاروب کے خلاف سردار اگر خاموشی کے جنگ کے سلسلے کو روکنے کی کوشش کرو گے۔ تم نے فوراً ہائی بھری اور یوں رامس اپنے پرانے اور خفیہ دوست عامل عاروب کے پاس جا کر تمہاری ساتھی کو لے آیا۔ ہمیں تم پر پہلے ہی شبہ تھا۔ یوں بھی ہم کافی عرصے سے رامس کی جاسوسی کر رہے تھے۔ یہ باتیں ہمارے ہی ایک جاسوس نے بتائی تھیں جسے کچھ روز پہلے ہی رامس کی طرف سے متوقع بغاوت کو بے نقاب کرنے کے لئے اس کے پیچھے لگایا گیا تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں خود سنیں۔ بولو، اب کیا کہتے ہو؟“ اتنا کہہ کر وہ مجھے گھورنے لگا۔

میرے منہ سے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج ہو گئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی غلط فہمی کی اصل وجہ کیا تھی۔ میں نے پُر سکون لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں معلوم ہو گا کہ جب میں معزز سردار اگر خاموشی کا مہمان ہوا تھا تو ہمارے درمیان مشترکہ طور پر عامل عاروب کو ہمیشہ کے لئے نابود کرنے کا منصوبہ طے پا چکا تھا۔ معزز سردار اگر خاموشی عامل عاروب کے خلاف تیسری بار فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اس سے استدعا کی تھی کہ اس طرح عامل عاروب اشتعال میں آ کر میری ساتھی کو جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے پہلے مجھے خود تنہا جا کر اپنی ساتھی کو گوریلز آپریشن کے ذریعے اس کی قید سے چھڑانا ہو گا۔ اس کے بعد عامل عاروب کے خلاف جنگ کا ہگل بجایا جا سکتا ہے۔ یہ معاملہ طے پا گیا مگر اس سے ایک رات قبل رات مہمان خانے میں مجھ پر کسی نامعلوم شخص نے قاتلانہ حملہ کیا۔ میں خوش قسمتی سے بال بال بچا تھا۔ پھر اسی رات ایک بوڑھے وید نے مجھے بڑی رازداری کے ساتھ بتایا تھا کہ مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ کرانے والا معزز سردار اگر خاموشی کا بھائی، رامس ہو سکتا ہے۔ کیونکہ عامل عاروب کے ساتھ رامس کے خفیہ دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ نہیں چاہتا کہ عامل عاروب کے خلاف جنگ کی جائے۔ اس لئے کہ میں نے ایک خون ریز مقابلے میں عامل عاروب کے کمانڈر بوغا کو ہلاک کر ڈالا تھا اور اس وقت عامل عاروب کی جنگی پوزیشن کمزور تھی۔ لہذا میں اب رامس سے بچنا چاہتا تھا کہ اگلے دن معزز سردار اگر خاموشی نے خود مجھے اس کے ہمراہ عامل عاروب کے خلاف میرے ساتھی کو چھڑانے کی مہم میں روانہ کر دیا۔ میں مجبور تھا۔ بغیر ثبوت کے میں بھلا کس طرح معزز سردار اگر خاموشی سے یہ کہتا کہ مجھے اس کے اپنے بھائی رامس سے بغاوت اور غداری کی بو آتی ہے۔ ناچار مجھے اس مہم میں ایک دوست نما دشمن کے ساتھ روانہ ہونا پڑا۔ راستے میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے پستول میں گولیاں نہیں ہیں جبکہ بد خصلت رامس نے اپنی گولیوں سے بھرا پستول مجھ پر تان لیا اور مجھے اس معاملت پر مجبور کیا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تاہم میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ چاہے کسی طرح بھی سہی، ایک بار اپنی ساتھی کو حاصل کر لینے کے بعد میں یہی چال رامس پر الٹ دوں گا۔ مگر افسوس کہ مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ اور ادھر راتوں رات رامس کے ساتھیوں نے معزز سردار کے خلاف بغاوت کر ڈالی۔ اور میں اور میرے دیگر ساتھی (انکل اعظم اور وزیر خان وغیرہ) بھی اس کے قیدی بنا لئے گئے۔ پھر ہمیں اس قید خانے میں ڈالا گیا جہاں معزز سردار اگر خاموشی بھی مقید تھے۔ اب تم ہی بتاؤ، اس میں میرا کیا قصور ہے؟..... میں تو آج بھی عامل عاروب پر بری طرح ادجار کھائے بیٹھا ہوں۔“

کارروائی ہی موثر رہے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں اب اپنی کارروائی کرنے کے لئے ایک آسان موقع مل چکا ہے۔“

”آسان موقع؟“ رشی کمال نے اُلجھے ہوئے لہجے میں دہرایا۔

”ہاں..... آسان موقع۔“ میں نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور مزید بولا۔ ”تم نے شاید مخبر کی باتوں پر غور نہیں کیا۔ قیدیوں کو کل صبح سر عام پھانسی دی جائے گی اور اس کے لئے راتوں رات غاصب سردار راس کی رہائش گاہ سے تھوڑا سا گیارہ کلومیٹر دور ایک میدان میں پھانسی گھاٹ کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی ہے۔ مذکورہ مقام آبادی کے بچپن سے قلعہ خانے والے قید خانے سے باہر بھی نکالا جائے گا۔ ہم درمیانی فاصلے پر سردار راس کی رہائش گاہ کے تہہ خانے والے قید خانے سے گزرے گا، ہم اس پر اچانک ہلہ بول دیں گے۔ اب یہی صورت ہو سکتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجھے اپنے ٹولے کے ساتھیوں کی تعداد بڑھانا ہوگی۔“

”ٹھیک ہے..... پھر میں اس مہم میں شامل رہوں گا۔“ وہ یکدم بولا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔

اب میرے کانڈھوں پر بڑی بھاری اور مشکل ذمے داری آن پڑی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ فکر انکل اعظم خان کی طرف سے لاحق تھی۔ انہوں نے ہم ماں بیٹے کا ہر مشکل وقت میں ساتھ دیا تھا اور اب تک دیتے چلے آ رہے تھے۔ میں ان کا شفقانہ رویہ بھلا کیسے بھلا سکتا تھا؟

ہم نے بھی اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور علی الصباح منہ اندھیرے اپنی خطرناک مہم کی طرف نکل پڑنے کی تیاری مکمل کر چکے تھے۔ البتہ گیند میری طرف سے بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ ذرا تنہائی پاتے ہی مجھ سے بولی۔

”نادر! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔“

میں نے سسکا کر اسے ملاعت سے سمجھایا۔ ”گیند! حوصلہ رکھو اور میری کامیابی کی دعا کرو..... اس وقت انکل اعظم کی زندگی داؤ پر لگی ہے۔ تم خود سوچو، بھلا میں انہیں کل بے گناہ پھانسی پر چڑھتا کیسے دیکھ سکتا ہوں؟“

میری بات پر گیند خاموش تو ہو گئی تھی لیکن اس کی سرگمیں آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ اسے روتا دیکھ کر میرا دل پلچ گیا۔ میں نے اس کے دونوں شانے محبت بھرے انداز میں تھامتے ہوئے کہا۔

”پلیز گیند!..... تمہارے یہ آنسو مجھے کمزور بنادیں گے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ ہم اس خوفی اور سفاک عامل عاروب کے شیطانی چنگل میں جانے سے بچ گئے ہیں اور اس وقت ہم دونوں محفوظ پناہ گاہ میں ہیں۔ بس صرف کل کا دن اور سہرہ لو اور میرے لئے دعا کرو۔ پھر نامساعد حالات کے قفس سے ہماری قیدی زندگی آزاد ہو جائے گی اور ہمیشہ کی خوشیاں ہمارا مقدر ہوں گی۔“

”مم..... مگر..... نن..... نادر! کل..... کل ہماری زندگیاں ہمیشہ کے لئے غم کے قفس کی قیدی بھی تو.....“ وہ لرزتی آواز میں کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ مگر میں اس کی دھوری بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔

”اللہ سے اچھی امید رکھو..... تم نے دیکھا، اس رب العزت نے آج تک مجھے ہر خطرناک مہم میں کامیابی ہی نصیب کی ہے اور ایسا ہوتا آیا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں ہمیشہ حق کی فتح ہی ہوتی ہے۔“

”اب میں تمہیں آئندہ کالانچ عمل بتاتا ہوں۔“ میں نے آخر میں کہا۔ ”اپنے ساتھیوں کو تین حصوں میں بانٹ دو۔ ایک قبیلے کے تیس فیصد ہم خیال آبادی میں داخل ہو کر ان کے ساتھ مل کر دیگر لوگوں کو غاصب سردار راس کے خلاف اکسائیں گے۔ دوسرے عامل عاروب کے گرد وہ پر نگاہ رکھیں گے۔ اس کی کمائنہ کر دو گے۔ جبکہ تیسرا میرے ساتھ غاصب سردار راس کی رہائش گاہ پر شب خون مار کر معزول سردار آگرموشی اور دیگر قیدیوں کو چھڑانے کی مہم پر روانہ ہوگا۔“

میں نے اسے اپنے تین جنگی حکمت عملی ترتیب وار بتاتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی توجہ اور غور سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے میرے لئے ستائش کے تاثرات جھلکنے لگے تھے۔

اب اس کا میرے ساتھ گفتگو کا انداز بھی احترام آمیز اور دوستانہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری جنگی حکمت عملی اسے بہتر لگی تھی۔ جس سے میرا اخلاص ظاہر ہوتا تھا۔ وہ آخر میں بولا۔

”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تمہارے ٹولے والی مہم میں خود میں بھی شامل رہوں؟“

میں نے اس کے کانڈھے پر دوستانہ انداز میں ہتھکی دی اور اسی لہجے میں بولا۔ ”دوست! میں نے مختلف مہمات کے لئے جن لوگوں کی گروپ بندی کی ہے وہ بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔ تم دیکھنا، ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ بالآخر اس نے اس کی تائید کر ڈالی۔

غیر محسوس طریقے سے معزول سردار آگرموشی کے جاں نثار ٹولے کی کمان میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ چنانچہ میں نے ہی رشی کمال کے ساتھیوں کے ساتھ ایک نشست جمائی اور راتوں رات سب کو اپنی اپنی مہمات سر کرنے سے متعلق آگاہی دے ڈالی۔ میں نے اپنے ہمراہ صرف نو افراد رکھے تھے۔ دسواں میں خود تھا۔

ہم نے اگلے دن پہلے ایک ٹولے کو قبیلے کی طرف روانہ کر دیا۔ نیز دو مخبر بھی ہم نے الگ سے جن کر چھوڑ دیے۔ ان دو مخبروں نے اگلے دن کا سورج ڈھلنے سے قبل ہمیں ایک خوف ناک خبر دی۔ اطلاع یہ تھی کہ معزول قیدی سردار آگرموشی کو عامل عاروب کے ”بے گناہ“ قبیلے پر تین مرتبہ جنگی جارحیت کے جرم میں اور اپنے قبیلے کو بھی بلاوجہ اس جنگ کی آگ میں جھونکنے اور متیوں بار ناکا کی صورت میں دونوں طرف کے لوگوں کو بے گناہ اموات کی پاداش میں امراء کے متفقہ فیصلے کے مطابق علی الصباح سر عام پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ جبکہ اس کے دیگر معاونت کار دو مہمان قیدی ساتھیوں یعنی انکل اعظم خان اور وزیر خان کو بھی یہی سزا سنائی گئی۔ اس اطلاع نے نہ صرف مجھے پریشان کر ڈالا تھا بلکہ معزول قیدی سردار آگرموشی کے جاں نثاروں میں بھی غم و غصے اور تشویش کی لہر دوڑادی تھی۔

”ہم آج ہی اس غاصب سردار راس کی رہائش گاہ پر شب خون ماریں گے۔“ رشی کمال نے غضب ناک لہجے میں کہا تو میں بولا۔

”نہیں دوست!..... یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔ اس طرح اپنے ہی ساتھی بلاوجہ اور بے دردی سے موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ راس سردار کی رہائش گاہ کسی معمولی انسان کی رہائش گاہ نہیں ہے بلکہ میرے ذہن میں اب موجودہ حالات کے مد نظر ایک نئی منصوبہ بندی تشکیل پا چکی ہے۔ اب گور یلا کارروائی ہی کرنا پڑے گی۔“ میں نے آخر میں پر سوچ لہجے میں کہا۔ مگر رشی کمال مطمئن نہ ہوا۔ وہ بولا۔

”اب اس نئی اطلاع کے بعد ہماری گور یلا کارروائی (کمائنہ و ایکشن) کا کوئی مقصد؟“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو رشی کمال!“ میں نے پُر زور لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”گور یلا“

سیدھی کر لیں۔ جب وہ متحرک دھبے ایک بڑی سی جیب اور پانچ چھ خچر سواروں کے مختلف سے قافلے میں بدلنے نظر آنے لگے تو میرے اعصاب یکنخت تن گئے۔

میں نے یہ غور پہلے اپنی آنکھیں کھینچ کر ان کی تعداد کا جائزہ لیا۔ چھ خچر سوار مسلح افراد کے علاوہ جیب کے اندر بھی چار پانچ مسلح افراد کی موجودگی یقینی تھی۔ ان میں مجھے غاصب سردار رامس کے مسلح دستے کا سالار بھی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مخصوص وردی سے میں اسے پہچان سکا تھا۔ سردار کی سواری ان میں شامل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ اسی سمت میں روانہ ہونے والا تھا، اپنی الگ سواری پر۔

پھر جیسے ہی قافلہ نزدیک پہنچا تو میں نے سب سے پہلے اپنا ترھوڑا مزید اٹھار کر جیب کے اندر موجود ”سواروں“ میں قیدیوں کی موجودگی کی تصدیق کر ڈالی۔ مجھے تینوں قیدیوں بہ شمول معزول سردار اگر موٹی سمیت انکل اعظم خان اور وزیر خان کی جھلک نظر آ گئی تھی۔

حملے کا وقت سر پر تھا۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے ہم قیامت بن کر اس قافلے پر ٹوٹ پڑے۔ میرے ساتھیوں نے سب سے پہلے خچر سواروں پر اچانک اپنی گولوں کے منہ کھول دیئے۔ جبکہ میں نے جیب کے ٹائروں کا نشانہ بنایا تھا۔

فضا میں بیک وقت گولوں کی گھن گرج کوئی تھی اور ہر طرف بھگدڑ اور افراتفری کا سماں بندھ گیا تھا۔ ہم نے یہ ”کام“ جلد سے جلد نمٹانے کا ایک وقت مقرر کر دیا تھا۔ یعنی پندرہ سے بیس منٹ۔ وقت کو ”مقرر“ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ذرا سی بھی اضافی تاخیر پر غاصب سردار رامس کے دیگر ساتھی مسلح دستے بھی ہم پر ٹوٹ پڑتے۔ جبکہ ہماری کور بھلا کارروائی (کمانڈو آپریشن) پورے مسلح لشکر سے بہر حال جنگ کرنے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے میں نے رشی گال کو بھی اس بات کی سختی سے تاکید کی تھی کہ اس محدود وقت کے اندر اندر ”کام“ نمٹانا ہوگا۔

خچر سوار مسلح دشمنوں میں سے سوائے سالار کے سب ہی چشم زدن میں لقمہ اجل بن گئے تھے جبکہ سالار نے ہر وقت خچر سے چھلانگ لگا کر خود کو بچا لیا تھا۔ پھر زمین پر گرتے ہی لڑھکتیاں کھاتا ہوا جیب کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ مگر جلد ہی دوسری سمت سے رشی گال کے ٹولے نے اسے گولیوں سے بھون ڈالا۔ جبکہ جیب کے اندر سے ہم پر دشمنوں نے جوابی فائرنگ کر ڈالی تھی۔

دونوں طرف سے فائرنگ کا تبادلہ جب طویل پکڑنے لگا اور ہمارے پاس صرف آٹھ منٹ بچے تو میں کچل کی سی تیزی کے ساتھ زمین پر ریختا ہوا جیب کی طرف بڑھا اور اس کے اگلے دونوں ٹائروں کے نیچے کچل جانے میں کامیاب ہو گیا۔

نیرا یہ عمل بہت خطرناک تھا۔ اس طرح میں اپنے ہی ساتھیوں کی ”کر اس فائرنگ“ کی زد میں بھی آ سکتا تھا۔ تاہم مجھے بہر حال انکل اعظم خان سمیت تین بے گناہ قیدیوں کی جان بچانے کے لئے جان کی بازی لگانا تھی۔ میں دوطرفہ چلنے والی گولیوں کی دھندل میں جیب کے نیچے سے ریختا ہوا عقبی گوشے سے ابھرا تو میری دیکھا دیکھی رشی گال نے بھی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اسی طرح پیش قدمی کی۔ وہ جیب کی دوسری سمت سے ابھرا تھا اور یکدم اس نے کھڑکی کی سمت پر ابھرتے ہی اندر موجود دشمنوں کو اپنی گولیوں سے نشانہ بنالیا۔ جیب میں سوار دشمن اس سمت متوجہ ہوئے تو میں نے جیب کے عقبی دروازے سے ابھر کر کچل ٹوٹی ہوئی اسکرین سے ان پر گولیاں داغ ڈالیں۔ ان کی خوں ریزی میں ہمارے تین ساتھی کام آ گئے تھے۔ تاہم دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔

ہم نے تینوں قیدیوں کو جلدی جلدی جیب سے نیچے اتارا اور انہیں لے کر اپنی جیبوں کی طرف

”حق کی جنگ میں خون کا نذرانہ دے کر بھی توفیق حاصل ہوتی ہے نادرا!“ اچانک غمگینہ نے سراسیمہ اور گھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مم..... مگر نادرا! میرے اندر اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہے کہ میں تمہاری اس کامیابی کو خون سے رنگا ہوا دیکھ سکوں۔“

میں نے بے اختیار غمگینہ کو خود سے لگا لیا۔ ہم ایک جان دو قالب کی حقیقی تفسیر بننے اپنے جسم و جان اور محبت فضاں و جود کی حلاوتیں کشید کرتے رہے۔ پھر میں نے ہولے سے اپنے مرتش ہونٹ اس کے کان کی پرتش لو کے قریب داکر کے دل کی محبت گہرائیوں سے سرکشی میں کہا۔

”غمگینہ! جنگ میں صرف شہید تو نہیں ہوا جاتا..... غازی بن کر بھی تو لوٹا جاتا ہے۔ محبت کی قسم! مجھے پورا یقین ہے، تمہاری بے لوث چاہت کی طاقت مجھے زندہ ایک بار پھر تمہاری طرف کھینچ لائی گی۔“ میں نے محسوس کیا کہ غمگینہ کا ڈھیلا پڑتا جسم ایکایک اٹکی تن گیا۔ شاید ہماری الوہی محبت کی قسم نے اسے پُر امید اور با حوصلہ کر دیا تھا۔

ہم دونوں دھیرے سے علیحدہ ہوئے۔ اس وقت چھو لہاری میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ باہر ویران برف زاروں میں شام کا کاجل گہرا ہونے لگا تھا۔

\*\*\*

کئی گھنٹوں بعد جب دور بریلی چوٹیوں پر طباق چاند کا روشن ترھ ماند پڑنے لگا اور دور مشرقی چوٹیوں کی سمت پوہ پھینٹنے لگی تو میں اور رشی گال اپنے گیارہ منتخب کردہ ساتھیوں کے ساتھ دو جیبوں میں روانہ ہو گئے۔ غمگینہ کو رشی گال کے دیگر ساتھیوں کی حفاظت میں دے کر میں اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ ہم غاصب سردار رامس کے قبیلے کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم نے وقت کا خاص خیال رکھا تھا۔ ایک محتاط اندازے اور پری پلاننگ کے تحت ہمیں غاصب سردار رامس کی رہائش گاہ (قید خانے) سے لے کر پھانسی گھاٹ تک جانے والے راستے پر گھات لگا کر بیٹھنا تھا جہاں سے قیدیوں کو گاڑی میں ڈال کر مسلح افراد کا مختصر قافلہ گزرنے والا تھا۔

مذکورہ مقام تک ہمیں پہنچنے میں پون گھنٹہ لگا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو دو گروپوں میں بھانٹ لیا۔ ایک گروپ رشی گال کی سرکردگی میں دے دیا۔ وہ راستے کے دوسری جانب بریلی ڈھلوانوں میں گھات لگا کر فروکش ہو گیا اور دوسری مخالف سمت پر بیٹھ ایسی ہی پوزیشن میں نے بھی اپنے گروپ کے ساتھیوں کے ساتھ سنبھال لی تھی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اب کسی وقت بھی مختصر قافلہ قیدیوں کو یہاں سے لے کر گزرنے والا تھا۔ صبح کا ڈب کا اُجرا ہنوز مشرقی چوٹیوں تک محدود تھا۔ باقی پوری وادی میں ملکجا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا جو ہمیں مکمل سپورٹ دے رہا تھا۔

ہماری بے چین و مضطرب نظریں راستے کے اس طرف مرکوز تھیں، جدھر سے مذکورہ قافلے کی آمد متوقع تھی۔ ابھی ہمیں وہاں گھات لگائے تھوڑی سی دیر ہوئی تھی کہ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہونے لگی۔

میری تھکی ہوئی نظروں نے مطلوبہ منظر کی جھلک دیکھ لی تھی۔ مذکورہ سمت کی طرف مجھے متحرک دھبے دکھائی دیئے۔ میں نے مخصوص آواز منہ سے نکال کر اپنے ساتھیوں کو باخبر کر دیا۔

میری عقابانی نظریں بدستور مذکورہ سمت پر نظر آنے والے متحرک دھبوں پر مرکوز تھیں۔ ہم نے اپنی سبیں

دے ڈالا مگر انہوں نے میری بات نہ مانی اور بہ دستور اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ نتیجتاً ان تینوں کو بھی ہونے بڑی بے دردی کے ساتھ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ جبکہ میرے پاس اب اس کے سوا اور کوئی رہ نہ تھا کہ میں ہتھیار پھینک دیتا۔ لیکن جیسے ہی میں نے خود کو دشمنوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا تو ایک میری چشم تصور میں نگینہ کا رنجور چہرہ رقصاں ہو گیا۔ کوئی بید نہ تھا کہ میرے ہتھیار پھینک دینے کے بعد دشمن مجھے بھی بعد میں زندہ نہیں چھوڑتے۔ ابھی میں یہ ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ اچانک ارد گرد سے مجھ کی جانب نائیں تن کیں۔

میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے اپنی گن پھینک دی۔ دشمنوں کے تیور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ پھر وہیں ان کے درمیان بحث چھڑ گئی۔ اگرچہ وہ اپنی مقامی زبان میں ہی آپس میں باتیں کر رہے تھے، جس سے بہر حال نا اہل تھا۔ تاہم کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بحث مجھے زندہ گرفتار کر کے لے جانے یا میری ہلاک کر ڈالنے کے سلسلے میں ہو رہی تھی۔ میرا رواں درواں دوسووں کی زد میں مرتش ہو رہا تھا۔ کچھ نہیں تھا کہ آئندہ میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ بالآخر یہی فیصلہ ہوا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ یہ فیصلہ ارد ہوتے ہی انہوں نے مجھے بری طرح دھکیلتے ہوئے اپنی جیب میں ڈالا۔ دوسری جیب میں کچھ دشمن رشی ل کے تعاقب میں روانہ ہو چکے تھے۔ مجھے جیب میں سوار کر دیا گیا اور یہ لوگ واپس پلٹے۔ ان لوگوں کے چہروں اور آنکھوں سے میرے لئے انتہائی درجے کی نفرت اور غیظ و غضب کی چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے یہ لوگ ادھر ہی گولیوں سے بھون ڈالتے۔ جبکہ خود میں لمبے حواس پر قابو پار کھا تھا اور سینے میں بے طرح دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ میں ہنوز فرار کے موقع کی ل میں تھا۔

میری عادت تھی کہ چاہے حالات کتنے ہی مایوس کن اور خطرناک کیوں نہ ہوں، میں امید اور حوصلے اور لہر گزرنے کی جستجو ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یہ جب نسبتاً چھوٹی تھی۔ اس میں ڈرائیور کے علاوہ صرف چار مسلح افراد ہی موجود تھے۔ تین میرے آگے تھے۔ تینوں نے مجھے گن پوائنٹ پر لئے ہوئے تھے، جبکہ بعد میں جب جیب روانہ ہوئی تو تیسرا بھی ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر جا کر براجمان ہو گیا۔ جبکہ باقی دشمن خجروں پر سوار تھے اور وہ سب جیب کی نامہ رفتار کے ساتھ دوڑے چلے آ رہے تھے۔

مجھے رشی گال اور تینوں قیدیوں کی بھی فکر تھی جن کے تعاقب میں مسلح دشمنوں کی تقریباً نصف تعداد ایک پہ اور خجروں پر روانہ ہو چکی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں بہ شمول رشی گال اور تینوں قیدیوں کے کامیابی سے لے جانے کی بس دعائیں ہی مانگ سکتا تھا۔

جیب مناسب رفتار سے ناہموار اور کچے بل کھاتے راستے پر ہچکوتے کھاتی ہوئی دوڑی جا رہی تھی۔ مجھے رفتار کرنے کے بعد کم از کم ایک بات تو میرے حق میں تھی کہ ابھی تک مجھے رن بہت نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی رے ہاتھ پیر آزاد تھے۔ انہوں نے مجھے نہتا کر کے صرف گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا اور یہی وہ موقع تھا کہ اسے ”بروقت“ فائدہ اٹھانے کے بارے میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ معاً ایک موڑ پر جیب اڑی سے دائیں جانب مڑی تو میرے ساتھ چپکے ہوئے مسلح دشمن کا توازن ذرا دیر کو بگڑا۔ اس نے خود کو نچالنے کی کوشش میں اپنی گن کا رخ غیر ارادی طور پر اس جانب کیا جدراس کا دوسرا ساتھی موجود تھا۔ میں نچلنے کی سی تیزی کے ساتھ اس کی گن پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت جمائی اور اس کے ٹرائیگر پر اپنی انگلی انجش بھی دے ڈالی۔ اس کی گن شاید سنگل شاٹ پر ”ایڈجسٹ“ تھی۔ سماعت شکن دھماکا ہوا اور گولی کی

دوڑے۔ تب پھر اچانک رشی گال کے ٹولے کے ایک ساتھی نے حلق کے بل چنچ کر رشی گال سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ انداز مجھے انتباہ ہی لگا تھا۔ میں نے ذرا ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا تو اس کی عقبی سمت میں جہاں قدرے ڈھلان کی جانب چٹیل سامیدان تھا، کئی مسلح افراد کا ایک پورا دستہ خجروں اور دو جیپوں میں اسی سمت بڑھا چلا آ رہا تھا۔

”بھاگو.....!“ میں حلق کے بل چنچا۔  
”ہمیں ان کا مقابلہ کرنا ہو گا نادرا!“ رشی گال چلا کر پرجوش آواز میں بولا۔ ”یہ لوگ اتنی آسانی سے ہمیں نہیں جانے دیں گے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، گال!“ میں نے اس کی بات رد کر دی۔ ”واپس چلو۔“  
اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہم تینوں قیدیوں کو ساتھ لئے اپنی جیپوں کی طرف دوڑے۔ اور پھر چشم زدن میں سوار ہو کر جیسے ہی روانہ ہونے لگے، دشمنوں کے دوسرے دستے نے ہمارے قریب پہنچتے ہی ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ دے ماری۔ رشی گال تو اپنی جیب آگے بڑھالے گیا جبکہ میری جیب اور میرے ساتھی دشمن دستے کی فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ میرے دو ساتھی کرب ناک چیخوں کے ساتھ جیب سے نیچے گرے تھے جبکہ جیب کی کھڑکیوں کے شیشے گولیاں لگنے سے ٹوٹ کر کرچیوں میں بکھر گئے تھے۔ میں پھرتی سے نیچے جھک گیا۔ تینوں قیدی رشی گال کی جیب میں سوار تھے۔ شکر تھا کہ ابھی میری جیب کا کوئی ٹائر گولیوں کی زد میں نہیں آیا تھا۔

میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور ڈرائیور کی سیٹ سنبھالنے ہی ایک جھکے سے جیب آگے بڑھائی۔ عقب سے دشمنوں کی وحشتانہ اور اندھا دھند فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ اچانک سماعت شکن دھماکا ہوا اور میری جیب جس نے ابھی پوری طرح سے رفتار بھی نہیں پکڑی تھی، بری طرح ڈولنا شروع ہو گئی۔ بد قسمتی سے جیب کا ایک ٹائر گولی لگنے سے برست ہو چکا تھا۔

”سب نیچے آؤ!“ میں چلا یا اور پھر اپنی گن سنبھالے ڈوٹی جیب سے چھلانگ لگا دی۔ جبکہ رشی گال اپنے ساتھی ٹولے اور تینوں قیدیوں کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اب میرے پاس دشمنوں کی بھاری تعداد کے سامنے ڈٹ جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہماری تعداد دشمنوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں مٹھی بھر تھی۔

چنانچہ ہم نے فوراً پوزیشن سنبھالی اور دشمنوں پر اپنی گنوں کے منہ کھول دیے۔ خجروں پر چار مسلح دشمنوں کو تو میں نے پہلے ہی برست میں ڈھیر کر ڈالا۔ تاہم انہوں نے بھی فوراً اپنی پیش قدمی روک کر خجروں اور جیپوں سے اتر کر مورچے سنبھال لئے۔

میرے ساتھیوں کی تعداد صرف پانچ تھی۔ اس کے باوجود ہم جم کر بے جگری سے لڑے تھے۔ مگر میں جانتا تھا کہ ہم زیادہ دیر تک اچانک اند پڑنے والے دشمنوں کے اس بھاری مسلح دستے کے سامنے نہیں ج سکیں گے۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ جسے موقع ملے وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے اپنے طور پر فرار اختیار کرنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ خود میں بھی یہی حکمت عملی اپنانا چاہتا تھا۔

میں نے فوراً جوابی فائرنگ موقوف کر ڈالی۔ اس طرح دشمنوں کو میری موجودگی کا پتہ چلتا تھا۔ میں دھیرے دھیرے عقب میں کھٹکے لگا مگر دشمن میری توقع سے زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہوئے۔ وہ پہلے ہی ہم سب کو کھیرے میں لے چکے تھے۔ میرے دو ساتھیوں نے دشمنوں کے گھیراؤ کو توڑنے کی کوشش میں اپنی جانیں گنوا دیں تو میں نے خود سمیت اپنے باقی ساتھیوں کو ہلاکت میں ڈالنے کی بجائے ہتھیار چھیننے کا

بھیا تک قربت نے دوسرے ساتھی کو اگلا سانس بھی نہیں نصیب ہونے دیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر میں نے دوسری جارحانہ حرکت کر ڈالی اور کہنی کی زوردار ضرب پہلے والے کی ٹھوڑی پر رسید کر دی۔ گن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو میں نے گن جھپٹ کر اس کا رخ پھرتی سے ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر براجمان دوسرے ساتھی کی طرف موڑا جو میری جانب اپنی گن کا رخ موڑ چکا تھا۔ مگر بلی دبانے کا مونہ میرے ہاتھ لگا۔ میری گن نے دوبارہ آتشیں قہقہہ اگایا اور گولی اس کی پیشانی توڑتی ہوئی آ رہی ہو گئی۔ پہلے والے نے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرنا چاہی تو میں نے گن کا ٹھوس بٹ اس کی کٹھنی پر رسید کر دیا۔ وہ سہلے سدھ ہو گیا۔ ادھر ڈرائیور نے جیب روکنا چاہی۔ میں نے اس کی گردن پر فائر کر دیا۔ وہ بھی آواز نکالنے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ جیب بری طرح ڈونگے لگی تو میں نے برق رفتاری سے ڈرائیور کی آڑی ترچھی لاش کو زبردست ٹھوکر مار کر باہر دھکیل دیا اور خود اسٹیرنگ سنبھلتے ہی اس کی رفتار بڑھا دی۔

میری جیب میں دُخن کا صرف ایک ہی ساتھی زندہ بچا تھا مگر وہ بے ہوش تھا۔ سر دست مجھے اس کی طرف سے کوئی تشویش نہ تھا۔ باہر خچر سوار دشمنوں کو جب تک ”اندز“ کی صورت حال کا ادراک ہوتا، میں جیب آندھی طوفان کی طرح دوڑا کر ان سے کافی دور نکل چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ان کے توانا مگر سست رو خچر جیب کی رفتار کا مقابلہ ہرگز نہیں کر پائیں گے۔ تاہم انہوں نے بے دریغ جیب پر فائرنگ ضرور کر ڈالی تھی۔ ٹھک، ٹھک کر کے کئی گولیاں جیب کی باڈی میں پیوست ہوئی تھیں مگر اب میں ان کے ہاتھ کہاں آنے والا تھا۔

میں نے جیب کو دائیں جانب نسبتاً میدانی علاقے میں اتارا اور ایک طویل چکر کاٹ کر واپسی کی جانب اس کا رخ موڑ کر رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔

میں اب خچر سوار دشمنوں کی فائرنگ رینج سے دور نکل چکا تھا۔ معاً جانے کس طرح عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑے اکلوتے دُخن کو ہوش آگیا اور وہ خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھ پر چبھنا۔ میری گن میرے پہلو میں پڑی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ اس کم بخت نے عقب سے اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے میری گردن کس لی تھی اور زور زور سے جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔ میرے دونوں ہاتھ جھکولے کھاتی اور پُر خطر راستوں پر دوڑتی جیب کے اسٹیرنگ پر جے رہنے ضروری تھے۔ یہ صورت دیگر جیب کی وقت بھی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر سکتی تھی۔ تاہم دوسری طرف اس حملہ آور کو بھی جواب دینا ضروری تھا جو اچانک ہی بلائے جان بن آیا تھا۔ حالانکہ مجھے اس کی طرف سے تقریباً دو گھنٹوں تک ”انٹانٹیل“ پڑے رہنے کی پوری توقع تھی۔ مگر وہ سخت جان واقع ہوا تھا اور جلد ہی ہوش میں آ گیا تھا۔

وہ اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے سے میری گردن کو بدستور پھینکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ مجھے اپنی سانسیں سینے میں کھٹتی محسوس ہونے لگیں۔ یہ صورت حال بھی کم خطرناک تو نہ تھی۔ چنانچہ اس کا فوری حل بھی اچانک ہی میرے ذہن میں ابھر ا تھا۔

شکست خوردہ دشمنوں کا ٹولہ پیچھے رہ گیا تھا۔ سر دست ان کی طرف سے مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں نے اچانک بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔ حملہ آور کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس نے باوجود اس کے میری گردن تو نہیں چھوڑی البتہ اس کی گرفت ضرور ڈھیلی پڑ گئی۔ ادھر میں نے جیب کے رکتے ہی اسٹیرنگ چھوڑا اور ایک گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے بھیا تک کر بہہ ج اُبھری اور میں نے پھرتی سے اپنی گردن اس کے شکنجے سے چھڑائی۔ اس نے اپنی تکلیف بھلا کر میرے پہلو میں رگی گن پر چبھنا مارا تو میں نے قدرے پلٹ کر اپنے ایک بازو کی کہنی اس کے چہرے پر دوبارہ رسید کر

دی جو اس کے جبڑے پر لگی مگر اس نے گن پر اپنی گرفت جماتے ہی اسے اچک لیا۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ میں بجلی کی طرح اپنی سیٹ سے تڑپا اور پلٹ کر اس پر جھپٹ پڑا۔ ہم دونوں اب جیب کے عقبی حصے میں ایک دوسرے سے جھکم جھکا ہو گئے تھے اور ہم دونوں کے ہاتھ گن پر مضبوطی سے گرفت جمائے دئے تھے اور کوئی بھی گن چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ تب پھر اچانک اس نے اپنے سر کی ٹکر میرے چہرے پر مید کر دی۔ میرا دماغ ایک لمحے کو جھجھکا سا گیا۔ لامحالہ میری گرفت گن پر کمزور پڑی اور اس نے میرے ٹھوکوں سے ایک جھٹکے کے ساتھ گن چھین لی۔ مگر جب تک وہ مجھ پر گن کی نال سیدھی کرنے کی کوشش کرتا، میں نے بھی پل کے پل سنبھلتے ہی ایک لات اس کے پیٹ پر ناف کے ذریعے رسید کر دی۔ اس کے حلق سے بھیا تک ڈکراہٹ نکلی اور وہ تکلیف کی شدت کو دبانے کے لئے جیسے ہی فطری ردِ عمل کے تحت رکوع کے ہاتھکا، میں نے گھٹنا اس کی پہلے سے مضروب اور پکلی ہوئی ناک پر رسید کر دیا۔

میرے یہ دونوں حملے کارگر ثابت ہوئے تھے جنہوں نے اسے بالکل ہی غدھال کر کے رکھ دیا۔ میں نے اپنی آسانی اس سے جھپٹ لی اور اس کے لہراتے اور بے سدھ پڑتے وجود کو ایک عدلات رسید کر دی۔ اچانک کر جیب کے پچھلے کھلے حصے سے باہر جاگرا۔

میں نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیب اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

\*\*\*

دن کا اُجالا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔ میں اپنے ٹھکانے پر بہ خیر و عافیت پہنچا تو نگینہ سمیت صبح بے ہوشی کے ساتھ میرے منتظر تھے۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر وہ خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ بالخصوص اُنکل اعظم اور نگینہ۔ وزیر خان میرا تہہ دل سے شکر گزار تھا۔

رشی گال البتہ کچھ پریشان اور منتظر نظر آ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دشمنوں کے ٹولے نے ان کا کافی دور تک تعاقب کیا تھا۔ تاہم وہ اس کے نزدیک نہیں پہنچ پائے تھے اور وہ انہیں جل دے کر قیدیوں کو با قیادت لے کر اپنے ٹھکانے تک آ پہنچا تھا۔

”لیکن نادرا!..... ہمیں اب اپنا یہ ٹھکانا بدلنا پڑے گا۔“ وہ آخر میں اپنی فکر آمیز پریشانی کی وجہ ظاہر کرتے ہوئے گہری متانت سے بولا۔

”تمہیں اس کا کیسے اندازہ ہوا؟“ میں نے اس کے تفکر بھرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”دشمنوں نے ہمارا خاصی دور تک تعاقب کیا تھا اور وہ لوٹ گئے تھے۔ ان کی سمت بالکل درست تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ مکمل تیاری اور بھاری تعداد کے ساتھ ادھر کا بھی رخ کر سکتے ہیں۔“

میں اس کی بات پر پریشان ہو گیا، پھر بولا۔ ”اگر یہ بات ہے تو پھر ہمیں فوراً سے بیشتر اپنا یہ ٹھکانا ڈھکانا ہوگا۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ وہ فوراً بولا۔

چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ دشمنوں سے چھینی ہوئی دو بیچوں کے علاوہ ہماری ایک جیب اور بھی تھی۔ باقی بڑی تعداد میں خچر بھی تھے۔

ہم نے اسی وقت وہ ٹھکانا چھوڑ دیا۔ رشی گال کے ذہن میں ایک اور خفیہ ٹھکانہ تھا جو وہاں سے کم دیش کیسوں کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم سب لگ بھگ ایک گھنٹے بعد وہاں پہنچ گئے۔

یہ مقام چاروں طرف سے فٹلی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا اور یہاں خاصی روئیدگی بھی پائی جاتی تھی۔



اس کے پاس گن تھی۔ میں نے وزیر خان کو وہیں انکل اعظم خان اور نگینہ کے پاس رہنے کا کہا اور خود پر نکل آیا۔

فائرنگ دو اطراف سے ہو رہی تھی۔ رشی کال کے ساتھی مورچے سنبھالے جنگ میں مصروف تھے۔ ہاڑہ بھی ہوتا تھا کہ یہ حملہ غاصب سردار راس کے جنگی ٹولے کا ہی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ ہمارے پہلے لے ٹھکانے پر پہنچے ہوں اور قدموں کے نشانات پر چلتے ہوئے یہاں آ گئے ہوں۔ اب میں بھی اس جنگ میں شریک ہو چکا تھا۔ مگر ذرا ہی دیر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دشمنوں کی افرادی دست بہر حال ہم سے زیادہ تھی۔

میرے پاس ایک گن تھی۔ جبکہ فاضل راؤ نڈز کے دو کلپ میری پتلون کی بیلٹ میں اڑے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر پھرتی سے اپنی جگہ بدلی۔ میں درحقیقت اس چھو لداری کے ذرا قریب ہی رہتا ہوا تھا، جہر نگینہ اور انکل اعظم خان موجود تھے۔ میں نے جیسے ہی اپنی جگہ بدلی، خود پوجھاڑیوں اور رتوں کے گھنے جھنڈے سے ہوتا ہوا دشمنوں کی صفوں کے ذرا نزدیک پہنچا تو مجھے سرمئی شام کی ملکی تاریکی میں ہرچ سنبھالے دشمنوں کی کثیر تعداد ہیولوں کی صورت نظر آئی۔ میں نے اپنے ہونٹ میچ لگے۔ اچانک میں نے چار سٹخ ہولوں کو چھو لداری کی طرف ریگتے دیکھا۔ یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ بہر سرعت میں نے ان کا جانب ریگتے ہوئے حرکت کی تھی۔ نہ جانے ان خبیثوں کو کیسے اس بات کا ادراک ہوا تھا کہ ان کے ہاں اس چھو لداری میں تھے۔

فائرنگ بدستور جاری تھی۔ سردست رائفلوں ہی کا استعمال ہو رہا تھا جس سے مجھے فوراً اتنا اندازہ تو ضرور ہوا تھا کہ دشمنوں کا اسلحہ صرف رائفلوں اور گولوں تک ہی محدود تھا۔ ان کے پاس بھاری ہتھیار نہ تھے۔ اے اس پر حیرت بھی ہوئی تھی۔ اگر یہ غاصب سردار راس کا ٹولہ تھا تو ان کے پاس میں نے ہینڈ گرنیڈ کے ادراک لا نچر بھی دیکھے تھے۔

بہر طور میں جیسے ہی اپنی چھو لداری کے ذرا قریب پہنچا تو میں نے ان چاروں مشتبہ حملہ آوروں کو لداری کا نشانہ بناتے ہوئے دیکھا۔ پل کے پل میں نے اپنی گن سیدھی کر کے ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ دو دشمنوں کو میں نے کر بہہ جیخوں کے ساتھ ڈھیر ہوتے دیکھا۔ جبکہ دو نے فوراً خود کو نیچے گر لیا تھا۔ اس سے ایک نے میری سمت پر برسٹ فائر کر دیا تھا۔ میں نے جھکا کر دے کر خود کو گولیوں کی مہیب زد ہچالیا تو مجھے اگلے ہی لمحے دوسرا برسٹ چلنے کی بھی گن گرج سنائی دی تھی۔ مگر یہ برسٹ مجھ پر نہیں داغا تھا۔ میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی۔ دوسری سمت سے ذرا سر اٹھا کر دیکھا تو میں نے ان دو سے ایک دشمن کو اپنی پہلی والی جگہ کی سمت محتاط انداز میں بڑھتے دیکھا۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی لداری پر اندھا دھند گولیاں برسا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اس کا نشانہ لے کر لمبی دی۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے اسے پل بھر میں واصل جہنم کر دیا۔

اس کے دوسرے ساتھی کو فوراً ہی میری پوزیشن کا اندازہ ہوا اور اس نے یکدم زمین پر لیٹ کر میری بگن کا منہ کھول دیا۔ میں نے بہر سرعت خود کو جھکا لیا اور تیزی کے ساتھ پوزیشن بدلی۔ اب میں "فائر" اور جگہ بدلو" کی حکمت عملی کے تحت آخری دشمن پر بدستور گولیاں داغے جا رہا تھا۔ مگر میرا آخری دشمن محتاط ہو چکا تھا۔ وہ بھی بڑی سرعت اور چابک دستی کے ساتھ نہ صرف اپنی جگہ بدل رہا تھا بلکہ مجھ پر پل فائر داغے جا رہا تھا۔

اچانک میں نے چھو لداری سے کسی کو گن سنبھالے باہر نکلتے دیکھا۔ میرا فاصلہ چونکہ اس سے خاصا

مجھے یہ نیا ٹھکانا پہلے والے ٹھکانے سے نسبتاً زیادہ اچھا اور محفوظ لگا تھا۔ حالات اپنی جگہ پر خطر تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کئی الفور نگینہ اور انکل اعظم خان کو یہاں سے واپس روانہ کر دوں۔ لیکن یہ اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔

یہ اسی روز سر شام کا ذکر تھا۔ ہم اس معاملے پر سر جوڑے گفتگو میں مصروف تھے۔ نگینہ کو میرے اس فیصلے سے سخت اختلاف تھا۔ وہ میرے بغیر یہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ جبکہ انکل اعظم کا بھی یہی خیال تھا۔ البتہ وزیر خان اپنے بیٹے کے قاتل سنبھال کو لئے بغیر ہرگز نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کا یہ الگ اور ذاتی معاملہ تھا۔ میں اس پر زور نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ نگینہ اور انکل اعظم خان سے میں نے پُر زور اصرار کیا کہ میری بات مان لیں۔ انکل اعظم نے تو بعد میں چپ سادھ لی مگر نگینہ اپنے فیصلے پر اٹل رہی تھی۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔

"نادر!..... تم آخر تک مجھے اس طرح آزمائش میں ڈالتے رہو گے؟" نگینہ کا جیسے اب پناہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے میں کرب بھی تھا اور شکوہ بھی۔ وہ سرکش سی ہونے لگی تھی۔ اور اپنی جگہ درست بھی تھی۔ تاہم اس حقیقت کو تو وہ بھی جانتی تھی کہ میں یہ سب اس کی خاطر ہی کر رہا تھا۔ میں نے اسے دوسرے انداز میں سمجھانا چاہا۔

"نگینہ! اُس موذی عاروب کا خاتمہ ضروری ہے۔ وہ ایک خطرناک وائرس کی طرح ہماری زندگی کا دشمن بن چکا ہے۔ اور پھر وزیر خان کا بھی تو معاملہ انکا ہوا ہے۔ جب تک میں سنبھال کو اس کے حوالے نہ کر دوں، میری بے گناہی کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟"

وہ شکوہ کنال نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی، پھر یکدم سسک کر بولی۔

"نادر! آخر یہ آزمائشیں کب ختم ہوں گی؟..... ایک کے بعد دوسری آزمائش، ایک اور امتحان۔ کہیں یہ میری جان ہی نہ لے لے۔"

میرا دل بیچ گیا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے اور ملاحت سے کہا۔

"نگینہ! میرا دل کہتا ہے، اب یہ آزمائشیں ختم ہونے والی ہیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہونے والا ہے۔ شب ستم گزیدہ کے بعد بحر مسرت ضرور طلوع ہوگی۔ تم میری بات مان لو۔ انکل اعظم خان کے ساتھ چلی جاؤ۔ حالات ایسے رہے کہ میں تمہیں یہ خوش خبری بھی نہیں سناسکا کہ ماں کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو چکا ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے تمہارے پیا (شاہ میر) کو بھی معاف کر دیا ہے۔ کیا یہ خوشی کی بات نہیں ہے کہ اب تمہارے پیا ہمارے پاس گرین لاج میں ہیں اور تمہیں بھی ان کے پاس جا کر رہنا چاہئے۔"

میری بات پر نگینہ کے چہرے پر چٹکی سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ مگر چہرے پر آرزو کی جوں کی توں رہی۔ اچانک باہر گولیوں کی ترتر ابھٹ ابھری۔ میں بری طرح چونک گیا اور رگوں میں خون کی گردش بیکخت تیز تر ہو گئی۔ میں نگینہ کو وہیں چھوڑ کر گن سنبھالے چھو لداری سے باہر نکلتا ہی چاہتا تھا کہ اچانک رشی کال بولکھایا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"نادر!..... دشمنوں نے بھاری تعداد میں ہماری پناہ گاہ پر حملہ کر دیا ہے۔..... ہمیں نکلتا ہوگا۔"

میں اس کی بات پر پریشان ہو گیا۔ "مم..... مگر..... انہیں یہاں ہمارے ٹھکانے کا علم کس طرح ہوا؟" میں نے فکری سے پوچھا۔ مگر رشی کال میری بات سنی ان کی سنی کر کے واپس مڑ گیا۔

چھو لداریوں کے باہر وقتے وقتے سے جاری رہنے والی گولیوں کی گھن گرج اب ایک تواتر سے ہونے لگی تھی۔ انکل اعظم خان اور نگینہ بری طرح پریشان اور ہراساں تھے۔ جبکہ وزیر خان آمادہ بہ جنگ نظر آ رہا تھا۔

بھی چلا جواب دیا تو وہ چند ٹائیے مجھے حشناک نظروں سے گھورتا رہا، پھر دوسرے ہی لمحے ایک بدست اور فاجحانہ قبچہ لگا کر بولا۔

”باغی ٹولے کو تو ہمارے ساتھیوں نے چن چن کر ہلاک کر ڈالا ہے۔ اور سردار اگر موشی بھی ختم ہو چکا۔ بہت جلد میرے ساتھی دوسرے باغیوں سمیت رشتی گال اور تمہارے ساتھیوں کو بھی پکڑ کر یہاں لانے والے ہیں۔ ابھی تم انتظار کرو۔ پھر تمہاری نظروں کے سامنے تمہارے پیاروں کو اذیتیں دے کر جان سے ماروں گا تاکہ میرے انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو سکے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے مسلح ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ فوراً حرکت میں آئے اور مجھے پکڑ کر قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

یہ وہی منحوس قید خانہ تھا جو تہہ خانے میں بنا ہوا تھا اور میں پہلے بھی یہاں مقید رہ چکا تھا۔ مجھے سردار رامس کی ان باتوں سے کچھ ڈھارس بندھی تھی کہ ابھی تک غمگینہ، انکل اعظم خان اور باغی رشتی گال سمیت اس کے دیگر ساتھی ان کے ہتھے نہیں چڑھ سکے تھے۔

مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ وہ کہاں غائب ہو گئے تھے؟..... جبکہ معزول اور بد نصیب سردار اگر موشی کا سفاکانہ قتل تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ دشمنوں کا ایک ٹولہ عقب سے جھولداری بر حملہ کر کے اندر داخل ہوا تھا اور انہوں نے سردار اگر موشی کو قتل کر ڈالا ہوگا۔ پھر بعد میں وہ غمگینہ اور انکل اعظم خان کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ مگر یہاں آکر تو مجھے کچھ اور کہانی سنائی جا رہی تھی۔ میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک چونکا دینے والا حوصلہ افزا خیال یہ بھی ابھرا تھا کہ ممکن ہے، سردار رامس کے آدمی سردار اگر موشی کو ہلاک کرنے کے بعد غمگینہ اور انکل اعظم خان کو اپنی گرفت میں لے جا رہے ہوں تو رشتی گال نے عین وقت پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہیں ان کے چنگل سے چھڑا لیا ہو۔ اس خیال میں پورا وثوق دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ میں بہر حال رشتی گال کی بے جگر اور بہادری کا معترف تو تھا۔

بہر طور اب دیکھنا یہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا؟ بہ قول اس خبیث سردار رامس کہ اس کے جنگجو ساتھی رشتی گال اور میرے دونوں ساتھیوں کو تلاش کر رہے تھے۔ سردست مجھے حالات مخدوش سے مخدوش تر ہوتے نظر آ رہے تھے۔

سردار رامس کے بھیا یک اور خونیں عزائم نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ اس خبیث اور بے حد سفاک شخص نے اقتدار کے لالچ میں آکر اپنے ہی سنگے بھائی کو بالآخر قتل کر ڈالا تھا اور اس کے ہمراہ اس گھناؤنی سازش میں خود بد نصیب اور آنجہانی سردار اگر موشی کی بیوی ناگاسی بھی شامل تھی جس نے اب نئے سردار یعنی اپنے ہی دوپور رامس سے شادی رچا لی تھی۔ مجھے ان کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر مجھے زیادہ فکر غمگینہ اور انکل اعظم کی طرف سے لاحق ہو رہی تھی۔ اور میں یہ بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ دونوں رشتی گال کے پاس ہوں اور محفوظ ہوں۔ سردار رامس کے سفاک آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔

البتہ اس خونی جنگ میں مجھے وزیر خان کی موت کا زیادہ افسوس ہو رہا تھا۔ مکش پور کی بستی کے سردار زور اور خان نے اپنی روایتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا کہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے والا میں نہیں بلکہ سنکھال نامی وہ کیلاشی باشندہ تھا جو عامل عاروب کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس نے میری ایک نسنی تھی اور بالآخر اپنے بھائی وزیر خان کو چند ساتھیوں سمیت میری راہ پر لگا دیا۔ تھا۔ اب کون جانتا تھا کہ وزیر خان کی موت ہی اسے یہاں پہنچا لائی تھی۔ مگر وزیر خان اور علی الترتیب اس کے چند ساتھیوں کی موت کے بعد میرے لئے سردار زور اور خان والا معاملہ مزید پیچیدہ ہو گیا تھا۔ لائحہ عمل وہ مجھ

قریب تھا اس لئے میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ وزیر خان تھا۔ میں نے جلا کر اسے دوبارہ اندر جانے کا کہا تو وہ میری آواز پر ٹھنکا مگر اس وقت قریب آتے آخری دشمن نے اسے بد قسمتی سے اپنی گن کے نشانے پر لے لیا تھا اور جب تک وزیر خان کچھ بھٹتا، اس نے فائر برسٹ کر دیا تھا۔

وزیر خان کو جھولداری سے شاید اس کی موت ہی پہنچ لائی تھی۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا تو مجھے قریب آئے آخری دشمن پر برسٹ فائر کرنے کا موقع مل گیا مگر میری گن سے خالی ”کچھ، کچھ“ کی آواز ابھری۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دوسرا میگزین کلب گن کے ساتھ ”انچ“ کیا اور دشمن کی سرٹ دیکھا مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ جھولداری کی طرف بڑھا۔ وہ اندر داخل ہوا مگر دوسرے ہی لمحے بری طرح ٹھنک گیا۔ جھولداری کا عقبی حصہ چاک تھا اور سامنے فرش پر سردار اگر موشی خون میں لٹ پٹ پڑا نظر آیا۔ میں بری طرح دہل گیا اور اس کی جانب لپکا۔ اس کے سینے میں ایک لمبی قردولی عین دل کے مقام پر دستے تک پوسٹ تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا، وہ مر چکا تھا۔

میں اٹھ کر چاک شدہ حصے سے باہر آ گیا۔ اس دوران فائرنگ کا سلسلہ بتدریج موقوف ہونے لگا تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے رشتی گال کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے یا پھر فراہم اختیار کر لی تھی۔ مجھے گنیز اور انکل اعظم خان کی برسرِ ارمگندگی کی فکر ستا رہی تھی۔

میں محتاط انداز میں مگر دیوانوں کی طرح غمگینہ اور انکل اعظم خان کو تلاش کرنے لگا کہ ایا تک بیک وقت کئی افراد میرے دائیں بائیں نمودار ہوئے اور آنا ٹانا مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ ان کا وضع قطع مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ غاصب سردار رامس کے ہی آدمی تھے۔ میری مشکلیں کس دی گئیں اور پھر مجھے ایک جیب میں سوار کرا دیا گیا۔

میں نے ان سے غمگینہ اور انکل اعظم کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنا چاہی تھی مگر یہ لوگ شاید میری زبان نہیں جانتے تھے اور مجھے محض درشت اور خوف ناک نظروں سے گھور کر رہ گئے۔

میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ ممکن ہے وہ دونوں ہی بد قسمتی سے ان کے ہتھے چڑھ گئے ہوں یا ان کے دوسرے ساتھیوں کی گرفت میں آچکے ہوں۔

ہر سو خاموشی کا راج تھا۔

مجھے غاصب سردار رامس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کی حالت خارش زدہ کتے کی سی ہو رہی تھی۔ مجھے یوں خوف ناک نظروں سے گھورنے لگا جیسے میری بوٹیاں تک نوچ لے گا۔

میری زبان صرف اس کو ہی آتی تھی۔ وہ چند ٹائیے جلے کڑھنے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے کے بعد غضب ناک لہجے میں بولا۔

”نادر!..... تم نے باغیوں کے ساتھ مل کر مجھے جو نقصان پہنچایا ہے، اس کی تلافی تو تمہاری موت بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن میں تمہاری زندگی کو اس قدر بھیا یک کر دوں گا کہ تمہیں اپنی اذیت ناک زندگی کی نجات بھی صرف موت ہی کی صورت نظر آئے گی اور تم مجھ سے موت کی بھیک مانگو گے۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”مجھے تم لوگوں کے داخلی معاملات سے نہ پہلے پہلے

تھی اور نہ اب ہے۔“

”بکواس بند کرو مکار آدمی!“ وہ مارے طیش کے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ”اگر یہ بات تھی تو پھر تم۔“

باغی ٹولے کے ساتھ ساز باز کر کے ہمارے اہم قیدیوں کو کیوں آزادی دلائی تھی؟“

”ان قیدیوں میں میرے اہم ساتھی بھی شامل تھے جنہیں تم نے بے گناہ قید میں رکھا ہوا تھا۔“ میں۔

میں ہوں۔ ویسے مجھے کچھ تسلی تو تھی کہ اس صورت میں وہ دونوں بھی یہاں میرے ساتھ تہ خانے میں ہوتے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے وہاں قید خانے میں رہتے ہوئے کتنے دن بیت گئے تھے۔ تاہم میں نے گزرے ہوئے وقت اور گھنٹوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے آج دوسرا دن ہی ہوا تھا۔ چند محنتی اور گزرے تو چار مسلح اشخاص اندر داخل ہوئے۔ میں نے ان سے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ مجھے کوئی جواب دیے بغیر گھسٹتے ہوئے اپنے ساتھ تہ خانے سے باہر لے آئے۔ جس کے بعد مجھے سردار رامس کے سامنے پیش کیا گیا۔

میں نے خلاف توقع اس کے چہرے پر درشتی کے بجائے الجھن آمیز فکر مندی کے تاثرات دیکھے۔ میں بھی سمجھا تھا کہ اب مجھے یہ خبیث شخص تختہ مشق بنانے والا تھا۔

وہ میری طرف خوف ناک نظروں سے چند تائیے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ”تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہیں آسان موت دی جا رہی ہے۔“

میں اس کی اسرار بھری گفتگو پر بری طرح دہل گیا تاہم حلق تر کر کے بولا۔

”میں سمجھا نہیں..... اس مہربانی کی وجہ.....؟“

”اس بات کو چھوڑو۔“ وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ اس کے بعد اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔

میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب جکڑ دیئے گئے۔ میرا دل گویا گنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ مجھے بھانسی دی جانے والی تھی۔ یہ کرب ناک حقیقت میں کس طرح گوارا کر سکتا تھا۔ مگر یہ ہو رہا تھا، ہونے والا تھا اور میں جی نادر علی خان بالکل بے بس تھا..... کیا واقعی میں بے بس تھا؟..... کیا میری زندگی اتنی ہی سستی تھی کہ میں ان برف زاروں میں بے بسی کی موت مارا جاؤں؟..... میں نے تو آج تک حق و صداقت کے لئے جنگ لڑی تھی۔ پھر ایسی بے بسی والی موت میرا مقدر کیوں بننے والی تھی؟ اور وہ بھی بے گناہی کی موت! نہیں نادر علی خان!..... نہیں! میرے اندر دور کہیں کوئی جلائی تھا۔ جس کی بازگشت مجھے اپنی ماعتوں تک میں سنائی دی تھی۔

مجھے ایک جیب میں سوار کرایا گیا۔ سردار رامس بھی دوسری گاڑی میں اپنے چند مسلح محافظوں کے ساتھ سوار ہوا۔ خیر سوار سب دستانے بھی موجود تھے۔ پھر یہ مختصر قافلہ بھانسی گھاٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دیگر امراء بھی ایک الگ گاڑی میں موجود تھے۔ باغیوں کے حملے کے پیش نظر اس بار مسلح دستے کی تعداد بڑھ کر دی گئی تھی۔

مگر ابھی یہ قافلہ سردار رامس کی قلعہ نما رہائش گاہ سے صرف چند گز آگے ہی گیا تھا کہ اچانک شور مچ گیا۔ قافلہ کو روکنے کا بھل بجا دیا گیا۔ سب لوگ وہیں رک گئے۔ جس جیب میں مجھے سوار کرایا گیا تھا، وہ بھی ایک جھٹکے سے روکی گئی تھی۔ نہ جانے کیا انہونی ہو گئی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے بھی حیران پریشان اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔ دو تین کچھ جاننے کی جستجو میں جیب سے اترے اور پھر ذرا سی دیر بعد وہ جب پریشان اور بوکھلائے ہوئے لوٹے تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

وہ دونوں اپنی زبانوں میں حواس باختہ لہجے میں اپنے ساتھیوں کو کچھ بتانے لگے۔ میں نے بھانپتی ہوئی نظروں سے ان کے چہروں پر نظر اور پریشانی کے آثار نمودار ہوتے دیکھے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ جانے ایسی کیا بات اچانک رونما ہو گئی تھی جس نے پورے قافلے میں پریشانی، تشویش اور بے چینی کی لہر دوڑا دی تھی اور قافلے کو اچانک روک دیا گیا تھا۔

پر ہی ٹک کر سکتے تھے۔ اس کے بیٹے شہ زور کو ہلاک کرنے کے بعد وزیر خان وغیرہ کو بھی میں نے ہی قتل کیا ہو گا۔ اب تو سنسکا ہی ایسا شخص تھا جو میری بے گناہی کو ثابت کر سکتا تھا۔ وہ نہ بھی کرتا تو کم از کم میرے لئے یہ ضروری تھا کہ میں اس خبیث کو زندہ گرفت میں لے کر کش پور کے سردار زور اور خان کے سامنے پیش کر دوں تاکہ اس کی بیٹی اپنے جوان بھائی شہ زور کے قاتل کی حیثیت سے سنسکا کو پہچان سکے۔ گویا مجھے ابھی یہاں مزید پرخطر مہمات سر کرنا تھیں۔ لیکن یہ معاملات تو بعد کی بات تھے۔ اس وقت میں خود دہرے تہرے حالات کا شکار ہو چکا تھا۔

سردار رامس کی قید میں آنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ وہ خبیث مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ تہ خانے کے سین زوہ اور محفل آمیز ماحول اور خندوش حالات کی سنگینیوں میں میرے دل و دماغ کو ایک پل کے لئے بھی سکون نہیں مل رہا تھا۔ یہاں گھپ تاریکیوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ میرے اندر دوسوسوں اور اندیشوں کے سانپ کھلبلاتے رہے۔

پھر اسی طرح کئی گھنٹے بیت گئے۔ نہ دن کا پتہ معلوم ہو رہا تھا نہ رات کا۔ کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا سوائے کالی گھپ تاریکی کے۔

میں ایک جگہ دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھا رہا۔ گھنٹوں پر گھنٹے گزرنے لگے۔ میں کبھی اٹھ کر تاریکی میں بے چینی سے ٹپٹپٹ لگتا تو کبھی بیٹھ جاتا۔ میرا سکون غارت ہو چکا تھا۔ مجھے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔ چشم تصور میں بار بار گنیز کا ستم رسیدہ چہرہ گردش کرنے لگتا تھا۔

جب حد سے زیادہ میرے اعصاب کشیدہ ہونے لگے تو میں نے پاگلوں کی طرح زور زور سے جھلانا شروع کر دیا۔ مگر لگتا تھا شاید میری چیخیں، میری آوازیں اس منحوس تہ خانے کی پُر ہول فضا میں ہی آجی چکاڑوں کی طرح گردش کر کے رہ گئی ہوں۔ باہر سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ قید تہائی تھی جو مجھے کانٹے لگی تھی۔ بالآخر چیختے چیختے میرا گلاؤں کھٹنے لگا اور میں نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ میں بری طرح ہاپٹے لگا۔ پھر مجھے نہ جانے کب نیند نے آیا۔

نہ جانے کتنی دیر میں پڑا سوا رہا۔ بیدار ہوا تو میں نے روشنی دیکھی۔ وہ تہ خانے کا دروازہ تھا۔ چار افراد کے ہیولے نظر آئے۔ ان میں سے تین مسلح نظر آ رہے تھے۔ جبکہ چوتھے کے ہاتھ میں کوئی ٹرے نما شے تھی۔ صرف وہی آگے بڑھا تھا۔ باقی تینوں گھنٹے تانے چوکس انداز میں وہیں کھڑے رہے تھے۔ اندر داخل ہونے والے نے ٹرے زمین پر رکھی اور پھر یہ سب واپس لوٹ گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

ایک بار پھر وہی کالی تاریکی چھا گئی۔ میں اندھیرے میں ٹٹول کر ٹرے میں جو کچھ بھی رکھا تھا، جلدی جلدی اپنے بھوک سے اٹھتے ہوئے معدے میں منتقل کرنے لگا۔ پانی کی آدھ بھری چھاگل بھی تھی۔

بھوک پیاس کا کچھ تذکرہ ہوا تو ذہن بھی ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا۔ خوراک اگر چہ ناکافی تھی مگر بہر حال تن مردہ میں کچھ تو جان پڑی تھی۔ سردست مجھے فرار کی ساری راہیں مسدود ہی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کروں؟ حالات تھے کہ اوپر تلے پلٹا کھارہے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ میں چوتھی حالات زدگی کا شکار تھا۔ کبھی فتح میرے نصیب میں آ رہی تھی اور کبھی دشمنوں کا مقدر بنتی۔

سوچ سوچ کر مجھے احساس ہونے لگا کہ مجھ سے کہیں فاش غلطی سرزد ہوئی تھی۔ مجھے عامل عاروب کا قضیہ نمٹانے کی مہم موخر کر دینی چاہئے تھی۔ یہ کام بعد میں بھی انجام دیا جاسکتا تھا۔ مجھے گنیز اور انکل اعظم کے ساتھ اس وادی سے فی الفور نکل جانا چاہئے تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اب تو میرا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ بات جاننے کی بے چینی لاحق تھی کہ خدا خواستہ گنیز اور انکل اعظم بھی دشمنوں کے ہتھے نہ چڑھ

مجھے دو بار خوراک وغیرہ پہنچائی جاتی تھی۔ جبکہ آج کے روز تیسری بار دروازہ کھلا تھا جو ظاہر ہے خلاف معمول ہی تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ میری مضطرب نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا، دو کیم خیم افراد اندر داخل ہوئے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں حیران پریشان مگر خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ان کے آگے آگے چل پڑا۔

میرے اندر زبردست الجھل مچی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ اچانک کس نوعیت کی پراسرار کیا کلب ہو گئی تھی؟..... اور اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

بہر طور سرد دست تو میں ان دونوں مسلح افراد کے آگے آگے گن پوائنٹ پر چلتا رہا۔ یہ لوگ مجھے ایک چکر دار زینے سے اوپر ایک راہداری میں لے آئے۔ میرا اندازہ درست تھا کہ یہ رات کا ہی کوئی درمیانی پہر تھا۔ نہ جانے یہ پراسرار حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔ حالات کی عجیب طرہ کاری جاری تھی۔ مجھے ایک شبانہ طرز کے وسیع و عریض کمرے میں لایا گیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جبکہ وسط میں خوب صورت اور نقشین نشست گاہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ مجھے ایک نشست پر بیٹھنے کا حکم ملا۔ اس کے بعد ان دونوں مسلح افراد نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

اب ہم تینوں کے علاوہ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ میرے لئے یہ دونوں مسلح افراد اجنبی ہی تھے۔ مراد یہ کہ اس سے پہلے تہہ خانے میں خوراک لانے والے کے ساتھ جو تین مسلح پہرے دار آتے تھے، ان میں سے بھر حال یہ دونوں نہیں تھے۔

بہر طور میں حکم کے مطابق ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ چکا تھا۔ اور وہ دونوں کیم خیم مسلح کار نہایت مستعدی سے میرے عقب میں خاموش کھڑے ہو گئے تھے۔

کمرے میں روشنی تھی۔ اس کے باوجود کمرے کے محدود ماحول میں عجیب سا اسرار بھرا سکوت طاری تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی اہم شخصیت ذرا ہی دیر بعد اندر داخل ہونے والی تھی اور پھر چند ثانیوں بعد جو توقع ”اہم شخصیت“ زرق برق لباس میں اندر داخل ہوئی، میں اسے دیکھ کر بری طرح ٹھٹھا تھا۔ وہ ناگاسی تھی..... سردار راس کی بیوی اور آنجنابی سردار آگرموشی کی بیوہ، ناگاسی۔ میں اسے دیکھ کر اڑا کھڑا ہو گیا۔

وہ بہت باوقار انداز میں چلتی ہوئی ایک دوسرے اندرونی دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی اور میرے جاننے والی نشست پر براجمان ہو گئی۔ ساتھ ہی مجھے بھی اس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میری دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ انداز و اطوار سے تمکنت ظاہر ہوتی تھی۔ چہرہ بھی شاداب اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

میں سردار راس کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔ لیکن اس کی بیوی ناگاسی سے باقاعدہ آج یوں ”ون نو دن“ ماننا ہو رہا تھا۔

میری حیرت بھری آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مگر اب میں حیرت کا سبب ڈھونڈنے کی بجائے اپنے ذہن کو تیزی سے کام میں لا رہا تھا۔

آنجنابی سردار آگرموشی، غاصب سردار راس، بوڑھا وید، سردار راس کا سالار، عامل عاروب اور رشتی گال کے علاوہ ناگاسی کا بھی ان افراد میں شمار ہوتا تھا جنہیں میری زبان آتی تھی۔ مگر صاف اور رواں زبانان صرف دو افراد کو ہی بولتے تھا تھا یہاں میں نے۔ ایک بوڑھے وید کو، دوسرے عامل عاروب کو۔ باقی سب ”کام چلاؤ“ بولی بول لیتے تھے۔

میں نے بھی گردن موڑ کر جیب کی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے وہاں سوائے انفرادی کے کچھ نظر نہ آیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد قافلے کو واپسی کا حکم ملا۔ مجھے مسرت آمیز حیرت نے گھیر رکھا تھا کہ نہ جانے کاتب تقدیر نے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا جو ظہور پذیر ہونے والا تھا؟

چونکہ ہم سردار راس کی رہائش گاہ کے قریب ہی تھے، اس لئے فوراً ہی ہم وہاں پہنچ کر رہے۔ پھر مجھے جیب سے نیچے اتارا گیا تھا۔ میری سب سے پہلے نگاہ سردار راس کی گاڑی پر پڑی تھی اور یہ دیکھ کر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا کہ جیب سے سردار راس کے بے سدھ وجود کو چار افراد اٹھائے تیزی کے ساتھ رہائش گاہ کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ مجھے بھی اندر لایا گیا تھا۔ رہائش گاہ میں کہرام مچ گیا تھا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ سردار راس کی اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی۔

پھر میں نے سردار آگرموشی کی بیوہ اور راس کی بیوی ناگاسی کو روتے پینیتے دیکھا۔ البتہ مجھے دوبارہ اسی منہوس تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا تھا اور میرے دونوں ہاتھوں کی رسیاں بھی نہیں کھولی گئی تھیں۔

نہ جانے یہ کیا معاملہ تھا۔ سردار راس کی اچانک طبیعت کیوں بگڑ گئی تھی؟..... مجھے مجھے نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ میں بہر حال اس انہوی پر اللہ کا شکر ہی ادا کر سکتا تھا کہ جس نے میری آئی ٹال دی تھی۔

نہ جانے مجھے اب اور مزید کب تک یہاں مقید رہنا پڑتا۔ اس طرح عجیب و غریب خیالات اور حالات میں کئی گھنٹے بیت گئے۔ مجھے ایک بار پھر بھوک پیاس ستانے لگی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رشتی گال اور اس کے بانی ساچی میری رہائی کے سلسلے میں کیا منصوبہ بندی کر رہے تھے؟ مگر مجھے زیادہ بے چینی اس بات کی ستا رہی تھی کہ آخر سردار راس کے ساتھ یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر ہوا کیا تھا؟ اور آیا وہ زندہ بھی تھا یا نہیں؟

انہی پُر سوچ خیالات میں چند گھنٹے اور بیت گئے۔ میری الجھن آمیز پریشانی فزوں تر ہونے لگی اور مجھے بھوک سے زیادہ پیاس ستانے لگی تھی۔

میرے مختار اندازے کے حساب سے مجھے ایک دن گزر چکا تھا۔ پھر دوسرے دن بھی مزید کئی گھنٹے بیت گئے تو مجھے خوراک اور پانی نصیب ہوا۔ تین مسلح افراد کے ساتھ وہ چوتھا شخص بڑے لے کر اندر داخل ہوا تھا، میں نے باہر سے آنے والی مدہم روشنی میں ان چاروں کے چہروں کو بغور دیکھا تھا۔ مجھے وہ مغموم سے نظر آئے تھے مگر چونکہ وہ میری زبان نہیں سمجھ سکتے تھے اس لئے ان سے کچھ پوچھنا بے کار ہی تھا۔

اگلے روز پھر مجھے اسی طرح خوراک فراہم کی گئی۔ اس دوران میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ پہلے مجھے صرف دن میں ایک بار خوراک دی جاتی تھی اور وہ بھی ناکافی ہوتی۔ باقی سارا دن میں بھوک پیاسا ہی رہتا تھا۔ مگر اب جب سے دوبارہ مجھے داخل زندان کیا گیا تھا تو مجھے نہ صرف دن میں دو بار خوراک دی جا رہی تھی بلکہ خوراک کی مقدار میں بھی کچھ اضافہ ہو رہا تھا۔ اس میں بیھڑ کے گوشت کے پھنے ہوئے پارچے اور توری روٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ دودھ کا گلاس، پانی کی پوری بھری ہوئی چھاگل بھی ہوتی تھی، ابلے ہوئے چاول بھی ہوتے تھے۔

میں اس خوشگوار تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ بلکہ اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی تھی کہ جب مستقل طور پر میری پشت پر بندھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی رسیاں بھی کھول دی گئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ پر اچانک یہ کس نوعیت کی مہربانیاں ہونے لگی تھیں۔

نہ جانے وہ کون سا پہر تھا کہ ایک روز تہہ خانے کا دروازہ کھلا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ رات کا کوئی درمیانی پہر تھا۔ پورے دن میں میرے تہہ خانے کا دروازہ صرف دو مرتبہ کھولا جاتا تھا اور اس دوران

”اگر یہ بات ہے تو ظاہر ہے کہ میں اپنے پاؤں پر خود کھلاڑی نہیں مار سکتا۔ دوسرے یہ کہ میں آپ کا شہر گزار ہوں، آپ نے ایک انجینی کی جان بچانے کے لئے ایسا کیا۔ لیکن کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس راز میں آپ عامل عاروب کو شامل نہ کرتیں۔ کیونکہ وہ بہر حال ایک دھوکے باز اور فریبی انسان ہے۔ آپ کو اس پر ہر وہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

عامل عاروب کے سلسلے میں یہ آخری بات میں نے قدرے ڈرتے ڈرتے کہی تھی۔ کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ ان دونوں میں درونِ خانہ نہ جانے کس قسم کے ”روابط“ استوار ہو چکے تھے۔ اور میرا عامل عاروب کے لئے اس قسم کا منفی تبصرہ کہیں ناگاسی کو ناگوار نہ مگرزے۔ لیکن چونکہ ناگاسی نے مجھے دو ٹوک گفتگو کرنے کا کہا تھا اس لئے میں نے کچھ ایسے انداز میں یہ بات کہہ دی تھی تاکہ ناگاسی بھی مجھے اپنا خیر خواہ سمجھے۔ میں نے دیکھا، میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکی اسرار بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں دور کہیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے سر کو ہولے سے تھمبی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا۔“

اسے اپنی بات کی تائید کرتے دیکھ کر بے اختیار میں نے اطمینان کی سانس لی تھی اور مجھے مزید کچھ کہنے اور پوچھنے کا حوصلہ بھی ہوا تھا۔ تاہم مجھے گہری اور پراسرار سازش کی بوسموس ہو رہی تھی۔ ایسی سازش جو بڑی کامیابی کے ساتھ انجام پزیر بھی ہو چکی تھی۔

”اے ہمراز بنانا میری مجبوری تھی..... درحقیقت جو میں چاہتی تھی، وہ بھی وہی چاہتا تھا۔“

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بہت مختصر اور چھوٹے چھوٹے جملے کہنے کی عادی تھی۔

”یعنی..... سردار راس کی موت.....؟“ میں نے بھی لقمہ دیا۔

”ہاں.....“

”کیا پوچھ سکتا ہوں کہ عامل عاروب کو سردار راس سے کیا دشمنی تھی؟ کیونکہ وہ دونوں تو ایک دوسرے کے زبردست حلیف تھے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں..... یہ بات درست ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ لیکن یہ دوستی صرف غادات کی حد تک تھی۔ سردار راس کو تم سے خاص قسم کی پر خاش ہو چکی تھی۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر بھاسی بڑھا دینا چاہتا تھا لیکن جب عامل عاروب کو اس بات کا علم ہوا کہ اس کا شکار یعنی تم سردار راس کی قید میں ہو تو اس نے سردار راس سے دوستانہ درخواست کی کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔ کیونکہ تم درحقیقت عامل عاروب کے ہی شکار تھے بلکہ تمہیں سردار راس سے حاصل کرنے کا اہم ترین مقصد عامل عاروب کا یہ تھا کہ وہ تمہیں برغمال بنائے رکھتے ہوئے تمہاری ساتھی نگینہ کو قابو میں کرنا چاہتا تھا۔ ناگاسی نے تھوڑے وقت کے بعد ایک گہری سانس لے کر گویا بات سینے کی غرض سے کہا۔

”سردار راس نے عامل عاروب کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کا اس سلسلے میں کہنا تھا کہ تم ایک خطرناک انسان ہو اور عامل عاروب کی قید سے کسی وقت بھی دوبارہ نکل بھاگ سکتے ہو۔ لہذا اب تمہیں ہلکی دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔ یہ بات عامل عاروب کو بری لگی اور یوں دونوں دوستوں کے ایمان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ مجھے ان ساری باتوں کا علم تھا۔ میں نے ایک روز عامل عاروب سے خفیہ افواہات کی اور میں تمہیں چھانی سے بچانا اور سردار راس کو ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ مگر تمہیں بچانے والی بات عامل عاروب سے میں نے چھپا رکھی ہے۔ تاہم میں نے عامل عاروب سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ کسی طرح

میری نظریں چند ثانیے ناگاسی کے چہرے پر جمی رہیں، پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنی نظریں جھکا دیں۔ تب پھر ناگاسی نے کچھ کہا تھا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ بولا تھا۔ میں سمجھا مخاطب میں ہی تھا اس لئے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے عقب میں کھڑے دو مسلح افراد پر جمی ہوئی تھیں۔ میں سمجھ گیا۔ ناگاسی نے انہی سے کچھ کہا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ اب کمرے میں صرف میں اور ناگاسی تھے۔

مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کے دورے پڑنے لگے۔ نہ جانے یہ کیسا اور کیا اسرار تھا؟..... ایک سردار کی بیوی کا یوں نصف رات کے پہرے میں میرے ساتھ یہاں تنہا بیٹھنا۔ غرضیکہ میں بری طرح اُبھن کا شکار ہو گیا تھا اور بار بار میرے دل و دماغ میں یہی سوال اُبھر رہا تھا کہ آخر سردار راس کہاں گیا؟ اور اس کی پری جمال بیوی.....؟ میں اُگے کچھ نہ سوچ پایا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے ناگاسی نے ہولے سے میرا نام پکارتے ہوئے گویا مجھے مخاطب کر کے کہا۔

”نادر! سردار راس مر چکا ہے۔“

اس نے فقط اتنا ہی کہا اور میرا دماغ ٹھک سے اڑ گیا۔ میں غیر یقینی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ”قبیلے کے قانون کی رو سے اب میں ہی سردار ہوں۔“ وہ دوبارہ ہموار لہجے میں بولی تو میں نے اخلافاً اظہارِ افسوس کے طور پر کہا۔

”مجھے بہت دکھ ہوا..... معزز سردار کو آخر اچانک کیا ہو گیا تھا؟“

میری بات پر اس کے عتابی اور گداز ہونٹوں پر رخ سی مسکراہٹ اُبھری اور وہ بدستور اپنی سرنگیں لگائیں میرے چہرے پر جمائے بولی۔

”نہیں..... افسوس کرنے اور یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ سردار راس کی اچانک موت کیسے واقع ہو گئی؟ کیونکہ مجھے بھی اس کا کوئی دکھ نہیں ہے۔“

مجھے اس کا لہجہ عجیب پر اسرار لگا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا منتظر تھا۔

”میں تم سے دو ٹوک گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ اور اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔“

”جی مادام!..... میں سن رہا ہوں۔“ میں نے بھی مختصراً کہا۔ البتہ میرے اندر بری طرح الجھل جلی ہوئی تھی۔

”سردار راس نے تمہیں چھانی پر چڑھانے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ لیکن یہ میں نہیں چاہتی تھی۔“ اس بار میں اس کی بات پر چونکا تھا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”میں اس کرم نوازی کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

”میں نے ہی اسے زہر دے کر ہلاک کیا تھا..... اور اس سلسلے میں عامل عاروب نے میری خفیہ طور پر مدد بھی کی تھی۔“

مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر ناگاسی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

”مجھے یقین ہے کہ تم اس راز کو افشاء کرنے کی کوشش میں خود کو ہلاکت میں نہیں ڈالو گے اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تم اس فائدے سے محروم ہو جاؤ گے جو میری وجہ سے تمہیں پہنچنے والا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رُکی۔ گویا مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا گیا ہو۔

مجھے اب کیا کرنا تھا اور کیا کہنا تھا؟..... میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے ہوئے مختلط لہجے میں سوال کیا۔

کر دینا چاہتا ہوں۔“ میں نے ذرا توقف کیا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آخر آپ کو اپنے دوسرے شوہر سردار راس کو قتل کرنے کی ایسی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ حالانکہ معافی چاہتا ہوں، آپ نے اس کے ساتھ مل کر ہی اپنے پہلے شوہر سردار آگر موشی.....“

”جی ہاں۔“ اس نے اچانک میری بات کاٹ کر سپاٹ لےجے میں کہا اور میں اس کا چہرہ نکتے لگا۔ ”درحقیقت میں دونوں بھائیوں کو دل ہی دل میں سخت ناپسند کرتی تھی۔ اس کی بڑی ٹھوس اور اہم وجہ ہے۔“ اس نے ذرا رک کر ایک گہری ہنسی بولی، پھر بولی۔

”میں ایک دوسرے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہت چھوٹا اور امن پسند قبیلہ تھا۔ میں وہاں کے سردار کی بیٹی تھی۔ جبکہ سردار آگر موشی کا قبیلہ ایک جارح اور سرکش قبیلہ تھا۔ میرے باپ کی ذرا سی غلطی پر سردار آگر موشی کے قبیلے نے اس پر چڑھائی کر دی۔ میرا باپ قتل کر دیا گیا اور ہمارے چھوٹے سے قبیلے کا شیرازہ بکھیر دیا گیا۔ مجھے بھی قیدی بنایا گیا۔ مگر بعد میں میرے حسن سے دونوں بھائی یعنی آگر موشی اور راس متاثر ہو گئے تھے۔ میں نے بھی اپنے قبیلے کا انتقام لینے کی خاطر ان دونوں بھائیوں سے خاموش انتقام لینے کی ٹھان رکھی تھی اور چونکہ اس وقت سردار آگر موشی ہی قبیلے کا سردار تھا اس لئے میں نے یہ چالاکی کی کہ اس کی بیوی بن گئی اور بعد میں خفیہ طور پر اس کے بھائی راس کے ساتھ گھڑ جوڑ کرنے لگی۔ اس کا بھی میری وجہ سے اپنے بڑے بھائی سردار آگر موشی کی طرف سے دل خراب ہو چکا تھا۔ یوں وہ بغاوت پر اتر آیا اور یوں میں نے بعد میں ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ کر ڈالا۔ تم اور تمہارے ساتھی رشی گال نامی جس باغی کی پناہ میں تھے، وہ درحقیقت میرے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور میرا منگیترا بھی تھا۔ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر پھر حالات نے پلٹا دکھایا اور سب کچھ تباہ و برباد ہوتا چلا گیا۔ مگر اب میری منزل قریب آچکی ہے۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو میں اس کے ان انکشافات پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اب ساری بات واضح ہو چکی تھی۔ میں ناگاسی کے استقلال، ذہانت اور طویل منصوبہ بندی اور پھر اس کی کامیابی پر عرشِ عش کر اٹھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ تنہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے عبرت سوز ماضی کے متعلق ذکر کرتے ہوئے اس کے سینے میں چھپی آتش انتقام، جھٹمٹائی آنکھوں اور چہرے پر غیظ کی سرخی کی مانند مترشح ہونے لگی تھی۔ وہ اس وقت مجھے کسی منتقم ناگن کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ بہر طور یہ اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اور وہ خاصی حد تک اس میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے قبیلے کو در بدر کرنے اور اپنے باپ کے قتل کا دونوں بھائیوں (آگر موشی اور راس) سے خاطر خواہ انتقام لے لیا تھا۔ کسی نے جی بچ ہی کہا ہے، عورت انتقام پر اتر آئے تو ناگن سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے اور اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔ تاہم میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا اور میں نے پوچھا۔

”کیا آگر موشی کے قبیلے نے آپ کو دل سے اپنا سردار تسلیم کر لیا ہے؟“

میرے استفسار پر اس کے عتابی ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ ”ہاں..... اس لئے کہ جن امراء کے انتخاب کے سلسلے میں، میں نے سردار آگر موشی کا ساتھ دیا تھا، ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر تقریباً سب ہی قبیلے کے لوگ تھے۔ اب اگر عامل عاروب کا خاتمہ ہو جائے اور میں رشی گال سے شادی کر لوں تو قبیلے کے قانون کی رو سے شادی کے بعد رشی گال کو قبیلے کی سرداری از خود منتقل ہو جائے گی اور یوں میرا برسوں کا خواب پورا ہو جائے گا۔“

”عامل عاروب کے سلسلے میں جس وقت چاہیں مجھے آپ ہم پر روانہ کر سکتی ہیں۔“ بالآخر میں نے گفتگو

سردار راس کو ہلاک کرنے میں میری مدد کرے تو میں تمہیں اس کے حوالے کر دوں گی۔ اور یوں عامل عاروب نے ہی مجھے ایک ایسا خطرناک زہر فراہم کیا جس کے اثرات زہر خورانی نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت ہی میں اکبھرتے تھے۔“

ناگاسی نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ میری حالت دگرگوں ہونے لگی۔ میں ایک بار پھر سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ناگاسی نے میری خاطر یہ سب کچھ کیوں کیا؟ سب سے پہلے سردار راس سے خفیہ گھڑ جوڑ کر کے اپنے پہلے عمر رسیدہ شوہر آگر موشی کے لئے ہلاکت کا سامان پیدا کیا اور پھر سازش کا میاب ہوتے ہی ناگاسی نے عامل عاروب سے خفیہ گھڑ جوڑ کر کے اپنے دوسرے اور نہایت جوان شوہر راس کو بھی ہلاک کر ڈالا اور اب..... یہ مجھ سے کیا چاہتی تھی؟ چاہئے تو اسے یہ تھا کہ عامل عاروب سے کئے گئے خفیہ معاہدے کی رو سے مجھے اس کے حوالے کر ڈالتی۔ لیکن اس نے ایسا کرنے کے بجائے مجھے یہاں بلالیا اور میں سمجھ رہا تھا کہ اس خفیہ اور انتہائی رازدارانہ نشست سے صرف چند وہی افراد آگاہ ہو سکتے تھے جو ناگاسی کے قریبی وفادار تھے۔ یہ محلاتی سازشیں تھیں۔ تاریخ ایسے عبرت ناک واقعات سے بھری پڑی تھی۔ کبھی اقتدار کی ہوس تھی تو کبھی حسین عورت کے حصول کی۔ کبھی غلام آقا بن جاتا تو کبھی آقا غلام۔ حتیٰ کہ بادشاہوں تک کو گدائے دیکھا۔

مجھے ان معاملات سے کوئی غرض نہ تھی۔ لیکن ناگاسی کی جانب سے ابھی تک میں ایک پر اسرار الجھن کا شکار تھا کہ آخر اس نے یہ سب کیوں کیا؟..... میری خاطر بھی کیوں؟..... میرے دل میں آتی تو سہی کہ میں اس سے اپنے حوالے سے بھی دریافت کروں کہ آخر یہ عامل عاروب سے حسب فضاء اپنا کام کرانے کے باوجود اس کے خلاف دھوکا یا وعدہ خلائی کیوں کر رہی تھی؟ چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے زبان کھولی۔

”سب سے پہلے تو میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ سب میری خاطر کیا۔ لیکن اب جبکہ آپ مجھے عامل عاروب کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتیں تو میں اس کے لئے بھی آپ کا احسان مند رہوں گا۔ مگر اس طرح عامل عاروب آپ کا بھی دشمن بن سکتا تھا۔ مانا کہ وہ سردار راس کو زہر دینے والا راز بھی نہیں اگل سکتا کیونکہ اس سازش میں وہ خود بھی شریک رہا ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کو اس سے خطرہ تو ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟“

میری بات پر ناگاسی اپنی جگہ سے اٹھی۔ میں نے بھی دانستہ ازراہ احترام کھڑے ہونا چاہا مگر اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ چند ثانیے دبیز قالین پر پرسوج انداز میں ٹپٹپٹی رہی اس کے بعد دوبارہ اپنی نشست پر براجمان ہو کر میری طرف بہ غور تکتے ہوئے بولی۔

”تم ایک بہادر اور جری انسان ہو۔ میں جانتی ہوں کہ عامل عاروب کو صرف تم ہی موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی تم اسے کئی بار نقصان پہنچا چکے ہو۔ وہ تمہاری طرف سے بری طرزِ خائف رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کا تقصیر ہمیشہ کے لئے اب نمٹایا جائے۔ عامل عاروب کی موت تمہاری بھی سب سے بڑی خواہش ہوگی۔“

میں اب اس کی آغاز سے آخر تک ساری گفتگو کا مقصد سمجھ چکا تھا..... تاہم پھر بھی سردار راس ایک سازش کے تحت قتل کے حوالے سے ابہام کا شکار تھا اس لئے ذرا محتاط انداز اختیار کرتے ہوئے اسے کہا۔

”اب جبکہ ہمارے درمیان رازدارانہ دوستی کا رشتہ استوار ہو ہی چکا ہے تو میں اپنی آخری الجھن بھی“

لگانا تھا۔ لیکن درپردہ ناگاسی اور متوقع سردار رشی گال میری سپورٹ کرتے رہے۔ تاہم رشی گال نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ لوگ بعد میں میری موت کا یا جان سے مار دینے کا اعلان کر کے میرے قصبے نے بھی جان چھڑا سکتے تھے۔

منصوبے کے تحت سب سے پہلے نگینہ اور انکل اعظم خان کوئی الغور یہاں سے روانہ کر دیا جاتا۔ انکل اعظم خان تو خاموش رہے۔ لیکن ظاہر ہے نگینہ کو یہ کب گوارا تھا۔

انکل اعظم خان نے البتہ ایک گھبرائیل کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔ ”نادر بیٹے! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ لیکن شش پور کے سردار زور آور والا مسئلہ مزید گھبر اور ٹوٹیش ناک ہو چکا ہے۔ اس کے بھائی وزیر خان کی لاش سمیت اگر ہمارے ہتھے سنکھال چڑھ جاتا تو میں بھٹا ہوں تمہارے لئے اچھا ہوتا۔ ورنہ وہ لوگ وزیر خان کا قتل بھی شہ زور کے قتل کی طرح تمہارے کھاتے میں ڈال دیں گے۔“

اس کی بات قابل غور تھی۔ مگر سنکھال کا زندہ حصول اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔ پھر حالات بھی ایسے نہ تھے کہ اب تک انکل اعظم خان اور نگینہ کو یہاں روکا جاتا۔ ہم بہر حال دونوں طرف سے مفرد قیدی ہی تھے۔ ناگاسی سے معاملت کے باعث اب بظاہر ہمارا گھبراہٹیں ٹھکانہ نہ تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر میں بے پناہان ہو چکا تھا اور رشی گال اور اس کے باقی ٹولے کی جیسے لائری کھل گئی تھی۔ وہ عنقریب سرداری ٹولے میں شامل ہونے والے تھے۔ اس لئے اس موقع سے جس قدر اور جلد فائدہ اٹھانا تھا، اٹھالینا چاہئے تھا۔ انکل اعظم خان کو اسی تناظر میں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چپ ہو رہے۔ بالآخر یہی طے پایا۔

نگینہ کی اس وقت بڑی غیر حالت تھی جب اسے انکل اعظم خان سمیت میں خود سے رخصت کر رہا تھا۔ مگر میرے اور انکل اعظم خان سمیت رشی گال نے بھی اسے سمجھایا تو اس کی کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ رشی گال نے یہ وعدہ بھی ہم سے کیا تھا کہ وہ میرا بھرپور ساتھ دے گا بلکہ عاروب کو ختم کرنا تو اب ہمارا مشترکہ غلام بن چکا تھا۔

بالآخر ان کڑے حالات سے گزرتے ہوئے نگینہ اور انکل اعظم خان کو رشی گال کے ایک مسلح دستے کی حفاظت میں وادی سے رخصت کر دیا گیا۔ وزیر خان کی لاش بھی ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔ رشی گال اس سے اگلے روز ناگاسی سے جا ملا۔ البتہ اس کے بیس بچپس کے قریب مسلح ساتھی جواب ”باغی“ نہ رہے تھے بوسے ساتھ اس خفیہ ٹھکانے پر موجود رہے۔

حالات کی کایا پلٹ میرے حق میں بدل گئی تھی اور اب مجھے عامل عاروب کی بخ کنی کے ساتھ ساتھ ٹھکانے کو زندہ گرفت میں لینا تھا۔

ادھر اب رشی گال ناگاسی سے شادی اور اس کے بعد دستار حاصل کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھا اور میں رشی گال کے ساتھیوں کے ساتھ اس برف زار ویرانے میں عامل عاروب کے خلاف فیصلہ کن حرب و حرب کی منصوبہ بندی جوڑنے میں مصروف تھا۔

\*\*\*

عامل عاروب کے سلسلے میں ناگاسی نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ممکن ہے میرے فرار کے ڈرامے کو وہ جھوٹ سمجھے اور یہ ممکن بھی تھا تو یہ عامل عاروب سے جنگ کرنے کا جواز بھی بن سکتا تھا۔

مگر میں جانتا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ عامل عاروب ایک شاطر اور مکار انسان تھا۔ وہ ذہنی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھ جاتا اور ڈسنے کے موقع کی تلاش میں رہتا۔

سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

”ہاں.....“ وہ بولی۔ ”لیکن تمہاری یہ ہم جوئی مجھے خفیہ رکھنا پڑے گی۔ تمہیں قید میں رکھتے ہوئے خفیہ طور پر فرار کروانا ہوگا۔ میں نے ایک تفصیلی خفیہ پیغام رشی گال کو پہنچا دیا ہے اور تمہارے لئے یہ خوش خبری بھی ہے کہ تمہارے دونوں ساتھی نگینہ اور اعظم خان اس کی پناہ میں ہیں اور میں رشی گال کی مکمل مدد کر رہی ہوں۔“

نگینہ اور انکل اعظم خان کی خیریت معلوم ہوتے ہی میں نے ایک گونہ طمانیت بھری سانس لی تھی۔ ”میرا خیال ہے اب تم نے ساری باتیں سمجھ لی ہوں گی۔“

”جی.....“ میں نے ہولے سے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ ”میں تیار ہوں.....“ اور عامل عاروب کی سرکوبی کے لئے جس قدر ممکن ہو سکے ہمیں جلد سے جلد اقدام اٹھانا چاہئے۔“ یہ کہہ کر میں نے کسی خیال کے تحت آخر میں کہا۔ ”مگر میں سب سے پہلے اپنے دونوں ساتھیوں یعنی نگینہ اور اعظم خان کو بے حفاظت واپس یہاں سے لوٹانے کا بندوبست کرنا چاہوں گا۔ کیونکہ وہ دونوں کسی وقت بھی میرے پاؤں کی زنجیر بن سکتے ہیں۔“

”یہ کام میں اپنے آدمی کے سپرد کرتی ہوں۔“ اس نے بلا تامل جواب دیا۔ ”میں ابھی اپنے ایک جاسوس کے ذریعے یہ خفیہ پیغام رشی گال تک پہنچاتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے تمہیں یہاں سے فرار ہونا پڑے گا اور منہ اند میرے تم رشی گال سے چالو گے۔ باقی میں سنبھال لوں گی۔“ اس نے بات ختم کر دی۔

میں نے بے اختیار اس منجز پر خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے اور ناگاسی کے درمیان نصف رات کی یہ ”ون ٹون“ ملاقات کافی حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔ اندرونی محلاتی سازشوں نے کم از کم میرا کام ”آسان“ بنا دیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میری جان بغیر کسی خون خرابے کے بچ گئی تھی بلکہ آئندہ کے لئے بھی راہیں ہموار نظر آنے لگی تھیں۔

ناگاسی نے اپنے جاسوس کے ہمراہ رات کے پچھلے پہر مجھے خفیہ طور پر ایک تیز رفتار جیب میں سوار کر کے روانہ کر دیا۔

رشی گال کا نیا ٹھکانا زیادہ دور نہ تھا۔ اسے اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے رشی گال کو غیر معمولی طور پر خوش اور ہشاش بشاش پایا۔ نگینہ اور انکل اعظم خان بھی مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے۔

میں نے رشی گال کو اس کی سابقہ منگیت ناگاسی کے ساتھ ہونے والی خفیہ نشست کے بارے میں تعینا آگاہ کر ڈالا۔ سردار رامس کی موت اور ناگاسی کے قبیلے میں سرداری سنبھالنے پر رشی گال اور اس کے ساتھیوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تاہم رشی گال نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ جلد از جلد ناگاسی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ قبیلے کے قانون کی رو سے عورت زیادہ عرصہ تک سردار نہیں رہ سکتی۔ اسے بہت جلد اپنے نئے جیون ساتھی کا انتخاب کر کے دستار سرداری اسے منتقل کرنا تھی۔ بہ صورت دیگر قبیلے کے معتبر امراء کے ہاتھ میں از خود اس کا فیصلہ چلا جاتا اور پھر وہ متفقہ طور پر قبیلے کے کسی بہادر شخص کو دستار سرداری سونپ دیتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہی معتبر امراء میں سے کوئی شخص سردار بن جاتا۔ یہ یہاں ہر قبیلے کا اپنا قانون تھا۔

چنانچہ ناگاسی بھلا یہ کیسے چاہتی کہ دستار سرداری کسی اور کو منتقل ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنے سابقہ منگیت رشی گال کا انتخاب کر لیا تھا۔

میری حیثیت بہ دستور ایک مفرد قیدی کی تھی جس کا کام صرف اور صرف عامل عاروب کو خفیہ طور پر



جیب کی ٹینگی ایندھن سے بھری ہوئی تھی۔ ایک فاضل کین تھی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق عامل عاروب کو افغانستان کے سرحدی علاقے نورستان کے اریب قریب ہونا چاہئے تھا۔ یہ قول اس کے ساتھی کہ وہ سنکھال سمیت چار ساتھیوں کے ہمراہ چھ چوروں پر فرار ہوا تھا۔ نیز اس کی منزل ”نورستان“ ہی تھی۔ وہاں عامل عاروب کے پیش روؤں کا خاصا بڑا گروہ تھا۔ نورستان درحقیقت افغانستان کا ایک صوبہ تھا۔

میں جیب کو ناہموار راستوں پر دوڑاتے ہوئے آبادی سے کوسوں دور نکل آیا تھا۔ میرے پاس تھوڑا بہت زادراہ بھی تھا۔ جیب بہت طاقت ور تھی۔ حقیقت یہ بھی سردار رشتی گال اور ناگاسی کی مہربانی تھی کہ انہوں نے جیب مجھے عنایت کی تھی۔ مگر عامل عاروب کے تعاقب کے لئے نہیں، بلکہ مجھے یہاں سے نکل جانے کی غرض سے۔ مگر میں واپسی کے سفر کی بجائے عامل عاروب اور سنکھال کے تعاقب میں روانہ ہو گیا تھا۔ جیب میں فاضل ناہمرا بھی موجود تھا۔ اپنی حفاظت کے لئے مجھے ایک طاقت ور ایم پی فائو رائٹل اور دو بھرے ہوئے فاضل کلپ بھی دیئے گئے تھے۔ نیز میری پنڈلی پر بندھی ہوئی ایک چھوٹی سی نیام میں قرولی بھی تھی۔ میں عامل عاروب کی موت بن کر اس کے تعاقب میں گامزن تھا اور شام کے آثار ہونے تک میں ایک پیالہ نمربف زار وادی میں پہنچ کرکا۔ جیب کا انجن میں نے اسٹارٹ رہنے دیا تھا۔ ورنہ اس غضب کی ٹھنڈ میں اسے سیلف اسٹارٹ کرنا ممکن نہ ہوتا اور دھکا لگانا پڑتا۔ جبکہ میں بہر حال تنہا جیب کو دھکا لگا کر اشارت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے جیب روکی تو اس کے انجن نے دھواں چھوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جیب کے ”ریڈی ایٹر“ کا پانی خشک ہو گیا تھا۔ یہاں کہیں پانی کا حصول بھی سردست ناممکنات میں نظر آ رہا تھا۔ ناچار میں نے اپنے پیئے والے پانی کی ایک ڈیڑھ بوتل ریڈی ایٹر میں انڈیل دی۔

سردی کے باعث مجھے پیاس سے زیادہ خوراک کی طلب ہو رہی تھی اور وہ میرے پاس بھنے ہوئے چنوں کی صورت میں موجود تھی۔ تاہم پانی کی ایک لیٹر کی بوتل بھی تھی۔ وادی میں شام اترتے ہی گویا رات کا گمان ہونے لگتا تھا۔ راستہ پر خطر اور دشوار تھا۔ اس لئے پہلے میں نے صبح تک سفر مؤخر کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ یہ تساہل کے زمرے میں آتا۔ عامل عاروب کے پاس خیر تھے۔ جب کے مقابلے میں اسے راستوں کی زیادہ سہولت تھی۔ جبکہ میرے لئے جیب کا راستہ دشوار اور کہیں کہیں تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ جس کے لئے مجھے ایک لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ حالانکہ میں نے سردار رشتی گال سے خصوصی طور پر یہ گزارش بھی کی تھی کہ مجھے جیب کے بجائے خچر کی سواری عنایت کر دی جاتی۔ کیونکہ مجھے آگے کا راستہ سوائے خیر سواری کے عبور کرنا ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔ جانے کیا سوچ کر سردار رشتی گال نے مجھے جیب دے دی تھی اور کہا تھا کہ ریموڈ پنچ کر میں اسے ایک ”وار“ نامی سرائے کے مالک سوریا کے حوالے کر دوں۔ پھر خود آگے چترال وغیرہ کی طرف نکل جاؤں۔ مگر چونکہ مجھے عامل عاروب کے تعاقب میں نکلنا تھا اس لئے یہاں نکل آیا تھا۔

بہر طور ذرا رک کر میں نے اندازہ لگایا کہ مفرد عامل عاروب کے تعاقب میں کہاں تک میں فاصلہ طے کر چکا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق مجھے اس کے اریب قریب ہونا چاہئے تھا۔ میں نے جیب کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور آگے بڑھ گیا۔ مگر چند کلومیٹر چلا تھا کہ راستہ مسدود ہو گیا۔ مجھے کوئی ایسا راستہ بھی نظر نہ آ رہا تھا کہ میں جیب کو دوسری سمت سے موڑ کر آگے سفر جاری رکھتا۔ بالآخر مجھے احساس ہو گیا کہ اب

تاہم مجھے یہ تفسیر ضرور جلد از جلد نمٹانے کا کہا گیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ناگاسی کی طرف سے خفیہ سی ہیکل سپورٹ حاصل ہو گئی تھی۔

میں نے پہلا حملہ عامل عاروب کے ٹھکانے پر رات کے پچھلے پہر کیا تھا اور اپنے چند ساتھیوں کی جان کا نذرانہ دے کر اسے خاصا بھاری جانی نقصان پہنچایا تھا۔ اس دوران میں نے عامل عاروب کو ٹھکانے لگانے اور سنکھال کو زندہ گرفت میں لینے کی بھی جان توڑ کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ یوں پھر ہماری عامل عاروب کے خلاف ایسی گوریلا کارروائیاں معمول کا حصہ بن گئیں۔ عامل عاروب کا جلد از جلد تفسیر نمٹانے کی خاطر رشتی گال اور ناگاسی میری مکمل طور پر مدد کر رہے تھے۔ ادھر رشتی گال اور ناگاسی کی شادی عمل میں آچکی تھی۔ بالآخر سردار رشتی گال کو منتقل ہو گئی تھی۔ ہماری بے درپے گوریلا کارروائیوں سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ عامل عاروب کے گروہ ہی ساتھی اب خوف زدہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔

عامل عاروب کا کوئی ایک قبیلہ نہ تھا۔ صرف مخصوص گروہ تھا جو کیلاش وادی کے مختلف قبیلوں کے آدمیوں کو ملے شدہ منصوبے اور پروگرام کے تحت اپنے گروہ میں شامل کر لیا کرتا تھا۔ اسی دوران ایک روز سردار رشتی گال کا اپنی ناگاسی اور رشتی گال کا مشترکہ پیغام لے کر میرے پاس پہنچا۔ یہ زبانی پیغام تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ عامل عاروب کا تفسیر جلد سے جلد نمٹایا جائے۔ کیونکہ اس نے ان کے خلاف پروپیگنڈا اور بلا اشتعال جارحیت کا الزام لگانا شروع کر دیا تھا۔ اس پیغام کے ساتھ ہی عامل عاروب پر مجھے آخری بار اور فیصلہ کن حملہ کرنے کی خاطر بھاری تعداد میں جدید ہتھیاروں سے لیس گوریلوں کی خاصی تعداد روانہ کر دی گئی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ جلد از جلد عامل عاروب کو ٹھکانے لگا دوں۔

میں جانتا تھا کہ اب عامل عاروب جیسے شاطر انسان کو اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ناگاسی نے مجھے اس کے خلاف ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے کیسی زبردست سازش تیار کی تھی۔ اس رات میں نے اپنے پورے ساتھیوں کے ساتھ عامل عاروب کے گروہ پر ہلہ بول دیا۔ بڑی زبردست مارا ماری ہوئی۔ عامل عاروب کا بچا کچھ گروہ تتر اور بری طرح انتشار کا شکار ہو گیا۔ اس حملے کے دوران مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ عامل عاروب حملے سے کئی گھنٹے پہلے ہی اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ جن میں سنکھال بھی شامل تھا، نکل بھاگا تھا۔ یہ بات ہمیں اس کے گروہ کے ایک گرفتار بیرو نے بتائی تھی اور اس نے راستہ ہمیں سمجھا دیا تھا۔ بہر حال اسے چھوڑ دیا گیا اور باقی گروہ کے آدمی قیدی بنا کر سردار رشتی گال کے حوالے کر دیئے گئے۔

لیکن اب میرے ساتھ عامل عاروب کے تعاقب میں جانے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ یہی نہیں، سردار رشتی گال اور ناگاسی کے لئے بھی یہی کافی تھا کہ عامل عاروب کو بالآخر بے خانماں بر باد کر کے وادی سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ نیز مجھے بھی یہی مشورہ دیا گیا تھا کہ اب میں بھی اپنی یہ ہم ترک کر کے وادی سے جلد از جلد نکل جاؤں۔ ورنہ ان دونوں کے لئے قبیلے میں میری وجہ سے پھوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا۔

صورت حال گھبر اور خطرناک ہو گئی تھی۔ اگر میں سردار رشتی گال اور اس کی بیوی کی بات نہ مانتا تو کچھ بعید نہ تھا کہ میں اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں ”پیارا“ کر دیا جاتا۔ بہر طور میں نے اللہ کا نام لیا اور ایک تیز رفتار جیب میں خود ہی تنہا، عامل عاروب اور سنکھال کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔



مسکراہٹ عود کر آئی۔

رہچھ اور انسان کا پرانا نکر اڑ ہے۔ وہ انسان کا دوست بننے میں بھی دیر نہیں لگا تا اور دشمن بننے میں بھی۔ عموماً انسانوں کے پڑاؤ میں اسے اپنی خوراک کی خاطر خواہ موجودگی کی توقع ہوتی ہے اور اس رہچھ نے بھی شاید اسی لئے ادھر کارخ کیا تھا۔ مگر راہ پاتے ہی اس نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ تاہم میں نے اسے جیسے ہی گویا ”پردانہ راہداری“ جاری کیا تو اپنے اصل ”ہدف“ کی طرف بڑھ گیا۔ اب مجھے صرف تماشا دیکھنا تھا۔ میں تھوڑا اور نزدیک سرک آیا۔ اسی وقت میں نے عامل عاروب اور اس کے پانچوں ساتھیوں کو بری طرح بد کہتے ہوئے دیکھا۔ رہچھ بڑے دھڑلے کے ساتھ ان کی طرف اپنے بھاری بھر کم وجود کے ساتھ دوڑا جا رہا تھا۔ انہوں نے رہچھ پر فائرنگ کر دی۔ رات کے پُر ہول ٹھہرتے سناٹے میں رہچھ کی لرزادینے والی چٹکھاڑ ابھری اور وہ مزید غضب ناک ہو کر ان پر جھپٹ پڑا۔

میں نے عامل عاروب کے دو ساتھیوں کو خونخوار گرفت کے زرخے میں پایا۔ اور پھر چشم زدن میں غضب ناک رہچھ نے اپنے تیز نوکیلے پنجوں سے ان دونوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ان کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخوں نے ماحول کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

عامل عاروب اور اس کے باقی تینوں ساتھیوں پر دہشت ناک بوکلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ یقیناً اتنے بڑے جسم اور خونخوار رہچھ کو اچانک اپنے سامنے پا کر ان کی یہی کیفیت ہونی تھی۔ اور کچھ غلط بھی نہ تھی۔ ابھی ابھی شہزادی بھی اس اچانک چوہنیشن پر بدحواس ہو جاتے تھے۔

البتہ انہوں نے رہچھ پر فائرنگ ترک نہ کی تھی۔ رہچھ کے جسم پر شاید کچھ زیادہ ہی موٹی چربی چڑھی ہوئی تھی اور یوں بھی میں جانتا تھا کہ جس ہلکی ساخت کے ہتھیاروں سے یہ لوگ اتنے بڑے درندے کو نشانہ مار رہے تھے، وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ہاں، اگر اس کی تھوٹھی پر دو چار ادھر پر تلے گولیاں داغی ہائیں تو اور بات تھی۔ مگر یہاں تو مسئلہ یہ تھا کہ بلی کی گردن میں گھٹی کون باندھے؟

میں بڑی دلچسپی کے ساتھ رہچھ اور انسانوں کی یہ جنگ دیکھ رہا تھا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا کہ رہچھ کا ”کام“ آسان کر دینا چاہئے۔

چنانچہ میں نے اپنی رائفل سیدھی کی اور سب سے پہلے عامل عاروب کے دو ساتھیوں کو نشانے پر لیا اور ہلکی دبا دیا۔ گولیوں کا برسٹ دھماکے سے بوچھاڑ کی صورت اٹھا اور میں نے دونوں کو کریہہ چہنیں مار کر لپٹے دیکھا۔ عامل عاروب اور سنکھال کے اچانک اس دوسری افتاد پر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ ادھر ادھر تلے لگے۔ پھر عامل عاروب اور سنکھال نے رہچھ کو چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی تو رہچھ ان کی طرف دوڑا۔ یہ لپک کر میں نے بھی ان کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔

ان دونوں نے جب رہچھ کو اپنے تعاقب میں آتے دیکھا تو سنکھال نے فوراً اپنی سمت بدل ڈالی۔ میں نے دوڑتے دوڑتے دیکھا کہ رہچھ اب عامل عاروب کے تعاقب میں تھا اور بہت غضب ناک ہو رہا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے عامل عاروب کا پاؤں رٹا اور وہ گر پڑا۔

رہچھ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اور خود میں بھی۔ مگر میں نے عامل عاروب کو چھوڑ کر سنکھال کا نشانہ لیا، اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر میں نے ایک گولی داغ دی۔ وہ چیخ مار کر گرا اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ادھر رہچھ کے خونی پنجوں سے بچنے کے لئے عامل عاروب اپنی کہنیوں اور پشت کے بل پیچھے پیچھے لپک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلاکتی دہشت طاری ہو گئی تھی۔ پھر اس کی مجھ پر بھی نگاہ پڑ گئی تھی۔ وہ لڑتی آواز میں مجھ سے التجا کرتے ہوئے بولا۔

پیدل سفر جاری رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے جیب سے مختصر سامان کی کٹ سنجال کر پشت پر باندھی، رائفل ہاتھ میں پکڑی اور جیب کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ایک سنگلاخ ڈرتے سے ابھر کر جب میں پیالہ نمادادی سے نکل کر ایک قدرے ڈھلان کے سرے پر نمودار ہوا تو مجھے سامنے خاصی تعداد میں روئندگی اور کچھ برف سے ڈھکے ہوئے درختوں کا مختصر سا جنگل نظر آیا۔ بغور دیکھنے پر میرا دل یکبارگی ٹھنکا۔ مجھے روشنی سی چمکتی نظر آئی۔ میں محتاط ہو کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا تو اچانک وہ روشنی ایک الاؤ میں تبدیل ہوئی دکھائی دینے لگی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

مذکورہ روشنی والی سمت پر مجھے کسی مختصر سے پڑاؤ کا گمان ہوا۔ میں سنگلاخ اور برقی چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا خود رو جھاڑیوں کے جھنڈ کے نزدیک پہنچ کر رکا اور سامنے نظریں جمادیں۔ آسمان صاف اور شفاف تھا۔ تاروں کے بھر مٹ میں کسی شہزادے کے چہرے کی طرح دکتے طباق چاند کی پراسرار روشنی میں مجھے الاؤ کے گرد بیٹھے چند افراد کے ہیولے نظر آئے اور ان کے قریب ہی اتنی ہی تعداد میں خنجر بھی کھڑے دکھائی دیئے۔

میرا دل گویا کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ نس نس میں جوش غیظ کی حرارت لاوے کی طرح کھولنے لگی۔ مجھے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ عامل عاروب اور اس کے ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں ان کے چہرے پہچاننے سے قاصر تھا۔ تصدیق ضروری تھی۔ میں برف سے ڈھکی خود رو جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ سے فائدہ اٹھاتا ہوا دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھنے لگا۔

جب میں ان کے تقریباً بیس پیچیں گز کے فاصلے پر پہنچ کر رکا تو مجھے عامل عاروب اور اس کے پانچوں ساتھیوں سمیت سنکھال بھی نظر آ گیا۔

اپنے دشمن دیرینہ کو قریب پا کر میرا دل مارے جوش غیظ کے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں ان پر شب خون مارنے کی سوچتا، اچانک مجھے اپنے عقب سے ایک سنسنائی ہوئی تیز غراہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھنک کر مڑا۔ میں سر تا پا لرز گیا۔ میں نے اپنے عقب میں صرف چند گز کے فاصلے پر کوشت کے ایک سفید تودے کو کھڑے پایا۔ یہ برفانی رہچھ تھا..... خاصا بھاری بھر کم اور جسم۔ وہ اپنے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا تھا اور کسی چھوٹے برفانی تودے کی طرح ہی دکھائی پڑتا تھا۔

مجھے رہچھ جیسے درندوں کا تجربہ تھا۔ عموماً یہ انسانوں سے کترایا ہی کرتے تھے۔ مگر بعض شرارتی اور ضدی یا بھوک کے مارے ہوئے رہچھ بسا اوقات مقابلے پر بھی اتر آتے تھے۔ مگر میں اس نازک وقت میں اس سے مقابلے کا بہر حال تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور پھر رہچھ کو مخصوص انداز میں ”شکارے“ دینے لگا۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ پڑاؤ کی جانب بیٹھے دشمنوں تک آواز نہ جائے۔ ان کی شاید ابھی تک رہچھ پر نگاہ نہیں پڑی تھی۔

تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے ابھرا۔ میں اگر عامل عاروب سمیت اس کے ساتھیوں کو رہچھ کی جانب متوجہ کر دیتا تو وہ یقیناً اس سے الجھ جاتے اور میں اپنا کام بھی با آسانی نسا سکتا تھا۔

مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی۔ رہچھ نے شاید چند گز کے فاصلے پر اپنے سامنے الاؤ کی روشنی دیکھ لی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چاروں طرف بڑھا اور ڈولت، دوڑتا پڑاؤ کی طرف لگا۔ میرے ہونٹوں پر مسیخ خنجر

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ اس کے چہرے پر خونخواری اور نفرت کی گہری پرچھائیاں ابھر آئی تھیں۔ مجھ سے بولا۔

”تم ہم سب کے لئے واقعی بہت خطرناک ثابت ہوئے ہو۔ بہت خطرناک..... لیکن اب تمہارا اہم دشمن عامل عاروب تو ختم ہو چکا۔ اب میرا کیا کرو گے؟..... مجھے جانے دو۔“

”خبردار! یہاں سے ذرا بھی ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ کوئیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے غرا کر کہا تو میں نے دیکھا ایک ایسی اس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ عود کر آئی۔ مجھے اس کجنت کی مسکراہٹ زہریلی لگی۔ وہ قامت میں مجھ سے دیتا ہوا ضرور تھا مگر جسم تو اتنا تھا۔ اندر کو دھنی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا پڑا تھا۔

”تم مجھے نہیں مار سکتے نار!..... اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں نہیں ہلاک کرنا چاہتے۔ مجھے عاروب نے بتا دیا تھا۔“

”ہاں..... تم نے بالکل درست کہا۔“ یہ کہہ کر میں دانت پیس کر اس کی جانب بڑھا اور اپنی رائفل کو ہال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر اس کی کینچی پر رسید کر ڈالا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے بے سدھ وجود کو اپنے کاندھے پر ڈال کر واپسی کے سفر پر ہولیا جدھر میری جیب کھڑی تھی۔

جیب زیادہ دور نہ تھی۔ میں رات کی تاریکی کے پچھلے پہر اس مقام تک پہنچا جدھر میری جیب کھڑی تھی۔ میں نے بے ہوش سنکھال کو جیب کے عقبی حصے میں پٹخا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط رسی کے ساتھ باندھ کر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور رائفل اپنے برابر والی سیٹ پر رکھ دی۔ پھر انیشین میں لگی ہوئی چابی کھائی۔ مگر جیب اشارت نہ ہوئی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سخت کڑکراتی سردی میں خاموش پڑے پڑے انجن واقعی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

میں نے جھل کر اسٹیرنگ پر دو ہتھ رسید کر ڈالے۔ جب پھر اچانک ایک مختصر اور نشیبی ڈھلان کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال ابھرا۔ میں جیب سے اُترا اور اپنے وجود کی ساری طاقت اپنے دونوں بازوؤں میں سمو کر جیب کو دھکا لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیب تھوڑا سر کی اور چپوئی کی رفتار سے کھسکتی رہتی ہوئی ڈھلان کے قریب جا پہنچی۔ اور جیسے ہی اس کے اگلے دونوں نائر ڈھلان سے ذرا نیچے اترے تو میں یکدم چھلانگ لگا کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور جلدی سے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ جیب ڈھلان سے نیچے کی طرف تیزی سے اترنے لگی تو میں نے فوراً سیلف لگا کر کچھ دایا اور کیئر ڈال کر کچھ پلیٹ سے پاؤں ہٹا دیا۔ جیب کو ایک دھچکا لگا اور پھر اس کا انجن یکدم غرا کر اشارت ہو گیا۔

ڈھلان سے اترنے کے بعد میں نے جیب واپسی کی طرف موڑ لی اور مناسب رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔ میری کیلاش وادی کی مہم بالا آخر کامیابی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ میں اب آگے کی سوچ رہا تھا۔ میں نے ہتھال تک اس جیب کو استعمال کرنے کا ارادہ باندھ رکھا تھا۔ سنکھال کو ان حالات میں میرا پتہ تک لے جانا مناسب نہ تھا۔ اس کے لئے مجھے بہر حال ہتھال کے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے مدد حاصل کرنا تھی اور وہیں میں نے انکل اعظم خان غیرہ سے رابطہ کر کے اپنی خیریت اور کامیابی کی اطلاع دینا تھی۔

میں دشوار گزار راستوں پر مسلسل سفر کرتا ہوا بالآخر ”ریبور“ کے راستے کیلاش وادی سے نکل آیا اور اب ہتھال کی سمت اڑا جا رہا تھا۔

سنکھال کو ہوش آ گیا تھا اور اپنے رن بستہ ہونے کے باوجود اس نے چیخا جلا تا شروع کر دیا تھا۔ مگر میں

”نن!..... نار!..... مم!..... مجھے اس درندے سے بچالو..... بچالو مجھے۔“

میں زور سے جلا کر بولا۔ ”تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے تھا۔ اب آواز دو اپنے جھوٹے دیوتا دیوتا! مینزی کو کہ جس کی بھینٹ تم ایک بے گناہ اور معصوم لڑکی کو چڑھانے والے تھے۔“

”مم!..... مجھے معاف کر دو۔ مم!..... مجھے معاف کر دو۔“ وہ معافیاں مانگنے لگا۔ مگر ریچھ اپنے پورے بھاری بھر کم پہاڑ جیسے وجود کے ساتھ اس پر جڑھ دوڑا اور پھر اپنے نوکیلے شکاری دانتوں اور تیز پنوں سے اسے نوچنے، بھنبھونے لگا۔ عامل عاروب کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اور پھر ریچھ کا سفید تھوٹھنا اور نیچے عامل عاروب کے ناپاک خون سے رنگین ہو گئے۔ ریچھ نے اسے بری طرح بھنبھونڈ ڈالا تھا۔

عامل عاروب کے جہنم واصل ہونے کا یقین کرنے کے بعد میں سنکھال کی جانب متوجہ ہوا جو میری چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہو چکا تھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چوٹ پڑا۔ وہ زمین پر لیٹے لیٹے قریب گری ہوئی اپنی رائفل اٹھانے کے لئے اس کی جانب ریٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ادھر میں نے جیسے ہی اس کی جانب قدم بڑھایا تو ریچھ ایک لرزادینے والی چٹکھاڑ کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا۔

میں یک دم اپنی جگہ پر رک گیا۔ میں نے ریچھ پر گولی چلانے کی سہ دست ”بے دوئی“ نہیں کی تھی اور اسی طرح کھڑا رہا۔ ٹھیک اسی وقت سنکھال نے یہ بے دوئی کر ڈالی کہ اس نے اپنی رائفل پر قبضہ جماتے ہی مجھ پر گولی چلا دی۔ میں اگر بروقت زمین پر نہ لیٹ جاتا تو یہ گولی میرا کام تمام کر ڈالتی۔

ریچھ غضب ناک ہو کر سنکھال کی طرف پلٹا۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ریچھ میرے آخری اہم شکار کا بھی عامل عاروب جیسا شکر کرے۔ چنانچہ ادھر جیسے ہی ریچھ نے سنکھال کی طرف دوڑ لگائی، اس نے دہشت زدہ ہو کر ریچھ پر فائرنگ کر ڈالی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ سنکھال اس کا شکار بن جائے۔ کیونکہ میں اسے زندہ اپنی گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اپنی رائفل سے ریچھ کے تھوٹھنے کا نشانہ بنانے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وجہ یہ کہ اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔

میں نے جلا کر سنکھال سے کہا۔ ”میری طرف رخ کر کے دوڑو۔ تاکہ میں اس کا نشانہ لے سکوں۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔“

میری بات پر سنکھال نے ایسا ہی کیا اور لنگڑاتا ہوا میری جانب دوڑنے لگا۔ اس کی رائفل خالی ہو گئی تھی۔ جسے اس نے پھینک دیا تھا۔ ریچھ اس کے تعاقب میں ذرا مڑا تو اس کا لمبوتر تھوٹھنا میرے نشانے بن گیا۔ میں نے لمبی دبا دی۔ کوئیوں کا پورا برست ریچھ کے تھوٹھنے پر پڑا اور وہ آخری غضب ناک چیخ مار کر وہیں برف پر ہی ڈھیر ہو گیا۔

\*\*\*

اس خوف ناک اور زبردست ہنگامے کے بعد ماحول پر ایک ایسی پراسرار سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ سنکھال نے اپنی زخمی ٹانگ پر برف لگائی تھی جس سے کسی حد تک خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ وہ باپ رہا اور عجیب و غریب وحشت ناک نظروں سے اپنے ساتھیوں اور بالخصوص قریب پڑی کچی ہوئی عامل عاروب کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

سنکھال متذکرہ بالا ان لوگوں میں سے تھا جسے میری زبان آتی تھی۔ مگر اس وقت وہ اپنا سر عجیب انداز میں ہلاتے ہوئے اپنی ہی بولی میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو، یہ سب بہت برا ہوا۔

مردم کا قتل بھی اسی کے سر جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ بہ صورت دیگر اگر آپ نے قانون کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی تو ہو سکتا ہے اس کا فائدہ آپ سے زیادہ مجرم سنکھال کو ہو جائے اور آپ بھی بلاوجہ سرکار سے ٹکر لے کر معتبہ ٹھہریں گے۔“

ایس بی ظہیر قریشی صاحب کی بات پر سردار زور آور کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دیگر مراد و مشیروں سے صلاح مشورہ کیا، اس کے بعد چپ سادھ لی۔

میرے سر سے بوجھ اتر گیا۔ میں خود کو بالکل ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے اب میرے نامساعد حالات کے سمندر میں تیرتی ہوئی بے پتہ ناؤ کو ایک کنارہ، ایک ساحل ملنے والا تھا جہاں خوشیاں تھیں، بے پایاں سرمتیں تھیں۔ یا شاید یہ میرا وہم تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا کہ میری خوشیوں اور مسرتوں پر کوئی بڑا مگر خاموش طوفان ایک اور شب خون مارنے کے لئے تیار تھا۔

گرین لاج میں ماں اور نگینہ بے چینی کے ساتھ ہماری منتظر تھیں۔ شاہ میر کو ماں نے ایک الگ کمرہ لئے رکھا تھا اور نگینہ بھی وہیں رہتی تھی۔

ہم نے بڑے عرصے بعد اپنی کامیابی کا جشن منایا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے گرین لاج سے عرصے سے روٹی ہوئی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئی تھیں۔

میں، ماں اور نگینہ بہت خوش تھے۔ میں سمجھتا تھا ماں نے شاہ میر کے سلسلے میں دشمنی کی ایک نئی مثال قائم کی تھی اسے معاف کر کے اور کڑے وقت میں اسے اور اس کی بیٹی کو اپنے ہاں پناہ دے کر..... مگر نگینہ بھی اس کے اس حسن سلوک سے از حد متاثر ہوئی تھی۔ بہر طور نگینہ نے اب اپنے گھر جانے کی فرمائش کر ڈالی۔

”لو بیٹی! تم گھر جانے کی بات کر رہی ہو۔ میں تو تمہیں اپنی بہو بنا کر یہاں لانا چاہتی ہوں۔“ ماں نے نگینہ کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ملامت سے کہا تو اس کا چہرہ شرم کے مارے گلزار ہو گیا۔ تاہم وہ سر جھکا کر ماں سے بولی۔

”ماں جی! اب تو آپ ہی میری ماں ہیں۔ لیکن مجھے اپنے گھر تو جانا ہے..... ابھی یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔“

”لیکن بیٹی! میں تو تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ اپنے انکل اعظم خان کے ہاں رہ لو۔ صرف چند دنوں کی تو بات ہے۔ میں اور نادر تمہیں عنقریب مگنی کی انگوٹھی پہنانے آجائیں گے۔“

ماں نے بڑے پیار سے کہا تو بے اختیار انکل اعظم خان بھی نگینہ کے سر پر ازراہ شفقت ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے بولے۔

”ماں بیٹی! اب تم ہمارے لئے غیر تھوڑی ہو؟..... ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم میری بیٹیوں جیسی نہ ہو۔ دیکھنا میں تمہیں کس طرح ایک باپ بن کر اپنے ہاں سے رخصت کروں گا۔“

باپ کے ذکر پر بے اختیار نگینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ہم سب اس کی آنکھوں سے اچانک ہی بہہ نکلنے لے ان آنسوؤں کا مطلب سمجھ چکے تھے۔

ایچانک کال ٹیل جی تو ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی کاشانہ صاحب آئی ہیں۔ میں ذرا چونکا۔ نگینہ نے فوراً اٹھو پونچھ کر میری طرف دیکھا۔ میں بے اختیار ہولے سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس دوران خود کاشانہ نور دوازے پر جا کر اندر لے آیا۔ کاشانہ حسب معمول اپنے لاابالی لباس میں تھی۔ یعنی نیکی اسٹائل کی شلٹ اور نیچے بلیو جینز، پیروں میں جوگر۔ وہ بہت نکھری نکھری اور اعلیٰ نظر آ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ میں نے جب نگینہ کا تعارف کروایا تو وہ بے اختیار خوشی سے بے قابو

تو جیسے اس کی طرف سے بہرہ بن چکا تھا۔ اس ویرانے میں اس کی چھین بھلاکون سننے والا تھا۔ بالآخر دن کی روشنی پھیلنے تک میں نے سیدھا قریبی پولیس اسٹیشن کا رخ کیا۔

وہاں کا تھانہ انچارج بھلا مانس تھا۔ میں نے اسے ساری کھانا ڈالی اور ساتھ ہی میں نے اس سے فون کی اجازت بھی طلب کر لی جو اس نے مجھے دے دی۔ میں نے سب سے پہلے انکل اعظم خان سے ہی رابطہ کرنا ضروری سمجھا۔ انہیں مختصر آساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ذرا دیر بعد انکل اعظم نے ایس بی ظہیر قریشی کی مدد سے تھانہ انچارج انسپٹر بہرام بزدار کو ہدایات دلوادیں۔

اس کے بعد بھلے مانس انسپٹر بہرام نے جب اپنی کسڈی میں لے لی اور سنکھال کو جھکڑیاں پہنا دیں۔ پھر وہاں سے ہمیں اسلام آباد روانہ کرنے کے انتظامات بھی اس نے کئے۔

انکل اعظم خان کی وجہ سے باقی سارے کام آسان ہوتے چلے گئے تھے اور میں سنکھال کے ساتھ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اتر۔ وہاں متعلقہ تھانے کی پولیس کے ہمراہ انکل اعظم خان، نگینہ اور ماں بھی میرے استقبال کے لئے موجود تھے۔

ماں نے مجھے گلے لگایا۔ نگینہ نے ہر مسرت نگاہوں سے میرا استقبال کیا۔ اس کے بعد ہم سب پولیس کے مختصر قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

بعد میں ماں اور نگینہ کو میں نے واپس گرین لاج روانہ کر دیا۔ جبکہ میں اور انکل اعظم خان ضابطے کی کارروائی نمٹانے متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایس بی ظہیر قریشی صاحب بھی بہ نفس نفیس ہمارے ساتھ تھے۔

مکش پور کی مذکورہ ہستی کے سردار زور آور خان سے رابطہ کیا جاتا رہا۔ انکل اعظم خان نے یہاں پہنچ کر یہ عقل مندی کی تھی کہ سردار زور آور خان کے بھائی وزیر ان کی لاش بذات خود ان کے حوالے کرنے کی بجائے ایس بی ظہیر کی معرفت اس تک پہنچائی تھی اور اس کے ساتھ ایک خصوصی نشست کے دوران ساری باتیں گوش گزار کر ڈالی تھیں۔ مگر سردار زور آور خان کی ایک ہی ہمت تھی کہ جب تک اس کے بیٹے شہ زور کے قاتل کو وہ سامنے نہ دیکھ لے اور مزید یہ کہ اس کی بیٹی شہزادی اپنے بھائی کے قاتل کو نہ پہچان لے، وہ کسی بات کو تسلیم نہیں کرے گا۔ چنانچہ ہم نے سنکھال کو ساتھ لیا اور پولیس کی جمیعت کے ساتھ مکش پور پہنچے۔

سردار زور آور خان مجھے دیکھ کر چراغ پا ہو گیا تھا مگر جب میرے ساتھ سنکھال کو دیکھا تو فوراً اپنی بیٹی شہزادی کو طلب کیا۔ شہزادی قاتلانہ حملے اور اپنے جوان بھائی شہ زور کو قتل کرنے والے سفاک انسان سنکھال کو دیکھ کر فوراً چیخ پڑی۔ تب کہیں جا کر میری طرف سے سردار زور آور خان کا ابال کچھ سرد ہوا تو سنکھال کی ہوا لگی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

”یہ ہمارا مجرم ہے۔ اسے ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔ اسے ہم خود سزا دیں گے۔“ سردار زور آور خان نے آخر میں ایس بی ظہیر قریشی صاحب سے کہا۔

میں اور انکل اعظم خان خاموش تھے۔ ایس بی صاحب نے بردبارانہ لہجے میں اس سے کہا۔

”دیکھئے سردار صاحب! آپ لوگ اسٹیٹ سے باہر نہیں ہیں۔ اور دوسری بات جو سب سے اہم ہے وہ یہ کہ یہ آپ کا قبائلی جھگڑا بھی نہیں تھا۔ سنکھال ایک غیر معروف گروہ سے تعلق رکھتا تھا جس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ یہ وادی کی لاش سے تعلق رکھتا تھا اور نہ ہی اس کی آپ سے کوئی دشمنی تھی۔ مگر بہر حال یہ قانون کا اور آپ کا مجرم ہے۔ اسے کڑی سے کڑی سزا دلوانے کا میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اس پر نہ صرف آپ کے بیٹے کے قتل کی فرد جرم عائد ہوگی بلکہ آپ کی بیٹی شہزادی پر قاتلانہ حملے سمیت آپ کے بھائی وزیر خان

”نادر! انکل نظر حیات اور کبیر آئے تھے، مجھ سے ملنے۔“

میں بری طرح چونکا۔

”کیا کہہ رہے تھے وہ دونوں خبیث؟..... تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا انہوں نے؟“ میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولی۔ تاہم اس کی آواز میں گھبراہٹ کا ارتعاش موجود تھا۔ ”مجھ سے ملنے آئے تھے اور ریت پوچھنے۔ دوبارہ پھر آئیں گے نادر!.....“ وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکی تو میں نے فوراً اس کی پشانی بھانپ کر پوچھا۔

”مگر کیا؟..... کوئی دھمکی تو نہیں دی ان خبیثوں نے تمہیں؟“

”نہیں..... ایسی بات تو نہیں تھی۔ لیکن..... انکل نظر حیات نے..... شاید میرا خیال غلط ہو، ہوں نے باتوں باتوں میں مجھ پر یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ اب میں انہیں ہی اپنا باپ سمجھوں۔ مزید یہ کہ مجھے اپنی بہو بنانے کا بھی اشارہ دے رہے تھے۔“

”کتا..... ذلیل..... خبیث!“ میں نے غضب ناک انداز میں نظر حیات کو گالیاں دے ڈالیں۔

”تم نے ان کی حوصلہ افزائی تو نہیں کی؟“

”نہیں..... میرا رویہ شروع سے سرد رہا تھا۔ میں بھلا یہ کیسے بھول سکتی ہوں کہ کبیر نے تمہارے ماتھے مجھے بھی اپنے ساتھی کالا ناگ کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔“ نگینہ نے بھی سچی سے کہا۔

میری طرح وہ کیا شادی کی وہ پہلی مہم نہیں بھولی تھی، جب میں اور نگینہ جہنم داخل عاروب کے زعمے میں تھے اور اس وقت کبیر نے کالا ناگ کے ساتھ وہاں ہم پر حملہ کیا تھا اور ہم دونوں پر بے دریغ گولیاں برسانے کی ٹھانی تھی۔

”دیکھو نگینہ!“ میں نے اپنے طیش اور ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”نظر حیات اور کبیر سے تم زیادہ اچھے کی کوشش مت کرنا۔ میں اس سے نمٹتا ہوں..... میری طرف سے ڈھیل ملنے پر وہ دونوں شاید اپنی اوقات بھول گئے ہیں۔“

اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ تاہم میں نے نگینہ کو ہدایت کر دی تھی کہ جس وقت وہ دونوں دوبارہ آنے کے پروگرام سے آگاہ کر دیں تو وہ مجھے بتادے۔ میرا پورا وجود غیظ و غضب کی آگ میں پھٹکنے لگا۔ مجھے نظر بات اور کبیر کی اس جرأت پر حیرت بھی ہو رہی تھی۔ میرے دل میں تو آئی کہ اسی وقت نظر حیات کے ہاں آکر اس کی گردن مروڑ ڈالوں اور دیگر قیدیوں کی طرح یہ آخری قفسہ بھی منٹا دوں۔ مگر اب میں قانون کو سمجھ میں لے کر اپنے آخری اور اہم ترین دیرینہ دشمن کو کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ غفورے کے ہتھم واصل ہونے کے بعد سے میری اور ماں کی قانونی پوزیشن مستحکم ہو گئی تھی جس کے بعد نظر حیات اور فضل، تعصب اور احساس کمتری کا مارا ہوا انسپکٹر اعجاز خٹس اپنا سامنہ لے کر رہ گئے تھے اور میں انہیں دوبارہ فوج نہیں دینا چاہتا تھا۔ انکل اعظم خان نے بھی مجھے یہی تلقین کی تھی۔

میں نے اب ان دونوں کینہ پرور باپ بیٹے سے اس وقت ہی نمٹنا مناسب جانا تھا جب وہ دوبارہ نگینہ کے ہاں آنے والے تھے۔

مجھے ان دونوں باپ بیٹے کی ڈھٹائی پر حیرت ہو رہی تھی۔ آخر یہ دونوں کس منہ سے اور کس برتے پر غینہ سے ملنے آئے تھے؟ حتیٰ کہ نظر حیات نے اشاروں کتابوں میں نگینہ کو اپنی بہو کا بھی عندیہ دے ڈالا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ کبیر نے نگینہ کو ہلاک کرنے کی مذموم کوشش بھی کی تھی۔ نگینہ کو تو اب کبیر

ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اسے گلے لگا لیا۔ نگینہ بے چاری ابھی تک حیران پریشان نظروں سے کبھی کا شاد کو اور کبھی مجھ سے جاری تھی۔

تب پھر میں نے نگینہ سے مختصر الفاظ میں کا شاد کا تعارف کروادیا۔

”نگینہ! میری بہن!..... خبردار، کسی غلط فہمی کا شکار مت ہونا۔ نادر صاحب میرے اچھے دوست ہیں اور بس۔“

کا شاد نے حسب عادت نگینہ سے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ بے اختیار نگینہ ہنس پڑی۔

”اللہ جانتا ہے، آج مجھے تمہیں اور نادر کو ساتھ دیکھ کر کس قدر خوشی ہو رہی ہے۔“ کا شاد نے نگینہ کو خود سے لگاتے ہوئے خلوص دل سے بولی۔ ”یو آر ریلی اے لکی گرل۔ نادر جیسا بہادر اور پیار کرنے والا انسان تمہارا شریک حیات بننے والا ہے۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے بولی۔ ”نادر صاحب! اپنی اور نگینہ کی شادی کی تاریخ مجھے ضرور بتائیے گا۔ میں ایک مہینے پہلے ہی یہاں آکر ڈیرا جمالوں گی۔ میں اپنی بہن نگینہ کی ہر رسم میں شریک رہنا چاہتی ہوں۔ بلکہ ہم دونوں شادی کی شاپنگ بھی اکٹھے ہی کریں گے۔“

وہ اپنی رو میں کہتی جاری تھی اور میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ تہہ در تہہ نظر آیا۔ اوپر چہرے سے خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے جبکہ اس کی تہہ میں ان کے درد کی دراڑی پڑی محسوس ہوتی تھی۔ جسے غالباً صرف میری ہی نظریں بھانپ رہی تھیں۔

کا شاد کے اچانک آجانے سے ایک بار پھر محفل گرم ہو گئی تھی۔ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹہ کا شاد کے ساتھ باتوں میں گزر گیا۔ وقت کے بیتنے کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ نگینہ بھی اب اس کے ساتھ اس مختصر عرصے میں خاصی کھل گئی تھی۔

کا شاد نے جانے کی اجازت لی تو محفل پر خواست ہوئی۔ اس کے جاتے ہی انکل اعظم بھی رخصت ہونے لگے تو نگینہ نے بھی جانے کی اجازت لی اور انکل سے استدعا کی کہ اسے گھر تک ڈراپ کر دیں۔

نگینہ کی بات پر ہم چونکے۔ البتہ انکل نے نگینہ سے کہا۔ ”نہیں بیٹی! تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ ”نہیں انکل! میں اپنے گھر جاؤں گی، پلیز!“ نگینہ نے بڑے رसान سے اصرار کیا تو ہم بھی چپ ہو رہے۔ تاہم میں نگینہ کی ہنسی تک چھوڑنے کے لئے تیار ہوا تو انکل اعظم خان نے کہا۔

”نہیں بیٹی! میں چھوڑ دوں گا..... کوئی مسئلہ نہیں۔“

مگر میں نہیں مانا۔ چنانچہ میں نے نگینہ اور شاہ میر کو اپنی جیب میں سوار کرایا۔ شاہ میر واقعی زندہ لاش کی مثل تھا۔ اپنے جسم کے ایک ذرا سے وجود کو بھی وہ جنبش دینے سے قاصر تھا۔ ماسوائے آنکھوں کی پتلیوں کے۔ اب پتلیں اس کی یادداشت بھی لوٹی تھی کہ نہیں۔ اور اگر لوٹ آئی تھی تو اسے ہمارے درمیان ضرور حیرت ہو رہی ہوگی۔

میں نگینہ کو لے کر پنڈی روانہ ہو گیا۔

دو ڈھائی گھنٹوں کے اندر اندر ہم پنڈی پہنچ گئے۔ میں نے بہ خیر و عافیت نگینہ کو اس کے باپ سمیت ان کی رہائش گاہ پر چھوڑا اور پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اب نظر حیات کے سلسلے میں حکمت عملی تیار کرنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ ایک زخمی سانپ کی طرح میری تاک میں ہوگا۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے اور اس کے سپنولے بیٹے کبیر کو اب تک یقیناً مارا۔ بارے میں علم ہو چکا ہوگا۔ اگلے روز مجھ سے نگینہ نے فون پر رابطہ کیا۔

سے ہی نہیں نظر حیات سے بھی شدید نفرت ہو چکی تھی۔ مزید یہ کہ ان دونوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ نگینہ درحقیقت مجھ سے شادی کی خواہاں تھی۔

ٹھیک ایک دن بعد ہی شام چار بجے نگینہ کی مجھے اپنے ٹال پر کال موصول ہوئی کہ نظر حیات اور کبیر چھ بجے شام اس کے ہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں اسی وقت اپنی جیب میں سوار ہوا اور پنڈی جا پہنچا۔ میں جیب وہاں پہنچا تو مجھے خاصی تاخیر ہو چکی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ راستے میں دو بار میری جیب خراب ہوئی تھی۔

میں وہاں پہنچا تو دونوں باپ بیٹا نگینہ کے ہاں تھے۔ نگینہ کو میں نے سخت طیش میں پایا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اب نظر حیات اور کبیر مجھے دیکھ کر کچھ پریشان اور بے چین سے ہو گئے تھے۔ میں نے ایک تیز سنسنائی ہوئی نظر ان دونوں باپ بیٹے کے چہروں پر ڈالی اور اچانک میری نگاہ قائلین پر گری ایک سو نے کی انگوٹھی پر پڑی جس میں ہیرا جگمگا رہا تھا۔ ایک جانب چھوٹی سی سرخ رنگ کی مٹلی ڈبیہ بھی پڑی تھی۔ یہ دونوں چیزیں نظر حیات اور کبیر کے قدموں کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ کبیر نے جلدی سے یہ دونوں اچک لیں۔

”نگینہ! یہ سب کیا ہے؟..... ان دونوں نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی؟“ میں نے ان دونوں کی طرف بدستور گھورتے ہوئے دانستہ نگینہ سے پوچھا تو وہ تلخ لہجے میں جواباً مجھ سے بولی۔

”یہ مجھے انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔“

میں بھنا کر رہ گیا۔ اور استہزائیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”اچھا..... مٹی کو ابھی تک خواب میں جھنجھڑے نظر آ رہے ہیں۔“ میں نے ان دونوں سے سردست بات بھی نہ کرنے کی کوشش کی اور نگینہ سے پوچھا۔ ”تم نے انہیں کیا جواب دیا ہے؟“

جواباً نگینہ بھی ان دونوں کی طرف دانت پیستے ہوئے دیکھ کر بولی۔

”کی الحال تو میں نے انہیں زبانی جواب دے دیا ہے کہ یہ دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہ کریں۔“

اس کے باوجود یہ دونوں بے غیرت باپ بیٹا یہاں بیٹھے ہوئے ہیں؟“

”ناور! زبان سنبھال کر بات کرو۔“ کبیر اپنی بے عزتی کے احساس تلے چراغ پا ہو کر بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کی جرأت پر ششدر رہ گیا۔ البتہ نظر حیات مجھ سے اب تک بری طرح خائف نظر آ رہا تھا۔ میں کبیر کو قہر ناک نظروں سے گھورتا ہوا چند قدم اس کی جانب بڑھا اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

”اگر تم اس وقت یہاں نگینہ کے گھر نہیں ہوتے تو میں تم دونوں خبیث باپ بیٹا کو اس سے زیادہ بے عزتی کر کے یہاں سے دھکے دے کر نکالتا۔ تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں قدم رکھنے کی؟..... تم تو نگینہ کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔“

”وہ سب تمہاری وجہ سے تھا۔“ وہ بولا۔

”گیٹ آؤٹ..... گیٹ آؤٹ..... یہاں سے اپنی منحوس صورتیں لے کر فوراً دفع ہو جاؤ۔ ورنہ.....“ میں غصے سے بے قابو ہو کر مٹھیاں بٹھکتے ہوئے بولا۔

”چلو بیٹے!..... چلو..... یہاں سے۔“ فوراً ہی نظر حیات نے اپنے بیٹے کا بازو پکڑا اور دونوں وہاں سے کھسک گئے۔

”مجھے تو اب ان دونوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔“ ان کے دفعان ہوتے ہی نگینہ نے مرتعش لہجے میں مجھ سے کہا تو میں اس سے بولا۔

”یہ دونوں ہمارا بال بھی بچا نہیں کر سکتے۔ تم دیکھنا، میں ان دونوں کا بہت برا شکر کرنے والا ہوں۔“

نگینہ کو کچھ حوصلہ ہوا۔ ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ میں نے نگینہ سے کہا۔

”نگینہ! ماں تمہیں انگوٹھی پہنانے کے لئے آنے والی ہیں۔“

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی تھی۔ پھر اس کے گداز ہونٹوں نے جیش کی۔

”تمہیں بہت جلدی ہو رہی ہے؟“ اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

”ہاں نگینہ!“ میں نے ایک گہری ہمارکی لی۔ ”درحقیقت میری اب تک کی زندگی میں برائے نام ہی خوشیاں رہی ہیں۔ اور میری ماں.....“ میں نے تھوڑا توقف کیا۔ شاید میرے حلق میں کرب کی رقت اتر آئی تھی۔ ”ماں بے چاری کی تو ساری زندگی دکھوں اور مصائب سے ہی عبارت رہی ہے۔“ میں نے کرب کی مٹی کو محسوس کرتے ہوئے نگینہ کی طرف دیکھ کر گنیمیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”نگینہ! یہ تصور صرف میں ہی کر سکتا ہوں کہ ہم دونوں کی شادی پر ماں کے دل کو کس قدر مسرت ہوگی۔ نگینہ! مجھے پورا یقین ہے کہ جب وہ میرے سر پر سہرا دیکھے گی تو یہ خوشی اس کے اب تک کے سارے دکھوں کا دارماں بن جائے گی۔ گویا اسے ایک نئی زندگی مل جائے گی۔“

”انشاء اللہ..... ایسا ضرور ہوگا۔“ بے اختیار نگینہ نے دھڑکتے تھے کہا۔

”نگینہ! ماں مٹکی کی اس رسم کو بڑی دھوم دھام سے ادا کرنا چاہتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے تم انکل اعظم خان کے ہاں شفقت ہو جاؤ تو بہتر ہے۔“

”نہیں نادر!“ نگینہ نے دھیرے سے کہا۔ ”میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میری ایک دور کی رشتے کی خالہ سلام آباد میں رہتی ہیں۔ میں نے انہیں فون کیا ہے۔ بے چاری سلائی کڑھائی کر کے گزارہ کرتی ہیں۔ مگر بڑی خوددار..... بہر حال میری بات انہوں نے مان لی ہے۔ وہ آج کل میں آنے والی ہیں۔ اور پھر ری سہیلیاں بھی تو ہیں۔ وہ بھی ادھر آ جاتی ہیں۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر میں امی کو مٹکی کی تاریخ تو دے دوں نا..... دو روز بعد کی تاریخ بل رہے گی؟“

نگینہ نے اثبات میں ہولے سے اپنا سر ہلا دیا۔

\*\*\*

اس روز مٹکی کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ میں ماں کا خوشی سے گلزار ہوا چہرہ دیکھ کر پھولے لہسا رہا تھا۔ نگینہ کی اسلام آباد سے خالہ بھی آ چکی تھیں۔ ان کا نام رحمت خاتون تھا۔ ہم نے ان سے ایک ات بھی کی تھی۔ مٹکی مانس اور نیک بزرگ خاتون تھیں۔ ہر وقت مسیح ہاتھ میں رہتی تھی۔ مٹکی کے تیسرے دن شادی کی تاریخ تھی۔ گویا چٹ مٹکی پت بیابہ والا معاملہ تھا۔ بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا جب میں، ماں اور انکل اعظم کے ساتھ رسم مٹکی کے لئے نگینہ کی طرف پنڈی نہوا۔

میں اور ماں اپنی جیب میں تھے اور جیب میں ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ افضل چاچا مرحوم کی بیوہ سیکینہ بھی ساتھ تھی۔ جبکہ انکل اعظم خان اور ان کی فیملی اپنی الگ کار میں تھے۔

ہم پنڈی پہنچے تو میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ نگینہ نے اپنی رہائش گاہ کو بڑی خوبصورتی سے سجایا ہوا اس کی رہائش گاہ کسی ہیرے کی مانند جگمگا رہی تھی۔ ایک ایلن اور تہا لڑکی کا یہ سارا انتظام اور انصرام

یقیناً حیرت ہی کی بات تھی۔

بہر طور ہمارا استقبال اس کی قریبی، عزیز سہیلیوں اور ان کے والدین نے کیا تھا۔ اگرچہ معنی کی یہ شاندار رسم کسی ہال وغیرہ میں بھی ہو سکتی تھی۔ مگر اس میں نگینہ کی خواہش کا دخل تھا کہ خوشیوں کے شادیانے اس کے گھر کے دروازے کے اندر گونجیں۔ خود اپنی طرح یہ اس کی ایک معصوم خواہش تھی اور مجھ پر تو ظاہر ہے اس کی ہر خواہش کا احترام کرنا لازم تھا۔ جانے کیوں اب میرے دل کو بھی نگینہ کو جلد سے جلد پانے کی خواہش بے چین کرنے لگی تھی۔ نگینہ کا بھی یہی حال تھا۔

گویا عرصہ دراز سے اب دو پیاسے دلوں اور بے قرار نگاہوں کو شب وصل کی گھڑیاں مطلوب تھیں۔ دل بے قرار اور نگاہ تمنا نے بہت جدائیاں جھیلی تھیں۔ اور ان منتظر نگاہوں نے اپنے مقدر کے آسمان کی بے کراں وسعتوں میں اپنی خوش نصیبی کے چاند کو دیکھنے کی بار بار آرزوئیں کی تھیں، بہت دعائیں مانگی تھیں۔ اب یہ منزل دور تو تھی۔ حالانکہ رسم معنی تھی مگر نگینہ کو تو ذہن کی طرح سچایا گیا تھا۔

میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا اور مجھے حقیقتاً اپنی قسمت پر رشک آنے لگا تھا کہ میں نگینہ جیسی معصوم، سندر، بجل اور حسین و جمیل اہل لڑکی کا شوہر بننے والا تھا۔ محبت کی ملکیت کے الوہی احساس تلے میرا دل فخر سے لبریز ہو گیا۔ نگینہ کو ذہن کی طرح سچانے اور اہتمام کرنے میں سارا ہاتھ کا شانہ کا ہی تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس نے معنی سے دو دن پہلے ہی یہاں ڈیرے جمائے تھے۔ وہ خود بھی بہت بنی سنوری ہوئی تھی اور خاصی پُرکشش نظر آ رہی تھی۔

نگینہ کو گھر سے سبز رنگ کا ریشمی شرارے والا لباس پہنایا گیا تھا جس پر زرتار کا خوب صورت کام کیا ہوا تھا۔ میک اپ بھی بڑا مناسب کیا گیا تھا۔ نگینہ کے چہرے پر حسن سے زیادہ حیا کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

کا شانہ نے بے اختیار بے تکلفی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نگینہ کے ساتھ صوفے پر بٹھادیا تھا۔ میں نے بھی موقع کی مناسبت سے اپنی تیاری کر رکھی تھی۔ لائسن پور کا قہری پین کشی سوٹ زیب تن کر رکھا تھا میں نے اور بالوں میں ”ہیئر جیل“ لگا کر انٹی کشی کر رکھی تھی۔

ماں نے بھی ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور ہمیشہ کی طرح باوقار نظر آ رہی تھیں۔ جبکہ انکل اعظم خان نے گرے کٹر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔

کا شانہ کی تو ادائیگی ہی کی طرح زانی تھی۔ اس نے اسکن ٹائٹ آسان اُردو میں ”تھک مور یوں“ والی چٹلون پہن رکھی تھی جو اس کی گوری گوری اور بھری بھری پنڈلیوں کو جکڑے ہوئے تھیں۔ اوپر گلابی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ تھا۔ نیچے کھسے۔ بڑا ہی عجیب گیٹ اپ تھا اس کا۔ مگر بہر حال اس کا حسن بھی جدا گانہ ہی نظر آتا تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

ماں نگینہ کے دائیں طرف ساتھ بیٹھ گئیں۔ جبکہ نگینہ کی خالہ رحمت خاتون میرے بائیں جانب براجمان تھیں۔ انکل اعظم بھی ایک جانب اپنی مختصر فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ ماں کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ نگینہ کا چہرہ گلزار تھا اور میں سرور۔

ماں نے نگینہ کے لئے معنی کی انگوٹھی بہت خوب صورت بنائی تھی۔ رسم معنی کی ابتداء ہونے لگی۔ گانے باجے چل رہے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر سکھیاں خوشی کے گیت گ رہی تھیں۔ اس کے بعد ماں نے نگینہ کو انگوٹھی پہنادی۔ بڑی خوشی اور محبت کے ساتھ اسے اپنے ساتھ بھیج کر اس کا بوسہ بھی لے لیا۔

رات گئے ہم وہاں سے فارغ ہوئے۔ تین دن بعد شادی تھی۔ رسم کتابتی تھی اور سب کچھ معمول کے

مطابق ہو رہا تھا۔ اور بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ نگینہ کا شادی کے بعد رخصتی وغیرہ کا انتظام کسی ”میرج ہال“ کے بجائے اپنی ہی رہائش گاہ پر منعقد کرانے کا اصل مقصد یہی تھا کہ وہاں اس کا باپ شاہ میر تھا۔ جو ظاہر ہے، بستر پر تھا۔ بہر طور ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ جبکہ ہم نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ میری دعوت و لبر کا بندوبست بھی ”گرین لاج“ کے سامنے والے وسیع و عریض سرسبز گھاس کے میدان میں تھا۔ تین دن ہوتے ہی کتنے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی گزر گئے۔ البتہ یہ الگ بات تھی کہ میرے لئے یہ تین دن کا نڈا دُبھر ہو گیا تھا۔

نگینہ کی طرف شادی کی قریب عروج پر تھی۔ اس کی رانٹ گاہ بعد نور بنی ہوئی تھی۔ نکاح ہوا، نگینہ سرخ عروسی جوڑے میں بہت ہی حسین اور پُرکشش نظر آ رہی تھی۔ شادی کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ اس کے بعد نگینہ کو میرے ہمراہ رخصت کیا گیا تو نگینہ نے باپ کے کمرے میں چلنے کی خواہش کی۔ ہم اس کے کمرے میں پہنچے۔ نگینہ بے اختیار بستر پر زندہ لاش کی شکل اپنے باپ شاہ میر کے وجود سے لپٹ کر رو دی۔ میرا دل بچ بچ گیا۔ ماں بھی ہمارے ساتھ وہاں موجود تھی۔ نگینہ نے اشک بار چہرے اور گلوگیر لہجے کے ساتھ باپ سے کہا۔

”پاپا!..... کاش آپ مجھے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر آج رخصت کرتے۔ کاش..... کاش اس وقت کوئی معجزہ ہو جائے پاپا!“ وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ میری نظریں شاہ میر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں جہاں مجھے ہلکے سے غیر محسوس ارتعاش کا احساس ہوا۔ اس کے بعد میں نے شاہ میر کی آنکھیں بھگیتے دیکھیں تو میں نے دیر سے سے نگینہ کے کاندھے پر ہاتھ دھرا دیا۔

”نگینہ! تمہارے پاپا کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ تمہیں وداع کر رہے ہیں۔“

نگینہ چونک کر اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو دیکھ کر مزید رو پڑی۔ ٹھیک اسی وقت ماں آگے بڑھی۔ اس نے آنسوؤں سے شاہ میر کا بے جان سا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور نگینہ کے سر پر رکھ دیا۔ نگینہ نے چونک کر سر اٹھایا تو ماں کو اپنے باپ کا بے جان ہاتھ پکڑے اپنے سر پر رکھتے دیکھا تو بے اختیار ماں سے لپٹ کر رو پڑی۔

”بیٹی! دل چھوٹا مت کر..... سب کی کوششوں سے ایک دن شاہ میر اپنے قدموں پر ضرور کھڑا ہوگا۔ یہ میں کہہ رہی ہوں۔ تمہاری ماں..... یہ میرا وعدہ ہے۔“

ماں نے پُر عزم لہجے میں کہا اور نگینہ کو کچھ ڈھارس بندھی تو ماں نے مجھ سے پوچھا۔

”نادر بیٹے! شاہ میر کو گرین لاج پہنچانے کا تم نے بندوبست کر لیا ہے..... یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

”جی امی!“ میں نے ہولے سے کہا۔ ”انکل اعظم نے انہیں اپنی گاڑی میں لے جانے کا پورا انتظام کر رکھا ہے۔ بس وہ ڈھیل چیز لے کر آتے ہی ہوں گے۔“

اس کے بعد ہم تینوں مہمانوں کے جہرمت میں رہائش گاہ کے وسیع احاطے میں آگئے تو اچانک میری نگاہ سامنے کھڑے کبیر پر پڑی۔ اس کے دلوں ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا سا گلدستہ تھا اور چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ۔ کبیر جیسے زہریلے سپو لیے کو یوں اچانک اور غیر متوقع طور پر اس اہم موقع پر پا کر میرے اندر اندیشہ شک و دوسوں کے سانچوں نے کلہاڑا شروع کر دیا۔ نگینہ اور ماں کی بھی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

”نگینہ!..... تم نے مجھے اپنی شادی پر نہیں بلایا۔ دیکھو، میں خود ہی آ گیا۔ تمہیں مبارک باد دینے۔“

میں نے عالم وحشت کے سے انداز میں نگینہ کے چہرے کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ مگر رادل نہیں بیان رہا تھا کہ نگینہ مر چکی تھی۔ وہ..... وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو کر کبھی نہ لوٹنے والے فرج جا چکی تھی اور اپنی ان مٹ یادیں، کبھی نہ بھرنے والے زخموں کی صورت میں میرے لئے چھوڑ چکی تھی۔ نگین..... میں یہ کیسے یقین کر لوں..... کہ نگینہ مر چکی تھی۔

”نن..... نہیں..... نہیں..... نگینہ!..... تن..... تم مجھے چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہو؟..... پس آ جاؤ..... واپس لوٹ آؤ۔“

مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا۔ میں دیوانوں کی طرح چلانے لگا۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میرے اعصاب منتشر ہو رہے تھے۔ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ میری جان نکل رہی تھی۔ میں پاگل ہو رہا تھا، ادھ موا ہو رہا تھا۔ میں..... نادر علی خان..... مضبوط اعصاب اور دل بردے کا مالک، نامی گرامی بد معاشوں اور خطرناک ترین دشمنوں کو پچھاڑنے والا نادر علی خان جیسے زندہ گور ہو رہا تھا۔ نگینہ کی لاش کو خود سے لپٹائے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا..... اور پھر مجھے لہجہ ہوش نہ رہا۔

\*\*\*

ماں اپنی بہو کو عروسی جوڑے میں لے جانے کی بجائے کفن پہنائے اپنے ساتھ آخری سفر پر جا چکی تھیں..... دوبرے غموں کی اذیت تا کیوں کو زخمِ ناسور کی طرح سہنے کے لئے میں نے دوبارہ آنکھیں کھول دی تھیں۔

ہسپتال سے لے کر پولیس اسٹیشن کی کارروائیاں نمٹائی جانے لگیں۔ مگر مجھے تو جیسے ہوش ہی نہ تھا۔ ہرے ساتھ انکل اعظم خان اور کاشانہ تھے۔

کبیر میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا اور نظر حیات اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد پاگل ہو چکا تھا۔ اس کا زورس بڑیک ڈاؤن ہو چکا تھا اور اسے پاگل خانے میں ایڈمٹ کر دیا گیا تھا۔

نگینہ اور ماں کی تدفین گرین لاج کے عقبی گوشے میں عمل میں لائی گئی تھی۔

چوتھے روز پتہ چلا کہ پاگل خانے میں زورس بڑیک ڈاؤن کے دوران نظر حیات کے دماغ کی نس پھٹ ہانے کے باعث اس کی بھی موت واقع ہو چکی تھی۔

یہ پانچویں روز کا ذکر تھا۔

مجھے چپ سی لگ گئی تھی۔ میرے اندر سناٹے آن بے تھے۔ مجھے کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہا تھا۔ دو میرا زیادہ وقت گرین لاج کے پچھواڑے ماں اور نگینہ کی قبروں کے قریب بیٹھے ان پر ہر روز نئے، تازہ پھول چڑھانے، پانی کا چھڑکاؤ کرنے میں گزرتا تھا۔ انکل اعظم خان اور بالخصوص کاشانہ مجھے اپنے تئیں قدر بھر سنبھالے ہوئے تھے۔

مگر میں نگینہ اور ماں کی جدائی کا غم بھلا کیسے بھلا سکتا تھا؟..... یہ زخمِ توب میرے جسم و جاں کا حصہ بن چکا تھا جو بھلائے نہیں بھولتا۔

ایک روز میں سرمائی دھوپ میں نگینہ اور ماں کی قبروں کے قریب زمین پر گم صم بیٹھا تھا کہ مجھے پتہ بھی نہ ملا کہ جانے کون دیرے دیرے چلتا ہوا میرے عقب میں آن کھڑا ہوا تھا۔

مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میری ہموور و نمکناظر نگینہ کی قبر پر مرتکز تھیں کہ اچانک کسی نے میرے دائیں اٹھ سے پر ہاتھ رکھا۔ میں جیسے بے حس ہو گیا تھا۔ جب میں کچھ نہ بولا تو مجھے ایک لرزتی آواز سنائی دی۔

اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔

اچانک میری نگاہ اس کے ہاتھوں میں تھمے ہوئے گلدستے پر پڑی تو مجھے گلاب کی پتیوں سے جھانکتی ہوئی مہیب نال کی جھلک نظر آئی جس کا رخ نگینہ کے سینے کی طرف تھا۔ میرے تن بدن میں جیسے سنسنی کی تیز لہر دوڑ گئی۔ اور پھر اس سے پہلے کہ میں حرکت کرتا، ایک دھماکا ہوا اور نال نے آتشیں شعلہ اُگلا..... نگینہ کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ گولی کی بھیانک قربت نے اس کے سینے کو بل بھر میں رگمیں بنادیا۔ اس کے حلق سے کھٹی کھٹی چیخ ابھری اور بے اختیار اسے گرنے سے سنبھالنے کو میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھے اور وہ ان میں جھول گئی..... کبیر کے ہاتھوں سے گلدستہ پھوٹ کر گر چکا تھا۔ اب پستول کی دھواں اُگلتی نال کا رخ میری جانب تھا۔ اس پر شدید دیوانگی کا دورہ طاری تھا اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

”نادر!..... میں ہار گیا۔ مگر میں نے تمہیں بھی جیتنے نہیں دیا۔ تم بھی اب نگینہ کے ساتھ اوپر آسمانوں میں سہرا سجاؤ۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی نال کا رخ میری جانب موڑا تو اچانک ماں سامنے آ گئیں..... گولی چلنے کا دوسرا دھماکا ہوا اور ماں کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہو گئی۔

میرا سکتو ٹوٹا اور پھر جیسے میرے ارد گرد آتش فشاں کھولتا ہوا لاوا اُگلنے لگے۔ میں جنونی انداز میں کبیر پر جھپٹا اور اس کے ہاتھ سے پستول چھپٹ کر اسے دھکا دیا اور پستول میں جتنی بھی گولیاں تھیں اس پر صرف کر ڈالیں۔

مرتے وقت بھی کبیر کے چہرے پر عجیب سی طمانیت آمیز مسکراہٹ تھی۔ مہمانوں میں زبردست چیخ و پکار اور بھگدڑ مچ گئی۔

میں نے بیک وقت خون میں لت پت ماں اور نگینہ کو سنبھال لیا تھا۔ ماں شاید دم توڑ چکی تھیں۔ مگر نگینہ میں ابھی چند سانس باقی تھیں اور مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری سانسیں جیسے نگینہ کی سانسوں کی ٹوٹی ڈور کے ساتھ تنقی ہو چکی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری کائنات میرے ہاتھوں میں دم توڑ رہی ہو۔ میرے اندر دل و دماغ میں وحشتوں کے سناٹے پیچ رہے تھے۔

میں نے فوراً نگینہ کو اٹھانا چاہا۔ مگر نگینہ نے ٹوٹی لرزتی آواز میں کہا۔

”نن..... نادر!..... تم..... مجھے..... آخری لمحات میں اپنے بازوؤں سے..... خود سے الگ نہ کرو..... آہ.....“

”نن..... نگینہ!..... تن..... تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم..... میں..... تمہیں.....“ مجھ سے بولا نہ گیا۔ لفظ ٹوٹنے لگے۔ نگینہ کے لبوں نے جنبش کی۔

”میری قسم تمہیں..... نن..... نادر!..... تم..... مجھے اپنے ساتھ بھیج لو..... تم..... میری سانسیں اکھڑ رہی ہیں..... تم..... مجھے اپنے سینے سے لگا لو..... پپ..... پلیز!“

اس کا دم رکنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بھری لگ گئی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے بچھین لیا۔

”نگینہ!..... نگینہ!..... تن..... تم مجھے..... چھوڑ کر نہیں جاسکتیں..... تن..... تن.....“

تم..... یہ..... تم..... میرے ساتھ بے وفائی نہیں.....“

میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میں نے محسوس کیا کہ جیسے نگینہ کے نرم و نازک وجود میں ایک ٹھہراؤ آ گیا ہو۔ اس کا وجود ابھی سکوت میں ڈوب گیا تھا۔ میں سر تاپا لرز گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ گیا ہو۔ جیسے..... جیسے زمین مل گئی ہو..... جیسے قیامت آ گئی ہو..... اور سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔

(ختم شد)